دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب
عمران ڈائجسٹ
مئی 2013
دو سلسلے وار تحریریں
تم سے تو وہ نہیں۔ جانگوگر
اسلم راہی کی تاریخی کہانی
شاہ جہاں
معاشرتی ناول
نقشِ دوام
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
PAK Society
LIBRARY OF PAKISTAN
ONE SITE ONE COMMUNITY
پاکستانی پوائنٹ
www.pakistaniPoint.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

Downloaded from Paksociety.com

دنیا بھر سے منتخب معیاری

MEMBER APNS	ممبر آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
CPNE	ممبر کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

عمران ڈائجسٹ

بانی: محمود ریاض
مدیر اعلیٰ: عامر محمود
منتظم: محمد شفیع

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

یادِ محمود ریاض
8

عمران ڈائجسٹ کے بانی جنابِ محمود ریاض صاحب کی برسی پر خاص مضمون ان کی یاد میں ماضی کی باتیں

مدیر

شاہ جہاں
10

اس تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ معروف مصنف کے قلم سے

اسلم راہی

پاسِ عہد
39

اس کے ماتحت نے پیسے کی ان چاروں کو خون میں لت پت اور بے حس و حرکت دیکھا تو حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ اسے پیسے یقین نہیں آیا کہ۔۔۔

ایم الیاس

پتھر کے صنم
53

دوسرے دن جب وہاں پہنچی تو کئی دنوں بعد آج پھر اس کے قدم اکھڑنے لگے۔ اسے وہ دن یاد آیا جب پہلی دفعہ وہ یہاں آئی تھی عجیب سا احساس اس پر طاری تھا۔

کامران جاذب

تقاریر
63

جب آدھی رات کو آنکھ کھلتی تو وہ اکثر ماں کو روتے ہوئے دیکھتا مگر جلدی سے آنکھیں بند کر لیتا کہ ماں کا بھرم رہ جائے پر پھر آہستہ آہستہ۔۔۔!

شازیہ رانا

جانگن
66

ایک پریشان حال نوجوان کی داستانِ حیات جسے جنوں سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ پُراسرار واقعات سے بھی ہوئی دلچسپ سلسلے وار داستان۔

ایم اے راحت

آزادی کے متوالے
92

رچرڈ کا فطری تجسس جاگ اٹھا تھا۔ وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ پیئر گارڈن کسی قسم کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز تھا اور بظاہر جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ۔۔۔!!

ایس اے ہاشمی

معافی
115

شاکرہ نے اتنا کچھ سننے کے بعد بھی بہت آرام سے دھیمے انداز میں بات کی تھی۔ اس کے باوجود منظور کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔

عالیہ توصیف

دوسری تصویر
123

میں توہم پرست نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں خوف کی ایک سرد لہر میرے پورے جسم میں سرایت کر گئی میں نے سوچا کہ۔۔۔!

کرم الٰہی چوہدری

دخل در معقولات
129

ڈرلی نے ریسٹ واچ کی طرف دیکھا۔ سات بج کر اکیاون منٹ ہوئے تھے۔ اس نے معذرت سے کہا۔ ”معاف کیجیے کالی کو دودھ پلانے کا وقت ہو گیا ہے۔“

محمد بلال

رقم دوڑ
134

وہ یقیناً خوش ہو رہے ہوں گے اور انہیں ہونا بھی چاہیے تھا۔ مگر اب پیئر کے سامنے سب سے بڑا مشن یہ تھا کہ وہ ان لوگوں کا تیا پانچا کرے۔

احمد صغیر صدیقی

شکستہ پیماں
152

میں فوراً ہی چلنے کے لیے تیار ہو گئی کیونکہ ایک ایک لمحہ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں نے اور شین نے گھر والوں سے رخصتی کلمات کہے اور۔۔۔!

محمد صدیق طاہر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

زہر کا ساگر
175

میڈونا نے ڈاٹا چینک سے رابطہ تو کرلیا لیکن وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ پروگرام ان دو جنیوں کے بارے میں اسے معلومات فراہم کرسکے گا۔ وہ جانتا تھا کہ.....!

راحیلہ جبیں بدر

فریب عقل
196

لیکن اب جبکہ مجھے آواز دی جاچکی تھی اور آواز دینے والی بھی قریب آچکی تھی تو نہ جانے کیوں مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ اسٹریٹ لائٹ کچھ دور تھی۔

محمد مقصود خان

جائز قتل
200

انسان کو جب کسی چیز کا چسکا پڑ جاتا ہے تو یہ عادت مشکل ہی سے چھوٹتی ہے۔ اس کی لذت اسے اپنی گرفت میں جکڑتی چلی جاتی ہے۔

سید ذوالفقار حیدر

الٹے پھیر
204

امریکی معاشرے کی ایک ایسی عورت کا قصہ جس نے اپنے سابقہ شوہر کو قتل کر دیا تھا لیکن اپنے جرم کو راز رکھنے کی خاطر اسے مزید قتل میں شریک کار بننا پڑا۔

سلیم اختر

تم سے دور نہیں
208

میں قلم ہوں۔ کائنات کی ہر شے فانی ہے لیکن مالک کائنات نے مجھے عمر دراز عطا فرمائی ہے۔ مجھے اس کائنات سے شناسائی کی خدمت سونپی گئی ہے۔

غزالہ جلیل راؤ

روشنی کی طرف
233

حالات پڑھ کر اور تصویر دیکھ کر میرا دل بھر آیا میں سوچنے لگی کہ میری نادانی تھی جو میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ بدنصیب سمجھتی تھی۔

دانش کمال

خودسر
238

میں نے ان کا بازو پکڑ کر بستر پر بٹھایا۔ مگر وہ بجائے بیٹھنے کے گر گئے اور میں بری طرح گھبرا گیا۔ کریم احمد خاں بے ہوش ہو چکے تھے۔

بیدم سیف آبادی

دھاروالا
244

بھیک مانگنا بہت برا ہے۔ اس میں غیرت جاتا رہتا ہے۔ ہم نے اسی دن پیسہ والا کا نوکری کرلیا۔ اس لے یہ کام ہمیں سکھادیا۔ اللہ والا بہت خفا ہوا بولا۔

عزیز احمد خان

الو
250

پتہ چلا کہ ایک آدمی ہے اسے آنے سے روکا جا رہا ہے اور وہ آدمی آنے پر بضد ہے۔ آخر بینا کے مالک نے اپنے نوکروں کو ڈانٹا کہ اسے آنے دو۔

مرزا حیدر عباس

تیری پائل کی جھنکار
253

عشق کا دیوتا حسن کی دیوی پر فریفتہ ہو گیا تھا نتیجتاً اس پراسرار کہانی نے جنم لیا۔ چترال کی وادی میں سینہ بہ سینہ چلتی ایک عجیب کہانی۔

ہما شاہین

مردہ بولتا ہے
260

لوگ یہی کہتے ہیں کہ جسم مر گیا سب کچھ ختم ہو گیا کیا یہ سچ ہے۔ وہ جسم کی قید سے آزاد ہو کر بھی گھر والوں کو بھولا نہیں تھا۔

نازش شاہین

نقش دوام
268

مجبوراً اس نے ہانگ کانگ جانے کی تیاری کرنی پڑی۔ سیٹھ سکندر علی نے بذات خود اسے بریف کیا اور پھر وہ ہانگ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

ایم اے راحت

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37 اردو بازار کراچی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

یاد محمود ریاض مدیر

محمود ریاض......ایک تاریخ......ایک عہد......ڈائجسٹوں کی دُنیا کا ایک روشن باب......!
مئی میں ان کی بارہویں برسی ہے۔اتنے سارے برس نا جانے کیسے دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے۔
وہ بھی دن تھے کہ ان کے دھیمے دھیمے قدموں کی آہٹ کا ہر کسی کو انتظار رہتا تھا۔
ایک ایسی شفیق ہستی......جو اپنی روشن آنکھوں سے انسان کے اندر کی کیفیات جان لیتی تھی......

ان کے مقابل بیٹھنے والے پر ان کی شخصیت کا سحر طاری ہو جاتا تھا بلکہ ان کا انداز گفتگو بھی مقابل کو اپنے فسوں میں جکڑ لیتا تھا۔

راہ چلتے شخص کی دلی کیفیات اور جذبات کا اندازہ لگا لینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی جب کہ اُنہیں اس پر دسترس تھی۔

آج سے بیالیس برس قبل ڈائجسٹوں کی دنیا میں ''عمران ڈائجسٹ'' کی بنیاد رکھی۔اس کا مقصد صرف بامقصد تفریحی ادب فراہم کرنا تھا۔جس پر ابھی تک عمل ہو رہا ہے۔عمران ڈائجسٹ کو ہی یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ادب کے اُفق پر جگمگانے والے کئی مصنفین کو اسی نے متعارف کرایا۔اس کے علاوہ جتنی تہلکہ خیز سلسلہ وار تحریریں عمران ڈائجسٹ میں شائع ہوئی ہیں' اتنی کسی اور ڈائجسٹ میں شائع نہیں ہوئیں۔اس کے علاوہ اردو ادب کی کئی شاہکار تحریروں کو بھی شائع کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

عمران ڈائجسٹ' خواتین ڈائجسٹ' شعاع' کرن......ایک ہی خوش رنگ درخت کی شاخیں ہیں' جس کی بنیاد محمود ریاض صاحب نے رکھی اور بڑے پیار سے ان کی آبیاری کی۔

آج پوری دُنیا میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ڈائجسٹ یہی ہیں۔

انہوں نے بہت سے مصنفین کی حوصلہ افزائی کی' ان میں لکھنے کی صلاحیتوں کو بیدار کیا اور ان کی تحریروں کو شائع کیا۔

ان کے حوصلے سے آج وہ تمام قلمکار بلند مقام پر بیٹھے ہیں۔

ان کی حوصلہ افزائی کی ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ پوری دُنیا میں شہرت پانے والی خواتین

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مصنفین انہی کی متعارف کردہ ہیں۔ ان کی شناخت اور تحریروں کی چاشنی محمود ریاض صاحب کے لگائے ہوئے پودوں سے ہی برقرار ہے۔ انہوں نے کبھی اس بات کو اپنے لیے قابل فخر نہیں گردانا۔

وہ چاہتے تھے کہ اردو کو مقام حاصل ہو اردو ادب کو ترویج حاصل ہو۔ ان کا جذبہ...... ان کا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ ان کے پرچے آج ان کی سوچ پر عمل پیرا ہیں۔

وہ اپنی یادیں چھوڑ کر جا چکے ہیں...... ان کی تربیت اب کام آ رہی ہے۔ وہ اپنے جذبے ہم سب میں منتقل کر چکے ہیں۔ جذبے اب بھی زندہ ہیں...... ان کا نام روشن کرر ہے ہیں۔ اب بھی مصنفین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان پرچوں میں ان کی تحریریں شائع ہوں۔ اس کے پس پردہ ناموری اور شہرت کی خواہش ہوتی ہے۔ خواہ اس بات کا وہ اقرار نہ کریں۔

ادب پرور گھرانے سے تعلق رکھنے والے محمود ریاض کے بھائی ابن انشاء سے کون واقف نہیں جو ادب میں نئے اسلوب کے بانی ہیں...... تحریروں کی شگفتگی، منفرد انداز بیان کے حامل ابن انشاء اپنی نثر نگاری اور شاعری کی وجہ سے ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود آج بھی زندہ ہیں۔ انہوں نے سفر ناموں کو ایک نئی جہت بخشی...... نیا اسلوب دیا...... شگفتہ تحریریں پڑھنے والوں کا پہلا انتخاب ابن انشاء ہی ہوتے ہیں۔

محمود ریاض صاحب نے بھی لکھا...... بہت ہی خوب صورت، دل نشین اور فکر انگیز انداز میں...... ان کی تحریریں قاری کو کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔

آج وہ ہم میں موجود نہیں ہیں...... لیکن نہیں...... وہ اب بھی ہم میں موجود ہیں...... ہماری فکر میں...... ہمارے انداز میں...... کیونکہ ہم انہی کے تربیت کردہ ہیں۔ انہی کی فکر سے سوچتے ہیں۔

ہم قارئین کو با مقصد اور تفریحی ادب فراہم کرتے رہیں گے۔ ان کا مشن...... مقصد...... لگن جاری ہے۔ ان کے لگائے ہوئے پودے پروان چڑھ رہے ہیں۔

ہم جب بھی اپنے اندر جھانکتے ہیں، وہ ہم میں موجود رہتے ہیں۔ اسی طرح سدا زندہ رہیں گے۔

قارئین سے استدعا ہے کہ ان کی روح کے ایصال کے لیے دعا فرمائیں کہ ربِ ذوالجلال اِن کی مغفرت فرمائے اور ان کے عزیز و اقارب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تاریخی کہانیوں کے شائقین کے لیے' بطورِ خاص

شاہ جہاں

اسلم راہی

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں سب سے زیادہ سازشیں ہوئی ہیں' اس کا اہم سبب جہاں اختیارات' اقتدار اور دولت رہی ہے وہیں عورت بھی ہے جو اس معاملے میں اہم حیثیت کی حامل ہے' اچھے برے ہر قوم' ہر مذہب اور ہر دور میں موجود رہے ہیں' اسلامی مملکتوں کے استحکام کے لیے مذہب پر کاربند سپہ سالاروں اور جنگجو سپاہیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ زیر نظر طویل تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا' وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنی مملکت کو مضبوط کرنے کے لیے کن کن امور پر توجہ دی اور اسے کمزور کرنے کے لیے سازشی عناصر نے کیا کیا جتن کیے۔

مسلمان حکمرانوں کا احوال' تاریخی حقائق' طویل داستان

Pakistanipoint Waqar Azeem

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

شاہجہاں کے حکم کے مطابق اس کا [illegible] آصف خان دکن سے واپس آگرہ چلا گیا تھا اور ان کے لشکریوں کی کمانداری مہابت خان اور بہادر خان نے سنبھال لی تھی دکن کی طرف روانہ کرنے سے پہلے شاہجہان نے کیونکہ مہابت خان کو خان خان خاناں کا خطاب دیا تھا لہذا لشکری اور چھوٹے سالار اب مہابت خان کو خان خاناں کے نام سے ہی پکارنے لگے تھے۔

دکن میں اب مہابت خان اور بہادر خان کو دو تین قوتوں کا سامنا کرنا تھا ایک مرہٹوں کا سالار شاہ جی دوسرا سابق ایرانی سالار ملک عنبر کا بیٹا فتح خان اور بہتری سب سے بڑی قوت بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت تھی جس پر ضرب لگانے اور راہ راست پر لانے کے لیے آصف خان ناکام ہوا تھا اور شاہجہاں نے اسی بناء پر اسے آگرہ میں واپس بلالیا تھا۔

جس وقت آصف خان ناکام واپس چلا گیا مرہٹوں کے سالار شاہ جی کا دماغ خراب ہوگیا اس نے اپنی نظریں جنوبی ہند کے ایک مضبوط اور مستحکم قلعے دولت آباد پر گاڑ دادیں دولت آباد کا قلعہ اور شہر اس وقت فتح خان کی نگرانی میں تھا مرہٹوں کا سالار شاہ جی جانتا تھا کہ وہ اکیلا دولت آباد کو فتح کرکے اس پر قبضہ نہیں کرسکتا لہذا اس نے بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کے حکمرانوں سے ساز باز کی ان سے مدد مانگی تاکہ وہ دولت آباد کو فتح کرلے۔

مرہٹوں کا سردار شاہ جی چاہتا تھا کہ نظام شاہی کا سلطنت کا خاتمہ کرکے ان کے سارے علاقوں پر قبضہ کرلے اس کی ابتداء وہ ان کے قلعے دولت آباد سے کرنا چاہتا تھا چونکہ نظام شاہی سلطنت پر فتح خان کی گرفت تھی اور اس نے نظام شاہی سلطان کو جیل بھیج کر اس کے بیٹے حسین کو تخت نشین کروایا تھا اس واسطے فتح خان نہیں چاہتا تھا کہ نظام شاہی سلطنت میں مرہٹوں کا سردار شاہ جی دخل اندازی نہ کرے اسے جب خبر ملی کہ بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کی طاقت اور قوت کے ساتھ مل کر شاہ جی دولت آباد پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ بڑا پریشان ہوا لہذا اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ ان دونوں قوتوں کے خلاف مغلوں سے مدد مانگے چنانچہ صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے فتح خان نے تیز رفتار قاصد مہابت خان اور بہادر خان کی طرف روانہ کردیے تھے۔

دوسری طرف مہابت خان اور بہادر خان بھی بڑے تیز اور مستعد ہو چکے تھے وہ اپنی تیاریوں کو آخری شکل دے چکے تھے ایک روز وہ بیٹھے لشکر کی تقسیم کو آخری شکل دے رہے تھے کہ فتح خان کا ایک قاصد ان کے پاس آیا اپنا تعارف اس نے مہابت خان اور بہادر خان سے کرایا تھا تعارف کے بعد مہابت خان نے اسے مخاطب کیا۔

''کیا فتح خان کی طرف سے تم کوئی اچھی خبر لے کر آئے ہو۔'' اس پر آنے والا وہ قاصد بولا اور کہنے لگا۔

''اکبر فتح خان کے لیے بری مرہٹوں کے سردار شاہ جی اور بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کے لیے اچھی اور آپ دونوں کے لیے میں نہیں جانتا وہ خبر کیسی ہوگی اور خبر یہ ہے کہ مرہٹوں کے سار دار شاہ جی نے بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کے ساتھ مل کر نظام شاہی سلطنت کے اہم قلعے اور شہر دولت آباد پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی ہے اب صورت حال یہ ہے کہ بیجاپور والوں نے شاہ جی کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے اس طرح مرہٹے اور بیجاپور والے دونوں مل کر نظام شاہی سلطنت کے خلاف حرکت میں آئیں گے صرف دولت آباد پر ہی قبضہ نہیں کریں گے بلکہ فتح خان کا خیال ہے کہ وہ نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ کرکے رکھ دیں گے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

قاصد جب خاموش ہوا تب مہابت خان بولا اور کہنے لگا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ مرہٹوں کا سردار شاہ جی اس وقت اپنے لشکر کے ساتھ گیا ہے۔''

قاصد نے اثبات میں گردن ہلائی کہنے لگا۔ ''جی میں جانتا ہوں وہ اس وقت کہاں ہے۔'' اس بار بہادر خان بولا اور کہنے لگا۔

''کیا وہاں تک تم ہماری راہنمائی کرسکو گے۔''

قاصد نے پھر اثبات میں گردن ہلائی اور زور دے کر کہا۔ ''یقیناً میں وہاں تک آپ کی راہنمائی کرسکتا ہوں۔'' اس کے بعد مہابت خان نے فیصلہ کن انداز میں آنے والے قاصد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب تم آرام کرو اس لیے کہ رات ہو چکی ہے اور کل تم ہمارے ایک لشکر کی رہنمائی مرہٹوں کے سالار شاہ جی کے لشکر کی طرف کرو گے۔''

قاصد نے اثبات میں گردن ہلائی اس کے بعد مہابت خان کے کہنے پر ایک چھوٹا سالار اس آنے والے قاصد کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

قاصد کے جانے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی پھر مہابت خان بولا اور کہنے لگا۔

''بہادر خان میرے بیٹے اب بولو تمہارے کیا ارادے ہیں۔'' بہادر کے چہرے پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا پھر وہ مہابت خان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''خان خاناں بات یہ ہے یقیناً میں آپ کے سامنے نام کا رہوں آپ کا تجربہ وسیع ہے جس کے سامنے میری حیثیت کچھ نہیں ہے میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں اگر آپ کے دل کو لگی تو اس پر عمل کرلیں گے ورنہ جو فیصلہ آپ کا ہوگا وہ ہی آخری ہوگا۔''

مہابت خان مسکرایا پہلے اس نے بہادر خان کی پیٹھ سے تھپتھپائی پھر کہنے لگا۔

''بہادر خان ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے نہ تم خام کار ہو تو عمر ضرور ہو لیکن پختہ کار ہو اب بتاؤ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔''

بہادر خان مسکرایا اس کے بعد وہ کہہ رہا تھا۔ ''خان خاناں آپ ایسا کریں لشکر تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں لشکر کے دو حصے آپ اپنی کمانداری میں رکھیں ایک حصہ مجھے دے دیں فتح خان کا جو قاصد آیا ہے وہ میری رہنمائی کرے گا اور میں مرہٹوں کے سردار شاہ جی کا رخ کروں گا اور اس سے نبٹنے کی کوشش کروں گا مجھے امید ہے کہ میں شاہ جی پر خوب ضرب لگاؤں گا اور اسے اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ وہ بیجاپور والوں سے مل کر نظام شاہی سلطنت کے خاتمے کے متعلق سوچ بھی سکے۔

اس کے بعد لشکر کے دو حصے آپ کے پاس رہ جائیں گے آپ آج رات ہی کو کچھ ہرکارے بیجاپور کی طرف بھجوا دیں جو چاروں طرف یہ خبر پھیلا دیں کہ آصف خان واپس جا چکا ہے اور آصف خان کی جگہ اب ان علاقوں میں مغلوں کا جہاندیدہ اور تجربہ کار سالار مہابت خان آچکا ہے لہٰذا مہابت خان ایک خاصے بڑے لشکر کے ساتھ بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت پر ضرب لگانے کے لیے پیش قدمی کر رہا ہے۔

جب یہ صورت حال پیش آئے گی تو بیجاپور کا لشکر رک جائے گا ان پر ہیبت طاری کرنے کے لیے آپ کا نام ہی کافی ہے چنانچہ وہ آپ سے ٹکرانے کی تیاری کریں گے آپ ان کی طرف پیش قدمی کریں لیکن ذرا سست رفتاری سے دوسری طرف میں شاہ جی کا بیڑہ غرق کرنے کے بعد آپ کی طرف آؤں گا اور پھر پوری قوت اور قوت کے ساتھ بیجاپور کے خلاف ضرب لگائیں گے بیجاپور والے اگر آصف خان کے قابو نہیں آئے تو پھر ہم دیکھیں گے کہ وہ کیسے اور کس طرح ہمارے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہو جاتے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد بہادر خان جب خاموش ہوا تب مہابت خان نے آگے بڑھ کر بہادر خان کی پیشانی چوم لی پھر کہنے لگا۔

''بیٹے قسم اللہ پاک کی تو نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے اب مجھے کہنے کی ضرورت نہیں ہے میرے خیال میں اٹھو لشکر کی تقسیم کو آخری شکل دیں۔''

مہابت کے ان الفاظ سے بہادر خان بھی خوش ہو گیا تھا پھر لشکر کی تقسیم کو آخری شکل دینے کے لیے دونوں اٹھ گئے تھے۔

آنے والی شب کے پچھلے حصے میں بہادر خان ایک لشکر لے کر آنے والے اس قاصد کی رہنمائی میں کوچ کر گیا تھا۔

دوسری طرف مرہٹوں کا سالار اور سردار شاہ جی بیجاپور کی عادل شاہی مملکت کے لشکر سے جا ملنے کے لیے کوچ کر رہا تھا لیکن مرہٹوں کی بدقسمتی کہ بہادر خان نے انہیں راستے ہی میں جا لیا اور ان کی راہ روک کر کھڑا ہوا۔

چونکہ قاصد پوری طرح بہادر خان کو مرہٹوں کے محل وقوع سے آگاہ کرتا جا رہا تھا لہٰذا مرہٹوں کے سامنے جاتے ہی بہادر خان اپنے لشکر کے ساتھ مرہٹوں پر دھرتی پر پھیلتے ظلمت کے غبار میں سانسوں میں زہر بھر دینے والی کھولتی خاک میں ملاتی جبلت رات کے بحران بے چہرہ المیوں اور ماحول کی بے چینی میں مبتلا کرتے آتشی طوفانوں کے سیل برہنہ اور برہم آگ کے شعلوں کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

دوسری طرف مرہٹوں کو بھی اپنی طاقت اور جرات دلیری اور حرب وضرب کی ہنر مندی پر بڑا فخر اور گھمنڈ تھا چنانچہ وہ بھی بہادر خان کے خلاف بدی کو ترستی چیختی ہواؤں اور سانسوں کی ڈوریاں کاٹتے آوارہ بگولوں کے رقص کی طرح شور کرتے ہوئے بڑھے اور وہ بہادر خان کے لشکر پر سزا کو فرض خیر کو اس تپش کو چاندنی ریت کو آب سمجھنے والے صحراؤں کی خاک چھانتے جنونیوں ظلمت کدوں کے روزنوں سے نکلتے ہوا و ہوس کے اندھے لمحات تنگ دتار کی ہیجان انگیزیوں اور کھلیانوں کے تنکے اڑاتے تیز آندھیوں کے جھکڑوں کی طرح حملہ آور ہو گئے تھے۔

اس طرح بہادر خان کے لشکری اور مرہٹے ایک دوسرے سے بری طرح ٹکرا گئے تھے میدان جنگ کے اندر ملعون ومطعون لمحے رقص کرنے لگے تھے وحشت کی ان بجھی آگ چار سو پھیلنا شروع ہو گئی تھی رعنائیوں کی دھند الم خیز طوفانوں جذبات کی لطافت تخریب کی آتش میں بدلنے لگی تھی زندگی کے ذائقے صدیوں کی پلتی خواہشیں پیلی رتوں کے زہر میں ڈھلنے لگی تھیں۔

تقریباً آدھا دن تک یہ ہولناک معرکہ جاری رہا جس کے نتیجے میں بہادر خان نے مرہٹوں کو بدترین شکست دی مرہٹوں کا آدھے سے زیادہ لشکر کاٹ دیا گیا مرہٹوں کے سالار اور سردار شاہ جی نے جب اپنے لشکر کی یہ حالت دیکھی تو شکست اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا لیکن اب بھاگنا بھی اتنا آسان نہیں تھا بہادر خان نے اپنے لشکر کے ساتھ وقت کی خوف بھری صداؤں بے رفاقت موت روحوں کے آزار اور حسرتوں کی اڑتی رداؤں کی طرح مرہٹوں کا تعاقب کیا اور ان کی مزید تعداد کم کی کہ آنے والے دور میں وہ اٹھنے کے قابل نہ رہیں۔

اس کے بعد جو سامان مرہٹے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے اس پر قبضہ کیا لشکر کو تھوڑی دیر اس نے ستانے سنبھلنے کا موقع دیا پھر وہ بڑی تیزی اور برق رفتاری کے ساتھ اس سمت کا رخ کر رہا تھا جدھر سفر کرتے ہوئے مہابت خان نے بیجاپور کی عادل شاہی مملکت کے لشکر سے ٹکرانا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دوسری طرف بیجاپور کا شکر یہ خیال کیے ہوئے تھے کہ مرہٹوں کا لشکر جب ان سے آن ملے گا تب اس کی طاقت میں خوب اضافہ ہو جائے گا اور اگر مہابت خان اور بہادر خان دونوں ان کے خلاف حرکت میں آئیں نہ آئیں وہ ضرور ان دونوں کے خلاف حرکت میں آئیں گے اور دکن کی سرزمینوں سے بے عزت اور ذلیل کر کے انہیں نکال باہر کریں گے لیکن بیجاپور والوں کو جب خبر ہوئی کہ مہابت خان خود ایک لشکر کے ساتھ ان کا رخ کر رہا ہے تب انہوں نے ایک مناسب جگہ اپنے لشکر کا پڑاؤ کر لیا تھا اور وہیں انہوں نے مہابت خان سے ٹکرانے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا ابھی تک انہیں یہ اطلاع نہیں ملی تھی کہ بہادر خان مرہٹوں سے نبٹنے کے لیے ایک لشکر لے کر ان کی طرف جا چکا ہے چنانچہ مہابت خان آگے بڑھا اور بیجاپور کے لشکر کے سامنے جا کر اس نے پڑاؤ کیا بیجاپور والے ابھی شش و پنج میں تھے کہ مرہٹوں کا لشکر ان کی طرف کیوں نہیں آیا شاید وہ اسی کا انتظار کر رہے تھے اسی بناء پر جونہی مہابت خان وہاں پہنچا انہوں نے جنگ کی ابتداء نہیں کی دراصل وہ چاہتے تھے کہ مرہٹے ان سے آن ملیں اور ان کی طاقت اور قوت میں اضافہ ہو۔

اسی دوران مہابت خان کو بھی خبر پہنچ چکی تھی کہ بہادر خان نے مرہٹوں کو بدترین شکست دی ہے مرہٹوں کے لشکر کی اکثریت کو اس نے کاٹ دیا ہے اور شاہ جی زخمی حالت میں بچے کھچے لشکر کو لے کر بھاگ گیا ہے یہ خبر مہابت خان کے لیے یقیناً خوش کن تھی اب وہ بڑی بے چینی سے بہادر خان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا تھا۔

جس روز مہابت خان بیجاپور کی مملکت کے لشکر کے سامنے پڑاؤ کیا تھا' اس کے اگلے روز دوپہر کے وقت بہادر خان بھی اپنے لشکر کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ مہابت خان نے شاندار انداز میں بہادر خان اور اس کے لشکریوں کا استقبال کیا' بہادر خان کو گلے لگا کر ملا کئی بار اس کی پیشانی چومی پھر علیحدہ کیا اور کہنے لگا۔

''بیٹے قسم اللہ پاک کی میں نے تم سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں تم ان ساری امیدوں کی حدود کو بھی پار کر گئے ہو تم انکساری سے کام لیتے ہوئے یہ نہ کہا کرو تم نام کار ہو' میں سمجھتا ہوں کہ جنگ کے ہنر میں اپنے آپ کو پختہ کار سمجھنے والے بھی تمہاری نسبت اپنی جنگی کارگزاری میں تم سے بہت پیچھے ہیں۔''

چنانچہ مہابت خان نے جو لشکر بہادر خان کے ساتھ گئے تھے ان کے آرام اور ان کے لیے خیموں کا عمدہ اہتمام کیا بیجاپور کا لشکر ابھی تک شش و پنج میں پڑا ہوا تھا لہٰذا جو لشکری بہادر خان کے ساتھ گئے تھے انہیں بھی ایک دن اور ایک رات آرام کرنے کا موقع مل گیا بیجاپور کا لشکر شاید مزید انتظار کرتا پھر تیسرے روز مہابت خان اور بہادر خان دونوں نے جنگ کی ابتداء کرنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ فجر کی نماز کے بعد وہ دونوں اکٹھے ہوئے ان کے لشکری کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تھے جب دونوں اکٹھے بیٹھ گئے لشکر کے اندر جو چھوٹے سالار تھے ان کو بھی بلا لیا گیا پھر گفتگو کا آغاز مہابت خان نے کیا اور وہ بہادر خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''بہادر خان میرے بیٹے جو جنگ متوقع ہے یہ تیرا اور میرا امتحان ہے' اس سے پہلے ان علاقوں میں شہنشاہ کا برادر نسبتی آصف خان ناکام ہو کر جا چکا ہے اور میں نے اپنے دل میں یہ بات ٹھان رکھی ہے کہ میں نے اور تم نے ان علاقوں سے ناکام ہو کر نہیں نکلنا ہم نہیں یا بیجاپور والے نہیں دونوں میں سے ایک کام ضرور ہو گا اسی میں ہماری عزت اسی میں ہمارے وقار کی بقا پنہاں ہے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد مہابت خان رکا پھر

Downloaded from Paksociety.com

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

''بہادر خان میرے بیٹے لشکر کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک حصہ میرے پاس اور دوسرا حصہ تمہارے پاس رہے گا بیجاپور والے چاہے اپنے لشکر کو چار چھ جتنے حصوں میں تقسیم کرلیں ہمیں ان سے کوئی غرض نہیں ہے ہم نے اپنی جنگی حکمت عملی کو سامنے رکھنا ہے اسی طرح چھوٹے سالاروں کی تقسیم بھی کرلی جائے گی اس کے بعد تھوڑی دیر تک لشکر کی صفیں درست کی جائیں گی اور جنگ کی ابتداء کی جائے گی بیجاپور والے مرہٹوں کے منتظر ہیں اور مرہٹے اب اس قابل نہیں رہے کہ ان سے آن ملیں بلکہ کبھی نہیں ان سے ملیں گے لہٰذا بیجاپور والوں پر اب ایسی ضرب لگانی ہے کہ انہیں بدترین شکست دے کر ان کے پاؤں اکھاڑ کر رکھ دیں۔''

بہادر خان کے علاوہ وہاں جس قدر چھوٹے سالار جمع تھے انہوں نے مہابت خان کو اس تجویز سے اتفاق کیا تھا پھر سب اٹھ کھڑے ہوئے پہلے لشکر کو دو برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا اس کے بعد لشکر میں طبل بجنے لگے اور لشکر کی صفیں درست ہونا شروع ہوگئی تھیں۔

بیجاپور کے لشکر نے جب دیکھا کہ مہابت خان اور بہادر خان ان کے خلاف جنگ کی ابتداء کرنا چاہتے ہیں تب انہوں نے بھی اپنے لشکر کی صفیں درست کرنا شروع کردی تھیں۔

جنگ کی ابتداء مہابت خان نے اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ کی اور وہ بیجاپور کے لشکر پر سمندر کی نادیدہ گہرائیوں سے اٹھتے قضا کی دھوپ کے لمبے سفر دشمن کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے والے طاقت اور جبروت کے خونی بگولوں چاروں طرف غم زمانہ کی دھول پھیلاتی آندھیوں اور زلزلوں کی دھمک اور کچی مٹی کے برتنوں کی طرح پاش پاش کرتے جاں فروشوں کے شور اور تپتے صحرا کے کھولتے سرابوں اور نفرت آگاتی ہواؤں کی یلغار کی طرح حملہ آور ہوگیا تھا مہابت خان کے ساتھ ہی ساتھ بہادر خان بھی اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ سات سمندر کے بے ساحل شور اشجار کو پتوں سے محروم کرتی آندھیوں ہونٹوں پر پپڑیاں جما دینے والی ریت کی قہر خیز پیاس کی طرح حرکت میں آیا پھر وہ بھی بیجاپور کے لشکر پر غضب ناک ہوکر ریگستانوں میں چلتی کھولتی ہیجان خیزیوں رحم نا آشنا تنہائیوں میں فنا کے آنچل پھیلائے تیز تند ہنگامہ خیز طوفانوں اضطراب اور بیزاری کے آثار میں سانسوں کے اندر تحلیل ہوجانے والی موت کی عمیق تلخ آمیزیوں اور رعد و برق کے طوفان کی خوف انگیزیوں کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

جوابی کاروائی کرتے ہوئے بیجاپور کا لشکر بھی دنیا و عقبیٰ کے اعلیٰ مدارج تائید الٰہی کو پس پشت ڈال کر حیلہ گروں اور چارہ سازوں کی طرح حرکت میں آیا پھر وہ گلی گلی نگر نگر پھیلتے غم انجام کے ابر نبض دوراں کو روکتی تدبیروں اور تعزیروں۔ گردش آسمان تلے بدنوں کو لہولہان رشتہ اتحاد و یگانگت کو پاش پاش کرتے وقت کی آندھیوں کے غبار کی طرح حملہ آور ہوگیا تھا۔

اس طرح میدان جنگ کے اندر موت کی منڈی لگ گئی تھی فضا کی تحریریں معاقضا کے سائے ساز حیات کی تاریں توڑنے لگے تھے تباہی کی آگ گریبان چاک اور زندگی موت سے آشنا کرنے لگی تھی ہر سر پر موت کھیلنے لگی تھی۔

آخر اس خون ریز جنگ کے بعد بیجاپور کے لشکر کو بدترین جنگ کا سامنا کرنا پڑا وہ اپنے لشکر کے بڑے حصے کو گنوا بیٹھے اور شکست اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے مہابت اور بہادر خان دونوں نے کچھ دور تک ان کے لشکر کا تعاقب کر کے ان میں مزید خوف و ہراس پھیلایا اس کے بعد بیجاپور کے لشکر کے پڑاؤ سے ملنے والی ہر شے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پر انہوں نے قبضہ کرلیا تھا یہ ایک نتیجہ خیز جنگ تھی جس میں خان خاناں مہابت خان اور بہادر خان نے بیجاپور کے لشکر کی ساری چولیں ڈھیلی کر کے رکھ دی تھیں اس ہولناک اور فیصلہ کن جنگ سے متعلق مبصرین مختصر الفاظ میں کچھ اس طرح رقم طراز ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں۔

وطن کے سابق ایرانی سالار عنبر کے بیٹے فتح خان نے جب مہابت خان کو پیغام بھجوایا کہ مرہٹوں کا سردار شاجی اور بیجاپور کی سلطنت کے عساکر مل کر دولت آباد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تب مہابت خان لشکر لے کر آگے بڑھا خون ریز جنگ کے بعد بیجاپور کو شکست ہوئی۔

اس کے بعد مہابت خان اور بہادر خان دونوں دولت آباد کے شہر اور قلعے کی طرف بڑھے سب سے پہلے مہابت خان اور بہادر خان نے دولت آباد کے نواح میں فتح خان کے باپ ملک عنبر کی بنائی ہوئی تمام قلعہ بندیاں ملیا میٹ کر دیں اس کے بعد مہابت خان اور بہادر خان نے دولت آباد کے قلعے میں ایک جگہ سرنگ لگائی یہ صورت حال دیکھتے ہوئے فتح خان جس کا کنبہ دولت آباد میں قیام کیے ہوئے تھا اسے اپنے کنبے کو محفوظ جگہ پر منتقل کرنا پڑا ان حالات میں فتح خان نے ایک بار پھر خان خاناں مہابت خان کو پیغام بھیجا کہ وہ مزید ایک دو دن کے لیے کارروائی معطل کر دیں تاکہ وہ بیجاپور سے شرائط کے بارے میں مشورہ کر سکے۔

یہ پیغام جب مہابت خان اور بہادر خان کے پاس پہنچا تو خان خاناں مہابت خان نے فتح خان کے لڑکے کو بطور یرغمال رکھنے کا مطالبہ کیا دراصل اس موقع پر فتح خان دوہری چال چل رہا تھا اور یہ پیغام بھیجنے سے اس کا مقصد صرف وقت ٹالنا تھا۔

چنانچہ جب مہابت خان اور بہادر خان کے لشکر نے سرنگ لگا کر قلعے میں ایک اور بڑا شگاف پیدا کر دیا تو فتح خان نے محسوس کیا کہ مزید مزاحمت ممکن نہیں اس نے اپنے بڑے لڑکے کو یرغمال کے طور پر مہابت خان اور بہادر خان کی طرف بھیج دیا اور ایک ہفتہ کی مہلت طلب کی تاکہ اپنے کنبے اور شاہی خاندان کے اندر کو خطرناک مقام سے کسی محفوظ جگہ منتقل کر دے۔

مہابت خان نے یہ درخواست قبول کر لی فتح خان کی درخواست پر اسے ساڑھے دس لاکھ روپے کی رقم بھی ادا نہ کر دی گئی درحقیقت مورخین لکھتے ہیں کہ یہ رقم فتح خان کو اطاعت قبول کرنے کی قیمت کے طور پر ادا کی گئی تھی۔ اس طرح فتح خان نے دولت آباد کی چابیاں خان خاناں مہابت خان کے حوالے کر دیں یوں دولت آباد کا قلعہ اور شہر جس پر بیجاپور کی حکومت قبضہ کرنا چاہتی تھی وہ مہابت خان اور بہادر خان کی بہترین کارگزاری کی وجہ سے مغلوں کی مملکت میں شامل کرلیا گیا تھا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ دولت آباد کی فتح کے بعد شاہجہاں کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور نظام شاہی سلطنت کے نام بنا نوعمر سلطان میں شاہ کو جسے فتح خان نے تخت نشین کیا تھا مغلوں کے حوالے کر دیا گیا جسے نظر بند کر دیا گیا اور بعد ازاں گوالیار کے قلعے میں منتقل کر دیا گیا اس طرح احمد نگر کی حکومت ختم ہوگئی اور یہ علاقہ مغلوں کی مملکت میں شامل کرلیا گیا چند دن بعد ہی بیجاپور والوں نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے ایک اور لشکر تیار کیا مہابت خان اور بہادر خان کا مقابلہ کیا لیکن ان کی بدقسمتی کہ ایک بار پھر انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا ان حالات میں مہابت خان اور بہادر خان نے آگے بڑھ کر پارندہ نام کے قلعے اور شہر کا محاصرہ کرلیا اور مورخین لکھتے ہیں کہ یہ محاصرہ لگ بھگ سات ماہ تک جاری رہا اسی دوران مہابت خان بیمار ہوگیا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لہٰذا اسے لے کر بہادر خان برہان پور کی طرف منتقل ہو گیا چنانچہ چھبیس اکتوبر 1134ء کو مہابت خان کا انتقال ہو گیا شاہجہان نے اس کی جگہ مالوہ کے عامل خان دوراں کو وطن کا عامل مقرر کیا اور فتح خان جوان علاقوں میں سرگرداں تھا اس کی خواہش کے مطابق لاہور جانے کی اجازت دے دی اس کی پنشن بھی مقرر کر دی ساتھ ہی شاہجہاں نے تیز رفتار قاصد دکن کی طرف بھجوائے اور بہادر خان کو واپس بلا لیا اس لیے کہ اڑیسر میں راجہ جھجر سنگھ بندیلہ نے مغلوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔

☆☆

آگرہ شہر میں اپنی حویلی کے اندر ایک روز مارواڑ کے راجہ جسونت سنگھ کی بیٹی راجکماری رتن مالا اپنی خواب گاہ میں بیٹھی ہوئی تھی جبکہ خود راجہ جسونت سنگھ اس کی پتنی سرسوتی دونوں بیٹے ودیا ناتھ اور قول راج دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے تھے اچانک جسونت سنگھ کو کوئی بات سوجھی اور اپنی پتنی سرسوتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''سرسوتی میں ایک انتہائی اہم موضوع پر تم تینوں ماں بیٹوں سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں یہ موقع بھی اچھا ہے اس لیے کہ یہ گفتگو رتن مالا سے متعلق ہے اور رتن اس وقت اپنے کمرے میں ہے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد جسونت سنگھ رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوا وہ کہنے لگا۔

''میں نے جب کبھی بھی بہادر خان سے گفتگو کی میں نے اندازہ لگایا کہ ہماری بیٹی رتن مالا بہادر خان کو پسند کرتی ہے یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے غلط بھی ہو سکتا ہے میں چاہتا ہوں تم اس سلسلے میں رتن مالا سے گفتگو کرو اگر تو رتن مالا واقعی بہادر خان کو پسند کرتی ہے تو میں سمجھتا ہوں یہ ہماری خوش بختی ہے اس لیے کہ بہادر خان سے بڑھ کر رتن مالا کو کوئی اچھا اور بہترین پتی نہیں مل سکتا اب اس کا شمار چوٹی کے سالاروں میں ہونے لگا ہے اور وہ شہنشاہ شاہجہاں کی نگاہوں میں کھب بھی چکا ہے اس کی اپنی حویلی ہماری حویلی سے بھی اچھی ہے گھر میں کوئی ٹوک ٹکائی کرنے والا بھی نہیں ہے دادی دادا بوڑھے ہو چکے ہیں ویسے بھی وہ ایسے لوگ ہیں جو کسی پر بے جا تنقید یا طنز نہیں کرتے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہماری بیٹی رتن مالا کو نہ اس سے بہتر کوئی گھرانہ ملے گا نہ اس سے اچھا کوئی پتی اب میں چاہتا ہوں کہ تم اس موضوع پر راجکماری رتن مالا سے بات کرو اگر تو رتن مالا مامی بھر لیتی ہے کہ وہ بہادر خان کو پسند کرتی ہے تو پھر ہم دونوں کی سگائی کا اہتمام کر دیں گے شادی چند سال کا وقفہ ڈال کر کر لیں گے ایسا میں اس لیے چاہ رہا ہوں کہ ہم نے اگر کوئی قدم نہ اٹھایا تو بہادر خان کو اپنانے کے لیے کئی گھرانوں کی اس پر نظر ہے لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ تم ابھی جا کر اس موضوع پر رتن مالا سے گفتگو کرو اس لیے کہ بہادر خان دکن سے واپس آ رہا ہے اور پھر راجہ جھجر سنگھ نے مغلوں کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور اس بغاوت کے فرد کرنے کے لیے شہنشاہ نے اپنے بیٹے اورنگ زیب کو مقرر کیا ہے اور اورنگ زیب کے ساتھ شہنشاہ بہادر خان کو بھجوانا چاہتا ہے اب میرا ارادہ یہ ہے کہ دکن سے واپسی کے بعد جب چند روز کے لیے بہادر خان آگرہ میں قیام کرے تو اس قیام کے دوران ہی ہم حرکت میں آ جائیں بشرطیکہ رتن مالا بہادر خان سے محبت کا اقرار کر لے اگر ایسا ہو جائے تو پھر راجہ جھجر سنگھ کی بغاوت فرو کرنے کے لیے روانگی سے قبل ہم بہادر خان اور رتن مالا کی سگائی کی رسم ادا کر لیں گے۔''

راجہ جسونت سنگھ کی اس تجویز کو نا صرف اس کی پتنی سرسوتی نے پسند کیا تھا بلکہ اس کے دونوں بیٹوں ودیا ناتھ اور قوی راج نے بھی اپنی خوشنودی کا اظہار کیا تھا اس کے بعد تینوں کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کنبے پر سرسوتی دیوان خانے سے نکلی جب وہ راجکماری رتن مالا کی خواب گاہ میں داخل ہوئی تو وہ اس وقت ایک مسہری پر نیم دراز تھی جب اس نے دیکھا کہ اس کی ماتا اس کی خواب گاہ میں داخل ہوئی ہے تو وہ اٹھی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی سرسوتی آگے بڑھی رتن مالا کے قریب ہو بیٹھی کچھ دیر تک وہ غور سے رتن مالا کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی اس دوران رتن مالا فکرمند سی ہو گئی تھی پھر وہ سرسوتی کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''ماتا آپ مجھے اس طرح گھورنے کے انداز میں دیکھ رہی ہیں جیسے میں آپ کی بیٹی نہیں بلکہ کوئی ملزم ہوں جس کے چہرے کے تاثرات کا آپ جائزہ لے رہی ہیں۔''

رتن مالا کے ان الفاظ پر سرسوتی کھل کر مسکرا دی تھی پھر سنجیدہ ہو کر رتن مالا کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''بیٹی میں ایک انتہائی اہم کام کے سلسلے میں تمہارے پاس آئی ہوں دیکھو میں نہ کوئی تمہید باندھوں گی نہ کوئی لمبا چکر کاٹوں گی براہ راست تم سے گفتگو کروں گی اس لیے کہ تیرے پتا جی تیسری شادی سے پہلے تیری سگائی کرنا چاہتے ہیں اب بتا تم تو کسی کو پسند کرتی ہے اگر نہیں کرتی تو پھر تیرے پتا جی اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ تمہاری سگائی کر دیں گے۔''

یہ بات سن کر رتن مالا کا چہرہ کسی قدر سرخ ہو گیا تھا لیکن وہ خاموش رہی تو سرسوتی پھر بولی۔

''بیٹی خاموشی کوئی جواب نہیں میں تمہارے منہ سے کچھ سننا چاہتی ہوں یہ نہ ہو کل کو کوئی غلط فیصلہ ہو جائے تو تم پچھتاتی رہو اور دکھوں میں پڑی رہو۔ میں تم سے کوئی چیز چھپاؤں گی نہیں تیرے پتا جی کا کہنا ہے کہ انہوں نے اندازہ لگایا ہے کہ ہماری بیٹی رتن مالا بہادر خان میں دلچسپی لیتی ہے اور اسے پسند کرتی ہے دیکھو بیٹی چپ تمہارے مستقبل کو خراب کر دے گی لہٰذا ابھی وقت ہے اگر تو تم بہادر خان کو پسند کرتی ہو تو بھلے منہ سے کچھ نہ بولو گردن جھکا دینا اور اگر تم بہادر خان کو پسند نہیں کرتی ہو تو اپنی آنکھیں میرے چہرے پر جما دینا۔''

یہ الفاظ سن کر رتن مالا مسکرائی اور پھر اس نے اپنی گردن جھکا لی تھی جس کا مطلب تھا وہ بہادر خان کو پسند کرتی ہے اس سے محبت کرتی ہے اس کی یہ ادا دیکھ کے سرسوتی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی پہلے اس نے رتن مالا کو گلے لگایا اس کی پیشانی چومی پھر ایک دم اٹھی اور بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے رتن مالا کی خواب گاہ سے نکل گئی تھی۔

مسکراتی خوشی کا اظہار کرتی ہوئی سرسوتی دیوان خانے میں داخل ہوئی اس کی یہ حالت دیکھتے ہوئے جسونت سنگھ بھی بہت کچھ سمجھ گیا تھا جہاں سے سرسوتی اٹھ کر گئی تھی وہیں بیٹھ گئی اور راجکماری رتن مالا کی خواب گاہ میں جو معاملہ پیش کیا تھا تفصیل سے اس نے اپنے پتی جسونت سنگھ اور اپنے دونوں بیٹوں سے کہہ دیا تھا۔

ساری تفصیل جاننے کے بعد جسونت سنگھ نے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا اس کے دونوں بیٹے بھی مطمئن اور خوش تھے پھر جسونت سنگھ کہنے لگا۔

''رتن مالا نے یہ فیصلہ دے کر میرا دل خوش کر دیا ہے اب دکن سے بہادر خان کو لوٹنے دو جس دن اس نے یہاں پہنچنا ہو گا اس سے ایک دن پہلے ہی میں اس موضوع پر قطب خان اور نگار خانم سے بات کر لوں گا اور مجھے قوی امید ہے کہ وہ دونوں میاں بیوی اس رشتے پر رضامندی کا اظہار کریں گے اور جب ایسا ہو گا تو پھر بہادر خان کی آمد پر بہادر خان اور رتن مالا کی سگائی کی رسم ادا کر دیں گے۔''

سرسوتی اور اس کے دونوں بیٹوں نے اس سے اتفاق کیا تھا جس کے بعد جسونت سنگھ نے زور زور سے اپنی راجکماری رتن مالا کو پکارنا

Downloaded from Paksociety.com

شروع کیا رتن مالا تقریباً بھاگتی ہوئی جب دیوان خانے کے دروازے پر آئی تب جسونت سنگھ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''بیٹی بھوک لگی ہے کھانا نہیں ملے گا۔''

رتن مالا کہنے لگی۔ ''پتا جی میں ابھی کھانا لگواتی ہوں۔'' رتن مالا جب پیچھے ہٹی تو سرسوتی بھی اٹھ کر اس کے ساتھ ہولی تھی۔

☆☆

راجہ جسونت سنگھ اور اس کی بیوی سرسوتی ایک روز بہادر خان کی حویلی میں داخل ہوئے اس وقت بہادر خان کا دادا قطب خان اصطبل میں اپنے گھوڑوں کے چارے کا اہتمام کر رہا تھا جبکہ بہادر خان کی دادی نگار خانم بھی اسے کام کرتے ہوئے اصطبل میں کھڑی ہو کر دیکھ رہی تھی ایسے میں جب راجہ جسونت سنگھ اور سرسوتی حویلی داخل ہوئے تو سب سے پہلے نگار خانم کی نگاہ ان پر پڑی اور اس نے قطب خان کو آگاہ کیا قطب خان نے کام چھوڑ دیا پھر دونوں میاں بیوی صحن کی طرف بڑھ جہاں جسونت سنگھ اور سرسوتی کھڑے تھے دونوں سے ملے اور انہیں اپنے ساتھ دیوان خانے میں لے کر گئے تھے۔

جب چاروں بیٹھ گئے تب گفتگو کا آغاز بہادر خان کے دادا قطب خان نے کیا اور راجہ جسونت سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں سمجھتا ہوں تم دونوں میاں بیوی کا یوں اکٹھے آنا کسی علت کے بغیر نہیں ہے۔'' راجہ جسونت سنگھ مسکرا دیا قطب خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''آپ کا اندازہ یقیناً درست ہے آج ہم یوں جانو ایک خاص علت اور وجہ کے تحت آئے ہیں پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے بہادر خان کا رشتہ کہیں طے کر دیا ہے۔''

یہ الفاظ سن کر قطب خان اور نگار خانم دونوں چونکے تھے اس موقع پر قطب خان کے بجائے نگار خانم بول اٹھی اور کہنے لگی۔

''ہم نے بہادر خان کا رشتہ طے تو نہیں کیا لیکن اس وقت میری نگاہوں میں دو لڑکیاں ایسی ہیں جن میں سے میں چاہوں گی کہ ایک بہادر خان کی بیوی اور اس گھر کی مالک بنے۔''

نگار خانم کے ان الفاظ پر راجہ جسونت سنگھ اور سرسوتی دونوں تجسس بھرے انداز میں نگار خانم کی طرف دیکھنے لگے تھے یہاں تک کہ سرسوتی نے نگار خانم کو مخاطب کیا۔

''خانم ہم بھی ایک خاص مقصد کے تحت آج آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں پہلے آپ ان لڑکیوں کے نام بتائیں گے جو اس وقت آپ کی نگاہوں میں ہیں اور جن میں سے ایک کو آپ چاہیں گی کہ وہ آپ کی بہو بنے۔''

نگار خانم کے چہرے پر تبسم نمودار ہوا کچھ دیر تک اس نے ایک گہری نگاہ سرسوتی پر ڈالی اچٹتی ہوئی ایک نگاہ اس نے اپنے شوہر قطب خان پر ڈالی قطب خان شاید اس کے اس طرح دیکھنے کا مطلب سمجھ گیا تھا لہٰذا اس نے اثبات میں گردن ہلا دی جس پر نگار خانم مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

''سرسوتی اور جسونت سنگھ جو دو لڑکیاں اس وقت میری نگاہوں میں ہیں ان میں سے ایک تو تمہاری راجکماری رتن مالا ہے اور دوسری بنگال سے آنے والی پرتگالی لڑکی مارتھل ان دونوں میں سے جو بھی لڑکی ہمیں مل گئی ہم سمجھیں گے کہ بہادر خان کے سلسلے میں ہم خوش قسمت ہیں۔''

نگار خانم کے یہ الفاظ سن کر سرسوتی اور جسونت سنگھ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے یہاں تک کہ جسونت سنگھ بولا اور کہنے لگا۔

''خانم آپ نے ہمارے دل کی بات پکڑ لی ہے ہم اپنی راجکماری رتن مالا کے رشتے کے سلسلے میں آپ دونوں کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ رتن مالا کو بہادر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

خان سے منسوب کر دیا جائے ابھی دونوں بچپنے سے نکل کر جوانی کی حدود میں داخل ہو رہے ہیں لہٰذا پہلے دونوں کی سگائی کر دیتے ہیں اور اس کے بعد کوئی مناسب وقت جان کر دونوں کا بیاہ کر دیا جائے گا۔''

جسونت سنگھ کے یہ الفاظ سن کر قطب خان بے پناہ خوشی کا اظہار کر رہا تھا یہاں تک کہ وہ بولا اور کہنے لگا۔

''جسونت سنگھ ایسی گفتگو کر کے تو نے میرا دل خوش کر دیا ہے رتن مالا ایک ایسی بیٹی ہے جو انشاءاللہ اس گھر کے لیے خوشی اور اتفاق اور یکجہتی کا باعث بنے گی دیکھو ہماری طرف سے کوئی عذر نہیں میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ بہادر خان بھی کوئی عذر پیش نہیں کرے گا بلکہ رتن مالا سے منسوب ہونے پر وہ فخر محسوس کرے گا۔''

اس پر راجہ جسونت سنگھ بولا اور کہنے لگا۔

''ایک دو دن تک بہادر خان بھی آنے والا ہے لہٰذا اس کی آمد کے بعد میں اپنی طرف سے سگائی کے لیے دو قیمتی انگوٹھیاں لے کر آؤں گا رتن مالا بھی ہمارے ساتھ آجائے گی اور سگائی کی رسم ادا کر دیں گے۔''

اس پر قطب خان کہنے لگا۔

''جسونت سنگھ نیک کام میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے تمہیں انگوٹھیوں کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' اس کے بعد قطب خان نے اپنے قریب بیٹھی اپنی بیوی نگار خانم کے کان میں کچھ کہا جسے سن کر وہ باہر نکل گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوٹی پھر اس نے دو جوہرات جڑی انگوٹھیاں اپنے شوہر قطب خان کی گود میں رکھ دی تھیں۔

قطب خان نے ایک انگوٹھی راجہ جسونت سنگھ کی طرف بڑھائی اور کہنے لگا۔

''جسونت سنگھ یہ انگوٹھی اپنے ساتھ لے جاؤ اور یہ سگائی کی انگوٹھی کے طور پر ہماری طرف

مسکرائیے

ہماری ہیروئنیں مغرب سے کسی طور کم نہیں۔ وہ دیکھنے میں پھول ہیں تو یہ پودا اور گملا۔ وہ کھانس رہی ہوں تو لگتا ہے ہنس رہی ہیں۔ یہ ہنس رہی ہوں تو لگتا ہے کھانس رہی ہیں لیکن ہیوی ویٹ ہیروئن ہنس رہی ہو تو لگتا ہے ڈانٹ رہی ہے۔ ایسے ہی جیسے شوکت علی گا رہا ہو تو لگتا ہے دھمکیاں دے رہا ہے۔

پنجابی فلم کا ہیرو بول رہا ہو تو اس کی آواز صاف سننے کے لیے لوگوں کو دور دور ہونا پڑتا ہے لیکن ہیروئن بولے تو قریب آنا پڑتا ہے تاکہ پتا چل سکے کہ بول رہا ہے کہ بول رہی ہے۔ شبنم کی آواز پرسوز ہے تو ہیوی ویٹ ہیروئن ساز، شبنم ڈائیلاگ بولے تو لگتا ہے حالت نزع میں بیان دے رہی ہے۔ سسکیاں بھرتی ہوئی بولتی ہے۔ اگر غمی کا سین ہو تو لفظ کے بعد سسکی ادا کرتی ہے جبکہ ہیوی ویٹ ہیروئن ہر وقت ہنستی رہتی ہے۔ وہ یوں بھی کہ ہنسنے سے ایک منٹ پہلے اس کا جسم ہلنا شروع ہو جاتا ہے اور ہنسنے کے ایک منٹ بعد تک ہلتا رہتا ہے البتہ رو رہی ہو تو لگتا ہے پورا محلہ رو رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی کتاب 'شناخت پریڈ' سے اقتباس

☆

ایک یہودی لڑکے کو ایک کیتھولک امریکی لڑکی سے محبت ہوگئی لڑکی کی ماں نے لڑکی کو سمجھایا کہ وہ لڑکے کو کیتھولک بنانے کی کوشش کرے لڑکی نے روزانہ اس سلسلے میں محنت شروع کر دی اور لڑکا جلد ہی کیتھولک عیسائی ہوگیا۔ مگر کچھ دن بعد اس نے شادی سے انکار کر دیا۔

''آخر ہوا کیا۔'' لڑکی کی ماں نے حیرت زدہ لڑکی سے پوچھا۔

''میں نے اسے عیسائیت کی کچھ زیادہ ہی تعلیم دے ڈالی ممی۔'' لڑکی نے روتے ہوئے بتایا۔

''اب اس نے پادری بننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نے رتن مالا کو پہنا دینا اور دوسری انگوٹھی جو ہے یہ رتن مالا سے سگائی کے طور پر بہادر خان کو اس کی دادی نگار خانم پہنا دے گی جسونت سنگھ یہ انگوٹھیاں نگار خانم نے بہادر خان کی شادی کے سلسلے میں ہی پہلے سے بنوا رکھی تھیں اس کے علاوہ بھی اس نے کافی زیور بنایا ہوا ہے اور مزید یہ کہ بہادر خان کی ماں کے دور کا بھی بہت سا زیور ہمارے پاس پڑا ہوا ہے جسے اس کے بعد کسی نے استعمال ہی نہیں کیا یہ سب کچھ رتن مالا ہی کے کام آئے گا۔'' راجہ جسونت سنگھ نے قطب خان کی دی ہوئی انگوٹھی سنبھال لی پھر بڑی ممنونیت سے قطب خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''ہم دونوں میاں بیوی نے آپ سے جو خواہشیں اور امیدیں وابستہ کی تھیں آپ نے اس سے کہیں بڑھ کر ہماری عزت افزائی کی ہے۔'' اس پر قطب خان مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''جسونت سنگھ عزت افزائی تو تم دونوں میاں بیوی نے کی ہے کہ اپنی لعل وگوہر جیسی بیٹی رتن مالا کو ہمارے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔'' قطب خان جب خاموش ہوا تب غور سے قطب خان کی طرف دیکھتے ہوئے جسونت سنگھ کہنے لگا۔

''اب ہم دونوں میاں بیوی جائیں گے اس لیے کہ رتن مالا اور اس کے دونوں بھائی بڑی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے ان ... بہن بھائی کا خیال یہ تھا کہ شاید آپ اس ... کو قبول نہ کریں اس لیے کہ وہ یہ سمجھ رہے ... بنگال میں بہترین کارگزاری کرنے کے ... ان کی شاندار مہم کے بعد بہادر خان شہنشاہ ... کی نظروں میں آچکا ہے اور اب اس کا ... سالاروں میں ہونے لگا ہے اس بناء ... ہے آپ اس رشتے کو قبول نہ کریں ... حال آپ نے یہ رشتہ قبول کرکے میں سمجھوں ... زمین سے اٹھا کر آسمانوں میں بٹھا دیا ہے اب ہمیں اجازت دیں تاکہ ہم تینوں بہن بھائیوں کو یہ خوش خبری سنائیں۔''

جواب میں مسکراتے ہوئے قطب خان اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا نگار خانم بھی کھڑی ہو گئی دونوں سرسوتی اور جسونت سنگھ کو لے کر دیوان خانے کے باہر آئے دونوں کو خدا حافظ کہا اس کے بعد وہ دونوں پہلے کی طرح اصطبل میں کام کرنے لگے تھے۔

جسونت سنگھ جونہی اپنی حویلی میں داخل ہوا اس کے دونوں بیٹے اور راجکماری رتن مالا دیوان خانے نکل کر صحن میں آگئے تھے جسونت سنگھ اور سرسوتی آگے بڑھے ان تینوں میں سے کسی سے بھی بات کرنے کے بجائے سیدھے دیوان خانے میں داخل ہوئے اس پر رتن مالا ودیا ناتھ اور قوی راج تینوں کے منہ لٹک گئے تھے شاید انہوں نے یہ سوچ لیا تھا کہ بہادر خان کے دادا نے اس رشتے سے انکار کر دیا ہے اس کے بعد وہ سہمے سہمے سے دیوان خانے میں داخل ہوئے اور جن نشستوں سے اٹھ کر باہر نکلے تھے وہیں بیٹھ گئے پھر رتن مالا کا بڑا بھائی ودیا ناتھ بول اٹھا اور جسونت سنگھ کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

''پتا جی آپ جس مقصد کے لیے گئے تھے اس کا کیا بنا۔''

ان الفاظ پر جسونت سنگھ اور سرسوتی مسکرا دیے پھر جسونت سنگھ نے رتن مالا کی طرف دیکھا اور اسے مخاطب کرکے کہنے لگا۔ ''بیٹی اپنی جگہ سے اٹھ اور یہاں میرے پاس آکر بیٹھ۔''

رتن مالا اٹھی اور اپنے باپ جسونت سنگھ کے پہلو میں جا کر بیٹھ گئی پھر جسونت سنگھ نے اپنے لباس کے اندر سے ہیرے جواہرات جڑی انگوٹھی نکالی رتن مالا کا ہاتھ پکڑا وہ انگوٹھی اس نے رتن مالا کو پہنا دی پھر بڑی محبت میں اپنا ہاتھ رتن مالا کے سر پر رکھتے ہوئے انتہائی شفقت میں جسونت سنگھ کہنے لگا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''رتن مالا میری بیٹی تو خوش قسمت ہے قطب خان اور نگ خانم دونوں نے بہادر خان کے ساتھ تمہارا رشتہ قبول کر لیا ہے اور یہ انگوٹھی بھی قطب خان اور نگار خانم نے ہی سگائی کے لیے دی ہے انہوں نے پہلے سے ہی کچھ انگوٹھیاں بنوا رکھی تھیں نگار خانم اور انگوٹھیاں لے کر آئی ایک تمہاری طرف بھیج دی گئی اور دوسری انگوٹھی وہ خود بہادر خان کو پہنا دے گی اس طرح تمہاری سگائی بہادر خان کے ساتھ پکی ہو گئی ہے میری بیٹی تو خوش قسمت ہے بلکہ ہم دونوں میاں بیوی بھی بھگوان ہیں کہ ہمیں اپنی بیٹی کے لیے ایسا عمدہ اور بہترین رشتہ ملا ہے۔''

جسونت سنگھ جب تک بولتا رہا رتن مالا گردن جھکائے دھیمے دھیمے مسکراتی رہی اور ساتھ ہی منگنی کی اس شاندار اور قیمتی انگوٹھی کی طرف بھی دیکھتی رہی اس موقع پر رتن مالا کا بڑا بھائی دیا ناتھ بولا اور جسونت سنگھ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''پتا جی کچھ پتا چلا کہ بہادر خان کب دکن سے یہاں پہنچے گا۔'' جسونت سنگھ کہنے لگا۔

''بیٹے جہاں تک مجھے پتا چلا ہے بہادر خان پرسوں آگرہ میں اپنے لشکر کے ساتھ داخل ہو گا۔'' اس کے بعد رتن مالا اور بہادر خان کی سگائی اور اس کے بعد اس کی شادی سے متعلق خوشی کا اظہار کرتے ہوئے گفتگو کر رہے تھے۔

بہادر خان نے آگرہ کے ایک چھوٹے سے مکان پر دستک دی تھی تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا دروازہ کھولنے والی مارتھل کی ماں فیدان تھی فیدان نے جب اپنے سامنے بہادر خان کو اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے کھڑے دیکھا تو بے پناہ خوشی کا اظہار کیا فیدان کے پیچھے ہی مارتھل بھی کھڑی تھی اور وہ بھی بے حد خوشی کا اظہار کر رہی تھی اس موقع پر جبکہ فیدان اور مارتھل دونوں ماں بیٹی بڑے شوق سے بہادر خان کی طرف دیکھ رہی تھیں بہادر خان انہیں مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''آپ دونوں ماں بیٹی مجھے اس طرح دیکھ رہی ہیں جیسے میں اجنبی ہوں اور مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہیں۔''

اس پر دونوں ماں بیٹی چونکی اور فیدان کے بجائے مسکراتے ہوئے مارتھل بول اٹھی۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے دراصل آپ چونکہ اچانک آموجود ہوئے اس بناء پر ہمیں حیرت ہوئی کہ آپ کیسے آ گئے۔'' اس کے ساتھ ہی فیدان کے دروازہ کھول دیا اور بہادر خان کو اندر آنے کے لیے کہا۔

بہادر خان نے گھوڑے کو باہر ہی باندھ دیا اس کے بعد وہ گھر میں داخل ہوا دونوں ماں بیٹی اسے ایک کمرے میں لے گئیں بہادر خان نے دیکھا وہ دو کمروں کا خوب صورت مکان تھا آگے ایک صحن تھا بیرونی دروازے کے پاس مطبخ تھا اور اس کے ساتھ ہی طہارت خانہ بنا ہوا تھا میزان اور مارتھل بہادر خان کو لے کر سامنے والے کمرے میں داخل ہوئیں تینوں جب نشستوں پر بیٹھ گئے تب گفتگو کا آغاز نیران نے کیا اور کہنے لگی۔

''بیٹا تم تو دکن کی طرف گئے ہوئے تھے کب آئے۔'' جواب میں بہادر خان مسکرایا اور کہنے لگا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے میں دکن سے آگرہ میں داخل ہوا ہوں ابھی تک میں اپنے گھر نہیں گیا آگرہ میں داخل ہونے کے بعد مجھے شہنشاہ نے طلب کیا اور مجھے اگلی مہم کا حکم بھی دے دیا اس لیے کہ میں پرسوں یہاں سے جھجر سنگھ کی بغاوت فرو کرنے کے لیے روانہ ہو رہا ہوں اور جو لشکر ادھر جائے گا اس کمانداری شہنشاہ کا بیٹا اورنگ زیب کرے گا شہر میں داخل ہونے کے بعد مجھے یہ پتا چلا کہ پرتگالیوں کے لیے جو خیمہ گاہ بنائی گئی

Downloaded from Paksociety.com

تھی وہ ختم کر دی گئی ہے اور آپ لوگوں کو مکان مہیا کر دیے گئے ہیں میں نے آپ دونوں کا پوچھا تب ایک پرتگالی نے مجھے آپ کے اس مکان کی نشاندہی کی لہٰذا میں گھر جانے سے پہلے سیدھا آپ دونوں ماں بیٹی کی طرف آیا ہوں پہلے مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف یا شکایت تو نہیں ہے۔''

بہادر خان کی اس گفتگو پر نیران اور مارتھل دونوں ماں بیٹی کچھ دیر تک شکر گزاری کے انداز میں اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر نیران بولی اور کہنے لگی۔

''بیٹے ہمیں کوئی شکایت اور بالکل کوئی تکلیف نہیں ہے یہ دو کمروں کا گھر ہمیں مل گیا ہے اس کے ملنے پر ہم دونوں ماں بیٹی کو کتنی خوشی ہے یہ ہم بیان نہیں کر سکتیں۔''

بہادر خان نے کندھے سے لٹکتی اپنی خرجین کو اپنی گود میں رکھا اس میں سے چھوٹے سے کپڑے میں بندھی ہوئی ایک پوٹلی اس نے نکالی پھر اسے نیران کی گود میں رکھ دیا کہنے لگا۔

''یہ تھوڑی سی نقدی ہے آپ لینے سے انکار نہ کیجیے گا یہ آپ کا حق بنتا ہے اگر آپ لینے سے انکار کریں گی تو میں یہ سمجھوں گا کہ آپ مجھے اجنبی خیال کرتی ہیں اور۔''

اس سے آگے کہتے کہتے بہادر خان کو رک جانا پڑا فیران بول اٹھی اور کہنے لگی۔ ''سب سے پہلے تو تمہیں گھر جانا چاہیے تھا اور ساری نقدی دادا کو دینی چاہیے تھی اس کے بعد انہیں فیر کر کے ہمیں کچھ نقدی دینی چاہیے تھی۔''

بہادر خان مسکرایا اور کہنے لگا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے دادا نے کبھی مجھ سے نقدی مانگی ہے اور نہ ہی پوچھا ہے دادا کے پاس ویسے ہی بہت سرمایہ ہے وہ میری طرف سے نہ کسی نقدی کی امید رکھتے ہیں نہ ہی پوچھتے ہیں لہٰذا آپ یہ نقدی سنبھالیں اپنے استعمال میں لائیں مجھے اجازت دیں میں اب جاتا ہوں۔''

بہادر خان کے خاموش ہونے پر پہلی بار مارتھل بولی اور کہنے لگی۔

''میں کھانا پکاتی ہوں کھا کر جایئے گا۔''

بہادر خان نے نفی میں گردن ہلائی اور کہنے لگا۔

''ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے میں اب گھر جاؤں کھانا تو میں اب شام ہی کو کھاؤں گا لشکر کی تیاری کے سلسلے میں شاید میں پرسوں آپ دونوں سے نہ مل سکوں اس لیے کہ میں پرسوں یہاں سے کوچ کر جاؤں گا۔'' اس کے ساتھ ہی بہادر خان اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا دونوں ماں بیٹی اسے دروازے تک چھوڑنے آئیں بہادر خان نے گھوڑا کھولا سوار ہوا اور اسے ایڑ لگا کر آگے بڑھ گیا تھا۔

بہادر خان جب اپنی حویلی میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا اس کا دادا اور دادی صحن میں کھڑے شاید اسی کی آمد کے منتظر تھے گھوڑے کی باگ پکڑے جب وہ صحن میں داخل ہوا تب قطب خان اور نگار خانم دونوں میاں بیوی آگے بڑھے گھوڑے کی باگ چھوڑ کر بہادر خان بھاگ کر آگے بڑھا دونوں سے ملا اس موقع پر نگار خانم نے اس کی پیشانی چومی پھر کہنے لگی۔

''میرے بچے کافی دیر ہوئی ہمیں یہ خبر مل چکی ہے کہ تم شہر میں داخل ہو چکے ہو پھر تم اتنی دیر بعد گھر میں کیوں آئے ہو۔'' اس پر بہادر خان بولا اور کہنے لگا۔

''دادی شہر میں داخل ہونے کے بعد شہنشاہ نے مجھے طلب کر لیا تھا شہنشاہ کا بیٹا اورنگ زیب بھی وہیں موجود تھا شہنشاہ نے مجھے اور اورنگ زیب دونوں کو ایک لشکر دے کر راجہ جھجر سنگھ کی بغاوت فرد کرنے کے لیے مقرر کیا ہے اور پرسوں میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ دادی آپ اور دادا دونوں دیوان خانے میں بیٹھیں میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گھوڑے کو اصطبل میں باندھ کر آتا ہوں۔''
اس موقع پر قطب خان آگے بڑھا اور بہادر خان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔
''بیٹے تم دادی کو لے کر دیوان خانے میں جاؤ، گھوڑے کو وہاں باندھ کر اس کی زین اتار کر اس کے دانے چارے کا میں بندوبست کرتا ہوں۔''
بہادر خان قطب خان کے سامنے کھڑا ہو گیا اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور کہنے لگا۔
''دادا میں آپ کا پوتا ہوں پوتے کے ہوتے ہوئے اگر دادا کام کرے تو دادا پھر میری زندگی پر تو بڑی لعنت ہے ویسے بھی اب تک میرے سارے کام آپ اور دادی ہی کرتے رہے ہیں لیکن اب جبکہ میں اس قابل ہوں آپ دونوں کی خدمت کروں اور پھر بھی میں چپ رہوں اور آپ میری خدمت کریں تو پھر میں کہوں گا کہ برتن کا منہ کھلا ہو تو کتے کو شرم آنی چاہیے دادا میں آپ کا پوتا ہوں بیٹا بھی ہوں لہٰذا میرے ہوتے ہوئے آپ اس طرح کا کام کیوں کریں گے۔''
بہادر خان کی اس گفتگو سے نگار خانم اور قطب خان دونوں کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی پھر نگار خانم آگے بڑھی ایک بار پھر اس نے بہادر خان کو لپٹا کر اس کی پیشانی چومی اس کے بعد بہادر خان علیحدہ ہوا اصطبل کی طرف گیا گھوڑے کا دھانہ زین اتار کر اس کے دانے چارے کا بندوبست کیا اور جو خرجین زین کے ساتھ بندھی ہوئی تھی اسے اتار کر وہ دیوان خانے کی طرف بڑھا اتنی دیر تک قطب خان اور نگار خانم دیوان خانے میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔
جونہی قطب خان دیوان خانے میں جا کر اپنے دادا کے سامنے بیٹھا قطب خان کہنے لگا۔
''میں جانتا ہوں تم ابھی آئے ہو تھکے ہارے ہو لیکن میں تمہاری تھکاوٹ دور کرنے کے لیے ایک اچھی خبر سناتا ہوں پہلے اپنا بایاں ہاتھ آگے کرو۔''
قطب خان کے ان الفاظ پر بہادر خان تجسس میں پڑ گیا تھا تاہم اپنے دادا قطب خان کا کہا مانتے ہوئے اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے کر دیا تھا۔
اس موقع پر قطب خان نے نگاہوں ہی نگاہوں میں نگار خانم کو مخصوص اشارہ کیا نگار خانم نے اپنے لباس کے اندر سے وہی انگوٹھی نکالی جیسی انگوٹھی راجکماری رتن مالا کے لیے بھیجی گئی تھی چنانچہ وہ انگوٹھی نکال کر نگار خانم نے بہادر خان کی انگلی میں پہنا دی۔
انگوٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے بہادر خان باری باری تجسس بھرے انداز میں اپنے دادا قطب خان اور دادی نگار خانم کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔
''یہ کیا معاملہ ہے مجھے ابھی تک کچھ سمجھ نہیں آئی۔'' قطب خان مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔
''لے بچے تیری غیر موجودگی میں ہم نے تیری منگنی تیری سگائی کا بندوبست کر دیا ہے۔''
''کس کے ساتھ۔'' بہادر خان نے چونک جانے کے انداز میں پوچھا تھا۔
جواب میں قطب خان کہنے لگا۔
''میرے بچے کیا تو سمجھتا ہے کہ ہم تیرا مستقبل خراب کریں گے یا تیرے مستقبل کو زنگ آلود بوسیدہ کرنے کی کوشش کریں گے دیکھ چند روز پہلے مارواڑ کا راجہ جسونت سنگھ اور اس کی پتنی سرسوتی دونوں آئے تھے انہوں نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ ان کی راجکماری رتن مالا بہادر خان کو پسند کرتی ہے لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ رتن مالا اور بہادر خان کو زندگی کا ساتھ بنا دیا جائے چنانچہ ہم نے منگنی کی انگوٹھی رتن مالا کو بھجوا دی اور یہ منگنی کی انگوٹھی تمہاری ہے جو تمہاری دادی نے تمہیں پہنا دی ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بہادر خان جب کسی قسم کے تاثرات کا اظہار نہ کیا تب کچھ دیر تک قطب خان اور نگار خانم دونوں میاں بیوی عجیب سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے رہے پھر نگار خانم بولی اور کہنے لگی۔

''بیٹے تم نے اپنی اس منگنی پر اپنے تاثرات کا اظہار نہیں کیا جس نے ہمیں جستجو میں ڈال دیا ہے۔'' بہادر خان مسکرادیا اور کہنے لگا۔

''دادی آپ کس قسم کی گفتگو کرتی ہیں آپ اور دادا کوئی فیصلہ کریں اور میں انکار کروں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا دادی آپ نے ماں بن کر دادا نے مجھے باپ بن کر پالا اور اگر میں ان دو ہستیوں کا جو میرے دادا دادی اور میرے ماں باپ بھی ہیں کہا نہ مانوں تو میں سمجھتا ہوں میں اپنے دادا اور دادی کی پرورش سے غداری کر رہا ہوں اور میں زندگی میں کم از کم ایسا نہیں کرنا چاہتا آپ کا احترام آپ کی عزت میں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا ہوں لہٰذا اس فیصلے سے روگردانی کرنا میں سمجھتا ہوں نیکی کے خلاف بغاوت کرنے کے مترادف ہے۔''

اس کے بعد وہ چرمی خرجین جو اس موقع پر بہادر خان نے اپنے کندھے پر لٹکا رکھی تھی وہ خرجین اس نے اپنی دادی نگار خانم کی گود میں رکھی اور کہنے لگا۔

''دادی اس میں نقدی اور دوسرا سامان ہے سنبھال لیجیے گا۔''

نگار خانم نے وہ خرجین سنبھال لی پھر وہ کہنے لگی۔

''بیٹے تو اٹھ پہلے نہا لے اتنی دیر تک میں تیرے لیے کھانا تیار کرتی ہوں میں جانتی ہوں تو تھکا ہارا ہے اور تجھے بھوک بھی لگی ہوگی۔''

بہادر خان منہ سے کچھ نہ بولا اپنی جگہ سے اٹھا اور حویلی کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا تھا قطب خان دیوان خانے میں ہی بیٹھا رہا جبکہ نگار خانم دیوان خانے سے اٹھ کر مطبخ کی طرف چلی گئی تھی دو روز بعد اورنگ زیب کے ساتھ بہادر خان آگرہ سے کوچ کر گیا تھا۔

☆☆

جہاں تک راجہ جنجر سنگھ بندیلہ کی بغاوت کا تعلق ہے تو مورخین لکھتے ہیں کہ جھجر سنگھ بندیلہ نے شاہجہاں کے خلاوف بغاوت کردی اس نے چوڑا گڑھ کے راجہ کو قتل کر کے اس کا تمام خزانہ قبضے میں لے لیا راجہ کے لڑکے نے شاہجہاں سے مدد کی درخواست کی تھی مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان دنوں شاہجہاں اپنی تخت نشینی کے بعد پہلی بار لاہور میں مقیم تھا اس نے آگرہ واپس ہوتے ہوئے بہادر خان کو دکن سے واپس بلا لیا تھا۔

مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ راجہ جھجر سنگھ پانچ سالوں تک دکن میں مغلوں کی خدمت کرتا رہا تھا وہ گونڈوانہ کے علاقے پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا جب ایسا نہ ہو سکا تو جھجر سنگھ نے پوڑا گڑھ کے قلعے کا محاصرہ کرلیا تھا اس دوران اسے شاہجہاں کی طرف سے بار بار ایسے اقدامات سے باز رہنے کا انتباہ کیا لیکن اس قلعے پر قبضے کرنے کے بعد جھجر سنگھ نے وہاں کے راجہ پریم نارائن کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ پریم نارائن کے لڑکے نے جب شاہجہان سے مدد کی درخواست کی تب شاہجہان نے راجہ جھجر سنگھ کو اطاعت قبول کرنے اور مقبوضہ علاقے مغل شکر کے حوالے کرنے کے ساتھ دس لاکھ روپیہ بطور جرمانہ ادا کرنے کا حکم دیا لیکن جھجر سنگھ نے ایسا کرنے سے انکار کردیا۔

علاوہ ازیں جھجر سنگھ نے اپنے لڑکے کی طرف پیغام بھیجا اس کا لڑکا اس وقت بالا گھاٹ کے مقام پر ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ قیام کیے ہوئے تھے چنانچہ جھجر سنگھ نے اسے پیغام بھیجا کہ وہ پورے لشکر کو لے کر اس کے پاس پہنچ جائے تاکہ دونوں باپ بیٹا اپنی پوری طاقت اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

قوت کے ساتھ اپنا دفاع کر سکیں۔
چنانچہ اس وقت تک اورنگزیب اور بہادر خان دونوں ایک لشکر لے کر بھنڈر کے نواح میں پہنچ چکے تھے وہاں اورنگزیب عالمگیر اور بہادر خان نے پڑاؤ قائم کر کے اپنے لشکر کو ستانے کا موقع فراہم کیا تھا۔
دشمن کے محل وقوع کا پتا لگانے کے لیے اورنگزیب نے جو مخبر اپنے آگے پھیلا رکھے تھے اسی جگہ اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت اورنگ زیب اپنے خیمے میں بہادر خان کے علاوہ کچھ دوسرے سالاروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ اسے مخبروں کے آنے کی اطلاع دی چنانچہ اورنگ زیب نے انہیں اپنے خیمے میں طلب کرلیا تھا۔
جب مخبر اورنگ زیب کے سامنے گئے تب بڑی شفقت اور بڑی محبت میں اس نے اپنے قریب بیٹھنے کے لیے کہا جب وہ بیٹھ گئے تب اورنگ زیب نے گفتگو کا آغاز کیا اور انہیں مخاطب کر کے کہنے لگا۔
''امیر الجیش ہم اچھی خبریں لے کر آئے ہیں جھجر سنگھ پوری طرح بغاوت پر اترا ہوا ہے اور اس نے ایک بہت بڑا لشکر بھی اپنے دفاع بلکہ یوں جانیے اپنی جارحیت کے لیے اکٹھا کرلیا ہے اس کے علاوہ جھجر سنگھ کا بیٹا نام جس کا بکرما جیت ہے وہ ایک خاصے بڑے لشکر کے ساتھ ان دنوں بالا گھاٹ میں قیام کیے ہوئے ہے چنانچہ جھجر سنگھ نے تیز رفتار قاصد اپنے بیٹے بکرما جیت کی طرف بالا گھاٹ روانہ کیے اور اس سے کہا ہے کہ وہ فی الفور اپنے لشکر کو حرکت میں لائے اور جھجر سنگھ سے جا ملے اسی طرح جب جھجر سنگھ اور اس کا بیٹا بکرما جیت دونوں اپنے اپنے لشکروں کو یکجا کریں گے تو ان کی طاقت اور قوت میں مزید اضافہ ہوجائے گا۔
امیر الجیش یہ پہلی خبر ہے دوسری خبر یہ ہے

مسکرائیے

احساس

بیوی نے ایک روز کسی محفل سے واپسی پر اپنے شوہر سے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
''آپ جب بھی کسی محفل میں جاتے ہیں اور کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ آپ شادی شدہ ہیں ،اور آپ کی ایک بیوی بھی ہے۔''
''نہیں......'' شوہر نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔''اسی وقت تو اس تلخ حقیقت کا احساس زیادہ شدت سے ہوتا ہے کہ میں شادی شدہ ہوں اور میری ایک بیوی بھی ہے۔''

ڈھولک

مریض: میرا داہنا ہاتھ ٹھیک ہوجائے گا تو کیا میں ڈھولک بجا سکوں گا۔''
ڈاکٹر:''کیوں نہیں تم ضرور بجا سکو گے۔''
مریض: ٫کیسی مزے دار بات ہے حادثے سے پہلے مجھے ڈھولک بجانی نہیں آتی تھی۔''

افسوس

ایک روز پٹواری جی کی گائے مرگئی تو سارا گاؤں افسوس کرنے ان کے گھر گیا۔ کچھ عرصے بعد پٹواری جی کا انتقال ہوگیا لیکن ان کے گھر کوئی نہیں گیا کیونکہ اسی دن تحصیل دار کی گھوڑی مرگئی تھی۔

☆☆

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کہ جھجر سنگھ کی ماں رانی پاربتی ان دنوں جھانسی میں قیام کیے ہوئے تھی اسے جب اپنے بیٹے جھجر سنگھ کی بغاوت کی اطلاع ہوئی تو جھانسی سے بھی ایک لشکر لے کر جھجر سنگھ کے پاس پہنچ چکی ہے اس طرح ان علاقوں میں ہمیں بے یک وقت تین لشکروں سے مقابلہ کرنا ہوگا ایک جھجر سنگھ کا دوسرا اس کے بیٹے بکرما جیت کا اور تیسرا وہ لشکر جو رانی پاربتی جھانسی سے لے کر جھجر سنگھ کے پاس پہنچی ہے۔''

وہ مخبر جب خاموش ہوا تب اورنگ زیب نے انہیں وہیں بیٹھنے کے لیے کہا پھر وہ بہادر خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''بہادر خان اب کہو تم کیا کہتے ہو تمہاری تجویز جاننے کے بعد میں پھر کوئی آخری فیصلہ کروں گا۔'' بہادر خان کچھ دیر خاموش رہ کر کچھ سوچتا رہا پھر اس نے اورنگ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''اس موقع پر میرے ذہن میں ایک تجویز ہے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں ایک حصہ مجھے دیں دوسرا آپ اپنے پاس رکھیں میں جھجر سنگھ کے بیٹے بکرما سنگھ کی طرف نکلتا ہوں اور کوشش کروں گا کہ اس کے لشکر کو جھجر سنگھ سے ملنے نہ دوں یا تو اسے شکست دے کر اس کے لشکر کا خاتمہ کر دوں یا جھجر سنگھ کے بیٹے بکرما جیت اور اس کے لشکریوں کو اس قدر نقصان پہنچاؤں کہ آنے والے دور میں وہ ہمارے لیے کسی خطرے کا باعث نہ رہے۔

میں چاہتا ہوں آپ یہاں سے بھنڈر شہر کی طرف کوچ کریں بھنڈر چند میل ہی آگے ہے اور وہاں سے آپ کو اسد کے علاوہ دوسرا ضرورت کا سامان بھی ملتا رہے گا جھجر سنگھ کے بیٹے بکرما جیت سے نبٹنے کے بعد میں بھنڈر ہی میں آپ سے آن ملوں گا اتنی دیر تک آپ تیار اور مستعد رہیے گا اس کے بعد پورے لشکر کے ساتھ ہم جھجر سنگھ پر ضرب لگانے کے لیے پیش قدمی کریں گے۔

بس فی الحال میرے پاس یہی تجویز ہے اگر آپ اس کے علاوہ کچھ چاہتے ہیں تو اس پر عمل کر لیا جائے گا۔''

مسکراتے ہوئے اورنگ زیب نے نفی میں گردن ہلائی پھر کہنے لگا۔

''بہادر خان جو کچھ تم نے کیا ہے آخری منصوبہ بندی یہی ہے یہ جو مخبر آئے ہیں ان میں سے ایک بالا گھاٹ کی طرف بکرما جیت کے لشکر کی طرف تمہاری راہنمائی کرے گا اور جب تم واپس آؤ گے تو پھر جھجر سنگھ کا رخ کریں گے میرے خیال میں اب اٹھو لشکر کی تقسیم کو آخری شکل دیں اس کے بعد دونوں اکٹھے یہاں سے کوچ کرتے ہیں میں بھنڈر شہر کے نواح میں پڑاؤ کر لوں گا اور تم جھجر سنگھ کے بیٹے بکرما جیت سے نبٹنے کے لیے بالا گھاٹ کا رخ کر جانا۔'' چنانچہ بہادر خان کے علاوہ وہاں بیٹھے چھوٹے سالاروں نے بھی اس سے اتفاق کیا تھا پھر سب اٹھ کھڑے ہوئے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا دو حصوں میں سے ایک حصہ بہادر خان اپنے کچھ سالاروں اور آنے والے راہنماؤں میں سے ایک کو لے کر وہ بالا گھاٹ کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

بالا گھاٹ میں جھجر سنگھ کے بیٹے کو جھجر سنگھ کا یہ پیغام مل چکا تھا کہ وہ اپنے پورے لشکر کو لے کر اس سے جا ملے چنانچہ جھجر سنگھ کا بیٹا بکرما جیت حرکت میں آچکا تھا اور وہ اپنے باپ کی طرف کوچ کر چکا تھا دوسری طرف بہادر خان نے بڑی تیزی اور برق رفتاری سے سفر شروع کیا تھا اور وہ بکرما جیت سے پہلے اس شاہراہ پر پہنچ گیا جس شاہراہ سے ہو کر بکرما جیت نے جھجر سنگھ کی طرف جانا تھا چنانچہ شاہراہ کے ایک طرف بہادر خان نے اپنے لشکر کا قیام کیا اور اپنے کچھ آدمی اپنے آگے پھیلائے تاکہ بکرما جیت کا لشکر جب

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ٰنڈیل دور رہ جائے تو اسے مستعد کر دیا جائے۔
اس طرح ججر سنگھ کے بیٹے بکر ماجیت پر ضرب لگانے کے لیے بہادر خان بالکل تیار اور مستعد ہو گیا تھا۔
یہاں تک کہ اس کے مخبروں نے اسے خبر کی کہ بکر ماجیت اپنے لشکر کے ساتھ لگ بھگ تین میل دور ہے یہ پیغام سنتے ہی بہادر خان نے اپنے لشکر کو پوری طرح تیار کر دیا اور بہادر خان اور اس کے سالاروں کی نگاہیں اب اس شاہراہ پر لگی تھیں جس شاہراہ پر بکر ماجیت نے اپنے لشکر کے ساتھ نمودار ہونا تھا۔
چنانچہ کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس شاہراہ پر غبار کے بادل اڑتے دکھائی دیے جس کا مطلب یہ تھا کہ جھجر سنگھ کا بیٹا بکر ماجیت اپنے لشکر کو لے کر قریب آ گیا ہے بس اس غبار کا دیکھنا تھا کہ بہادر خان حرکت میں آیا اپنے لشکر کو وہ شاہراہ پر لے گیا تا کہ بکر ماجیت کی راہ روکی جائے۔
بہادر خان کو اس کے مخبروں نے یہ بھی اطلاع کر دی تھی کہ بکر ماجیت جو لشکر لے کر آ رہا ہے عددی لحاظ سے اسے بہادر خان کے لشکر پر زیادہ بلکہ بہت فوقیت حاصل ہے لہٰذا اس سے کسی طریقے سے نبٹنا ہوگا۔
چنانچہ بہادر خان نے سب سے پہلے اپنے لشکر کو صفوں کی صورت میں شاہراہ پر استوار کیا اس کے بعد اس نے لشکر کی اگلی صفوں کو بٹھا دیا اور انہیں تیروں اور کمان سے لیس کر دیا گیا تیسری صف کو کھڑا رہنے دیا گیا لیکن وہ بھی اپنے تیر اور کمانیں سنبھال چکے تھے۔
جونہی بکر ماجیت کا لشکر پتھروں کی زد میں آیا بہادر خان نے ایک تکبیر بلند کی اس تکبیر کا بلند ہونا تھا کہ اگلی تین صفیں جن میں سے دو بیٹھی ہوئی تھیں اور ایک کھڑی تھیں انہوں نے بکر ماجیت کے لشکر پر ایسی موسلا دھار بارش جیسی تیر اندازی کی کہ بکر ماجیت کے ان گنت لشکری تیروں سے چھو گئے اپنے گھوڑوں سے گر گئے اور ان کے گھوڑے بھی بدک کر ادھر ادھر ہٹ گئے تھے۔
یہ صورت حال دیکھتے ہوئے بکر ماجیت نے وحشیانہ انداز میں آگے بڑھتے ہوئے راہ روکنے والوں پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا جب بکر ماجیت کے لشکری اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے آگے بڑھے تب بہادر خان کے کہنے پر اگلی تینوں صفوں نے اپنے کمانیں اپنی پشت پر ٹکا دیں اپنی تلواریں اور ڈھالیں سنبھالیں اور بکر ماجیت کے حملے کو روکنے کے لیے وہ بالکل تیار اور مستعد ہو گئے تھے۔
چنانچہ بکر ماجیت اپنے لشکر کے ساتھ آتے ہی اداسیوں کے مہیب جنگل میں پھوٹتے نصیبوں ٹوٹتے خوابوں شہر جاں کی گلیوں میں بلتی عذاب رتوں آنکھوں میں صحرائی وحشتیں بھرتے سزا در سزا بڑھکتے دائروں اور تلخی بھری گہری اذیتوں کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔
دوسری طرف بہادر خان نے بھی اپنے لشکر کو قدرت کے ہولناک قہر نفرت کے سلگتے لمحات درد کے طوفانوں چڑھتی دکھ کی کتھاؤں کی طرح آگے بڑھایا پھر وہ بکر ماجیت کے لشکر پر محرومیوں کی دلدلیں کھڑی کرتے موت کے کڑے سایوں۔ عمر کے ویران راستوں پر روح کی آسودگی کو جھلسا دینے والے ان دیکھے پاتال کی ہو بھری کروٹوں دھمال ڈالتے بگولوں اور بے تاب موسموں میں دھند میں چھپے عذابوں کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔
اس طرح میدان جنگ کے اندر دل کبیدہ تن دریدہ سر بریدہ ہونے لگے تھے۔ موت کی باز گزشت ہوس کا اضطراب سماعتوں میں بے حسی بصارتوں میں گرد بھرنے لگا تھا ہواؤں میں خون کی بو رچ گئی تھی موت بدنوں میں پنجے گاڑنے لگی تھی قضا کے کاروان سانسوں کو لرزاں کرنے

 DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لگے تھے نقارے گونج رہے تھے تلواروں کی برق چمک میدان جنگ کے اندر ایک خوف ایک وحشت کا سماں برپا کرنے لگی تھی۔

اس ماحول میں بکر ماجیت کے لشکر کی حالت بڑی تیزی مضمحل آرزوؤں منفعل ارادوں تعزیرین بنشتی تدبیروں طوفان کے سایوں میں چاک گریبانوں موت کی منڈل میں رقص کرتی فضا کی ان گنت تحریروں کی سی ہونا شروع ہوگئی تھی یہاں تک کہ راجہ جھجر کے بیٹے بکر ماجیت نے شکست قبول کی اس لیے کہ وہ خود بھی زخمی ہوا تھا لہٰذا وہ اپنے بچے کھچے لشکریوں کو لے کر وہ اپنے باپ کی طرف بھاگا تھا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ اس جنگ میں جھجر سنگھ کا بیٹا بکر ماجیت زخمی ہوا تاہم وہ اپنا آپ اور اپنے کچھ لشکریوں کو بچا کر اپنے باپ راجہ جھجر سنگھ کی طرف بھاگنے میں کامیاب ہوگیا تھا اس وقت راجہ جھجر سنگھ خود ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ اڑیسہ کے نواح میں پڑاؤ کیے ہوئے تھا۔

دوسری طرف بکر ماجیت کی بدترین شکست دینے کے بعد بہادر خان بھنڈر شہر کی طرف آیا جس کے نواح میں اورنگ زیب نے اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کر رکھا تھا بہادر خان جب وہاں پہنچا تو شاندار انداز میں اورنگ زیب نے اس کا استقبال کیا اس شاندار فتح پر اسے مبارک باد بھی دی پھر اورنگ زیب ہی کے خیمے میں خود اورنگ زیب بہادر خان اور دوسرے سالار بیٹھ گئے اس کے بعد اورنگ زیب کو مخاطب کرتے ہوئے بہادر خان کہنے لگا۔

''راستے میں مجھے اپنے مخبروں سے خبر ہوئی آپ تک بھی یہ خبر پہنچ گئی ہوگی کہ راجہ جھجر سنگھ اڑیسہ شہر کے نواح میں ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ قیام کیے ہوئے ہے میرے خیال میں اس کا زخمی بیٹا بکر ماجیت بھی اس سے جا ملا ہوگا میرا اپنا ارادہ ہے کہ ہمیں یہاں بھنڈر میں قیام کر کے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے آج ہی اپنا یہ پڑاؤ ختم کر کے پیش قدمی کرنی چاہیے سیدھا اڑیسہ کے نواح میں اس سمت کا رخ کریں جہاں راجہ جھجر سنگھ نے قیام کر رکھا ہے اس سے ٹکرائیں اور اسے بتائیں کہ بغاوت کے کیا نتائج نکلتے ہیں۔''

بہادر خان کی یہ گفتگو سن کر ہلکا سا تبسم اس موقع پر اورنگ زیب کے چہرے پر نمودار ہوا پھر وہ کہنے لگا۔

''بہادر خان جو کچھ تم کہہ رہے ہو میں مکمل طور پر اس سے اتفاق کرتا ہوں یہاں مغرب کی نماز کے بعد لشکر کے کھانے کا اہتمام کر کے عشاء کی نماز کے بعد کوچ کیا جائے گا اور اس رفتار سے کوچ کیا جائے گا کہ صبح سویرے ہم اڑیسہ کے نواح میں اس جگہ پہنچیں جہاں راجہ جھجر سنگھ نے قیام کر رکھا ہے اس سلسلے میں ہمارے مخبر ہماری راہنمائی کریں گے۔'' چنانچہ یہ طے ہونے کے بعد سب اپنے اپنے خیموں کی طرف ہو لیے تھے جبکہ لشکر نے عشاء کی نماز کے بعد وہاں سے کوچ کیا تھا مورخین لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کی کمانداری میں مغل لشکر نے اس شاہراہ پر اڑیسہ کا رخ کیا جو شاہراہ بھنڈر سے ہوتی ہوئی اڑیسہ کی طرف جاتی تھی۔

بہر حال اگلے روز کی صبح سویرے اورنگ اور بہادر خان اپنے لشکر کے ساتھ اڑیسہ کے نواح میں اس جگہ جا پہنچے جہاں جھجر سنگھ نے اپنے لشکر کے ساتھ قیام کر رکھا تھا اس کے لشکر کے بالکل سامنے اورنگ زیب اور بہادر خان نے اپنے لشکر کا پڑاؤ قائم کرنا شروع کیا۔

اتنی دیر تک جھجر سنگھ کا شکست خوردہ بیٹا بھی اس کے پاس پہنچ چکا تھا اور جھجر سنگھ کو اپنے بیٹے کی اس شکست کا بڑا دکھ اور بڑا غم بھی تھا۔

چنانچہ دونوں لشکر ایک دن اور ایک رات ایک دوسرے کے سامنے پڑے رہے دراصل جھجر سنگھ اپنے ان لشکریوں کو تھوڑا استانے کا موقع

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

قیام کرنا چاہتا تھا جو اس کے بیٹے بکرماجیت کے ساتھ آ ملے۔ جھجر سنگھ بھی باقاعدہ طور پر جنگ نہیں چاہتا تھا لیکن انہیں چنانچہ اگلے روز دونوں لشکر یوں ایک دوسرے کے سامنے اپنی صفوں کو درست کرنا شروع کر رہا تھا۔

جھجر سنگھ نے اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا جبکہ دوسری طرف اورنگ زیب نے بھی اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کیا ایک حصہ اپنے پاس رکھا اور دوسرا بہادر خان کی کمانداری میں دیا اس طرح دونوں لشکر ایک دوسرے پر ضرب لگانے کے لیے اپنی صفیں درست کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے سالاروں اور لشکریوں کو جنگ سے متعلق ہدایات بھی جاری کرنے لگے تھے۔

صفیں درست ہونے کے بعد سب سے پہلے جھجر سنگھ اور اس کے سالار حرکت میں آئے اور وہ اورنگ زیب اور بہادر خان کے لشکر پر کئی شالوں کے قصے فضاؤں کے ماتم ہواؤں کے لوحوں کی داستانیں کھڑی کرتی قتل گاہوں کی مقروض ریزہ ریزہ کرتی تیز آندھیوں زبان کو زخم خوردہ جسموں کو سیل تندرو کا شکار کرتے خیال احساس کے انقلاب اور سوچوں کی سیڑھیوں ذہنوں کے اوطاق میں اندھی تعبیریں بھرتی طویل جدائی کی کالی راتوں کی طرح حملہ آور ہو گئے تھے۔

چنانچہ جھجر سنگھ کے اس حملے کے جواب میں پہلے اورنگ زیب نے اپنے لشکر کے ساتھ ابتدا کی وہ اپنے لشکر کو پہاڑوں پر یلغار کرتے بادلوں کی گرج رعد کے طوفانوں، جسم وجان کا دھواں نکال دینے والی قوت، وقت کے طوفانوں کے تھپیڑوں کی طرح تکبیریں بلند کرتے ہوئے حرکت میں آیا گام صبا کی مانند افق پار سے ماہیوں کے صحرا میں رقص طوفانوں کی ایمان خزیوں روحوں کی گہرائیوں تک جلتی دھوپ کی طرح اتر جانے والی جدائی کے اندھے سایوں نا امیدی کے گہرے عذابوں زمین کے سینے میں دفن کر دینے والے بھٹکتے قلزموں کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

اورنگ زیب کے ساتھ ہی ساتھ بہادر خاں بھی سلگتی تنہائیوں میں بے روک سیلابی ریلے کی یورش سوچوں کے دشت میں بھٹکتے آگ کی خصیلیں کھڑی کرتے جذبوں کی طرح حرکت میں آیا اور پھر وہ بھی جھجر سنگھ کے لشکر پر دوپہر کی بہتی لو میں آتشیں پکار کے شور' صحراؤں کی تپتی ہواؤں میں طوفانوں کے خروش کائنات کی گہرائیوں تک اتر جانے والے اندوہناک زہریلے لمحوں اور جسموں کی شریانوں میں آگ بن کر داخل والی آتشیں ناآسودگیوں خون سے تر ولولوں بگولوں کے وحشی پن کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

اس طرح اڑیسہ کے نواح میں بھونچال کھڑے کرتے طوفاں اٹھ کھڑے ہوئے تھے زندگی کا ضمیر خون آلود اور رسوائیوں اور نفرتوں کی تعبیریں اپنا رنگ جمانے لگی تھیں وہم بوتی صدائیں جذبوں کی یلغار بیدار آرزوؤں کا درد پھیلتے بکھرتے لگا تھا شور آگاہی کے ماحول میں جبر کی دھول اڑانے لگی تھی وقت کے خواب ناک مناظر عدم کا راستہ دکھانے لگے تھے آنکھوں کی چمک ہونٹوں کی مسکراہٹیں مسحور کن نقش ونقار راکھ راکھ' روشنی زرد رتوں کی رسوائیوں اور مرجھائے سوکھے پھولوں تبدیل ہونے لگے تھے۔

جھجر سنگھ اور اس کا بیٹا بکرماجیت اور دوسرے سالار زیادہ دیر تک اورنگ زیب اور بہادر خان کے تیز حملوں کا مقابلہ نہ کر سکے لہٰذا شکست اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور جنگلوں میں سے ہوتے ہوئے انہوں نے جھانسی کا رخ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مورخین لکھتے ہیں یہ جس وقت جھجر سنگھ جن علاقوں میں بھاگا یہ تمام علاقہ گھنے جنگلات سے گھرا ہوا تھا اس دوران ان گھنے جنگلات کے اندر مندھیلوں نے اورنگ زیب اور بہادر خان کے لشکر پر پے در پے حملے بھی کیے تا کہ وہ راجہ جھجر سنگھ کا تعاقب ترک کر دیں لیکن وہ آگے بڑھتے رہے اس صورت حال کے پیش نظر راجہ جھجر سنگھ اپنے بیٹے کو اس کے حال پر چھوڑ کر اوڑچھا سے نکل کھڑا ہوا اس کا کنبہ اور خزانہ جنوب کی جانب دمونی کے مقام پر منتقل کر دیا گیا تھا۔

چنانچہ اورنگ زیب اور بہادر خان بھی اپنے لشکر کے ساتھ نہایت تیزی کے ساتھ پیشقدمی کر رہے تھے چنانچہ دمونی وہ مقام جہاں راجہ جھجر سنگھ نے اپنا خزانہ منتقل کیا تھا اورنگ زیب اور بہادر خان اپنے لشکر کے ساتھ دھونی کے قریب پہنچ گئے۔

یہاں بھی راجہ جھجر سنگھ نے اپنی طاقت اور قوت کو اکٹھا کیا اور چاہتا تھا کہ دمونی کے نواح میں اورنگ زیب اور بہادر خان کو شکست دے کر دمونی کے اندر اپنے قدم جمائے اور ایک بار پھر وہاں اپنی قوت کو جمع کرے۔

لیکن مورخین لکھتے ہیں کہ مغل لشکر نے دمونی کو تہہ بالا کر دیا اور پیشقدمی جاری رکھی راجہ جھجر سنگھ نے مایوس ہو کر چوڑا گڑھ سے فرار اختیار کیا اور تقریباً چھ ہزار لشکریوں اور ساتھ ہاتھیوں اور افرادے خانہ کے ساتھ دکن کی طرف نکل گیا۔

اس نے پندرہ دن تک مسلسل سفر کیا لیکن مغلوں کا لشکر برابر میں لگا ہوا تھا اس لیے اورنگ زیب اور بہادر خان راجہ جھجر سنگھ کی اس بغاوت اور سرکشی کو اس کے انجام تک پہنچانے کا عزم کیے ہوئے تھے۔

مورخین مزید لکھتے ہیں کہ راجہ جھجر سنگھ جس وقت اپنے بچے کھچے لشکر کے ساتھ دکن کی طرف بھاگ رہا تھا اس دوران اس نے خود ہی اپنی بہت سی عورتوں کو ہلاک کر دیا جن گھوڑوں پر یہ عورتیں سوار تھیں مورخین کے مطابق جب ان گھوڑوں نے بدک کر مغلوں کے لشکر کی طرف جانا چاہا تو جھجر سنگھ نے ان گھوڑوں کو بھی ہلاک کر دیا چونکہ راجہ جھجر سنگھ کے پاس ان جوہر کی رسم ادا کرنے کا وقت بھی نہیں تھا اس لیے کہ جوہر کی رسم کے مطابق تکلیف اور شکست کی صورت میں راجپوت اپنے عورتوں کو آگ میں جلا کر ختم کر دیا کرتے تھے۔

راجہ جھجر سنگھ برابر بھاگتا چلا جا رہا تھا اسے جگہ جگہ مغلوں کے لشکر کے ہاتھوں گزند پہنچ رہا تھا چنانچہ اس کے بہت لشکری جنگلوں کی طرف بھاگ گئے اس کے علاوہ مورخین کہتے ہیں کہ مغلیٰ لشکریوں نے راجہ جھجر سنگھ کے بہت سے قریبی رشتے داروں کو گرفتار کر لیا اور متعدد راجپوت زخمی عورتوں طبی امداد بھی پہنچائی۔

اسی دوران تعاقب کرتے کرتے اورنگ زیب اور بہادر خان کو یہ خبر بھی پہنچی کہ راجہ جھجر سنگھ اور اس کے ایک لڑکے کو گونڈوں نے قتل کر دیا ہے اسی دوران اورنگ زیب کو یہ بھی اطلاع ملی کہ شہنشاہ شاہجہان خود ایک لشکر کے ساتھ بڑی تیزی سے ان علاقوں کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔

چنانچہ جب اورنگ زیب اور بہادر خان کو یہ خبر ملی کہ گونڈوں نے راجہ جھجر سنگھ اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیا ہے تب انہوں نے جھانسی کے مضبوط قلعہ کا رخ کیا اس لیے جھانسی کے لشکر نے مغلی لشکر کے خلاف راجہ جھجر سنگھ اور اس کے بیٹے بکر ماجیت کی مدد کی تھی۔

چنانچہ جھانسی کے شہر اور قلعے کی اندر جو لشکر تھا وہ انہوں نے اورنگ زیب اور بہادر خان کا مقابلہ کیا لیکن اورنگ زیب اور بہادر خان نے جھانسی پر ایسے تیز اور جان لیوا حملے کیے کہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

... مطابق انہوں نے جھانسی کو فتح کر
... لیا اور اسے مغلوں کے علاقوں
... ملا لیا۔

... طرف شاہجہان اپنے لشکر کے
... سفر کرتے ہوئے پہلے اوڑچھا شہر پہنچا
وہاں اس نے اپنے لشکر کو ستانے اور آرام کرنے
... فراہم کیا مورخین لکھتے ہیں کہ اسی مقام پر
... کوندے جنہوں نے راجہ ججھر سنگھ اور اس کے
بیٹے کو قتل کیا تھا وہ شاہجہان کی خدمت میں حاضر
ہوئے اور انہوں نے باغی راجہ ججھر سنگھ اور اس
کے لڑکے بکر ماجیت کے کٹے ہوئے سر شاہجہاں کو
روانہ کیے مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس جنگ
کے دوران چونکہ راجہ ججھر سنگھ کی ماں پاروتی بھی
زخمی ہوئی تھی لہٰذا وہ ان زخموں کی تاب نہ لا کر مر
گئی تھی۔

چنانچہ ایک دو روز اوڑچھا میں قیام کر کے بعد شاہجہاں اپنے لشکر کے ساتھ جھانسی کے نواح میں اس جگہ پہنچا جہاں اورنگ زیب اور بہادر خان نے اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کر رکھا تھا۔

شاہجہان جب اورنگ زیب اور بہادر خان کے پڑاؤ کے پاس آیا تب اورنگ زیب اور بہادر خان اور دوسرے دیگر سالار استقبال کے لیے آگے بڑھے شاہجہاں کے ساتھ اس وقت سلطنت مغلیہ کا وزیر سعد اللہ شاہجہان کا برادر نسبتی اورنگ زیب کا ماموں آصف خان مارواڑ کا راجہ جسونت سنگھ امبر کا راجہ جے سنگھ اور کچھ دوسرے لوگ تھے شاہجہان اپنے گھوڑے سے اتر کر باری باری اورنگ زیب اور بہادر خان سے ملا اس شاندار فتح پر ان دونوں کو مبارک باد دی ساتھ ہی اس نے اپنے لشکر کو وہاں پڑاؤ کرنے کا حکم دے دیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے اورنگ زیب اور بہادر خان کے لشکر کے قریب شاہجہان کے لشکر نے خیموں کا شہر آباد کر دیا تھا اس موقع پر شاہجہان کچھ دیر تک بڑی شفقت سے اپنے بیٹے اورنگ زیب کی طرف دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

"اورنگ زیب میں سمجھتا ہوں اپنی پہلی مہم میں جو تم نے بہادر خان کے ساتھ کارگزاری کا مظاہرہ کیا ہے یہ کوئی عام سالار اور لشکر کا امیر کر ہی نہیں سکتا تھا تم نے راجہ ججھر سنگھ کے خلاف میری خواہشوں کے مطابق ضرب لگائی ہے اور ایسا کر کے میرے بیٹے تم نے مجھے اپنی کارگزاری سے سو فی صد مطمئن کر دیا ہے۔"

اورنگ زیب کے ساتھ ہی چونکہ بہادر

خوف خدا

خلیفہ ہارون الرشید کے سامنے ایک باغی کو ہتھکڑیوں میں پیش کیا گیا۔ یہ ایک خطرناک شخص تھا۔ ہارون فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے قتل کر دے گا۔ قتل کا حکم صادر کرنے سے پہلے ہارون نے غضب ناک آواز میں باغی سے پوچھا:
"تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔"
"وہی سلوک جو خدا آپ کے ساتھ کرے گا' جب آپ اس کے سامنے جائیں گے۔"
ہارون کا غصہ کافور ہو گیا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ چند لمحوں بعد درباریوں نے اس کی تھکی ہوئی آواز سنی۔
"اسے آزاد کر دیا جائے۔"
سپاہیوں نے ہتھکڑیاں کھول دیں۔ باغی دربار سے چلا گیا۔ درباریوں میں سے کسی نے ہارون رشید سے کہا:
"امیر المومنین' آپ نے باغی کا ایک ہی جملہ سن کر اسے آزاد کر دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس کی گرفتاری میں سپاہیوں کو کتنی زحمت ہوئی تھی۔ نیز اس کی آزادی سے شرپسندوں کو اور شہ مل سکتی ہے۔"
ہارون نے بے ساختہ حکم دیا: "باغی کو دوبارہ گرفتار کر لیا جائے۔"
دوبارہ باغی ہتھکڑیوں میں پہنچا۔ اس نے آتے ہی ہارون رشید سے کہا۔ "حضور میرے متعلق دوسروں کی رائے پر کان نہ دھریئے اگر اللہ آپ کے متعلق دوسروں کی رائے سنتا تو آپ ایک لمحہ بھی خلیفہ نہ رہ سکتے۔"
ہارون نے اسے پھر آزاد کر دیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

خان بھی کھڑا ہوا تھا لہٰذا ایک گہری نگاہ اس موقعہ پر شاہجہان نے بہادر خان پر ڈالی پھر کہنے لگا۔

''تمہاری منگنی ہوگئی اور تم نے ہمیں بتایا نہیں وہ تو راستے میں جسونت سنگھ نے مجھ پر انکشاف کیا کہ تمہاری سگائی راج کماری رتن مالا کے ساتھ طے ہو چکی ہے۔''

اس پر ہلکے سے تبسم میں بہادر خان بولا اور کہنے لگا۔ ''شہنشاہ معظم دکن کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے میں آپ سے ملاقات کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور حیرت کی بات یہ کہ جب میں اپنے گھر گیا تو میرے دادا اور میری دادی نے مجھے کھانا بعد میں دیا پہلے مجھے دیوان خانے میں لے گئے اور مجھے بتائے بنا ہی میری دادی نگار خانم مجھے سگائی کی انگوٹھی پہنا دی۔

اس وقت میں کچھ نہیں سمجھتا تھا کہ یہ انگوٹھی کاہے کے لیے پہنائی جا رہی ہے لیکن بعد میں میرے دادا نے مجھے پر انکشاف کیا کہ آگرہ سے میری آمد سے پہلے محترم جسونت ہماری حویلی میں گئے تھے اور راج کماری رتن مالا کے ساتھ میرا رشتہ طے کیا تھا اسی روز سگائی کی انگوٹھی رتن مالا کو پہنا دی گئی اور جب میں گھر پہنچا تو مجھے بھی سگائی کی انگوٹھی پہنا دی گئی شہنشاہ معزم اس کے ایک دن بعد میں امیر جلیس اورنگ زیب کے ساتھ راجہ جھجر سنگھ کی طرف چلا گیا اور مجھے کسی سے اپنی اس سگائی کے متعلق کچھ کہنے سننے کا موقع تک نہ ملا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد بہادر خان جب خاموش ہوا تب شاہجہان بولا اور کہنے لگا۔

''کیا یہ سگائی طے کرتے وقت تمہارے دادا قطیب خان نے تمہاری رضامندی حاصل نہیں کی تھی۔''

جواب میں بہادر خان مسکرا دیا اور کہنے لگا۔ ''قطعاً نہیں مجھ سے پوچھا تک نہیں گیا منگنی کی انگوٹھی پہنانے کے بعد مجھ پر انکشاف کیا گیا۔''

شاہجہان بھی مسکرا دیا تھا دوبارہ اس نے پوچھا۔ ''کیا رسم کی ادائیگی سے پہلے تم نے رتن مالا کو دیکھ رکھا تھا۔''

''جی میں اسے اس سے پہلے کئی بار دیکھ چکا تھا اور بنگال کی طرف جانے سے پہلے دادا اور دادی کے ساتھ میرا دو ایک بار محترم جسونت سنگھ کی حویلی میں بھی جانا ہوا تھا۔''

''کیا تمہیں اس سگائی کے متعلق کوئی اعتراض ہے۔'' شاہجہان نے اس موقعہ پر غور سے بہادر خان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ لیا تھا۔

بہادر خاں پھر مسکرا دیا اور کہنے لگا۔ ''جی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

شاہجہان کے پہلو میں کھڑا مارواڑ کا راجہ جسونت سنگھ اس گفتگو پر مسکرا رہا تھا اور بڑے شوق اور بڑی شفقت سے بہادر خان کی طرف دیکھے جا رہا تھا اس کے بعد شاہجہان نے اورنگ زیب کی طرف دیکھا اور اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''بیٹے! میں دراصل جھانسی کی طرف آیا تھا مجھے کچھ مخبروں نے اطلاع دی تھی کہ جھانسی کے اندر جو لشکر ہے ہمارے خلاف کاروائیوں میں مصروف ہے لیکن میں سمجھتا ہوں میرا یہاں آنا بیکار ثابت ہوا میری یہاں آمد سے پہلے ہی تم دونوں نے جھانسی کو فتح کر کے قبضہ کر لیا ہے لہٰذا میں تم دونوں کی اس کارگزاری پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے میرے خیال میں تم دونوں بھی تھکے ہارے ہو آرام کرو میرے لشکر کا پڑاؤ قائم ہو چکا ہے میں اپنے خیمہ کی طرف جاتا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی شاہجہان اپنے خیمہ کی طرف ہو لیا تھا۔

اورنگ زیب اور بہادر خان بھی جب

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

وہاں سے ہٹنے لگے تب راجہ جسونت سنگھ نے بہادر خان کو مخاطب کیا۔

''بہادر خان میرے بیٹے تم تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ آؤ۔''

چنانچہ اورنگ زیب اپنے خیمے کی طرف چلا گیا بہادر خان راجہ جسونت سنگھ کے ساتھ ہو لیا تھا۔

جسونت سنگھ کے ساتھ بہادر خان جب اس کے خیمے میں داخل ہوا تو خیمے میں اس وقت جسونت سنگھ کی پتنی سرسوتی راج کماری رتن مالا دونوں بیٹھی ہوئی تھیں جسونت سنگھ ساتھ بہادر خان کو دیکھتے ہوئے راج کماری رتن مالا اور اس کی ماتا سرس وتی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی دونوں اپنے جگہ پر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں جسونت سنگھ اور بہادر خان خیمے میں داخل ہوئے اس موقعہ پر سرس وتی بڑی تیزی سے آگے بڑھی بہادر خان کو اپنے ساتھ لپیٹا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہنے لگی۔

''بیٹے میں تمہاری شاندار کارگزاریوں پر تمہیں دلی مبارک باد پیش کرتی ہوں۔''

جسونت سنگھ کے ساتھ بہادر خان آگے بڑھا تب راج کماری رتن مالا بھی اپنی کھنکتی ہوئی آواز میں بہادر خان کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''میں آپ کو جھجر سنگھ اور اس کے بیٹے امور جھانسی کی مہم کی کامیابی کرنے پر مبارک باد دیتی ہوں۔''

اس موقع پر بہادر خان نے ایک پر شوق نگاہ راج کماری رتن مالا پر ڈالی تھی پھر جسونت کے کہنے پر وہ وہاں بیٹھ گیا جب کہ سرس دیوی اور رتن مالا دونوں جسونت سنگھ اور بہادر خان کے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔

بہادر خان اس موقعہ پر چونکہ جنگی لباس پہنے ہوئے تھا اور اپنے خیمے کی طرف نہیں گیا تھا کچھ کہنے کے لیے آغاز کرنا چاہتا جسونت سنگھ بولا اور کہنے لگا۔

''بیٹے دکن سے واپسی کے بعد تم آگرہ میں داخل ہوئے اور ہم سے ملاقات کیے بغیر جھجر سنگھ کی مہم کی طرف روانہ ہو گئے۔''

جواب میں بہادر خان بولا اور کہنے لگا۔

''بیچ میں صرف ایک دن کا وقفہ تھا جس روز میں آگرہ پہنچا اگلے روز میں نے سو کر گزار دیا پھر اس کے اگلے روز میں اورنگ زیب کے ساتھ اپنی مہم پر روانہ ہو گیا لہٰذا مجھے کسی سے ملنے کا موقع نہ ملا۔''

جسونت سنگھ پھر بولا اور کہنے لگا۔

''بیٹے آج شام کا کھانا تم ہمارے ساتھ کھاؤ گے اب تم ہمارے گھر کے ایک فرد ہو راج کماری رتن مالا کے ساتھ تم جب اور جس وقت چاہو جس موضوع پر چاہو گفتگو کر سکتے ہو اس لیے اب تم دونوں کو ایک دوسرے سے منسوب کیا جا چکا ہے میں نے رتن مالا کو بھی اجازت دے دی ہے کہ وہ جب اور جس وقت چاہے تم سے مل سکتی ہے۔''

بہادر خان پہلے جسونت سنگھ کا شکریہ ادا کیا پھر کہنے لگا۔

''اس وقت مجھے اجازت دیں میں جاتا ہوں جا کے لباس تبدیل کروں گا۔''

اس موقعہ پر دھیمی لہجہ میں راج کماری رتن مالا بولی اور کہنے لگی

''جو آپ کا جنگی لباس ہے اس پر خون کے دھبے ہیں یہ اتار کے مجھے دیجیے گا میں دھو ڈالوں گی۔''

جواب میں مسکراتے ہوئے بہادر خان بولا اور کہنے لگا۔ ''اس کی نوبت نہیں آئے گی ہر لشکری ہر سالار کو اپنا کام خود کرنا پڑتا ہے میں سمجھتا ہوں اگر کوئی سالار جنگ کے دوران دوسرے پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ ایک اچھا سالار ثابت نہیں ہو سکتا۔'' اس کے ساتھ ہی بہادر خان

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا پھر جسونت سے اجازت لے کر وہ اس کے خیمہ سے نکل کر اپنے خیمے کی طرف ہو لیا تھا۔

☆☆

مہابت خان کے وفات پانے پھر لشکر کا ایک حصہ لے کر بہادر خان واپس آگرہ جانے کی وجہ سے دکن کے حالات پھر خراب ہو گئے گو مہابت خان کی وفات کے بعد شاہجہان نے مالوہ کے عالم خان دوران کو مہابت خان کی جگہ دکن کا ولی مقرر کیا تھا لیکن دوران خان حالت کو اپنی گرفت میں نہ رکھ سکا جگہ جگہ بلوے اٹھ کھڑے ہوئے بیجاپور کے حالات خراب ہو گئے اور اس کے کچھ سالار آپس میں ٹکرا گئے یہ صورت حال دیکھتے ہوئے شاہجہان نے دکن کے علاقوں کے اندر ہی قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس کے پاس لشکر بھی کافی بڑا تھا ایک لشکر کے ساتھ پہلے ہی اس کا بیٹا اورنگ زیب اور بہادر خان راجہ جھجر سنگھ سے نبٹنے نپٹ کر جھانسی میں شاہجہان سے مل چکے تھے چنانچہ جب جنوبی ہندوستان کے حالات مزید خراب ہونا شروع ہوئے جگہ جگہ کش مکش سرکشی بغاوت کے اثر نمودار ہونے لگے تو مورخین لکھتے ہیں شاہجہان آگرہ نہیں گیا پورے لشکر کے ساتھ بقول مورخین اس نے دریائے نربدا کو عبور کر کے دولت آباد پہنچ کر اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کیا دولت آباد پڑاؤ کرنے کے بعد شاہجہان نے تیز رفتار قاصد بیجاپور کے حکمرانوں کی طرف روانہ کیے اور بیجاپور والوں سے مطالبہ کیا کہ بیجاپور نے جو احمد نگر کے کچھ علاقے اپنے قبضے میں کر لیے ہیں وہ مغلوں کے حوالے کر دیے جائیں اس کے علاوہ بیجاپور کی سرزمینوں میں مرہٹوں کے علاوہ احمد نگر کے سلطان کے قریبی رشتے داروں کو بیجاپور سے نکال دینے کا مطالبہ کیا۔

یہ پیغام بھجوانے کے بعد شاہجہان نے پورے لشکر کے ساتھ دولت آباد سے بھی کوچ کر اب وہ بالا گھاٹ کی طرف روانہ ہوا بالا گھاٹ پہنچ کر شاہجہان نے اپنے سالاروں کے ساتھ مشاورت کے لیے سب کو اپنے خیمہ میں طلب کر لیا تھا۔

چنانچہ جب سارے سالار اس کے خیمہ میں جمع ہو گئے جمع ہونے والوں میں مارواڑ کا راجہ جسونت سنگھ اور امبر کا راجہ جے سنگھ بھی شامل تھے شاہجہان کے دائیں جانب اس کا بیٹا اورنگ زیب اور اس کے آگے بہادر خان بیٹھا ہوا تھا پھر جسونت سنگھ راجہ جے سنگھ اور دوسری سمت دکن کا حاکم دوران خان سالار شائستہ خان اور کچھ دیرے سالار بیٹھے ہوئے تھے۔

شاہجہان نے سب سے پہلے سب کا بغور جائزہ لیا اس کے بعد انہیں مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"دکن کے حالات بار بار ہمیں مداخلت کرنے پر مجبور کرتے ہیں اس وقت بھی حالات ہمارے حق میں نہیں ہیں احمد نگر کے علاقے پوری طرح مغلوں کی ملکیت قرار پا چکے ہیں اس کے باوجود کچھ قلعے ایسے ہیں جن پر باغی عناصر قبض ہو چکے ہیں اور ان قلعوں میں زیادہ تر مشہور قلعے ادھ گیر اور اودسا ہیں میرا یہ ارادہ ہی کہ بیجاپور یا مرہٹوں کی قوت کا سامنا کرنے سے پہلے ہمیں ان دو قلعوں پر قبضہ کر لینا چاہیے اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو ماضی کے وہ علاقے احمد نگر کے تحت تھے وہ ساری ہماری ملکیت ہو جائیں گے۔

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بیجاپور اور احمد نگر کے باغیوں کے علاوہ ان قلعوں کے اندر مرہٹے بھی قابض ہیں اور مرہٹے چاہتے ہیں کہ شمالی اور جنوبی ہند کے مسلمان ایک دوسرے سے برسرپیکار رہیں اور ان کی ان لڑائیوں سے مرہٹے فائدہ اٹھا رہے ہیں لہٰذا میں چاہتا ہوں ادھ گیر اور روسا نام کے دونوں قلعوں کو باغیوں سرکشوں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ے خالی کرا کے اپنی مملکت میں شامل کیا جائے۔

جہاں تک میں سوچ سکا ہوں میں چاہتا ہوں ایک لشکر میرا بیٹا اورنگ زیب اور سالار بہادر خان لے کر جائیں ادھ کیرا اور اوسا کے قلعوں پر حملہ آور ہو کر انہیں فتح کر لیں اس کے بعد ہم بیجاپور والوں کی خبر لیں گے جو ماضی میں دکن میں اٹھنے والی ہمارے خلاف بغاوت اور ہر قسم کی سرکشی کی حمایت اور مدد کرتے رہے ہیں اب بتاؤ تم لوگ ادھ کیرا اور اوسا کو کیا اہمیت دیتے ہو اور کیا ہمیں ان پر حملہ آور ہو کر اپنی مملکت میں شامل نہیں کرنا چاہئے۔“

سب سارے سالاروں نے اس سے اتفاق کیا تب اگلے روز شاہجہان نے اپنے بیٹے اورنگ زیب اور بہادر خان کو اس مہم پر مقرر کیا گیا وہ دونوں اپنا لشکر لے کر ادھ کیرا اور اوسا رام کے قلعوں پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

دوسری طرف ادھ کیرا اور روسا نام کے ان قلعوں کے اندر باغیوں نے قیام کر رکھا تھا انہیں بھی خبر ہو گئی تھی کہ شاہجہان نے اپنے بیٹے اورنگ زیب اور سالار بہادر خان کو ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا ہے لہٰذا علیحدہ علیحدہ قلعوں کے لشکر کا مقابلہ کرنے کے بجائے ادھ کیرا اور روسا میں جو بعض قوتیں تھیں وہ یکجا ہوئیں اور پھر ادھ کیرا اور اوسا کے درمیانی حصوں میں انہوں نے اپنے لشکر کا پڑاؤ کر لیا تھا وہیں انہوں نے اورنگ زیب اور بہادر خان کے لشکر سے ٹکرانے کا فیصلہ کیا تھا۔

دوسری طرف اورنگ زیب بہادر خان کو بھی ان کے طلایہ یہ خبریں دے چکے تھے کہ دشمن کا لشکر ادھ کیرا اور اوسا کے درمیان پڑاؤ کیے ہوئے ہے اور مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار اور مستعد ہیں تب اورنگ زیب اور بہادر خان نے بھی انہی ہی علاقوں کا رخ کیا تھا جہاں باغیوں نے پڑاؤ کر رکھا تھا۔

چنانچہ جونہی اورنگ زیب بہادر خان اپنے لشکر کے ساتھ وہاں پہنچے باغی قوتوں نے اپنے لشکر کی صفیں درست کرنا شروع کر دی تھیں اس کا مطلب کا وہ جنگ کے ابتدا کرنا چاہتے تھے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اورنگ زیب اور بہادر خان نے بھی مشورہ کیا لشکر کو انہوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ایک حصہ اورنگ زیب نے اپنے پاس رکھا دوسرا بہادر خان کی سرکردگی میں دیا اس طرح وہ باغیوں سے نپٹنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

دوسری طرف اپنی صفیں درست کرنے کے بعد باغیوں کا سالار حرکت میں آیا پھر وہ اورنگ

اندازِ فکر

حکیم لقمان سے کسی نے پوچھا۔ ”حکمت کس سے سیکھی؟“

جواب ملا: ”اندھوں سے...... وہ پہلے زمین کو اچھی طرح ٹٹول لیتے ہیں تب آگے بڑھتے ہیں۔“

☆☆

پولیس اسٹیشن پر فون کی گھنٹی بجی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے فون اٹھایا۔ کسی نے کہا۔

”میری بیوی اچانک غائب ہو گئی ہے۔ کیا کروں؟“ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ ”سب سے پہلا کام یہ کرو کہ ہمیں اس کا حلیہ بتاؤ۔“

”قد پانچ فٹ دو انچ۔ وزن ایک سو باسٹھ پونڈ معمولی سے بھینگی۔ دو دانت باہر نکلے ہوئے۔“ شکایت درج کرنے والے نے بتایا۔

”تم نے پہلے رپورٹ کیوں نہیں کی۔؟“

”بات یہ ہے کہ دو ہفتے تک میں یہی سمجھتا رہا ہوں کہ ایک خوشگوار خواب دیکھ رہا ہوں۔“

Downloaded from Paksociety.com

زیب اور بہادر خان لشکر پر دوریوں کی کہر بھری منزلوں میں بزم کو ازم میں بدل دینے والے راکھ کی تہ سے اٹھتے شعلوں' شہروں کو دھواں دھواں کرتے بے چہرہ شور سلاسل بستیوں کو ویران ویران کرتے زبان کے جبر درد بھری تقریروں اور دل پر عذاب بنکر طاری ہوتے سمندر کی طرح جوش مارتے انقلاب کی طرح حملہ آور ہو گئے تھے۔

جواب میں پہلے اورنگ زیب نے اپنے کام کی ابتداء کی اور اپنے لشکر کے ساتھ وہ نطق کا کمال لذت اظہار چھیننے والے سلگتی ریت کے جھکڑوں رگوں کو تبسم سے محروم کرتی انوکھی حشر سامانیوں پر تمکنت وشوکت ہر عزیمیت و اس تقامت اکھڑتے سانسوں اور ڈوبتی نبضوں تبدیل کرتی صحرائی لگولوں کی جوش مارتی پختہ کاری کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

اورنگ زیب کے ساتھ ہی ساتھ بہادر خان بھی اپنے حصے کے لشکر کو لے کر حرکت میں آیا پھر وہ بھی باغیوں کے لشکر پر بے سحر راتوں کی وسعتوں میں قبرستانوں کی تاریکیوں وہموں کے سایوں میں دفن کر دینے والے ابھرتے شراروں کے حصودان دیکھی اور اجنبی سرزمینوں کے انوکھے حذب و مستی میں بدنوں کے پیچ وخم ادھیڑ دینے والی فضا کی دائمی تلخیوں اور سربستہ رازوں اور لہو میں ڈبوتی اداس شام کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا یوں میدان جنگ کے اندر پریت کی حرمت چاہت کی عزت اپنائیت کی حدت نغموں کے ابال آتشین نا آسوگیوں دکھ کی افسانوں آہیں بھرتی تنہائیوں اور خوف کی وادیوں میں تبدیل ہونا شروع ہو گئے تھے۔

ایک گھمسان کا رن پڑا شروع شروع میں باغیوں کا خیال تھا ہمارے لشکر کی تعداد چونکہ زیادہ ہے لہٰذا ہم کامیاب اور فتح مند رہیں گے لیکن جب اورنگ زیب اور بہادر خان نے اپنے تیز اور جان لیوا حملوں کے باعث انہیں اپنا آپ دکھانا شروع کیا تب باغیوں کے لشکر میں بدنظمی سی پھیلنا شروع ہوئی اس لیے کہ انہوں نے دیکھا ان کے سامنے ان کے ان گنت لشکریوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں جون ہی دشمن کے لشکر اندر بدنظمی پھیلنا شروع ہوئی اس سے اورنگ زیب اور بہادر خان نے خوب فائدہ اٹھایا اپنے حملوں کی شدت میں اور اضافہ کیا جس کے بعد باغی قوتوں کو بدترین شکست ہوئی ان میں سے بہت سو کو کاٹ دیا گیا بہت کم لوگوں کو اپنی جانیں بچا کر بھاگنے کا موقعہ ملا۔

ادھ گیر اور اوسہ کے درمیان دونوں قلعوں کی طاقت اور قوت کو بدترین شکست دینے اور ان کے لشکر کی تعداد بہت کم کر کے بعد اورنگ زیب اور بہادر خان نے سب پہلے ان کے پڑاؤ ہر چیز پر قبضہ کیا وہ باغی اور سرکش جو جنگ کے دوران بچ گئے تھے انہوں نے ادھ گیر یا اوسا کا رخ نہیں کیا وہ جانتے تھے اگر انہیں شکست اٹھانے کے بعد دونوں قلعوں میں کسی ایک میں بھی پناہ لینے کی کوشش کی تو اورنگ زیب اور بہادر خان اس قلعہ کا محاصرہ کر لیں گے اور کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے لہٰذا اپنی جانیں بچانے کے لیے وہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے جس کے نتیجے میں اورنگ زیب اور بہادر خان نے آگے بڑھ کر ادگیر اور اوسہ نام کے دونوں قلعوں پر قبضہ کر لیا اور یوں دونوں قلعے مغلوں کی سلطنت میں شامل کر لیے گئے اس طرح ان قلعوں پر قبضہ کرنے اور ان کے نواح میں باغی اور سرکش قوتوں کو شکست دینے کے بعد اورنگ زیب اور بہادر خان اس سمت روانہ ہو گئے تھے جہاں شاہجہان نے اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کر رکھا تھا۔

اس تاریخی داستان کے باقی واقعات
آئندہ ماہ ملاحظہ کریں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

... نے جیسے ہی ان چاروں کو خون میں لت پت اور بے ... کت دیکھا' وہ حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ اسے جیسے ... یں آیا کہ چاروں اس آسانی سے موت کا نشانہ بن جائیں گے۔ ... وشی سے سرشار اور جھومتا ہوا ان لاشوں کی طرف بڑھا۔ وہ ... روکتا ہی رہ گیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان نوجوانوں کے ساتھی ... کہیں موجود اور چھپے ہوئے ہوں' وہ نہ نکل آئیں اور......!

پاسِ عہد

ایم الیاس

اس شمارے کی ایک دلگداز کہانی

جب وہ دس برس پیشتر وادی جموں و کشمیر آیا تھا' اس وقت بھی آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ یہ تحریک کوئی پرانی نہیں تھی۔ تقسیم ہند کے بعد سے چل رہی تھی۔ کبھی تو یہ تحریک زوروں پر چلتی' تو کبھی سرد پڑ جاتی تھی لیکن اس نے کبھی دم نہیں توڑا تھا۔ بالکل ہی ختم نہیں ہوئی تھی مگر دس برس پہلے تحریک آزادی کچھ سرد پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس بات کو بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ جب بھی' جہاں بھی آزادی کی تحریک چلتی ہے' وہ اس وقت تک چلتی ہے جب تک آزادی حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس کے ملک میں دو سو برس تک تحریک آزادی چلی تھی۔ پھر بڑے خون خرابے اور عظیم قربانیوں کے بعد ملک انگریزوں سے آزاد ہوا تھا۔

اس ملک کی تاریخ بھی اس وادی میں

Downloaded from Paksociety.com

دہرائی جارہی تھی۔ دو برس پہلے جب یہاں آیا تھا' وہ اس تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے نہیں بلکہ اس حسین خطے کی سیر وتفریح اور سیاحت کے لئے...... اس کی بڑی تعریف سنی تھی' سنتار ہتا تھا۔ اس کے ایک چچا نے اس وادی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں زمینداری کرلی تھی۔ اس کی حکومت نے' اس کی قوم کے لیڈروں نے ہمیشہ اس بات کی ترغیب دی تھی کہ اس وادی میں اس قوم کی جتنی اکثریت ہوگی' اس کے ملک اور قوم کے لئے اور تحریک آزادی کو ختم کرنے' کچلنے اور پامال کرنے میں اتنی ہی مفید ثابت ہوگی۔ اس لئے اس کا چچا اس وادی کے ایک گاؤں میں آ گیا تھا۔

اسے دس برس پہلے کی باتیں آنے لگیں۔ وہ چچا کے گاؤں گیا تھا۔ اسے شروع ہی سے گاؤں اور اس کی فضا بہت پسند تھی۔ اس وقت اس پر بھرپور جوانی آئی ہوئی تھی۔ جیسے چیری پر شگوفے آتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں پہلی بار کسی گاؤں میں آیا تھا۔ یہاں بالکل نئی زندگی تھی۔ کچھ عجیب طرح کی تیزی اور تندی اس کے بہاؤ میں تھی۔ جو کبھی کبھی پہاڑی وادیوں میں بھری برسات میں آتی ہے۔ بہار کے چمکتے ہوئے دن میں وہ گھومنے نکلا تھا۔ ابھی سیب اور آڑو کچے تھے' انجیر پھیکے تھے اور چیری کے رخساروں پر وہ گلابی رنگ بھی نہ تھا جو مثال کے طور پر اس وادی کی دوشیزاؤں کے چہروں پر اس نے کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر گھاس بڑی لمبی' لچکدار اور خوشگوار تھی اور اس کے قریب سے گزرنے پر اسے گھاس سے وہی خوشبو آتی تھی جو اس کے بدن میں آرہی تھی۔ جوانی اور بہار میں ایک ہی خوشبو آتی ہے' جو شہروں میں کبھی نہیں ملتی ہے۔

وہ بہت دور تک اونچی گھاٹیوں میں چلا گیا تھا۔ اس لئے کہ ایسی کھلی فضا' جس میں سکون ہی سکون ہو' اس کا شہر میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ندی کنارے سفیدے کے پیڑوں کی لمبی قطاریں اور گھاس کے ایک کونے قطعے میں گائیں چر رہی تھیں۔ بادلوں کے ٹکڑے شریر بچوں کی طرح گھاٹیوں سے پھسل کر گاؤں کے مکانوں تک آتے تھے...... اس کا چچا بہت چھوٹا زمیندار تھا۔ اسے اور اس کے دونوں بیٹوں کو اپنی زمینوں پر خود کام کرنا پڑتا تھا جس وقت وہ گھر سے نکل رہا تھا' اب اس کا چچا انگور کی بیلیں اپنے باغیچے میں ٹھیک کررہا تھا۔ وہ ایک گھوڑے پر سیر کے لئے نکلا تھا۔ اس کے چچا کے دونوں بیٹے کسی کام سے سری نگر گئے ہوئے تھے۔ اوپر گھاٹیوں میں جاکر اس نے جہاں گھوڑا باندھا تھا' اس سے آگے جانا بہت مشکل تھا۔ اس نے گھوڑے کو اخروٹ کے پیڑ سے باندھ دیا تھا اور پھر اوپر چل دیا تھا۔ کہیں سفید بادل تھے' کہیں پھولوں کی بیلیں تھیں' کہیں جھاگ اڑاتا ہوا آبشار تھا جو سفید موتی کی طرح تھا۔ وہ قدرت کے ان حسین نظاروں میں کھوکر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوگیا تھا۔ جیسے جنت میں آ گیا ہو۔

''لگتا ہے آپ پہلی بار اس وادی کی سیر و سیاحت کے لئے آئے ہیں۔'' اس نے اپنی پشت پر ایک میٹھی سی آواز سنی جس نے اس کے کانوں میں رس گھول دیا تھا۔

اس نے ایک دم سے چونک کر اور پلٹ کر دیکھا۔ اس آواز کو سن کر اس کے سارے بدن کو سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک نوجوان سالڑکا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ کشمیری سیب کی طرح سرخ تھا۔ اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ سفید پگڑی بھی باندھ رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بندوق تھی۔ اس کے چہرے پر نرمی وشائستگی تھی مگر اس کی عقابی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

''جی ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

[illegible] ہاتھ میں بندوق دیکھ کر کچھ خائف سا ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔ [illegible] سمجھا، کاش آنند گاؤں میں رہتے [illegible] داری کرتے ہیں۔ میں اس حسین [illegible] اور ان سے ملنے آیا ہوں [illegible]

”میں ایک مجاہد ہوں‘ جو اپنی اس وادی کی آزادی کے لئے لڑ رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں یہاں سے گزر رہا تھا‘ آپ کو دیکھا تو یہاں چلا آیا۔“

”لیکن یہاں دور دور تک فوج اور بی ایس ایف کے کسی کیمپ کا نام ونشان نہیں ہے‘ پھر آپ نے یہ بندوق کس لئے اٹھا رکھی ہے۔“

”میں یہاں سے اپنے کچھ دوستوں اور رشتہ دار جوانوں کو محاذ جنگ پر لے جانے آیا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ لوگ چونکہ چلنے کے لئے تیاری کر رہے ہیں‘ میں نے سوچا کہ جب تک کیوں نہ یہاں کی سیر کر لوں۔ میں نے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنی تو اس طرف چلا آیا۔ پھر آپ کو دیکھا۔“

”ابھی تو آپ کی عمر لکھنے پڑھنے کی ہے‘ نہ کہ ہتھیار اٹھانے کی۔“ وہ حیرت سے بولا۔ ”اتنی سی عمر میں آپ نے بندوق اٹھالی......“

”میں اور میرے ساتھی جو میرے ہم عمر ہیں‘ وہ تحریک آزادی میں حصہ لے رہے ہیں‘ ان کے ایک ہاتھ میں قلم بھی ہے۔“

”تمہیں موت سے ڈر نہیں لگتا......“ اس نے تحیر زدہ لہجے میں پوچھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”ہم موت سے نہیں ڈرتے ہیں‘ بلکہ اسے گلے لگا لیتے ہیں۔ ہم تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتے ہیں۔ اس کے متمنی ہوتے ہیں۔“

”زندگی ایک بار ملتی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”زندگی بہت حسین ہوتی ہے۔ تم نے ابھی زندگی کہاں دیکھی ہے۔ اس کا لطف کہاں اٹھایا ہے۔ تمہاری عمر موت سے کھیلنے اور مفت میں گنوانے کی نہیں ہے...... اور پھر تمہارا مقابلہ ایک بہت بڑے ملک کی فوج سے ہے‘ جس کی تعداد کا‘ اس کی طاقت کا تمہیں بالکل ہی اندازہ نہیں ہے۔ تم لوگ برسوں سے اس کے خلاف لڑ رہے ہو...... آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہو۔ اس سے تمہاری قوم نے کیا حاصل کیا...... کتنے سہاگ اجڑ گئے‘ گودیں خالی ہو گئیں۔ تمہاری عمر کے لڑکے لڑکیاں یتیم ہو گئے۔ لڑکیوں کے ہاتھوں میں مہندی کے بجائے خون رچ گیا۔ تم نے کبھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس کی کہ آج اور کل میں کتنا فرق ہے۔ چھوٹی بڑی طاقت میں کیا فرق ہے۔“

”زندگی ایک بار ملتی ہے تو موت بھی ایک ہی بار آتی ہے۔“ لڑکے نے کہا۔ ”ہم موت سے اس لئے نہیں ڈرتے ہیں کہ اس کا ایک دن معین ہے اور پھر موت ہماری حفاظت بھی کرتی ہے‘ کیونکہ ہم سب موت کی امانت ہوتے ہیں۔ ہمیں حسین زندگی سے زیادہ شہادت کی تمنا ہوتی ہے۔ شوق شہادت کی تمنا میں ہم دشمن کی صفوں میں جا گھستے ہیں۔ لگتا ہے کہ آپ نے تاریخ نہیں پڑھی...... ایک ایسی قوم پر جس میں جذبہ آزادی بیدار ہو چکا ہے اس پر تسلط قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ حریت پسندانہ تعداد سے ڈرتے ہیں‘ نہ سامان حرب سے...... جب کوئی موت سے نہیں ڈرتا ہے تو پھر کسی کے ساتھ ناانصافی کرنے اور ظلم و ستم روا رکھنے پر ڈرتے ہیں۔“

”یہ جذباتی باتیں ہیں۔“ اس نے اس لڑکے کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ دل میں حیران تھا کہ اس نوجوان کو زندگی سے نہیں موت سے پیار ہے۔ وہ ایک خوبصورت زندگی پر موت کو ترجیح دے رہا ہے۔ یہ جذبہ اس میں کس بات نے پیدا کیا۔ پھر وہ بڑی نرمی اور شائستگی سے کہنے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لگا۔ ''تم ابھی نوجوان ہو۔ تمہاری عمر ستر اٹھارہ برس کی بھی نہیں ہے۔ زندگی صرف موت کی نذر کرنے کے لئے نہیں ہوتی ہے۔ تم جس دنیا میں رہ رہے ہو' اس دنیا سے نکل کر یہ دنیا کتنی حسین اور رنگین ہے۔ یہ زندگی مزے اٹھانے اور عیش کرنے کے لئے ہے نہ کہ کسی کی زندگی سے کھیلنے کے لئے ہے۔''

''ہم مسلمان آخرت کی اس زندگی پر یقین رکھتے ہیں جو لافانی ہوگی۔ یہ دنیا فانی ہے۔ اس فانی دنیا میں کچھ نہیں ہے۔ ایک دن سب خاک ہو جائے گا لیکن آخرت کی دنیا اس وقت حسین' پرکیف اور راحت بخش ہوگی' تم تصور نہیں کر سکتے ہو۔ یہاں زندگی ہی نہیں' ہر چیز عارضی اور فانی ہے۔''

وہ اس نوجوان اور اس کی باتوں کو کبھی بھولا نہیں۔ دس برس گزر جانے کے بعد بھی اسے اسی طرح یاد تھا جیسے یہ کل کی بات ہو۔ آج دس برس کے بعد ایک اعلیٰ فوجی افسر کی حیثیت سے کشمیر آیا تھا۔ اس کا تبادلہ کشمیر کر دیا گیا تھا تاکہ وہ کشمیری حریت پسندوں کے خلاف جنگ میں حصہ لے سکے۔ تحریک آزادی کو کچل سکے۔ حریت پسندوں کے جذبوں کو تاراج کر سکے۔ ان حریت پسندوں نے اس کی فوج کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ لاشوں کا تحفہ بھیج رہے تھے' جدید ترین ساز و سامان اور فوج کی اکثریت بھی ان مجاہدین کو' جو تعداد میں بہت کم تھے' شکست نہ دے سکی تھی۔ جب کہ اس کی فوج نے وادی میں ان حریت پسندوں اور ان کی تحریک کو دبانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ بستیوں کی بستیاں جلا دی تھیں' عورتوں کی بے حرمتی کی تھی' نہتے بوڑھوں اور جوانوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ سیکڑوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بھر دیا تھا۔ ان پر تشدد کیا جاتا تھا' پھانسی بھی دی گئی تھی لیکن یہ مجاہدین سیسہ پلائی دیوار بنے ہوئے تھے۔ اس کی فوج نے برسوں میں جانے کیا کچھ کیا تھا پھر بھی اسے ان مجاہدین پر فتح نصیب نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے اپنی ڈیوٹی سنبھالنے کے بعد ساری خفیہ رپورٹیں پڑھیں جو بڑی ہولناک اور لرزہ خیز تھیں۔ اس قوم کے ابھی دماغ درست نہیں ہوئے تھے جبکہ کتنے جوانوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ دس موت کی آغوش میں جاتے تھے' ان کی جگہ پندرہ جوان لے لیتے تھے۔ عورتوں کی بے حرمتی اور اغوا سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ جیلیں بھرنے سے ان کے عزم و حوصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ عام قسم کے ہتھیاروں سے مقابلہ کر رہے تھے۔

وہ ایک روز مختلف علاقوں اور بستیوں سے ہوتا ہوا ایک ایسے علاقے میں آیا تھا جو دور دراز تھا۔ ایک مخبر کی اطلاع کے مطابق یہاں کچھ ایسے نوجوان اس علاقے میں موجود تھے' جنہوں نے فوج کو شدید ترین نقصان پہنچایا تھا۔ تین جرنیلوں اور پچاس کے قریب فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ دستی بموں کے حملوں سے تین کیمپوں اور سات ٹرک جو اسلحے سے لدے ہوئے تھے' تباہ کر دیا تھا۔ اس راستے سے فوجی دستے گزرتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔ ان کی ہیبت فوجیوں کے دلوں میں ایسی بیٹھ چکی تھی کہ وہ راتوں کو سوتے میں بھی ڈر جاتے تھے۔ ایک اطلاع یہ تھی کہ ان کے ساتھ ایک جوان لڑکی بھی ہے' جوان کے دوش بدوش تحریک آزادی میں حصہ لے رہی ہے۔ اس نے بھی نجانے کتنے فوجیوں کو قتل کیا ہے۔

یہ راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے اس کی فوج کو بڑی مشکلات پیدا ہو گئی تھیں۔ جب تک ان حریت پسندوں پر قابو نہیں پایا جا سکتا تھا' اس وقت تک یہ راستہ کھل نہیں سکتا تھا۔ یہ راستہ فوجی اہمیت کا حامل تھا۔ اب اس کے لئے بہت ضروری تھا کہ ان جوانوں کو موت کی نیند سلا دے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

وہ اپنے ماتحت کے ساتھ ان نوجوان مجاہدین کی تلاش میں نکلا جنہوں نے اس کی فوج کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ دراصل وہ ایک ایسی جگہ سے اپنے دشمن پر حملہ کرتے تھے کہ دشمن بے بس ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس کے لئے ایک قدم آگے بڑھانا بھی ناممکن ہو جاتا تھا۔ وہ علی الصباح ہی آج اس علاقے میں آ گیا تھا۔ وہ چاروں طرف دیکھتا رہا تھا۔ سہ پہر ڈھلنے کے بعد اس نے کچھ لوگ پہاڑی کے عقب سے نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ ایک چٹان پر اپنی بندوقیں رکھ کر نماز پڑھ رہے تھے کہ اس نے اپنی جدید ترین روسی ساخت رائفل سے انہیں باری باری بھون دیا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے اس تیزی اور پھرتی سے کیا تھا کہ ان میں سے کسی ایک کو سنبھلنے، چھینے اور بندوق اٹھانے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ یہ کل چار نوجوان تھے۔ اسے حیرت اس بات کی تھی ان چار نوجوانوں نے اس کی فوج کو تگنی کا ناچ نچا کر رکھا ہوا تھا۔ سیسہ پلائی دیوار بنے ہوئے تھے۔ ان چاروں نے جو نقصان پہنچایا تھا، وہ چار سو آدمی بھی مل کر نہیں پہنچا سکتے تھے۔ انہوں نے اس کی فوج کے دانت کھٹے کر کے رکھے ہوئے تھے۔

اس کے ماتحت نے جیسے ہی ان چاروں کو خون میں لت پت اور بے حس و حرکت دیکھا، وہ حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا کہ چاروں اس آسانی سے موت کا نشانہ بن جائیں گے۔ وہ خوشی سے سرشار اور جھومتا ہوا ان لاشوں کی طرف بڑھا۔ وہ اسے روکتا ہی رہ گیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان نوجوانوں کے ساتھی جو کہیں موجود اور چھپے ہوئے ہوں، وہ نہ نکل آئیں اور اس کے ماتحت کو بھون کر رکھ دیں۔ ہر قدم کا خطرہ موجود تھا۔ وہ اپنی جھاڑیوں کے پیچھے اپنی رائفل لئے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنی دوربین سے مختلف سمتوں کا جائزہ لیا۔ شاید کوئی اس طرف آتا ہوا دکھائی دے۔

اس وقت وہ جو خوشی محسوس کر رہا تھا، ایسی خوشی تو اس نے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتے وقت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے اپنی فوج کے راستے کا ایک ایسا پتھر ہٹا دیا تھا جو اس کی فوج کی بڑی تعداد اور جدید ترین ہتھیار بھی ہٹا نہیں سکے تھے لیکن اس نے اپنی اس خوشی کا اظہار ماتحت پر نہیں کیا تھا۔ صرف اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے ملک سے یہ تہیہ کر کے اس وادی میں آ گیا تھا کہ اپنی تدبیر اور عقل و فراست سے ان حریت پسندوں کو ختم کر کے دم لے گا۔ اس نے جو یہ کارنامہ انجام دیا تھا وہ اس کی فوج کے نزدیک نہ صرف بہت اہم تھا بلکہ عظیم تھا۔ اس کارنامے پر اسے مزید ترقی مل سکتی تھی۔

اس کا ماتحت ان لاشوں کے پاس پہنچ کر انہیں نفرت اور حقارت سے دیکھ رہا تھا کہ فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ماتحت کے ایک سنسناتی ہوئی گولی آ کر لگی تھی۔ پھر اس کے ماتحت کو جیسے بھون دیا گیا تھا۔ جس نے بھی اس کے ماتحت کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا، اس نے اپنے ساتھیوں کی موت کا بڑا سفاکانہ انتقام لیا تھا۔ اس کے لئے یہ اندازہ کرنا بہت مشکل تھا کہ کس جانب سے اس کے ماتحت پر فائرنگ کی گئی ہے۔ چند لمحوں کے بعد پھر فضا پر سکوت چھا گیا۔

اسے خوف اور دھڑکا لگ گیا تھا کہ جس نے اس کے ماتحت کو قتل کیا ہے، کہیں اب وہ اسے نشانہ بنانے کی سوچ نہ رہا ہو لیکن اس اندیشے کا کوئی جواز نہ تھا کیونکہ اس کے ماتحت کو لاشوں کے پاس دیکھ کر اسے ختم کرنے والا اس نتیجے پر پہنچا ہوگا کہ اس کے ماتحت کے سوا یہاں کوئی اور نہیں ہے۔ لہٰذا وہ اسے تلاش نہیں کرے گا۔ لیکن وہ کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ دشمن کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ اسے نرغے میں لے سکتا تھا۔ اس کا حشر بھی اس کے ماتحت جیسا عبرتناک ہو سکتا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تھا۔ ویسے اسے خطرے کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں ایک لمحہ رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

چند لمحوں کے بعد اسے شمال کی جانب سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بہت دور سے آرہی تھی۔ شمال میں اس کی فوج نے کئی بستیوں کو نذر آتش کر کے انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا تھا۔ اب وہ اس علاقے پر قابض تھے اور انہوں نے وہاں اپنے کیمپ قائم کئے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا تھیلا اور رائفل سنبھالی۔ پھر وہ جھاڑیوں اور پہاڑوں کے عقب سے نکلا۔ ایک محفوظ جگہ رک کر اس نے اپنی دوربین سے چاروں طرف کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک پل کے لئے اس کی دوربین اس کے ماتحت کی لاش اور چار جوانوں کی لاشوں پر مرکوز ہوگئی۔ اس نے ان چاروں کو غور سے دیکھا۔ ان کی عمریں زیادہ نہ تھیں۔ وہ سولہ برس سے لے کر بائیس تیئس برس کے نوجوان تھے۔ ایسے کم سن نوجوانوں نے اس کی فوج کو تسخیر کیا ہوا تھا۔

دس برس کے بعد یہاں آ کر اس نے خفیہ رپورٹیں دیکھیں تو اس میں یہ بات بھی لکھی ہوئی تھی کہ کم سن اور نوجوان لڑکے بھی خصوصی تربیت حاصل کر کے اپنے باپ' بھائیوں اور جوان مردوں کے دوش بدوش آزادی کے لئے برسرپیکار ہیں۔ ان کے دلوں میں موت کا کوئی خوف نہیں ہے اور نہ ہی دنیاوی زندگی کی رنگینیوں سے کوئی دلچسپی ہے۔ وہ صرف اور صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس کی فوج اس وادی سے نکل جائے۔ انہیں خودمختاری اور آزادی مل جائے۔

اس کے ملک کے ایک اخبار کے صحافی نے جس نے وادی کا دورہ کیا تھا' جو حریت پسندوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا تھا اور تین ماہ تک اس کا قیدی رہا تھا' اس نے ان حریت پسند نوجوانوں کے بارے میں لکھا تھا کہ مجاہدین میں اکثریت ایسے جوانوں کی ہے جس کی مسیں ابھی بھیگ رہی

ہیں۔ اس نے ان کے ساتھ محاذ پر جا کر یہ دیکھا تھا کہ وہ فوج کا کس بہادری سے مقابلہ کرتے ہیں۔ بے جگری سے لڑتے ہیں۔ شاہینوں کی طرح اپنے دشمن پر جھپٹتے ہیں۔

اچانک فضا گولیوں کی گونج سے لرز اٹھی۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ یہ جو فائرنگ ہو رہی ہے' وہ شاید اس کی فوج کے کسی قافلے پر ہو رہی ہے۔ یہ لوگ تعداد میں پانچ چھ معلوم ہوتے ہیں۔ اس نے چھپنے اور وہاں رہ کر انتظار کرنے کے بجائے وہاں سے فرار ہونے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ ان کے اوپر آنے اور اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھنے پر اس کے لئے کوئی خطرہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ وہ اس کی تلاش میں بھی نکل سکتے تھے۔

اس نے مشرق کی سمت تیزی سے دوڑ لگا دی تھی کیونکہ وہ اس جگہ سے بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن اسے آ لے۔ کیا معلوم اس کا غیر محسوس انداز سے تعاقب کیا جا رہا ہو۔ اس کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ راستے سے ناواقف تھا۔ اس نے ایک دو جگہ رک کر دیکھا تھا۔ کوئی اس کے تعاقب میں نہیں آرہا تھا۔ اگر کوئی اس کے تعاقب میں ہوتا تو اب تک گولیاں اس کا تعاقب کر کے اسے ختم کر چکی ہوتیں۔

وہ کدھر جائے۔ کس سمت جائے۔ اس کی فوج کے کیمپ کہاں ہوں گے' وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ دوربین کی مدد سے دیکھتا بھی جا رہا تھا کہ شاید کہیں کوئی کیمپ دکھائی دے جائے اور پھر شام بھی ہو رہی تھی۔ شام کے دھندلکے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ دن اگر ہوتا تو وہ دوربین کی مدد سے راستے کا تعین کر لیتا۔ اس کے ماتحت کے بیگ میں نہ صرف نقشہ بلکہ خورد و نوش کا سامان اور پانی کی بوتل بھی رہ گئی تھی۔ نقشہ اس کے پاس ہوتا تو اسے اس قدر مشکل نہ پیش آتی۔ وہ جدھر منہ اٹھا' ادھر تیزی سے اور گرتا پڑتا چلتا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

رہا تھا کیونکہ راستہ ناہموار تھا۔ راستے میں پہاڑی پتھر پڑے ہوئے تھے۔ چلتے چلتے وقت خاصا گزر گیا تھا۔ شام کے سائے اندھیرے میں مدغم ہو رہے تھے۔ اس اندھیرے میں دوربین کی مدد سے دیکھنا کچھ فائدہ مند نہیں تھا۔

اس نے کسی جگہ رک کر اور صبح تک وقت گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب وہ چلتے چلتے کسی جگہ ستانے کی غرض سے بیٹھ جاتا تو اسے قریب سے گولیوں کے چلنے کی آواز سنائی دیتی، جس کے باعث وہ چلنے پر مجبور تھا۔ وہ ساری رات اندھے میں چلتا رہا تھا۔ ٹھوکریں کھاتا رہا تھا۔ پگڈنڈیوں اور پہاڑیوں سے ہوتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کی منزل کہاں ہے، اسے معلوم نہیں تھا۔ کسی بھی جگہ رکنا اور رات کاٹنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ساری رات وہ فائرنگ کی آوازیں سنتا رہا تھا۔ قریب سے اور بہت دور سے بھی، جیسے مجاہدین اس کی فوج سے برسرپیکار ہیں۔

پھر وہ ایک پہاڑی کے دامن میں تھک ہار کے بیٹھا تو اس نے صبح صادق کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بہت دور سے ایک بہت ہی دھیمی سی آواز سنی۔ اس نے اپنے کان لگا دیئے۔ یہ اذان کی آواز تھی۔ اس نے اذان سے اندازہ لگایا کہ کوئی بستی قریب میں ہے۔ گہری خاموشی کی وجہ سے اسے آواز سنائی دے گئی تھی۔ وہ آپ ہی آپ دشمن کے حصار میں آ گیا تھا۔ یہاں سے نکلتے ہی بستی کے کسی شخص کی نظر اس پر پڑ سکتی تھی۔

اب اس کے بس میں نہیں رہا تھا کہ وہ اس جگہ بیٹھا رہے کیونکہ وہ نڈھال ہو رہا تھا۔ تھکن سے چور تھا۔ اس کے لئے بھوک، پیاس ناقابل برداشت ہو رہی تھی، حلق سوکھ گیا تھا، حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ اس کے جوتے گھس کر پھٹ چکے تھے۔ اس کی قمیض بھی کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اس کے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے سارے راستے میں نہ تو کوئی آبادی نظر آئی تھی، نہ چشمہ ملا تھا، نہ کوئی ندی یا نہر تھی، جھیل تھی۔ سنسان، ویران اور بیابان علاقہ تھا۔

اس نے سوچا کہ یہاں بیٹھ کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے تو بہتر ہے کہ وہ دشمن کے ہاتھوں بہادری کی موت کیوں نہ مرے۔ ایک فوجی کے شایان شان نہیں کہ کتے کی موت مرے۔ وہ ایک فوجی افسر بھی ہے۔ دشمن اسے مارنے سے پہلے ایک گلاس پانی تو پلا دے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دشمن اسے ہلاک نہ کرے اور اپنا قیدی بنا لے۔ دشمن کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہ ہوگا کہ اس نے چار نوجوان مجاہدین کو موت کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کی موت کی ساری ذمہ داری اس کے ماتحت پر آ جائے گی، جس کی لاش ان جوانوں کے قریب پڑی ہوئی ہے۔ دشمن اس کی فوج سے اپنے ساتھیوں کی رہائی کے عوض سودے بازی کرسکتا ہے کیونکہ بہت سارے مجاہدین اس کی فوج کی قید میں ہیں۔

سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب وہ بیدار ہوا تو سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ صبح ہو چکی تھی۔ فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ وہ بہ وقت تمام اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے چھپتے چھپاتے چلنے کھلے میدان سے ہو کر چلنے کو ترجیح دی۔ پھر اس نے ایک جگہ رک کر دوربین کی مدد سے مخالف سمت دیکھا۔ سب سے پہلے اسے ایک بہت ہی چھوٹی سی مسجد دکھائی دی۔ مسجد کے عقب میں کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر اسے ایک بڑا سا مکان دکھائی دیا۔ اس مسجد اور مکان کے سوا اسے کوئی آبادی دکھائی نہیں دی تھی۔ یہ علاقہ پہاڑیوں اور جنگل سے گھرا ہوا تھا۔

وہ مکان زیادہ دور نہ تھا لیکن یہ مسافت اس کے لئے صدیوں کی بن گئی تھی۔ اس کے لئے ایک قدم بھی چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ اس میں اتنی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سکت بھی نہ تھی کہ کچھ تیز ہی چل سکے۔ وہ کس طرح چل رہا تھا' یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ کیوں نہ وہ ایک ہوائی فائر کردے۔ پھر اس خیال سے رک گیا کہ کہیں اس مکان کے اندر سے کوئی اس پر فائر نہ کردے کیونکہ اس وادی کے ہر مکان میں ایک نہ ایک حریت پسند موجود تھا۔

اس مکان کے قریب پہنچتے ہی اس کے ہاتھ سے بیگ اور بندوق چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ اس نے دروازے پر دستک دینے کے لئے جیسے ہی اتھ رکھا' دروازہ کھل گیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ غش کھا کر مکان کے اندر گرا۔ اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر وہ بے ہوش ہوگیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک لمبی چوڑی مسہری کے نرم وگداز بستر پر پایا۔ اس کے قریب ایک نوجوان عورت کھڑی تھی۔ اس کی عمر چوبیس' پچیس برس سے زیادہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کے رخساروں پر چیری کا گلابی رنگ تھا۔ وہ ایک صحت منداور چاق وچوبند عورت تھی۔ دراز قد تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی تھی۔ جھیل کی سی بڑی بڑی آنکھوں میں بڑی گہرائیاں تھیں۔

اس عورت کو دیکھ کر اس کے دل میں خوف سی لہر اٹھی۔ وہ اس وقت ایک حریت پسند عورت کی قید اور اس کے رحم وکرم پر تھا۔ اس کی وردی اس کا تعارف تھی۔ اس وادی کی ہر عورت' لڑکی' بوڑھی' بچہ' نوجوان اور مرد اس کی فوج کے بدترین دشمن تھے۔ خون کے پیاسے تھے۔ آج ایک دشمن کی عورت اس کی نظروں کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس گھر میں اس عورت کے سوا کوئی اور نہیں ہے اور پھر اس عورت کی نگاہ میں اس کے لئے نفرت اور حقارت بالکل بھی نہ تھی۔

نہ ہی وہ اسے ایک دشمن کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی سی طاری تھی۔ بڑی پروقار سی لگ رہی تھی۔

وہ عورت اسے بیدار دیکھ کر خاموشی سے اندر کے ایک کمرے میں چلی گئی۔ اس نے سوچا کہیں وہ اسے ختم کرنے کے لئے اندر سے اسلحہ لانے تو نہیں گئی ہے۔ مگر وہ اسے دہلیز پر ہی ختم کرسکتی تھی۔ اسے اندر لاکر بستر پر تو نہ لٹاتی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ عورت دودھ کا گلاس لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے خوبصورت اور سڈول ہاتھوں میں بندوق نہ تھی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ سے لبالب بھرا ہوا بڑا گلاس تھا۔ وہ اس کے پاس آکر بولی۔ ''دودھ پی لیں۔''

اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ وہ اس قدر نڈھال تھا کہ اس کے لیے بیٹھنا دشوار ہورہا تھا۔ یہ دیکھ کر عورت نے دودھ سے بھرا گلاس مسہری کے سرہانے والی میز پر رکھ دیا۔ پھر اسے اٹھ کر بیٹھنے میں مدد دی۔ جب وہ بیٹھ گیا تو عورت نے اس کی طرف دودھ کا گلاس بڑھا دیا۔ دودھ ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی کر اسے خالی کردیا۔ اس ایک گلاس دودھ نے اس کے سارے جسم میں فروخت اور تازگی کی لہر دوڑادی۔ اس نے بڑی توانائی سی محسوس کی۔ اس کی تھکن اور نڈھالی حیرت انگیز طور پر بہت کم ہوگئی تھی۔ یہ دودھ نہ تھا بلکہ امرت پانی تھا جس نے اسے ایک نئی زندگی دی تھی۔

جب عورت نے اس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لیا تو اس نے عورت کی طرف ممنون نگاہوں سے دیکھا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

''اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم اپنے مہمانوں کی خاطر مدارت روایتی انداز سے کرتے ہیں۔ آپ ہمارے معزز مہمان ہیں۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

انتخاب

گزارشات

ایک معروف قانون دان عدالت میں اپنے موکل کے حق میں دلائل کے انبار لگا رہے تھے۔ جب قانون دان کو دلائل پیش کرتے ہوئے چار گھنٹے ہو گئے تو جج نے تنگ آ کر قانون دان سے کہا۔

''کیا فاضل وکیل یہ بتائیں گے کہ وہ کب تک اپنا شغل جاری رکھیں گے۔؟''

وکیل نے برجستہ جواب دیا۔

''جناب والا! یہ تو فاضل عدالت پر منحصر ہے کہ وہ کتنی دیر میں اس نکتے کو سمجھتی ہے۔ ویسے ایک اور جج صاحب پانچ منٹ میں میری گزارشات کو سمجھ سکتے تھے۔''

حق خدمت

ایک شخص کو شہر کے سب سے بڑے شعبہ جاتی اسٹور سے قیمتی اشیاء چوری کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ضمانت پر رہا ہو کر اس نے ایک وکیل صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ وکیل صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ وکیل صاحب نے ایف آئی آر کا مطالعہ کرنے کے بعد سنجیدگی سے کہا ''میں دو شرائط پر آپ کا دفاع کر سکتا ہوں' آپ کو مجھے یقین دلانا ہوگا کہ آپ بے گناہ ہیں اور یہ کہ مجھے دو ہزار روپے فیس کے طور پر ادا کریں گے۔''

ملزم نے چند لمحے غور کیا اور بولا: ''میں آپ کو پندرہ سو روپے اور ایک سیکو گھڑی پیش کر سکتا ہوں جو میں نے اس اسٹور سے دو ماہ پہلے اڑائی تھی۔ اب بتایئے کیا آپ میرا دفاع کریں گے۔!''

''لیکن میں آپ کا مہمان کیسے ہو گیا۔''

اس نے کہا۔ ''میں دشمن ہوں۔ فوج کا ایک افسر ہوں۔ ہماری فوج آپ کی قوم کے جوانوں کو موت کے گھاٹ اتار رہی ہے۔''

''ہر وہ شخص ہمارا مہمان ہوتا ہے جو گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ چاہے وہ شخص فوج سے یا ہمارے دشمن سے تعلق رکھتا ہو۔'' اس عورت نے جواب دیا۔

''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ نے مجھے قیدی بنا کر رکھ لیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''پھر آپ مجھے مجاہدین کے حوالے کر دیں تاکہ وہ فوج سے بدلے بازی کر سکیں۔''

''آپ مسلمانوں کو نہیں جانتے ہیں اور نہ ہی آپ نے مسلمانوں کی تاریخ پڑھی ہے' ورنہ یہ بات آپ نہیں کہتے۔'' وہ عورت کہنے لگی۔ ''مسلمان کسی بھی خطے کا کیوں نہ ہو' وہ اپنے گھر آئے ہوئے مہمان کو بہت عزت اور تعظیم دیتا ہے۔ ہمارا مذہب بھی یہی درس دیتا ہے۔ آپ میرے گھر کے اندر بے ہوش پڑے ہوئے تھے' گھر میں داخل ہو چکے تھے' اس لئے آپ میرے مہمان ہوئے۔ آپ قید میں نہیں ہیں۔ نہ میں آپ کو مجاہدین کے حوالے کروں گی۔ آپ اس گھر میں جب تک قیام کریں گے اس وقت تک مہمان رہیں گے' کسی کی مجال نہیں کہ آپ سے کچھ کہے۔ آپ پر انگلی اٹھائے۔''

پھر وہ عورت دودھ کا گلاس لے کر اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آئی تو اس کے ہاتھ میں دو ابلے ہوئے انڈے اور دودھ کا گلاس تھا۔ جس وقت وہ انڈے کھا کر دودھ پی رہا تھا' اندر سے عورت اس کی قمیص لے کر آئی۔ وہ دھلی ہوئی اور صاف لگ رہی تھی۔ عورت نے قمیص کو کرسی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت میلی ہو گئی تھی' میں نے اچھی طرح دھویا ہے۔ یہ سوکھ بھی گئی اور اس میں نم بھی ہے۔ تھوڑی دیر میں سوکھ بھی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جائے گی۔''

جب وہ انڈے کھا کر دودھ پی چکا تو وہ ٹرے اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''اب آپ آرام کریں۔ مجھے اجازت دیں تاکہ میں آپ کے لئے ناشتا تیار کرلوں۔ آپ سو جائیں تو بہتر ہے' کیونکہ آپ کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ آپ ساری رات ایک پل کے لئے بھی نہیں سوئے ہیں۔''

''آپ میرے لئے کوئی تکلف اور اہتمام نہ کریں۔'' اس کے چہرے پر ندامت کی سرخی پھیل گئی۔ ''اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں اپنے جسم میں اتنی طاقت اور توانائی محسوس کررہا ہوں کہ اپنا سفر جاری رکھ سکوں۔ وہ انڈوں اور دو گلاس دودھ نے میری ساری تھکن دور کردی ہے۔ مجھے اجازت دیں۔''

''آپ اس طرف کیسے آنکلے......'' عورت نے متعجب ہوکر پوچھا۔ ''کیونکہ یہ جگہ ایک ویرانے میں ہے۔ یہاں قریب میں کوئی بستی بھی نہیں ہے۔''

''میں کل شام اپنے ایک ماتحت کے ساتھ اس وادی کی سیر کو نکلا تھا۔ وہ راستے میں ایک مجاہد کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ میں کیمپ کی طرف جاتے ہوئے راستہ بھول گیا۔''

''آپ کو ایک لمبا سفر طے کرنا ہے۔ آپ بغیر کھائے پیئے جائیں گے تو راستے ہی میں تھکن سے برا حال ہوجائے گا۔ میں ناشتا تیار کئے لیتی ہوں۔''

معلوم نہیں وہ کتنی دیر تک گہری نیند سوتا رہا تھا۔ اسے عورت نے بیدار کیا۔ جب وہ بیدار ہوا تو اس نے اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کیا۔ سونے کی وجہ اسے بہت فائدہ ہوا تھا۔ عورت نے دسترخوان پر ناشتا چنا ہوا تھا۔ ناشتے میں بہت کچھ تھا۔ مکھن' بالائی' پراٹھے' تلی ہوئی مرغی' آملیٹ اور انڈوں کا حلوہ' یہ ساری چیزیں اصلی گھی سے بنی ہوئی تھیں۔ اس لئے اس میں سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے خوب سیر ہوکر کھایا کیونکہ اسے لمبا سفر کرنا تھا۔

اس نے نہ چاہتے ہوئے پوچھا۔ ''اس وقت وادی کے حالات کیا ہیں۔ کیونکہ مجھے اس وادی میں آئے ہوئے تیسرا چوتھا دن ہے۔''

''وہی حال جو برسوں سے چلا آرہا ہے۔'' عورت کہنے لگی۔ ''آپ کی فوج نے ہماری وادی کے چپے چپے پر قبضہ کررکھا ہے۔''

وہ سمجھ گیا کہ یہ عورت کس لئے اس کے ساتھ اخلاق اور نرمی سے پیش آرہی ہے۔ خاطر مدارات کررہی ہے۔ اس لئے کہ اس کی فوج کی ہیبت اس کے دل پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس نے بڑے متکبرانہ انداز سے کہا۔ ''جب کبھی ہماری فوج نے اس علاقے کا محاصرہ کیا' آپ ان سے میرا نام لے دیں۔ میں آپ کو اپنا کارڈ دوں گا' وہ دکھا دیں' پھر کوئی آپ سے کچھ نہیں کہے گا۔ آپ کے ساتھ عزت کا سلوک کیا جائے گا۔''

عورت اس کی بات کی تہ میں پہنچ کر بولی۔ ''ہم مسلمان کسی کے ساتھ مہمان نوازی اس لئے نہیں کرتے کہ وہ اس کا صلہ کسی احسان کی شکل میں دے اور پھر ہم ایک ایسے شخص سے کسی احساس اور بھلائی کی توقع نہیں کرتے ہیں اور نہ خواہشمند ہوتے ہیں کہ اس کی نظر کرم ہو۔ مجھے کسی نرمی اور رعایت کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''معلوم نہیں کس لئے آپ لوگوں کو اپنی ذات پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے۔ آپ کی قوم اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتی نہیں ہے۔'' وہ شدید حیرانی سے بولا۔ ''کیا آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ہماری فوج کی تعداد کتنی ہے...... وہ کس قدر طاقتور اور مضبوط ہے۔ حریت پسند ہمیں یہاں سے نکالنے میں اب تک کامیاب نہ ہوسکے۔''

''ہم گھمنڈ اور تکبر بالکل بھی پسند نہیں کرتے ہیں کیونکہ اللہ کو یہ بات بالکل پسند نہیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہے۔ ہمیں اللہ کی ذات پر پورا بھروسا اور توکل ہوتا ہے۔ کاش! آپ نے ہماری تاریخ پڑھی ہوتی...... مسلمان کبھی ساز و سامان اور دشمن کی تعداد سے خائف نہیں ہوا۔ اس نے اپنے سے دگنی، تگنی، اور چوگنی تعداد کے دشمن کو شکست فاش دی ہے۔ آج بھی تاریخ اس کی گواہ ہے...... اس وقت اس بحث سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ صرف تلخی اور بدمزگی پیدا ہوگی۔ ہم مہمانوں کی بہت عزت اور احترام کرتے ہیں اور ان کی دل آزاری نہیں چاہتے ہیں۔ میں ایک میزبان ہونے کے ناطے یہ نہیں چاہوں گی کہ آپ دل میں ناگواری سی محسوس کریں۔ میں آپ کا لحاظ اور خاطر مدارت اس لئے اور اس خوف سے نہیں کر رہی ہوں کہ آپ ایک فوجی افسر ہیں۔ یہ کشمیری چائے پئیں، کتنی عمدہ ہے۔''

''ہاں...... یہ چائے بہت عمدہ ہے۔'' اس نے یکے بعد دیگرے دو گھونٹ لینے کے بعد تعریفی لہجے میں کہا۔ ''میں نے دارجلنگ کی چائے بھی پی ہے لیکن اس چائے کی سی بات میں نے آج تک کسی چائے میں نہیں پائی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ وادی کے پسماندہ اور دور دراز علاقے کی دیہاتی عورت اتنے اچھے عمدہ اور لذیذ کھانے پکا لیتی ہے۔ ذائقہ بھی خوب ہے۔ اصل بات ذائقے کی ہوتی ہے جو ہر عورت کے ہاتھ میں نہیں ہوتا ہے۔''

''آپ کی زبان سے تعریف سن کر مجھے اپنی محنت وصول ہوگئی ہے۔ آپ ایک فوجی ہوتے ہوئے بھی کھانے کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں۔''

''آپ لوگوں نے جو خود مختاری اور ایک آزاد مملکت کے لئے جو جنگ شروع کر رکھی ہے آپ لوگ حریت پسند تحریک کا نام دیتے ہیں۔'' اس نے موضوع بدلا۔ ''کیا یہ دہشت گردی نہیں ہے کہ اس تحریک کی آڑ میں کسی کے اشارے پر تخریبی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ آپ کیوں اور کس لئے علیحدگی پر تخریبی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ آپ کیوں اور کس لئے علیحدگی پسندی کی تحریک کو ہوا دے رہے ہیں۔ جبکہ ہمارے ملک کا اٹوٹ انگ ہے۔ ایک ریاست ہے۔ کیا اس وادی کے لوگ اپنا قیمتی وقت، زندگی اور مستقبل تباہ و برباد نہیں کر رہے ہیں۔ کیا ایک مسلمان کے لئے یہ بات شایان شان ہے اور بہادری کی ہے کہ میرے ماتحت کو چھپ کر گولی ماردی گئی۔''

''یہ سرزمین ہماری اپنی ہے۔'' عورت جو اس کی باتیں بڑے غور، ضبط اور تحمل سے سن رہی تھی، ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ہم ایک الگ قوم ہیں، ہمارا دین، ایمان آپ لوگوں سے الگ ہے۔ اگر کسی اور قوم نے آپ کے ملک پر...... کسی نے آپ کے گھر پر قبضہ کرلیا اور آپ لوگوں کو باہر نکالنے کی کوشش کی تو کیا آپ اس بات کو برداشت کر سکیں گے...... کیا آپ اسے باہر نکالنے کی کوشش نہیں کریں گے...... آپ کے ماتحت کو اس لئے گولی ماری گئی تھی کہ وہ حملہ آور تھا۔ میدان جنگ میں تھا۔ جنگ اسی طرح لڑی جاتی ہے۔ کوئی حریف سامنے آکر اپنے حریف کو نشانہ نہیں بناتا ہے۔''

وہ لاجواب ہو کر خاموش ہوگیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ایک معمولی سی عورت ایک ایسی بات کہہ دے گی کہ اس کی زبان پر مہر لگ جائے گی۔ اب اسے احساس ہوا تھا کہ یہ عورت کوئی معمولی نہیں ہے۔ اس سے جیتنا اور بحث کرنا مشکل ہے کیونکہ اس عورت کے پاس ہر بات کا مدلل جواب موجود ہے۔

اسی اثناء میں اس نے مکان کے عقبی حصے میں آہٹیں اور بہت سارے لوگوں کی آوزیں سنیں۔ وہ بلند آواز میں کلمہ پڑھ رہے تھے۔ اس نے چونک کر حیرت اور خوف سے عورت کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ملاحظہ والی نظروں سے دیکھا۔ اسے ایسا لگا تھا کہ دس بارہ مجاہدین اس مکان کے عقبی حصے میں داخل ہورہے ہیں۔ اس کے سارے بدن میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ عورت کمرے سے نکل کر دروازہ بند کر کے گئی۔ اگلے لمحے واپس آ کر اس نے کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔ پھر وہ اس سے بولی۔ ''میرے چار جوان بھائیوں کو کل شام نماز کی حالت میں دشمن نے شہید کر دیا۔ ان کے دوست اور ساتھی ان کی میتیں لے کر آئے ہیں۔ میں اپنے عظیم بھائیوں کا دیدار کر آؤں...... انہیں سلام کر آؤں...... خوش آمدید کہوں۔ کتنے عظیم ہیں میرے بھائی کہ انہیں شہادت نصیب ہوئی ہے۔ ان کی شوق شہادت کی تمنا پوری ہوئی...... اللہ کی بارگاہ میں ان کی دعائیں مستجاب ہوئیں۔ فرشتے بھی انہیں سلام کرنے اور ان کی روحوں کو لے جانے کے لئے آئے ہوں گے کیونکہ وہ اللہ کی راہ میں...... آزادی کی راہ میں شہید ہوگئے۔ انہوں نے اپنی بڑی بہن کو کیسی عزت' کیسا عظیم رتبہ اور اعزاز دیا ہے۔ آج انہوں نے مجھے سرخرو کر دیا ہے۔ ایسی عظیم سعادت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی ہے۔''

وہ بھونچکا سا ہوگیا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ یہ عورت بڑے وقار اور تمکنت سے کھڑی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا' کہیں یہ عورت صدمے سے پاگل تو نہیں ہوگئی ہے۔ نہیں یہ پاگل نہیں ہوئی تھی۔ پاگل پن کی کوئی علامت اس کے بشرے اور آنکھوں سے ظاہر نہ تھی۔ وہ تحیر زدہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کے جوان بھائیوں کو شہید کر دیا گیا' لیکن آپ کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ چہرے پر ملال تک نہیں ہے۔ کیا آپ کو ان کی موت پر کوئی صدمہ نہیں ہوا ہے۔''

''اس لئے کہ وہ مرے نہیں زندہ ہیں۔ شہید مرتے نہیں' زندہ رہتے ہیں۔ ہم انہیں مردوں میں شمار نہیں کرتے ہیں۔'' عورت نے دل دہلا دینے والے سکون سے کہا۔

''سچ پوچھئے تو میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی عظیم بہن اور عورت کے بارے میں سنا نہ دیکھا...... آپ لوگ اپنے مذہب پر کیسا پختہ ایمان رکھتے ہیں۔''

''اصل چیز یقین ہے...... یہ یقین اللہ کی ذات پر ہوتا ہے یہ یقین ہوتا ہے جس سے دشمن دہل جاتا ہے۔''

''مجھے ان کی موت سے بڑا صدمہ ہوا ہے۔ اس لئے کہ آپ کے بھائی تھے۔ میں ایک مہمان کی حیثیت سے اپنے دلی صدمے کا اظہار کر رہا ہوں۔''

''جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہوتی ہے۔'' عورت کہنے لگی۔ ''بڑے صدمات سہنے پڑتے ہیں۔ نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں۔ جنگ یقیناً بہت بری چیز ہے' لیکن اس کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ اصول ہوتے ہیں لیکن آپ لوگوں نے تمام اصولوں کو روند دیا' پامال کر دیا۔ ہلاکو اور چنگیز خان کی روحوں کو بھی شرمندہ کر دیا...... جنگ میں بڑی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ وہ ہم دے رہے ہیں' ہماری ماؤں کی گودیں خالی کی جارہی ہیں' بہنوں کے سہاگ اجاڑے جارہے ہیں' ہماری عورتوں کی عزتیں محفوظ نہیں رہی ہیں۔ نہتے نوجوانوں کو بھون دیا جاتا ہے۔ ہمارے خون سے ہماری ہی سرزمین سرخ کی جارہی ہے...... درندگی اور بربریت کی ایک نئی تاریخ مرتبہ کی جارہی ہے۔ اس کے باوجود ہم منزل کی جانب رواں دواں ہیں...... آخری سانس تک رہیں گے۔''

''مجھے اس بات سے خوف آرہا ہے کہ آپ کے بھائیوں کے ساتھیوں اور دوستوں نے مجھے ان کا قاتل سمجھ لیا تو وہ مجھے......''

''اگر آپ ان کے قاتل بھی ہوئے تو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گھبرائیں نہیں...... آپ میرے گھر میں بالکل محفوظ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مہمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ کوئی آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا...... میں آپ پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ ان میں سے کوئی جذباتی ہوا تو میں اسے گولی ماردوں گی۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ آپ لوگ اس قدر مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری فوج کبھی اس علاقے کا رخ نہیں کرے گی۔''

''یہ علاقہ ایک ایسی جگہ پر ہے کہ کسی کے خواب و خیال میں اس کی موجودگی نہیں آسکتی ہے۔ اس کے دامن میں ایک بہت بڑی آبادی بھی ہے جو دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے۔ یہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی ہے۔ غلطی سے ادھر دشمن آگیا تو وہ زندہ بچ نہیں پاتا ہے۔ بڑی بھول بھلیاں ہیں۔ اس لئے ہمیں فوج سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ نہ ہی کسی سفارش کی ضرورت ہے۔ ہم دشمن سے کبھی زندگی کی بھیک نہیں مانگتے ہیں۔ صرف ایک ایسا راستہ تھا جس سے آپ اس علاقے سے نکل کر شمال کی طرف جاسکتے ہیں۔ شمال میں آپ کے دو کیمپ تھے۔ رات انہیں مجاہدین نے اڑا دیا۔''

''مجھے جلدی سے یہاں سے نکال دیجئے...... کہیں ایسا نہ ہو کہ اندر سے کوئی آجائے۔ مجھے دیکھ کر بھون کر رکھ دے۔'' وہ دہشت زدہ ہو کر بولا۔

''آپ میرے گھر اور میرے علاقے میں بالکل محفوظ ہیں۔ جب میں آپ کو اپنے گھر اور علاقے میں زندگی کی ضمانت دے رہی ہوں تو آپ خوفزدہ کیوں ہو رہے ہیں۔ اس علاقے میں ایک جوان لڑکے کو اس کے کسی دوست نے ی بات پر طیش میں آکر قتل کر دیا تھا۔ پھر اس نے اس لڑکے کے ہی گھر پناہ لے لی۔ بیس برس

اندازِ فکر

ایک چوہیا اپنے تین ننھے منے بچوں کے ساتھ شام کی سیر کو نکلی کہ ایک بلی سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس سے پہلے کہ بلی ان کی طرف جھپٹتی، چوہیا اپنی پوری طاقت سے چلائی۔

''بھوں بھوں...... بھوں بھاؤں۔''

بلی ہکابکا رہ گئی اور اپنے قدموں واپس دوڑ گئی۔

چوہیا نے اپنے بچوں سے کہا۔

''اب تم جان گئے ہوگے کہ اپنی مادری زبان سیکھنے کے علاوہ بھی کوئی اور زبان سیکھنا کتنا ضروری ہے۔''

خوبصورت باتیں

☆ جس طرح موسم بدلنے کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے اسی طرح کے وقت کے بدلنے کا بھی ایک موسم ہوتا ہے حالات بدلتے ہی رہتے ہیں۔ حالات کے ساتھ حالت بھی بدل جاتی ہے۔ رات آجائے تو نیند بھی کہیں سے آہی جاتی ہے۔ وہ انسان کامیاب ہوتا ہے جس نے ابتلاء کی تاریکیوں میں امید کا چراغ روشن رکھا۔ اور اُمید اس خوشی کا نام ہے جس کے انتظار میں غم کے ایام بھی کٹ جاتے ہیں' امید کسی واقعہ کا نام نہیں ہے۔ یہ تو صرف مزاج کی ایک حالت ہے۔ قدرت کے مہربان ہونے پر یقین کا نام اُمید ہے۔

☆ انسان پریشان اس وقت ہوتا ہے' جب اس کے دل میں کسی بڑے مقصد کے حصول کی خواہش ہو لیکن اس کے مطابق صلاحیت نہ ہو۔ سکون کے لیے ضروری ہے کہ یا تو خواہش کم کی جائے یا پھر صلاحیت بڑھائی جائے۔ ہر خواہش کے حصول کے لیے ایک عمل ہے۔ عمل نہ ہو تو خواہش ایک خواب ہے۔ ہم جیسی عاقبت چاہتے ہیں' ہمیں ویسا ہی عمل کرنا چاہیے۔ کامیابی تو ہے ہی محنت کرنے والوں کے لیے۔

 DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تک وہ اس گھر میں بالکل محفوظ رہا۔ وہ طبعی موت اسی گھر میں مرا۔ لہٰذا آپ کو پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔''

''اچھا تو پھر آپ مجھے اجازت دیں۔'' اس نے اپنی بندوق اور بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو اپنے بھائیوں کی آخری رسومات بھی تو ادا کرنا ہیں۔''

''چند لمحے صبر کیجیے......'' وہ بولی۔ ''میں چادر اوڑھ کر آتی ہوں تاکہ آپ کو وہ راستہ دکھلا دوں جو شمال کی طرف جاتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ بھول بھلیوں میں پھنس جائیں۔ پھر کوئی حریت پسند آپ کو نشانہ بنا دے...... پھر آپ کی لاش پڑی سڑتی رہے گی۔''

وہ اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آئی تو اس نے اپنے آپ کو کالی چادر میں چھپایا ہوا تھا لیکن چہرہ بے نقاب تھا۔ وہ اسے لے کر مکان سے باہر نکلی۔ اس نے عورت کے چہرے کی طرف دیکھا۔ شاید وہ اپنے بھائیوں کے جس صدمے کو دل میں دبائے ہوئے ہے' چہرے سے عیاں ہو جائے۔ آنکھوں سے جھلک جائے لیکن ایسی کوئی بات اس کے بشرے سے ظاہر نہیں تھی۔ البتہ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی دمک تھی۔ آنکھوں میں چمک سی تھی' جیسے اس نے بہت کچھ پالیا ہو...... اس کے دل میں شک کی لہر اٹھی۔ اس عورت نے جھوٹ بولا ہے کہ وہ چاروں لڑکے اس کے بھائی ہیں۔ یہ عورت ہرگز ان کی سگی بہن نہیں ہے۔ وہ سگی بہن ہوتی تو صدمے سے نڈھال ہو جاتی۔ ان کی موت کا ماتم کرتی۔ اسے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتی۔

عورت اسے مکان سے باہر لے کر نکلی۔

عورت اس کے آگے آگے چلی جا رہی تھی۔ اس کی چال میں بڑی تمکنت تھی۔ وقار تھا۔ اس نے چلتے چلتے کئی بار مڑ مڑ کے دیکھا تھا کہ کہیں کوئی اس کے تعاقب میں تو نہیں آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی چال تو نہیں چلی جا رہی ہے۔ ایسی بات نہ تھی۔

وہ عورت ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک پہاڑی پر رک گئی۔ پھر وہ اسے اشارہ سے بتانے لگی۔ ''میرا علاقہ یہاں سے ایک فرلانگ پیچھے رہ گیا ہے۔ اب ہم دوسرے علاقے میں کھڑے ہیں۔ اب تم نہ میرے مہمان ہو اور نہ میں تمہاری میزبان...... تم اس وقت صرف اور ایک فوجی اور دشمن ہو...... میرے بھائیوں کے قاتل ہو۔''

''یہ بات آپ اتنے وثوق اور یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں کہ میں آپ کے بھائیوں کا قاتل ہوں۔ انہیں کسی اور فوجی نے گولی ماری ہوگی۔''

''جس وقت تم بے ہوشی کی حالت میں تھے میں نے تمہاری رائفل اور گولیاں چیک کی تھیں۔ میرے شہید بھائیوں کے جسموں سے تمہاری رائفل کی گولیاں نکلی ہیں۔''

اس نے اپنا بایاں ہاتھ چادر سے باہر نکالا۔ اس کی مٹھی میں رائفل کی گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ باہر نکالا تو اس میں ایک ریوالور تھا۔ وہ سرد سفاک لہجے میں بولی۔ ''اگر تم میرے جوان بھائیوں کو نماز کی حالت میں شہید نہ کرتے تو شاید میں تمہیں معاف کر دیتی کہ جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہے...... لیکن تم نے بزدلی کا ثبوت دیا جو ایک فوجی کے شایانِ شان نہیں۔ میرے اس ریوالور میں صرف چار گولیاں ہیں۔ یوں تو تمہارے لئے ایک گولی کافی ہے لیکن میں تمہیں ہر ایک بھائی کا نام لے کر گولی ماروں گی تاکہ اپنے ایک ایک بھائی کا انتقام لے سکوں۔''

پھر اس کا ریوالور شعلے اگلنے لگا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

پلٹ آیا۔ کیا مجال جو ڈھنگ سے بات کرے 'جنگلی' وہ
زانی اور اس دن مسز انصاری کے اصرار کے باوجود وہ
رکی۔ اس میں ان شوخ آنکھوں کا سامنا کرنے کی ہمت
ہر لمحے اس کا تمسخر اڑاتی تھیں۔ دوسرے دن جب وہاں
کئی دنوں بعد آج پھر اس کے قدم اکھڑنے لگے۔ اسے وہ دن
پہلی دفعہ وہ یہاں آئی تھی عجیب سا احساس اس پر
حسن کا سامنا وہ کیسے کرے گی۔

پتھر کے صنم

کامران جاذب

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

پتھر کی خوب صورت روش پر چلتے ہوئے اس کے قدم جیسے لڑکھڑانے لگے۔ اس نے گھبرا کر دل میں دعا مانگی۔ وہ مکینوں کی امارت سے مرعوب ہوگئی تھی سرخ پتھروں سے بنی سبز بیلوں سے ڈھکی خوب صورت کوٹھی وسیع لان' سلیقے اور نفاست سے بنی کیاریوں میں رنگ برنگے پھول مکینوں کے ذوق کے ترجمان تھے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ پورچ تک پہنچ گئی اور آہستہ سے گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔

عجیب سا خوف اس کی رگ رگ میں بسا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تھا۔ یونہی گھبرائی گھبرائی وہ لان میں گھورنے لگی۔ وہ پہلی دفعہ انٹرویو کے لیے آئی تھی۔ پاپا کی وفات اور ماں کی بیماری کے بعد گھر کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر آن گرا تھا۔ اس نے بہت جگہ درخواستیں بھیجی تھیں اور آج صبح اخبار میں بچوں کے لئے ٹیوٹر کا اشتہار پڑھ کر وہ چلی آئی۔ ٹیلی فون پر اسے چار بجے بلایا گیا تھا۔

''فرمایئے۔''

اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک نوجوان اس سے مخاطب تھا۔ دروازے سے ٹیک لگائے ہاتھ میں سگریٹ تھامے وہ بڑی شوخی سے مسکرا رہا تھا۔

''جی...... جی میں زیبا شاہ ہوں۔'' کوشش کے باوجود وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو نہ پا سکی۔

''ارے۔'' وہ ہنس دیا۔ ''آپ زیبا شاہ ہوں یا شبنم شاہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا یہ بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

وہ اور زیادہ گھبرا گئی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو عجیب شرارت چہرے پر لیے وہ اسے گھور رہا تھا۔

''جی میرا مطلب ہے! جی۔ وہ جی۔'' پریشانی میں بات اس کے منہ سے نہ نکل رہی تھی۔ وہ پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''اجی گھبرایئے نہیں محترمہ میں تو آپ کی ہر خدمت بجا لانے کو تیار ہوں۔'' اب گھبراہٹ سے زیادہ اسے غصہ آیا۔ عجیب آدمی ہے جنگلی قسم کا تمیز تو جیسے چھو کر نہ گئی ہو۔

''جناب شاید آپ نے ایک ٹیوٹر کے لیے اشتہار دیا تھا میں اس کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔'' وہ غصے سے بولی۔

''آہا۔ تو آپ یوں تشریف لائی ہیں۔ معاف کیجیے دراصل آپ کے چہرے پر عینک نہیں تھی، ماتھے پر تیوری غائب اس لیے پہچاننے میں غلطی ہوئی۔''

''دیکھیے آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''ارے۔ ارے غصہ جانے دیجیے۔ دیکھیے نا آپ نے آتے ہی زیبا شاہ کی بجائے ٹیوٹر کہا ہوتا تو غصہ آنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ تشریف لے آیئے۔'' وہ دروازے سے ہٹتے ہوئے بولا۔

اسے اس کی ناشائستگی پر غصہ تو سخت آیا۔ ایک لمحے کو تو اس کا دل چاہا واپس لوٹ جائے لیکن پھر سوچنے لگی۔ بھلا یہ جنگلی انسان یوں آرام سے اسے واپس لوٹ جانے دے گا اور یہی سوچ کر وہ چپ چاپ اسے کے پیچھے چلتی گئی۔

''تشریف رکھیے محترمہ ٹیوٹر صاحبہ۔'' وہ صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

زیبا نے ایک لمحہ اس کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور پھر چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آپ انٹرویو کے لیے تیار ہو جایئے میں ابھی حاضر ہوا۔'' یہ کہہ کر جھٹ سے دروازے کے باہر غائب ہو گیا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ بڑھ کر اس بدتمیزی آدمی کا منہ نوچ لے اور کہے 'تمہارے حاضر ہونے کی ضرورت نہیں' لیکن پیچ و تاب کھا کے رہ گئی۔ سر جھکائے بیٹھی وہ ناخن سے نیل پالش کھرچتی رہی۔ خیال بٹانے کو اس نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سرخ پردوں اور سرخ ایرانی قالین سے سجا کمرہ زرو مال کا پتا بتاتا تھا۔ سجاوٹ ذوق کی ترجمانی کر رہی تھی۔

آہٹ پر وہ چونکی۔ وہ پھر موجود تھا۔

''کیوں محترمہ آپ تو ابھی تک گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔''

''جی۔ جی ہاں۔ جی نہیں۔'' وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو نہ پا سکی۔

وہ ہنس دیا۔ بڑی بڑی شوخ آنکھیں جیسے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس ... مرا رہی تھیں۔ غصہ اور گھبراہٹ سے
... رنگ سرخ ہو گیا۔
''بیگم انصاری کدھر ہیں۔ میں ان سے
ملوں گی۔'' وہ تلخی سے بولی
''وہ ابھی آیا ہی چاہتی ہیں۔ اتنی دیر
میں اپنا تعارف کرائے دیتا ہوں۔ مجھے حسن
کہتے ہیں اور میں ہوں آپ کا شاگرد۔''
''جی!'' زیبا کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت
سے پھیل گئیں۔
''دیکھیے صاحب مجھے اجازت دیجیے۔
آپ سنکی انسان ہیں آپ بھی۔'' اس کی سمجھ
میں نہ آ رہا تھا وہ کیا کہے اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
''ارے! ارے بات تو سنیے نا۔'' وہ عجلت
میں بولا۔
لیکن وہ تو جیسے رو دینے کو تھی۔
''دیکھیے اطمینان سے سنیے۔ کیا آپ ٹیوٹر
کی ضرورت کا اشتہار پڑھ کر نہیں آئیں۔'' وہ
دونوں ہاتھ کمر پر باندھے ہوئے بڑے آرام
سے بولا۔
اس نے بے چارگی سے سر ہلا دیا۔ ''لیکن
اس میں تو دو بچوں کے لیے لکھا تھا۔''
''جی ہاں تو ایک میں ہوں نا۔'' وہ بڑے
پرسکون لہجے میں بولا۔
''اف خدایا۔'' وہ سر پکڑ کر رہ گئی۔
''بھئی دیکھیے۔ ماں باپ کے لیے تو اولاد
سدا بچہ ہی رہتی ہے ابھی ابھی پچھلے سال تک
میری امی بڑے پیار سے میرا سر چومتے ہوئے
جب کہتی تھیں۔ میرا بچہ! تو میں خوشی سے جھوم
جاتا تھا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈالتے ہوئے بولا۔
زیبا کا دماغ جیسے چکرا رہا تھا۔ یہ بیٹھے
بٹھائے وہ کس مصیبت میں پھنس گئی اسی لمحے گھنٹی
بجی۔
''لیجیے شاید بیگم صاحبہ آگئیں۔'' اور وہ
جھٹ کمرے سے غائب ہو گیا تب اس کی جان
میں جان آئی۔
گھٹا ہوا سانس آہستہ آہستہ جیسے چلنے لگا اور
ابھی اس نے اپنی گھبراہٹ پر پوری طرح قابو
بھی نہ پایا تھا کہ ایک خوب صورت نوعمر خاتون
اندر آئیں ان کے ساتھ دو پیارے سے بچے
تھے۔
''ارے معاف کیجیے گا۔ مجھے دیر ہو گئی کیا
بہت انتظار کرنا پڑا آپ کو۔'' انہیں شاید اس کی
گھبرائی ہوئی شکل دیکھ کر احساس ہوا اور اس کا
دل چاہا وہ ان صاحب کی پوری واردات ان
کے گوش گزار کر دے لیکن اتنی ہمت وہ بھلا کہاں
سے لاتی۔
وہ چپ رہی تو وہ پھر بولیں۔ ''میں ایک
دفعہ پھر آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ میں ایک
بہت ضروری کام سے گئی تھی میرا خیال تھا میں
ٹھیک چار بجے واپس پہنچ جاؤں گی۔'' بات
کرتے کرتے انہوں نے کلائی پر لگی گھڑی
دیکھی۔
''ارے کچھ زیادہ لیٹ بھی نہیں ہوئی۔
ابھی تو سوا چار بجے ہیں۔'' انہوں نے ہنس کر
کہا۔
تو وہ بھیگی بھیگی سی مسکراہٹ لبوں پر لے
آئی۔ ''جی۔ جی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔'' وہ
انہیں کیا بتاتی یہ پندرہ منٹ اس نے کس مصیبت
میں کاٹے تھے۔
''جی! وہ آپ کے شوہر۔''
اور وہ اس کی بات کاٹ کر ہنس دیں۔
''میرے شوہر تو اسلام آباد گئے ہوئے
ہیں۔ آپ کی ملاقات میرے دیور سے ہوئی
ہوگی۔ تنگ تو نہیں کیا اس نے آپ کو۔''
''جی نہیں۔'' وہ دانت پیستے ہوئے زیر
لب بولی۔
نوکر چائے لے آیا اور اس دوران زیبا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نے مسز انصاری سے تفصیلاً بات کرلی۔ انہوں نے اسے روزانہ شام چار بجے آنے کو کہا' تھوڑی دیر بیٹھی وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ بے حد خوش اخلاق تھیں ان کی باتوں نے اس کا غصہ بھی یوں اڑا دیا تھا کہ جاتے ہوئے اس جنگلی کا تصور تک اس کے ذہن سے غائب تھا۔

دوسرے روز جب وہ ٹھیک چار بجے وہاں پہنچی تو بچے لان میں اس کا انتظار کررہے تھے۔

''ہیلو زیبا آنٹی۔'' لکی نے بھاگتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

''لکی۔ ممی کہتی ہیں بڑوں کا نام نہیں لیتے۔'' چوچو نے اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے نصیحت کی' اس دن نہ چاہتے ہوئے بھی ہر آہٹ پر وہ چونک جاتی اور تب باتوں باتوں میں اسے پتا چلا وہ واپس جاچکا تھا۔

بچے جلد ہی اس سے مانوس ہوگئے۔ ٹھیک چار بجے وہاں پہنچ جانا اس کا معمول بن چکا تھا وہ تقریباً ایک گھنٹہ بچوں کو پڑھاتی۔ اس کے بعد مسز انصاری سے حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوتا' اکثر وہ اسے چائے کے لیے روک لیتیں اور کبھی کبھار ان کا ڈرائیور اسے گھر پہنچا جاتا۔

امی خوش تھیں کہ چلو اسی بہانے اس کا دل بہل گیا ہے اور خود وہ بھی کسی حد تک مطمئن تھی انصاری صاحب سے ابھی تک نہ ملی تھی ان کے متعلق بیگم انصاری نے بتایا تھا کہ وہ تقریباً ایک ہفتہ اور اسلام آباد رہیں گے۔

وقت اچھا کٹنے لگا تھا۔ مسز انصاری اس کے لیے بڑی اچھی دوست ثابت ہوئیں اور بچے اچھے ساتھی۔

پھر ایک دن جب لکی اور چوچو اس سے ٹیوشن پڑھ رہے تھے ہارن کی تیز آواز پر دونوں بڑبڑا اٹھے۔

''حسن چچو۔'' اور وہ دونوں اٹھ بھاگے۔

اس نے بھی گردن موڑ کر دیکھا۔ گہرے نیلے رنگ کی قمیض اور کالی پتلون میں وہ بڑا وجیہہ لگ رہا تھا۔

''آداب ٹیوٹر۔'' وہ ذرا سا جھک کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''شاگرد حاضر ہے!'' اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اندر چلا گیا۔

غصہ پھر سے پلٹ آیا۔ کیا مجال جو ڈھنگ سے بات کرے 'جنگلی' وہ زیر لب بڑبڑائی اور اس دن مسز انصاری کے اصرار کے باوجود وہ چائے کے لیے نہ رکی۔ اس میں ان شوخ آنکھوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی جو ہر لمحے اس کا تمسخر اڑاتی تھیں۔ دوسرے دن جب وہاں پہنچی تو کئی دنوں بعد آج پھر اس کے قدم اکھڑنے لگے۔ اسے وہ دن یاد آیا جب پہلی دفعہ وہ یہاں آئی تھی عجیب سا احساس اس پر حاوی تھا۔ حسن کا سامنا وہ کیسے کرے گی۔ لکی نے کل ہی بتا دیا تھا آنٹی چچو اس دفعہ ڈھیر ساری چھٹیاں لے کر آئے ہیں۔ ڈیڈی کے آنے کے بعد جائیں گے۔

خلاف توقع بچے لان میں بیٹھے اس کا انتظار کررہے تھے۔ وہ آرام سے بیٹھی ان کو پڑھاتی رہی لیکن ہر آہٹ پر اس کا دل دھڑک اٹھتا اور پھر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا وہ واپسی کے لیے اٹھی تو مسز انصاری نے اسے روک دیا۔

''زیبی تم چائے پی کر جاؤ گی۔'' اور وہ انکار نہ کرسکی۔

چائے وہیں آگئی تو انہوں نے نوکر کو حسن صاحب کے بلانے کے لیے کہا۔

''تمہیں اپنے دیور اور ان کے چچو سے ملاؤں!'' انہوں نے بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

آہستہ آہستہ قریب ہوتی ہوئی سیٹی کی آواز پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ سفید کرتا پاجامہ پہنے وہ بڑی شوخ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

من میں سیٹی بجاتا چلا آ رہا تھا۔ آنکھوں میں
وہی شوخی۔ ایک لمحے کو اس نے دل ہی دل میں
اس کی خوب صورتی کا اقرار کیا لیکن دوسرے ہی
لمحے غصے سے گردن جھٹک دی۔
''حسن یہ ہیں زیبا شاہ! میری اور بچوں کی
دوست۔'' مسز انصاری اس کا تعارف کرا رہی
تھیں۔
''بھابھی یہ زیبا شاہ ہوں یا شبنم شاہ مجھے
اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' اس نے اس دن کی
بات پھر کہہ دی۔ ضبط کے باوجود ہلکی سی
مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔
''اور زیبی۔ یہ میرے چہیتے لیکن بے حد
شریر اور نٹ کھٹ دیور حسن انصاری ہیں۔'' مسز
انصاری ہنستے ہوئے بولیں۔
''السلام علیکم۔'' وہ بڑے مہذب لہجے میں
ہاتھ ماتھے تک لے جا کر بولا۔ ایک لمحے کو زیبی کا
دل اچھلا دوسرے ہی لمحے وہ کرسی گھسیٹتے جھکا اور
دھیرے سے بولا۔ ''کیا حال ہے ٹیوٹر۔''
اس کا دل چاہا اس کمینے انسان کے منہ پر
تھپڑ دے مارے لیکن وہ زہر بھری آنکھوں سے
اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اور وہ ڈھٹائی سے
مسکراتا رہا۔ چائے زہر مار کر کے وہ اٹھ کھڑی
ہوئی۔
''میں آپ کو چھوڑ آؤں ٹیوٹر۔'' اس نے
زیر لب کہا۔
''جی نہیں شکریہ۔'' وہ تیزی سے بولی۔ تو
اس نے جھٹ کٹی کو گود میں اٹھا لیا اور اس کا ہاتھ
اپنی گال پر لگاتے ہوئے بولا۔
''توبہ توبہ کٹی جان یہاں تو بڑے زور کی
آندھی چل رہی ہے۔''
مسز انصاری کو خدا حافظ کہے بغیر وہ تیز تیز
قدموں سے چلی آئی۔ اس کی حالت کچھ عجیب سی
ہو رہی تھی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کرے۔ ایک
دل چاہتا اس ہار کو اتار پھینکے لیکن پھر اسے امی کا

خیال آتا۔ وہ کیا کہیں گی اور مسز انصاری۔
دوسرے دن نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تیار ہو گئی
اس کی مضمحل اور پریشان صورت دیکھ کر امی گھبرا
گئیں۔
''کیا ہوا؟۔''
وہ آنکھوں میں آنسو لیے اسے پیار کرنے
لگیں۔
''کچھ نہیں امی۔'' وہ جاتے ہوئے بولی۔
بس سے اتر کر وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔
گیٹ پر حسن کو کھڑے دیکھ کر اس کے قدم
ڈگمگا گئے تھے۔
''ہیلو ٹیوٹر۔'' وہ خوش دلی سے مسکرایا۔
''کیا ہوا۔ بڑی اداس اداس لگ رہی ہیں۔''
''ٹیوٹر...... ٹیوٹر۔'' اس کے ذہن میں جیسے
طوفان آ گیا۔ ''ہر لمحہ ٹیوٹر...... ٹیوٹر شٹ اپ۔''
وہ چیخی۔ خود اپنی آواز اسے اجنبی لگی۔ اس کی
آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔
''حسن صاحب آپ کو کیا حق ہے میری
مجبوریوں کا مذاق اڑانے کا۔ آپ کو کیا معلوم
مجھے کن مجبوریوں نے آپ کی تضحیک کا نشانہ بنایا
ہے۔'' گرم گرم آنسو اس کی خوب صورت
آنکھوں سے ابلنے لگے۔
اور پھر جیسے شوخ دیے بجھ گئے۔ ایک لمحے
کو وہ ساکت رہ گیا۔
''ارے۔ مس زیبا شاہ۔ اگر میری باتوں
سے آپ کو تکلیف۔''
لیکن آنکھوں پہ ہاتھ رکھے وہ تو جیسے
بھاگ رہی تھی۔
''سنیے تو!'' وہ کہتا رہا۔
جانے کیسے وہ گھر پہنچی۔ اس کے ذہن میں
تو بس ٹیوٹر ٹیوٹر تھا۔ عجیب بے کسی تھی۔ اس کا بس
نہ چلتا تھا کہ وہ آنسو روکے۔ ذہن چکراتا ہوا
محسوس ہوتا تھا اور اسے یوں لگا جیسے وہ پاگل
ہو جائے گی اتنی بے عزتی، اتنی توہین۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

امی اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔
''زیبی میں نے تجھے منع بھی کیا تھا طبیعت بہت خراب ہے کیا۔'' امی سخت فکر مند تھیں۔
''جی امی اس لیے میں راستے ہی سے واپس آ گئی ہوں۔'' وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔
بستر پر لیٹ کر وہ تکیے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ''اللہ میاں۔ تو نے یہ کیسا دن دکھایا ہے۔ پاپا اگر آج زندہ ہوتے تو وہ بھلا کا ہے کو ایسی توہین برداشت کرتی۔''
امی گرم گرم چائے لے آئیں۔ اکلوتی بیٹی بیوہ کا سہارا۔ وہ تو اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو اٹھتی تھیں۔ امی اس کا سر سہلاتی رہیں اور وہ چپ چاپ آنکھیں بند کیے تانے بانے سلجھاتی رہی۔
ہارن کی آواز پر امی باہر گئیں۔ ''جانے کون آیا ہے۔'' وہ چپ چاپ پڑی رہی۔
''زیبی مسز انصاری نے تجھے لینے کسی کو بھیجا ہے۔''
''امی اسے کہہ دیجیے میں نہیں جا سکتی۔'' وہ بولی۔
اور جانے کیوں امی کے پیچھے پیچھے وہ بھی چلی آئی۔ دور سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ امی بتا رہی تھیں کہ وہ گئی تو تھی لیکن راستے ہی سے واپس آ گئی۔ طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔
''جی کیا بہت زیادہ خراب ہے ان کی طبیعت۔'' لہجے میں تاسف تھا زیبا کا دل اچھلا۔ حسن کی آواز اس نے پہچان لی تھی۔ ''ہونہہ کمینہ ذلیل۔'' غصہ پلٹ آیا۔
''میرے لائق کوئی خدمت۔''
وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔ اب امی کہیں اسے ڈاکٹر بلانے کو ہی نہ کہہ دیں لیکن اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ واپس جانے کو کہہ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سے شوخی غائب تھی۔ کار میں بیٹھتے ہوئے ایک لمحے کو اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر چل دیا۔
اگلے روز صبح ہی مسز انصاری آ گئیں۔ رات بھر میں اس کی طبیعت کافی سنبھل گئی تھی۔ لیکن سوجی سوجی آنکھوں اور چہرے پر پھیلی زردی سے وہ کافی کمزور لگ رہی تھی۔
''زیب۔'' انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔
''میں تو کل سخت پریشان ہوئی' ڈرائیور بھی نہیں تھا اور حسن کو جب دوبارہ چلنے کو کہا تو وہ مانا ہی نہیں ورنہ میں کل ہی آتی اور پھر حسن نے واپسی کا پروگرام بنا لیا خدا معلوم اسے ہوا کیا ورنہ اس کا ارادہ تو ابھی چند روز رہنے کا تھا۔''
مسز انصاری ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئیں لیکن اس کے اندر تو غبار سا تھا۔ عجیب بے چینی اور بے کلی۔ وہ کھوئی کھوئی سی ان سے باتیں کرتی رہی۔ کتنی شفقت تھی ان کی باتوں میں۔
امی کو ایک دم اطمینان سا ہوا اور اس دن مسز انصاری کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ بچوں کو پڑھانے چلی گئی۔ اسے اطمینان تھا وہ جا چکا تھا وہ جو قدم قدم پر اس کی تضحیک کرتا۔ اسے اس کی مجبوری کا احساس دلاتا تھا۔
چند دنوں بعد جب انصاری صاحب واپس لوٹے تو اس نے محسوس کیا دونوں بھائیوں میں کس قدر مشابہت ہے لیکن عادتوں میں کتنا تضاد تھا۔ وہ جتنا شوخ اور چلبلا تھا انصاری صاحب اتنے ہی کم گو اور سنجیدہ تھے۔ مسز انصاری نے جب انہیں اس کے حالات بتائے تو انہوں نے نہایت شفیق لہجے میں اپنائیت اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ ''مسز انصاری اگر اسے ایک دوست بن کر ملیں تو انصاری صاحب میں اسے بڑے بھائی کا عکس ملا اگر اس جنگلی سے اس کی ملاقات نہ ہوتی تو یہ لوگ کس قدر اچھے تھے ایک دم مہذب اور شریف۔'' وہ جھنجلا کر سوچتی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہاں وہ پھر بھی اس کے سر پر سوار رہا۔ وہ [illegible] والی شوخ آنکھیں جیسے اسے گھورنے [illegible] اس کے بعد تقریباً ایک مہینہ حسن نہیں [illegible] انصاری اکثر اس کا ذکر چھیڑ دیتیں اور [illegible] سخت ناراض تھے مسز انصاری سے [illegible] جہلم میں کسی بینک کا منیجر تھا اور انصاری صاحب کا اکلوتا بھائی۔

"اف زیبا۔ تم سوچ نہیں سکتیں وہ کس قدر [illegible] ایک دم چلبلا کئی دفعہ تو انصاری صاحب [illegible] باتوں سے عاجز آجاتے ہیں لیکن زیبی [illegible] اچھا ہے اور یہ بچے تو جیسے اس کے [illegible] ہیں۔" مسز انصاری کہے جا رہی تھیں اور وہ [illegible] کیا کیا سوچ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ [illegible] اگل دے' اس نے اسے کتنا شرمندہ کیا [illegible] شریف آدمیوں والی حرکت تھی۔ چلو [illegible] بھی دیتی۔ تو اس کا متواتر ٹیوٹر ٹیوٹر [illegible] اسے توہین کا احساس دلاتا تھا اور وہ پھر بھی تو نہ کہہ سکی لیکن اندر ہی اندر سلگتی رہی مسز انصاری اس کی شرارتوں کے بے شمار قصے مزے لے لے کر سناتی رہیں لیکن وہ کسی پر بھی مسکرا نہ [illegible]

ایک دن جب وہ بچوں کو پڑھا رہی تھی تو [illegible] کرتے کرتے گلکی کو جانے کیا خیال آیا۔ "[illegible] ہم کو فون کریں اتوار کو میری سالگرہ ہے [illegible] نہیں ڈھیر ساری چھٹیاں لے کر [illegible] ہیں۔"

اور اسے گلکی پر بے اختیار پیار آیا۔ جانے [illegible]

دوسرے دن مسز انصاری بتا رہی تھیں کہ [illegible] بہت معذرت کی کہ کام کی زیادتی کی [illegible] نہیں آسکتا۔ ایک لمحے کو زیبا شاہ کہیں [illegible] دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے [illegible] نئے جذبے کو مسل دیا۔ اتنی توہین [illegible] ایک دم کمینہ پن۔

"لیکن تمہیں پتا ہے۔ گلکی بھلا ماننے والی ہے وہ کہاں اپنے چچو کے بغیر کیک کاٹے گی۔ اس نے فون پر ہی باقاعدہ رونا شروع کر دیا اور اس کی بات اس کا چچو ٹال جائے' ناممکن اس نے وعدہ لے کر ہی چھوڑا۔" مسز انصاری گلکی کے گلابی گالوں سے کھیلتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

اسے ایک دفعہ پھر اپنا سانس گھٹتا ہوا سا محسوس ہوا۔

"پتا نہیں یہ حسن کو کیا ہو گیا ہے ایسا تو وہ کبھی نہ تھا۔ زیبی وہ یہاں سے جانے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ ابھی چھٹی گزار کے گیا ابھی پھر اداس ہو گیا۔ بس بچوں میں بچہ بنا رہتا ہے۔"

مسز انصاری کی آواز اسے دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی ایک نئے احساس نے پھر سر اٹھایا۔ "کہیں وہ اس دن کی بات سے تو......" دوسرے ہی لمحے وہ اپنا خیال جھٹک کر پھر گلکی کی سالگرہ کی باتیں کرنے لگی۔

"زیبی آنٹی آپ صبح ہی صبح آجائیں۔" وہ اٹھتی تو گلکی اس سے لپٹ گئی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ زیبا تم صبح ہی چلی آنا۔" مسز انصاری نے بڑے پیار سے کہا۔

"ارے نہیں آپا۔ میں شاید نہ آسکوں۔" اس میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔

"کیوں۔" مسز انصاری ایک دم حیران ہو گئیں۔

"کچھ مصروفیت ہے۔ ورنہ میں ضرور آتی۔" وہ نظریں بچاتی ہوئی بولی۔

"گلکی کی سالگرہ سے بھی زیادہ۔" مسز انصاری اب زیبا کی دوست بن چکی تھیں اور پھر اس کے لاکھ انکار کے باوجود وہ نہ مانیں۔

"بس اب کچھ نہ بولنا۔ میں ٹھیک ساڑھے تین بجے کار بھیج دوں گی۔"

"نہیں' پلیز آپا۔ بہت بہت شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں میں خود ہی آجاؤں گی۔" وہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گھبرا گئی۔
دوسرے روز وہ ابھی تیار بھی نہ ہوئی تھی کہ کار آ گئی اور پھر عجلت میں اسے تیار ہونا پڑا زرد ساڑی اور بڑے سے خوب صورت جوڑے میں لگی زرد کلیوں نے اس کے چہرے پر عجیب اداسی بکھیر دی تھی۔ اس نے تحفہ سنبھالا اور چل دی۔
اور جب وہ ہال میں داخل ہوئی تو بہت سے مہمان آ چکے تھے دروازے کے قریب ہی اسے مسز انصاری مل گئیں۔
''آپ کو اور بھائی جان کو گگی کی سالگرہ مبارک ہو آپا۔'' اس نے جان بوجھ کر پاس کھڑے حسن کو نظر انداز کر دیا اور جب وہ گگی کو تحفہ دے کر آگے بڑھی تو اس نے دیکھا گہرے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس وہ اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
''السلام علیکم۔'' حسن نے بڑی آہستگی سے کہا۔
اس نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی شوخی غائب تھی۔ ترچھی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئی۔ اور پھر کتنی ہی دیر اسے اپنے آپ پر غصہ آتا رہا۔ آخر اسے سلام کا جواب تو دینا چاہیے تھا اور تبھی اس نے سنا وہ گگی سے کہہ رہا تھا۔
''بیٹے' لوگ بہت ناراض ہیں۔''
سب مہمان آ چکے تو گگی کیک کاٹنے لگی۔ حسن اسے گود میں لیے درمیان میں کھڑا تھا اور اس کے دائیں بائیں انصاری صاحب اور بیگم انصاری تھے۔
حسن گگی کو گود میں لیے دالان میں آیا۔ ایک لمحے کو ادھر ادھر دیکھا۔ ''بھئی چوچو کدھر ہے۔ ٹھہریے میں اسے بلا کے لاتا ہوں۔'' وہ بچوں کی طرف گیا۔ اور پھر اس نے گگی کے کان میں جانے کیا کہا چند لمحوں بعد وہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی۔
''آنٹی آپ ہمارے پاس چلیے نا۔'' وہ اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے ضد کرنے لگی۔ اس سے انکار کرتے نہ بنی۔ وہ اٹھی اور چپ چاپ مسز انصاری کے قریب کھڑی ہوگئی اور انہوں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
اسی لمحے حسن نے گگی کو گود میں اٹھاتے ہوئے اس کے گلابی رخسار چوم لیے اور زیر لب بولا۔
''میری ننھی لوگوں کو ہم سے ذرا پیار نہیں۔'' اور گردن کو ذرا سا خم دیتے ہوئے آنکھوں کے کونوں سے زیبا کی خوب صورت سہمی سہمی آنکھوں میں دیکھا۔
''اللہ! کسی نے سن لیا تو انصاری صاحب کیا سمجھیں گے۔'' بے عزتی کے خوف سے آنسو اس کی آنکھوں میں جھلملا اٹھے۔
واپسی پر کافی دیر ہوگئی اور جب اس نے مسز انصاری سے اجازت چاہی تو وہ بولیں۔
''ڈرائیور کو آ لینے دو۔ تمہیں چھوڑ آئے گا۔''
اور ان کے اصرار کے باوجود وہ نہ مانی اور چلی آئی۔ پورچ میں اس نے دیکھا حسن دیوار سے ٹیک لگائے بڑے خوب صورت انداز میں سگریٹ پی رہا تھا۔
''جا رہی ہیں۔''
اس نے ایک لمحہ کو مڑ کر دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔
''چلیے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔'' وہ اس کے پیچھے چلا آیا۔
''جی نہیں شکریہ۔'' اس نے ذرا برہم ہو کر کہا۔
''رات کافی ہو چکی ہے اور زیبا...... ! میرا مطلب ہے مس زیبا شاہ آپ اکیلی کیسے جائیں گی۔''
''آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''زیبا میں آپ کو اکیلا نہیں جانے دوں
گا'' انداز میں تحکم تھا اور اس نے یوں ہاتھ
بڑھایا جیسے اس کا بازو تھام لے گا اور وہ ایک دم
گھبرا کر پیچھے ہٹ آئی۔
''آئیے!'' کار کا دروازہ کھولتے ہوئے
...''
''نہیں نہیں۔ کبھی نہیں۔'' وہ بولی اور تیزی
سے اندر چلی گئی۔ دروازے میں داخل ہوتے
ہوئے اس نے دیکھا وہ اسی طرح دروازہ
تھامے شکست خوردہ انداز میں کھڑا تھا۔
''زیبا اچھا کیا تم آ گئیں۔ مجھے بہت فکر تھی
کہ اس وقت اکیلی کیسے جاؤ گی۔ ویسے تم لڑکی
بھی بڑی پیاری ہو اور آج سچ مچ تم نے غضب
ڈھایا ہے۔'' انہوں نے آہستہ سے اس کا ہاتھ
تھام لیا۔
''جی۔ جی ہاں میں نے سوچا ڈرائیور کا
انتظار کر ہی لوں۔'' اس نے گھبراہٹ میں ہنستے
ہوئے جواب دیا۔ اس کے دل و دماغ میں ہلچل
مچی تھی۔ غصہ اور نفرت ایک نئے جذبے سے نبرد
آزما تھا۔
جب وہ جانے کے لیے کار میں بیٹھنے لگی تو نہ
چاہتے ہوئے بھی اس کی نظریں واپس مڑیں وہ
اسی طرح پورچ میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس
رات بہت دیر تک اسے نیند نہ آئی۔ اس کے
دماغ میں یہ کیسی ہلچل تھی۔ اگلے روز جب وہ پہنچی
تو بچے لان میں موجود نہ تھے۔ دو منٹ بیٹھی وہ
انتظار کرتی رہی اور تب اس نے سوچا اندر چل کر
دیکھے۔
ڈرائنگ روم میں اس نے جھانکا تو حسن
صوفے پر لیٹا کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا۔ آہٹ پر وہ
چونکا اور اسے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا۔
''آئیے۔''
''ملکی اور چوچو کہاں ہیں۔'' وہ گھبرا گئی۔
''وہ...'' وہ جواب دیتے ہوئے رک

مسکرائیے

ایک دفعہ تین بے وقوفوں کو سزائے موت سنائی گئی۔ تینوں کو تختہ دار پر لے جایا گیا۔
سب سے پہلے ایک سے اس کی آخری خواہش پوچھی گئی۔ اس نے کہا کہ وہ نماز ادا کرنا چاہتا ہے لہٰذا اس کی خواہش پوری کرنے کے بعد اسے تختہ دار پر چڑھا دیا گیا' مگر تختہ خراب ہو گیا' لہٰذا اس کی جان بچ گئی۔
اس کے بعد دوسرے سے اس کی آخری خواہش پوچھ کر پوری کی گئی اور اسے دار پر چڑھا دیا گیا مگر خراب تختے نے اس کی بھی جان بچالی۔ اب تیسرے سے بھی اس کی آخری خواہش پوچھی گئی۔ اس نے کہا۔
''پہلے تختہ تو ٹھیک کراؤ۔''

☆☆

''اتنی زیادہ رقم کا بل......؟'' آپریشن کے بعد ایک مریض نے سرجن کا بل دیکھ کر احتجاج کیا۔
''میرے دوست!'' سرجن نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہیں معلوم ہو جاتا کہ تمہارا کیس کتنا پیچیدہ تھا اور کس طرح میں نے تمہارے آپریشن کو پوسٹ مارٹم میں تبدیل ہونے سے روکا۔ تو تم اس سے تین گنا بل بھی خوشی سے ادا کر دیتے۔''

☆☆

حکیم لقمان ایک دن اپنے شاگردوں کو حکمت و دانائی کا درس دے رہے تھے' ایک شخص سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ دیر تک ان کی صورت پر غور کرتا رہا اور آخر پہچان کر بولا:
''تم وہی شخص ہو ناں جو فلاں مقام پر میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتے تھے۔''
''ہاں میں وہی شخص ہوں۔'' حکیم لقمان نے جواب دیا۔
تب اس نے متحیر ہو کر کہا۔ ''تو یہ مرتبہ تمہیں کیونکر حاصل ہوا۔؟''
لقمان نے فرمایا: ''دو باتوں سے ایک سچ بولنا اور دوسرے بلا ضرورت بات نہ کرنا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گیا۔''آپ بیٹھیے میں دیکھتا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا وہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی۔ چند منٹ بعد وہ واپس آ گیا۔

''وہ لوگ تو گھر پر نہیں۔'' اس کی آنکھوں کی شوخی لوٹ آئی تھی۔

''جی۔ اور مسز انصاری۔'' وہ گھبرا گئی۔

''بھیا اور بھابھی معہ بچوں کے کیپٹن حسن کی بچی کی سالگرہ پر گئے ہیں۔''

''انہوں نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔''

زیبا ایک دم پریشانی میں کھڑی ہو گئی۔

''آپ کھڑی کیوں ہو گئیں بیٹھیے۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی' سفید کرتا اور پاجامہ میں وہ بہت وجیہہ لگ رہا تھا۔

''مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا ہے زیبا۔''

''لیکن مجھے کچھ نہیں سننا۔'' وہ دل کی پکار کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

''آپ کہیں نہیں جا سکتیں' کیا آپ مجھے واقعی کمینہ آدمی سمجھتی ہیں۔'' اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں لہراتے خوف کے سائے دیکھ کر وہ بولا اور زیبا شاہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی۔

''بات یہ ہے زیبا کہ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ میرا مقصد ہرگز آپ کو دکھ دینا نہ تھا۔''

''میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''نہ سنو۔ میں بھی اس وقت تک جانے نہیں دوں گا جب تک تم صلح نہیں کرو گی۔''

وہ چپ چاپ بیٹھی ناخن کریدتی رہی اس کے دل میں عجب طوفانی لہریں اٹھ رہی تھیں اور دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

وہ سگریٹ سلگائے یونہی بلا مقصد لمبے چوڑے ڈرائنگ روم کا چکر لگاتا رہا۔ دھیمے سروں میں گنگناتا ہوا وہ اسے بہت اچھا لگا۔

''پتھر کے صنم' تجھے ہم نے محبت کا خدا جانا۔''

ایک ہی مصرعے کو بار بار دہراتا اس کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکراتا رہا۔ تب اسے اچانک خیال آیا اگر اس وقت مسز انصاری آ جائیں تو۔

''بھئی دیکھیے پلیز میری امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

''اونہہ کہہ دیجیے گا۔ ایک شاگرد بہت نالائق ہے۔'' وہ زیر لب مسکراتا ہوا بولا۔ تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ہنسی آ گئی۔

وہ بدستور وہی مصرعہ گنگناتا رہا۔ اب وہ روہانسی ہو گئی۔

''ارے یہ کیا۔'' اس نے اس کی آنکھوں کے بھیگتے کنارے دیکھ لیے۔

''چلیے آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔'' وہ ناراض ہو کر بولا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلی جائیں گی یا چھوڑ آؤں۔'' اس نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اور وہ چپ چاپ کار میں بیٹھ گئی۔

''اب مجھے میری بات کا جواب مل گیا۔ آپ لاکھ چھپائیں۔'' وہ اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

''پتھر کے صنم۔''

''اور ہاں ایک بات بتاؤں۔ آپ کی خفگی اب اور برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے بھیا اور بھابھی کو بھی میں نے ہی چلتا کیا تھا ہاں۔''

خوب صورت آنکھوں میں شوخیاں سمیٹے اس نے زیبا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ تو وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ ہر طرف بہار ہی بہار تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

باپ کے مرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ زندگی کتنی مشکل اور جبر مسلسل ہے' جب آدھی رات کو آنکھ کھلتی تو وہ اکثر ماں کو روتے ہوئے دیکھتا مگر جلدی سے آنکھیں بند کر لیتا کہ ماں کا بھرم رہ جائے پر پھر آہستہ آہستہ اس کا تکیہ بھیگنے لگتا اور صبح اٹھانے کے ...ر وقت پہ آنکھ نہ کھلتی اور ......!!

تقدیر

شازیہ رانا

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

''**آخر** کب تک ہم ایسی زندگی گزارتے رہیں گے۔''

نذیر نے ہاتھ میں پکڑا اصافہ چارپائی پہ پٹختے ہوئے کہا تو اس کی ماں جو رات کے کھانے کے لیے دال چن رہی تھی چونک کر سر اٹھا کے دیکھنے لگی۔

''آج پھر استاد نے کپ ٹوٹ جانے پہ جانوروں کی طرح مارا ہے۔''

اب کی بار نذیر کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے۔ حمیداں کو اور کچھ نہیں سوجھا تو اسے گلے لگا کے سسکنے لگی۔

حمیداں کا خاوند ٹی بی بگڑ جانے کی وجہ سے چھ مہینے پہلے دوائی کو ترستے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ نذیر اور راشدہ ان کے دو بچے تھے' راشدہ کی شادی وہ اپنی زندگی میں ہی کر گیا تھا اور نذیر اسکول میں جاتا تھا لیکن باپ کی بیماری کی وجہ سے اسے آٹھویں سے ہی اٹھا لیا گیا اور باپ کے مرنے کے بعد گھر کا واحد خود کفیل ہونے کی وجہ سے قریبی ہوٹل میں نوکری کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ زندگی اپنی ڈگر پہ چلنے لگی مگر جب کبھی وہ ماں کو استاد کے بارے میں بتاتا تو وہ رونا شروع کر دیتی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس لئے اس نے اب گھر آ کے بتانا چھوڑ دیا تھا اور ماں مطمئن ہوگئی کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔

''یار تم تو اتنے اچھے سٹوڈنٹ تھے۔ ماسٹر جی نے تمہاری مفت پڑھائی کے لئے درخواست بھی دے دی تھی پھر تم کہاں غائب ہو گئے؟''

ایک دن ہوٹل جاتے ہوئے اس کی مڈبھیڑ اس کے کلاس فیلو احمد سے ہو گئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے ملنا پڑا۔

''بس یار ابا کی وفات کے بعد مجھے ہی گھر سنبھالنا تھا تو اس لئے۔''

اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا اور آخر میں دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا کہ وہ مزید نہ کریدے۔

''چلو اللہ تمہیں صبر دے، میں اسکول سے لیٹ ہو رہا ہوں' اچھا اللہ حافظ۔''

احمد سمجھ چکا تھا کہ اس کی کیا مجبوری ہے اس لئے مزید نہیں ٹٹولا کہ وہ شرمندہ ہو جائے گا اور مسکراتے ہوئے چل دیا مگر نذیر نے اپنا رستہ بدل لیا اور وہاں سے نہ گزرنے کی قسم کھالی۔ نجانے کیا ہوتا تھا کہ اسکول جاتے ہوئے مسکراتے بچوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مرچیں بھرنے لگتی تھیں اور وہ اپنا دھیان کسی اور طرف بٹا لیتا۔

باپ کے مرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ زندگی کتنی مشکل اور جبر مسلسل ہے' جب آدھی رات کو آنکھ کھلتی تو وہ اکثر ماں کو روتے ہوئے دیکھتا مگر جلدی سے آنکھیں بند کر لیتا کہ ماں کا بھرم رہ جائے پر پھر آہستہ آہستہ اس کا تکیہ بھگنے لگتا اور صبح اٹھانے کے باوجود وقت پہ آنکھ نہ کھلتی اور جب آنکھ کھلتی تو وہ بھاگم بھاگ ہوٹل پہنچتا اور استاد کو گالیاں دینے اور دھلائی کا جواز مل جاتا۔

''کیا ہوا؟ کیوں مار رہے ہو اس بیچارے کو۔''

دیر سے آنے پہ استاد پھر بری طرح پیٹ رہا تھا کہ ایک گاہک جو کہ شکل سے بہت مہذب اور پڑھا لکھا لگ رہا تھا نے پاس آ کے استاد کا چلتا ہوا ہاتھ روکا۔

''صاحب آپ بیچ میں نہ آئیں' یہ میرا اور اس کتے کے پلّے کا معاملہ ہے۔''

استاد نے اس آدمی کو ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے اسے پھر سے دھنکنا شروع کر دیا۔

''مگر یہ انسانیت نہیں ہے۔''

اس آدمی نے دوبارہ مداخلت کی تو استاد گرج اٹھا۔

''صاحب اگر اتنا ہی خیال ہے تو اسے اپنے ساتھ ہی لے جائیں' ناکام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔''

استاد نے یہ کہتے ہوئے پھر ہاتھ اٹھانا چاہا تو صاحب نے جلدی سے کہا'

''ٹھیک ہے میں اسے ساتھ لے جاتا ہوں۔ بتاؤ تمہارا کتنا حساب ہے اس کی طرف۔''

یہ کہتے ہوئے وہ پرس نکال کے پیسے گننے لگے اور نذیر کو لگا کہ کوئی جھٹکا ر ہو گیا ہے اور وہ آنسو صاف کرنا ہی بھول گیا۔

''اس کے باپ نے مرنے سے پہلے کچھ قرضہ لیا ہوا تھا' وہ پورا ہو جائے تو پھر یہ جہاں مرضی دفعہ ہو جائے۔''

استاد نے نفرت سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''کتنا قرضہ ہے؟''

صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''پورے ۵۰ ہزار۔''

استاد نے تنک کر جواب دیا۔

''ابھی تک کتنے ہوئے ہیں؟''

صاحب نے پرسوچ انداز میں کہا۔

''ابھی تو مر کے ۵۰۰۰ کئے ہیں اس حرامی نے مگر آپ اتنی سر درد کیوں لے رہے ہیں۔''

آخر استاد ان کے بار بار پوچھنے پہ تنگ آ گیا۔

''یہ لو ۲۰۰۰۰ اور میں کل آ کے باقی کے تیس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں لے جاؤں گا اور کل ہی اسے بھی اس جہنم سے لے جاؤں گا۔"

صاحب نے نفرت سے پیسے استاد کو تھماتے ہوئے کہا تو وہ ہکا بکا رہ گیا اور نذیر جو اس وقت سے خاموش کھڑا تھا ایک دم چونک گیا اور آنسو صاف کرنا ہی بھول گیا۔

"کیا ناشتہ کیا ہے؟"

صاحب نے فارغ ہو کے نذیر سے آ کے پوچھا۔

"نہیں، آج لیٹ ہو گیا تھا اس لئے ویسے ہی آ گیا۔"

اس نے لب بھینچے بتا دیا پر صاحب کے دل پہ ایک گھونسا سا پڑا۔

"میں کل اسی ٹائم پہ تمہیں لینے آ جاؤں گا، بولو منظور ہے؟"

شکم سیری کے بعد صاحب نے اپنا مدعا بیان کیا اور اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بس سر ہلا دیا۔

☆☆

آج کی صبح نذیر کے لئے ایک نئی صبح تھی۔ ساری رات سوچنے کے بعد وہ طے کر چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے مگر ماں کو کچھ نہ بتایا اور ہوٹل چلا گیا، ٹھیک ۱۵ منٹ بعد صاحب آیا، اس کا حساب بے باک کیا اور اسے لے کے ساتھ چل پڑا۔

"کیا پڑھنے کا شوق ہے۔"

آراستہ پیراستہ گھر میں قدم رکھتے ہی صاحب نے پوچھا تو نذیر کی آنکھیں ایک لمحے کو چمک گئیں۔

"مجھے تمہارا جواب مل گیا ہے۔"

صاحب نے مسکراتے ہوئے کچن کا رخ کیا۔

☆☆

نذیر نے اب پھر سے اسکول جانا شروع کر دیا تھا، صاحب ایک ٹرسٹ اسکول غریب بچوں کے لئے چلا رہے تھے، بہت دولت مند اور نرم مزاج انسان تھے، بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور اولاد نہیں تھی اس لئے نذیر کو ہمیشہ اولاد کا درجہ دیا مگر وہ اپنی ماں کے پاس ہی رہتا مگر اسے کسی بات سے آگاہ نہ کیا اور وہ بھی خاموشی سے اپنی زندگی اس کولہو کے بیل کی طرح گزارتی رہی جو اپنے مدار سے کہیں نہیں جاتا۔

☆☆

آج وہ نذیرے سے مسٹر نذیر بن چکا تھا اور نہایت کامیابی سے صاحب کا اسکول چلا رہا تھا۔ صاحب پچھلے مہینے دل کا دورہ پڑنے سے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے تھے اور اپنی تمام تر جائیداد نذیر کو سونپ گئے تھے۔

"نہیں چھوڑوں گا، حرامزادے۔"

نذیر کہیں جا رہا تھا کہ قریبی ہوٹل پہ پانی پینے رکا تو ایک آدمی ایک ۱۴، ۱۵ سال کے بچے کو قصائیوں کی طرح پیٹ رہا تھا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس کا کیا قصور ہے؟"

نذیر نے قریب آ کر آدمی سے پوچھا۔

"کوئی کام ٹھیک سے نہیں ہوتا اس نالائق۔"

آدمی کے منہ سے مغلظات کا طوفان نکل پڑا۔

"کل بھی ایک گاہک برتن صاف نہ ہونے کی وجہ سے اٹھ کے چلا گیا۔"

اتنا بتا کے وہ پھر سے اپنے محنت طلب کام میں جت گیا۔

☆☆

گاڑی اپنے سفر پہ رواں دواں تھی اور ایک اور نذیر اس کے پہلو میں بیٹھا ناخن کتر رہا تھا اور نذیر آنکھیں موندے اپنی سیٹ پر یوں دراز ہو چکا تھا جیسے ایک اور بچپن بچانے کی سرشاری رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پانچویں قسط

جادوگر

ایم اے راحت

دِل والوں کی دِلّی...... مُغلوں کی یادگاروں اور وَلیوں دَرویشوں کی آغوش میں سانس لینے والی دِلّی میں پیش آنے والے ایک پریشان حال نوجوان کی داستانِ حیات جسے جِنوں سے واسطہ پڑگیا تھا۔ سطر سطر تجسس اور پراسرار واقعات سے سجی ہوئی دلچسپ سلسلے وار داستان۔

اس جہان میں بہت سے لوگوں کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ جن پر عقل حیران رہ جاتی ہے اور یقین ہی نہیں آتا کہ اس طرح بھی ہوسکتا ہے......؟ ایسے ہی واقعات سے بھرپور یہ داستان بھی آپ کو اپنے حصار میں جکڑ لے گی۔ عمران ڈائجسٹ کا نیا اور حیرت انگیز سلسلہ

عمران ڈائجسٹ کا سنسنی خیز پر تجسس اور نیا سلسلہ

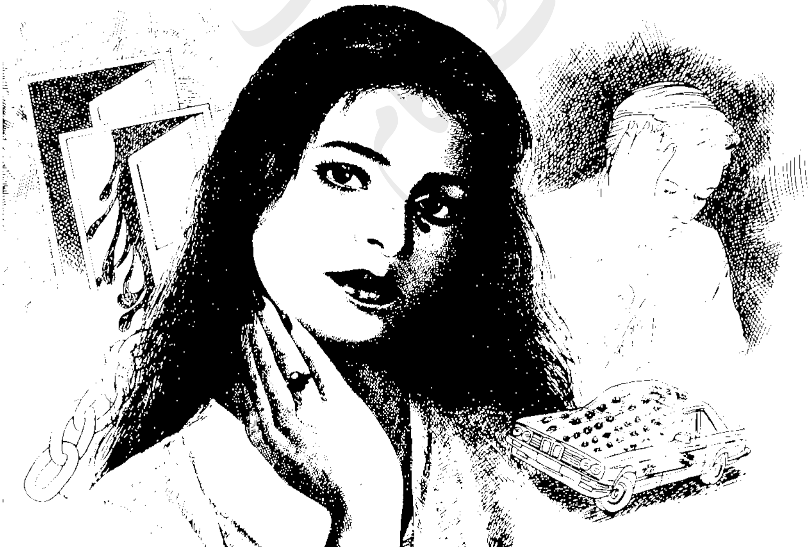

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

وہ پانی میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گئی' ہم نے بار بار مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کی لیکن مچھلیاں ہاتھوں میں گدگدیاں کرتی ہوئی پھسل جاتی تھیں چنانچہ اس کوشش میں ہمارے لباس پانی میں تربتر ہوگئے اور ایک بھی مچھلی ہمارے ہاتھ نہیں آسکی اور پھر یہ طے ہوگیا کہ یہ کام ایک ویٹر کے سپرد کردیا جائے' چنانچہ اس نے ہماری پسند کی مچھلیاں پکڑ کر ہمارے سامنے تلنا شروع کردیں۔

اطراف کی تمام میزیں بھری ہوئی تھیں اور اکثر لوگ جو یہاں کی اونچی سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے شراب نوشی میں مصروف تھے' ہمارے برابر والی میز پر مشاعرہ ہورہا تھا' خیام کے ملک میں شعروشاعری کی محفل نہ ہوتی تو تعجب کی بات تھی' دوپہر ڈھل رہی تھی اور دھوپ کی ملاحت میں خنکی کا اثر نمایاں تھا' ہم لوگ ریستوران سے نکل کر دریا کے قریب ایک پتھر پر جابیٹھے' پانی میں ہاتھ ڈالا تو انتہائی سرد تھا' خراج کے بہتے ہوئے پانی کا شور اور ہوا کی سرسراہٹ سے کانوں میں ایک عجیب سے ساز کی آواز پہنچ رہی تھی' آب جو کا اثر ابھی تک ذہن پر سوار تھا یا پھر کینس ہی کے انداز میں لچک پیدا ہوگئی تھی۔

خود میری اپنی کیفیت زیادہ پریشان کن نہیں تھی لیکن اس کا قرب مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کینس کافی دیر تک یہاں بیٹھی رہی پھر اس نے ایک کتابچہ نکال کر اس کی ورق گردانی شروع کردی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی سرخی چھائی ہوئی تھی' پتہ نہیں وہ ایرانی نژاد تھی یا ہندوستانی ہی تھی' لیکن اس کے نقوش کی دلآویزی اب مجھ پر واضح ہورہی تھی' دفعتہً اس نے اپنی گہری سیاہ آنکھیں اٹھائیں اور بولی۔

''کیپین کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اگر تمہاری خواہش ہے تو چلو چلتے ہیں؟'' میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا' ٹیکسی ڈرائیور کو میں نے پورے دن کے لئے مخصوص کرلیا تھا اور وہ ہمارا انتظار کررہا تھا' چنانچہ نے اسے کیپین چلنے کے لئے کہا' ڈرائیور نے گردن گھما کر ہم دونوں کو دیکھا پھر اس مسکراتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کردی' کینس نے آہستہ میرے کان کے قریب سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ڈرائیور مسکرایا کیوں تھا؟''

''مسکراہٹ پر پابندی تو نہیں لگائی جاسکتی۔'' میں نے بے خیالی میں جواب دیا لیکن تھوڑی دور چلنے کے بعد اندازہ ہوگیا کہ اس مسکراہٹ کیا معنی رکھتی تھی' کیپین کا راستہ نہایت دشوار اور پرخطر تھا' گہری کھائیاں اور خوفناک موڑ جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی سب سے خوفناک رویہ ڈرائیور کا تھا جو انتہائی برق رفتاری سے ٹیکسی دوڑا رہا تھا۔

''واپسی کا سفر خوفناک ہوگا' ڈرائیور کو شاید ٹیکسی کی رفتار پر کنٹرول نہیں ہے' کہیں بھی اس کا ہاتھ بہک سکتا ہے۔'' کینس نے گہری سانس لے کر کہا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا پھر میں نے کہا۔

''تو پھر رات کی واپسی کی ضرورت نہیں ہے' ہم کسی نہ کسی جگہ رات کو قیام کرلیں گے۔''
کینس کے چہرے پر عجیب سے آثار پھیل گئے۔ کچھ دیر تک وہ عجیب سے انداز میں مجھے گھورتی رہی' پھر بولی۔

''کیا یہ ڈرائیور رات کو رکنے کے لئے تیار ہوجائے گا۔''

''اسے رات کا معاوضہ بھی ادا کردیا جائے گا' میرا خیال ہے کہ اسے کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

میں نے انگریزی میں ڈرائیور سے کیپین میں رات کے قیام کے بارے میں پوچھا اور ڈرائیور نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے بتایا کہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

...ب ہو سکتے ہیں' یہ بات سن کر کسی
... کر گیا تھا۔ جب سیاحت ہی ٹھہری تھی
... سے کیوں گریز کیا جائے چنانچہ ہم
... ساحل پر پہنچ گئے اور شب کے اس
... میں لہروں کا شور اس بات کا اعلان
... سمندر قریب ہے' ٹیکسی سمندر کے
... دور تک گئی' پھر دائیں سمت ایک
... سائن نظر آنے لگے اور ٹیکسی کا رخ
... جانب ہو گیا۔ دلچسپی بھی محسوس ہوئی اور
... بھی ذہن میں جا گزیں تھا' ممکن ہے
... کے سوچنے کا انداز مجھ سے مختلف
... کے کاؤنٹر پر ایک عمر رسیدہ عورت اور
... عمر کا ایک مرد بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں نے
... مسکراتی نگاہوں سے دیکھا اور ہمارے لئے
... الفاظ ادا کئے' شب بسری کے لئے ہمیں
... سے ایک کمرہ مل گیا لیکن کمرے کی طرف
... تے ہوئے ہمارے ذہن میں معمر جوڑے کی
... ہوئی نگاہیں گردش کر رہی تھیں۔ یہاں غالباً
... بسری کے لئے آنے والے مشکوک ہی
... تے ہوں گے' کمرہ کافی خوبصورت تھا' اس کی
... کھڑکی سے کیپسین دیکھا جا سکتا تھا' ہم نے
... ے کا جائزہ لیا' گینس عجیب سی کیفیت میں
... میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا' وہ
... آہستہ چلتی ہوئی آگے بڑھی اور کھڑکی کے
... جا کھڑی ہوئی۔ اس نے کھڑکی کھول لی
... سمندر کے رخ سے سرد ہوائیں اندر داخل
... نے لگیں' لیکن اس وقت وہ انتہائی خوشگوار لگ
... ہی تھیں' میں نے کہا۔

''تم پریشان ہو گینس۔؟''

''نہیں کیوں؟''

''میں تمہارے چہرے پر ایسے ہی آثار
... رہا ہوں۔''

''کوئی خاص بات نہیں اور یوں بھی تو ہم
... طویل وقت ساتھ گزار چکے ہیں' یہ دوسری
بات ہے کہ اس وقت ہم جہاز کے تہہ خانے میں تھے۔''

''ہاں کیوں نہیں گینس میں تمہیں اپنی طرف سے ایک شریفانہ رویے کا اطمینان دلاتا ہوں۔''

''منہ دھو رکھو' میں خود بھی اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔''

''تم یہ الفاظ کہہ کر اس اعتماد کو مجروح کر رہی ہو جو ہمارے درمیان موجود ہے۔''

''اعتماد۔'' گینس کے لہجے میں ایک عجیب سی لغزش تھی' اس نے گردن جھٹکی اور ایک دم ہنس پڑی۔

''ہاں...... کیوں ہمارے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم نہیں ہے' ویسے کیپسین کو سمندر نہیں کہا جا سکتا' بلکہ اسے ایک بہت بڑی جھیل کا نام دیا جا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے' لیکن یہ جھیل کسی طور سمندر سے کم نہیں۔''

رات کی تاریکی میں لہروں کے جھاگ صرف لکیروں کی شکل میں نظر آ رہے تھے۔ ہم دونوں دیر تک وہاں کھڑے رہے۔ پھر پلٹتے تو گینس بے اختیارانہ انداز میں میرے جسم سے ٹکرا گئی' میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی اور اس سے کھانا کھانے کے بارے میں پوچھا۔

''کچھ بھی منگوا لو' کھائے بغیر تو نیند نہیں آئے گی۔''

''جہاز پر بھی یہی ہوتا تھا۔'' میں نے کہا اور ہنس پڑا' ویٹر کو بلا کر رات کے کھانے کا آرڈر نوٹ کرایا جو ہمیں آدھے گھنٹے کے بعد سرو کیا گیا۔ لیکن اس آدھے گھنٹے کے انتظار کا صلہ اچھا ملا تھا۔ بہت ہی نفیس کھانا تھا' کئی چیزیں اجنبی تھیں جنہیں کھانے میں لطف آیا' کھانے سے فارغ ہو کر ایک بار پھر ہم دونوں ایک کھڑکی کے نزدیک جا بیٹھے۔ اس وقت ہوٹل میں نیچے جانے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کی کوئی تک نہیں تھی کیونکہ وہاں بہت زیادہ رش نظر نہیں آ رہا تھا' کافی دیر تک ہم کھڑکی کے پاس بیٹھے رات کی تاریکی میں سمندر کے اڑتے ہوئے ان جھاگوں کو دیکھتے رہے پھر کینس نے کہا۔

''سونے میں ذرا دقت ہوگی ان کمبختوں نے صرف ایک ہی بستر بچھایا ہے۔''

''کمبختوں کا قصور نہیں ہے' غالباً یہاں وہی لوگ آتے ہیں جنہیں ایک......''

''شرارت نہیں' میرا خیال ہے تم آرام سے سو جاؤ' مجھے نیچے سونے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔''

''ایسے موقعوں پر جواں مرد اپنی خدمات پیش کرتے ہیں' لہٰذا میں بھی اس کی تقلید کروں گا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

کینس بمشکل تمام بستر پر سونے کے لئے تیار ہوئی' میں نے نیچے ہی ایک جگہہ منتخب کر لی اور پھر کھڑکی بند کر دی تا کہ سمندر کی طرف سے آنے والی خنک ہوائیں رات کو جاگنے کا سبب نہ بن جائیں' کینس پتہ نہیں سوئی تھی یا جاگ رہی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں عجیب عجیب خیالات جنم لے رہے تھے' حالانکہ ہم نے تنہا طویل سفر طے کیا تھا' لیکن اس وقت میری ذہنی کیفیت وہ نہیں تھی' یا تو یہ موسم کا اثر تھا یا پھر یہ ہوٹل اور یہاں کا ماحول' میں ذہن سے خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ابرانوس آ گیا۔

''میرے ناقابل اعتماد دوست' کیا اب بھی تم مجھ سے دور ہو؟'' میں نے سوال کیا لیکن ابرانوس کی کوئی آواز نہیں ابھری۔

''ٹھیک ہے' اب میں نے تمہارا تصور تک چھوڑ دیا ہے۔'' میں نے کہا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا' نیند آنے میں کافی دیر لگی' لیکن جب نیند آئی تو ایسی آئی کہ صبح کو ہی آنکھ کھلی' اس وقت کینس صبح کا اخبار دیکھ رہی تھی جو فارسی زبان میں تھا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا تو اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور مسکرا کر بولی۔

''اب اٹھ جاؤ' مجھے افسوس ہے کہ تمہیں ایک بے سکون رات گزارنی پڑی۔''

میں انگڑائی لے کر اٹھ گیا' کینس دھلی دھلی سی نظر آ رہی تھی۔ غالباً وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر بیٹھی تھی کیونکہ اس کے بالوں میں نمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں خاموشی سے غسل خانے کی جانب بڑھ گیا' گرم پانی موجود تھا اس سے غسل کرنے میں کافی لطف آیا اور رات کی کسلمندی دور ہوگئی' اس کے بعد باہر نکلا تو کینس نے ناشتہ منگوا لیا تھا' سامنے ہی ناشتے کے برتن لگے ہوئے تھے۔

''خوب! عورت ہونے کا پورا پورا ثبوت دے رہی ہو۔''

''مزہ آ گیا شامی' یقین کرو مزہ آ گیا' میرا خیال ہے اب ہمیں ناشتے کے فوراً بعد چلنا چاہیئے۔''

''ڈرائیور سے ملاقات تو نہیں ہوئی۔''

''ابھی آیا تھا میں نے اس سے کہا کہ ہم ناشتے کے فوراً بعد روانہ ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک۔'' میں نے جواب دیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم ہوٹل سے باہر نکل آئے' کیسپین کے کنارے تھوڑی دیر تک چہل قدمی کی' کوئی خاص بات نہیں تھی' سمندر صرف سمندر ہوتا ہے اس کے بعد ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر واپس چل پڑے کیونکہ اس علاقے میں زیادہ تر سفر رات کی تاریکی میں کیا گیا تھا اس لئے بہت سے مناظر ہمیں دن کی روشنی میں اجنبی اجنبی سے لگے ڈرائیور نے حسب معمول اپنی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا اور اگر ہم سہمے ہوئے نہیں ہوتے تو یقیناً واپسی کے سفر سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہوتے' ڈرائیور نے ہمیں ہماری خواہش

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مطابق فانوس کے سامنے اتارا۔ ٹیکسی کا ادا کر کے ہم اترے اور فانوس میں گئے، اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر میں تو کینس بھی میرے پیچھے پیچھے اندر آ گئی، بیٹھنے کے بعد بولی۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں، دوپہر کا کھانا ساتھ ہی کھائیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی، میرے لئے اب اور کوئی مشغلہ نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ میں نے بقیہ وقت کمرے میں ہی گزارا، دوپہر کو کینس تیار ہو کر میرے کمرے میں پہنچ گئی۔

''آؤ کھانا نیچے ہی کھائیں گے۔'' اس نے کہا اور ہم دونوں نیچے چل دیئے، فانوس کا ڈائننگ ہال اس وقت بھی خاصا آباد تھا، ویسے بھی یہاں اچھی خاصی رونق رہتی تھی۔ ملکی اور غیر ملکی افراد کی کافی بڑی تعداد نظر آتی تھی۔ اس وقت بھی ڈائننگ ہال میں بہت سے لوگ موجود تھے، ہم ایک میز کی جانب بڑھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانے میں مصروف ہو گئے، کھانے کے دوران کینس نے کہا۔

''میں سوچ رہی تھی شامی کہ اخبار میں ایک اشتہار دے دوں۔''

''کس سلسلے میں؟'' میں نے سوال کیا۔

''باطش چنگیزی کے لئے، میں اس اشتہار میں ایک چھوٹا سا مضمون لکھوں گی کہ باطش چنگیزی جہاں بھی ہوں، فانوس کے اس کمرے میں اپنے شناسا سے ملاقات کریں، ممکن ہے اس طرح سے کوئی کام بن سکے۔ ویسے تو عظیم الشان ایران میں باطش چنگیزی کو تلاش کرنا ممکن نہیں ہے۔''

''سوچ لو، اگر یہ مناسب ہے تو ضرور

''میں یہ اشتہار کوشش کر کے آج ہی اخبارات کو دے دیتی ہوں، میرا خیال ہے ہوٹل کا منیجر اس سلسلے میں میری مدد کرے گا، تم تصور نہیں کر سکتے شامی کہ میرے دل میں کیا کیا خواہشیں ہیں، میں اپنی شناخت چاہتی ہوں، میں یہ چاہتی ہوں کہ مجھے میرے بارے میں علم ہو جائے، پتہ نہیں وہاں سے آ جانے کے بعد ان لوگوں پر کیا گزری۔''

''ہاں یقیناً، کوئی نہ کوئی احساس تو ہوگا، خاص طور سے حاذق ریاضی پر۔''

''بالکل ٹھیک۔'' اس نے جواب دیا۔

''ممکن ہے حاذق ریاضی نے باطش چنگیزی سے رابطہ قائم کیا ہو کیونکہ تم کہتی ہو کہ اس نے باطش چنگیزی ہی کے ایماء پر تمہاری پرورش کی ہے، اب یہ اشتہار اگر باطش چنگیزی کی نظر سے گزر جائے تو شاید اس کے دل میں یہ خیال آ جائے کہ یہ تم ہی ہو سکتی ہو جو اس کی تلاش میں یہاں آئی ہے۔''

''بالکل بالکل میں نے بھی اسی انداز میں سوچا ہے، کھانے کے بعد ہم یہاں سے اٹھ جائیں گے، تم چاہو تو تم چلے جانا میں یہ کام کر لوں گی۔'' اس نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی، مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں تھا، چنانچہ کھانے کے بعد ہم ڈائننگ ہال سے باہر نکل آئے، وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ ابرانوس کو ایک بار پھر پکارا اور اس کی طرف سے جواب نہ آنے پر اس پر ہزار بار لعنت بھیجی اور پھر اپنے بستر پر دراز ہو گیا، کھانے سے طبیعت ذرا بوجھل سی ہو گئی تھی، آنکھیں بند کیں تو نیند آ گئی، شام کو تقریباً ساڑھے چار بجے میری آنکھ کھلی تھی، منہ ہاتھ وغیرہ دھو کر لباس تبدیل کیا اور ہوٹل سے باہر نکل آیا، کینس کا کمرہ بند تھا۔ وہ ابھی واپس نہیں تھی، یونہی آوارہ گردی کرنے کے لئے میں سڑکوں پر نکل آیا، سڑکوں پر وہی روایتی رونق نظر آ رہی تھی، میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا کافی دور نکل گیا، پھر ایک

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

چھوٹے سے پبلک پارک میں داخل ہوگیا۔ یہاں زندگی کی رونقیں شباب پر تھیں۔ نوجوان جوڑے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گشت کررہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت بچے ادھر ادھر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے' خوانچے والے اور بہت سے لوگ موجود تھے جو زندگی کی ضروریات فروخت کررہے تھے۔

میں پارک میں ٹہلتا رہا' پھر میں ایک گوشے سے نکل رہا تھا کہ اچانک میں نے دو آدمیوں کو اپنی طرف نگراں دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئے تھے' دراز قامت اور اچھے لباس میں ملبوس تھے' ان میں سے ایک کے منہ میں پائپ دبا ہوا تھا اور وہ اس کے گہرے کش لے رہا تھا' میں نے ان کی جانب دیکھا تو وہ دونوں اس طرح بے نیاز ہوگئے جیسے انہوں نے میری طرف توجہ ہی نہ دی ہو' پتہ نہیں وہ کیوں ٹھٹکے تھے۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ مجھے دیکھ کر چونکے ضرور تھے' کہیں کوئی مصیبت نہ نازل ہوجائے' میں نے سوچا اور پارک سے باہر نکل آیا' اس کے بعد میں دیر تک پیچھے مڑمڑ کر ان دونوں کو تلاش کرتا رہا' لیکن ان دونوں میں سے کوئی نظر نہیں آیا تھا چنانچہ میں واپس اپنے ہوٹل میں آگیا۔

شام کے تقریباً ساڑھے سات بجے گینس میرے پاس پہنچی تھی اور مجھ سے اپنی کاروائی کی تفصیلات بیان کررہی تھی' اس نے بتایا کہ اس نے تمام اخبارات میں اشتہارات دے دیئے ہیں' ڈنر کے بعد ہم دیر تک ہوٹل کی تفریحات میں مشغول رہے اور پھر اپنے کمرے کی جانب چل پڑے' اس وقت تقریباً پونے گیارہ بجے تھے' گینس نے مسکراتے ہوئے مجھے الوداع کہا میں دروازہ کھول کر اندر پہنچا' لباس تبدیل کیا اور پھر بستر پر لیٹنے ہی جارہا تھا کہ دفعتہً ہی ایک عجیب سا احساس ہوا' غالباً یہ میری چھٹی حس تھی جس نے مجھے کہا تھا کہ اس کمرے میں میرے علاوہ بھی اور کوئی موجود ہے۔ پھر میری نگاہ وارڈروب کی طرف اٹھ گئی کیونکہ اس کا فاصلہ دیوار سے اتنا تھا کہ کوئی الماری کے پیچھے چھپ نہیں سکتا تھا' اسی وقت الماری کے پیچھے سے دو افراد باہر نکل آئے اور مجھے انہیں پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی' یہ وہی دونوں تھے جنہیں میں نے پارک میں دیکھا تھا۔ میں بوکھلائے ہوئے انداز میں مسہری سے نیچے اتر آیا۔ لیکن دونوں کے ہاتھوں میں دبے ہوئے پستولوں کا رخ میری ہی جانب تھا۔ ان میں سے ایک نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اگر تمہارے منہ سے آواز نکلی تو وہ تمہاری آخری آواز ہوگی۔''

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگا' ان میں سے ایک میرے قریب پہنچ گیا۔ اس نے میرے لباس کی تلاشی لے ڈالی' لیکن لباس میں اسے کیا ملتا' اس کے بعد اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر ایک سمت دھکا دیا اور اسی وقت دوسرے آدمی نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز میری ناک سے لگائی' یہ تو اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ وہ بدبودار شئے کیا ہے' لیکن ایک لمحے میں میرے ہوش وحواس رخصت ہوگئے اور اس کے بعد تاریکی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ یہ تاریکی نجانے کب تک میرے ذہن پر مسلط رہی اور جب حواس جاگے تب بھی یہ تاریکی میری آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی تھی۔ میں اپنے آپ کو محسوس کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ میں کہاں ہوں' بدن کے نیچے بے شک بستر تھا لیکن گزرے ہوئے واقعات بھی ذہن کے پردوں سے ٹکرارہے تھے۔ میں نے خوفزدہ انداز میں مسہری ٹٹولی اور چند ہی لمحوں میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ کم از کم یہ میرے ہوٹل کے کمرے کی مسہری نہیں ہے' میں بوکھلا کر اٹھ بیٹھا' پاؤں نیچے رکھے تو کسی نرم و دبیز قالین کا احساس [illegible] بلکہ ہوٹل کے کمرے میں قالین [illegible] اتنا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

رم اور شاندار نہیں' گویا یہ کوئی اور جگہہ ہے اور وہ لوگ اور وہ بدبو جس نے میرے حواس سلا دیئے تھے کسی نشہ آور شئے کی تھی' لیکن وہ لوگ کون تھے۔

میرے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا' دل ہی دل میں میں نے ایک بار پھر ابرانوس کو پکارا' لیکن اس کی آواز معدوم تھی' مجھے ایک دم خود پر غصہ آنے لگا' نجانے کیوں میں اسے بار بار پکارتا ہوں۔ اس بدبخت نے میری خوداعتمادی چھین لی تھی' میں نے اپنے طور پر ایک آخری فیصلہ کیا کہ اب جو کچھ بھی کروں گا اپنی ذات ہی کے سہارے کروں گا۔ پتہ نہیں وہ کون لوگ تھے انہوں نے مجھے کیوں اغواء کرلیا تھا۔ تاریکی اس قدر پھیلی ہوئی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دیتا تھا' ہوسکتا ہے یہ رات ہی کا وقت ہو۔ میں اپنی جگہہ سے اٹھا اور فرش پر چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا' ناک کی سیدھ میں چلتا ہوا آخر کار ایک دیوار کے پاس پہنچ ہی گیا اور پھر دیوار کو پکڑ پکڑ کر آگے بڑھنے لگا۔ الیکٹرک سوئچ جتنی بلندی پر لگائے جاتے ہیں اتنی بلندی پر ہاتھ سے ٹٹولتا ہوا دیوار کے سہارے سہارے آگے بڑھتا رہا۔ پھر کسی چیز سے ٹکرایا اور اس کے گرنے کی آواز بلند ہوگئی۔ غالباً وہ دھات کی کوئی چیز تھی' ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دفعتہً ہی چٹ کی آواز ہوئی اور روشنی پھیل گئی' اندھیرے سے اچانک روشنی میں آتے ہی میری آنکھیں خودبخود بند ہوگئیں' لیکن اب کسی کی سانسوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی' میں نے خود کو سنبھال کر اس طرف دیکھا۔ پھر ایک دراز قد آدمی کو کھڑے ہوئے پایا اس کا سر گنجا تھا' ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا۔ سامنے ہی ایک دروازہ کھلا ہوا تھا' یقیناً وہ اسی دروازے سے اندر آیا تھا' جو چیز نیچے گری تھی وہ ایک پیالہ نما گلدان تھا جو ایک خوبصورت سے اسٹینڈ پر رکھا ہوا تھا' وہ شخص مجھے گھور رہا تھا میں نے کہا

''کونسی جگہہ ہے یہ اور کون ہو تم؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا۔

''تم وقت سے پہلے ہوش میں آگئے ہو' بہتر یہ ہے کہ پھر سے بے ہوش ہو جاؤ' تمہیں کم از کم دن کے دس بجے ہوش میں آنا ہے۔''

''فضول بکواس مت کرو۔'' میں غصیلے انداز میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے پستول والا ہاتھ میری طرف کردیا اور بولا۔

''مجھے اجازت ہے کہ میں تمہاری پیروں کو زخمی کردوں۔''

''ارے واہ بلاوجہ زخمی کردو' میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟''

''یہ دس بجے ہی معلوم ہوگا اور اس سے پہلے تمہیں صرف بے ہوش رہنا ہے''

''نہیں پیارے بھائی میں دس بجے تک انتظار کرلوں گا' مجھے بے ہوش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''یہ کام کی بات ہوئی نا۔'' اس کے ہونٹوں پر بھیانک مسکراہٹ پھیل گئی۔ کافی خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا' قدوقامت میں بھی بہت زیادہ تھا اگر میں اس سے بھڑنے کی کوشش کرتا تو مجھے ہی نقصان پہنچتا' چنانچہ میں نے صبر کیا اور واپس مسہری پر جا کر بیٹھ گیا' وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا اور پھر اس نے گلدان اٹھا کر اپنی جگہہ پر رکھا۔ پھول اس میں جمائے اور دروازے کی جانب بڑھ گیا' دروازہ باہر سے بند ہونے کی آواز صاف سنائی دی تھی' لیکن اس نے لائٹ بند نہیں کی تھی۔ میں مسہری پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

پھر میں نے کمرے کا جائزہ لیا' یہ ایک وسیع کمرہ تھا جس میں قالین کی مناسبت سے بہترین چیزیں سجی ہوئی تھیں' خوابگاہ ہی معلوم ہوتی تھی'

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

مسہری بھی بہت قیمتی تھی‘ جس پر میں لیٹا رہا تھا‘ لیکن یہ کونسی جگہ ہے اور مجھے کیوں اغواء کیا گیا ہے جس شخص کو دیکھا تھا وہ تو شکل ہی سے غندہ نظر آتا تھا‘ کمبخت بے پناہ تن و توش کا مالک تھا‘ بہر حال میں اس سے یہاں کشتی نہیں لڑنا چاہتا تھا‘ پھر وقت گزرتا رہا‘ صبح کی روشنی آہستہ آہستہ پھوٹنے لگی‘ جس کا احساس دروازوں اور کھڑکیوں سے ہو رہا تھا۔ پھر پورا اجالا پھیل گیا‘ ابرانوس کا نام میں اب بھول کر بھی اپنے ذہن میں نہیں لینا چاہتا تھا‘ سب سے زیادہ غصہ اسی پر آرہا تھا‘ اس کی وجہ سے ہمیشہ مشکلوں کا شکار ہو جاتا تھا۔

پھر اس وقت گھڑی میں سات بجے تھے جب دو افراد اندر داخل ہوئے‘ ان میں سے ایک وہی تھا جس سے میری ملاقات ہو چکی تھی‘ دوسرا باورچی قسم کا آدمی تھا‘ وہ ٹرالی ڈھکیلتا ہوا لا رہا تھا۔ اس ٹرالی پر ناشتے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے ناشتہ کرنے کے لئے کہا اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گیا۔ میں نے ایک نگاہ ناشتے پر ڈالی پھر باتھ روم میں منہ ہاتھ دھویا۔ دانت وغیرہ صاف کئے اور باہر نکل کر ناشتے میں جت گیا۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ خدا خدا کر کے دن کے دس بجے اور میں نے یہ بات محسوس کی کہ یہ لوگ زبان کے پابند ہیں۔ دس بجے دو آدمی اندر آئے تھے‘ اس بار بھی وہ گنجا ہی ساتھ آیا تھا اور اس کے ساتھ دوسرے آدمی جو تھا وہ بھی جسامت میں گنجے سے کم نہیں تھا‘ لیکن وہ شخص قدرے مہذب نظر آتا تھا‘ اس کے بال سفید تھے جبکہ چہرہ انتہائی جاندار تھا‘ اسی نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔

میں نے کچھ لمحے سوچا پھر ان دونوں کے پیچھے نکل آیا۔ دروازے کے دوسری طرف ایک پتلی سی راہداری تھی‘ ان میں سے ایک شخص میرے ہو گیا‘ دوسرا آگے‘ گویا وہ لوگ مجھ پر نگاہ رکھ رہے تھے۔ اس طرح ہم ایک اور کمرے میں داخل ہو گئے جہاں ایک تیسری شخصیت ایک کالے رنگ کی میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی‘ اس کے قد و قامت کا تو اندازہ نہیں ہو سکا تھا لیکن اس کے چہرے شانوں اور پر وقار چہرے سے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ ان میں نمایاں شخصیت کا حامل ہے‘ اس نے تیکھی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

’’تشریف لائیے جناب‘ لیکن آپ کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ ہم لوگ ہر معاہدے کی پابندی چاہتے ہیں۔ بے شک آپ کا سابقہ ریکارڈ بہت خطرناک ہے‘ لیکن آپ کو یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ آپ کا واسطہ کن لوگوں سے ہے؟‘‘

’’سبحان اللہ کیا سمجھ رہے ہیں آپ لوگ مجھے؟‘‘ میں نے کہا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

’’کیا خیال ہے تمہارا‘ تم کیا سمجھ رہے ہو؟‘‘ اس نے کہا۔

’’میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہیں میرے بارے میں آپ کو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی۔‘‘

وہ شخص چونک کر مجھے دیکھنے لگا پھر اس نے کہا۔’’ ارے...... تم نے اردو کہاں سے سیکھ لی۔‘‘

’’یہ میری اپنی زبان ہے۔‘‘

’’جھوٹ بول رہے ہو مائی ڈیئر منوچہر۔‘‘

’’کیا...... کیا...... کیا...... یہ منوچہر کون ہے؟‘‘ میں نے سوال کیا اور اس شخص کے چہرے پر تھوڑی سی تلخ کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

’’نیا ڈرامہ کرنے کی کوشش مت کرو مائی ڈیئر منوچہر۔‘‘

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''دیکھئے آپ بالکل غلط بات کر رہے ہیں۔''

''سنو منوچہر..... تم انتہائی غلط انسان نکلے ہم نے تو یہ سنا تھا کہ تم معاوجہ لینے کے بعد انتہائی ایمانداری سے اپنا کام کرتے ہو۔ برے آدمیوں میں آپ کو ایک اچھا آدمی تسلیم کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ غلط ثابت ہو رہا ہے' آپ جانتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ ایران کے بہترین مفاد میں ہے' آپ کو ایران کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے ہی اس کام کے لئے تیار ہونا چاہیئے تھا' لیکن آپ نے انتہائی بددیانتی کا ثبوت دیا ہے اور اپنے معاوضے کے آدھی رقم وصول کرنے کے باوجود آپ نے راہ فرار اختیار کی ہے۔ ہمیں یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں آپ ہمارے دشمنوں کے آلۂ کار نہ بن گئے ہوں۔''

''میری جان' میرے پیارے بھائی' ایک بار پھر اپنی ان چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے غور کر لو' میرا نام منوچہر نہیں بلکہ مجھ بدنصیب کا نام احتشام احمد عرف شامی ہے اور میرا تعلق پاکستان سے ہے۔''

''ٹھیک ٹھیک' آپ تشریف رکھئے' ہم اب بھی آپ سے دوستانہ ماحول میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔''

''ایک بات بتایئے' کیا میرا منوچہر بننا ضروری ہے؟''

''میں نے کہا نا فضول باتوں سے گریز کرو۔''

''خیر' اب تمہیں ایک بات اور بتا دوں' جب بھی تمہیں اصل منوچہر ملے گا' تم اس تشویش کا شکار ہو جاؤ گے کہ میں تمہارے راز سے واقف ہو چکا ہوں اور بلاوجہ میرے لئے مصیبت کھڑی کر دو گے' میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ میں منوچہر نہیں ہوں۔ بعد میں میرا قصور نہیں ہوگا۔''

''کچھ کہنا ہی بیکار ہے مسٹر منوچہر' چلیں پہلے آپ کو یقین دلا دیں کہ آپ منوچہر ہی ہیں پھر باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔'' اس شخص کے لہجے میں غراہٹ سی پیدا ہو گئی تھی۔

''چیف اگر مجھے اجازت دیں تو میں اسے یاد دلا دوں کہ یہ کون ہے؟'' گنجے نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''نہیں ہمیں ابھی ان کے ساتھ اتنا برا سلوک نہیں کرنا چاہتے۔ انہیں موقع دیا جائے' جاؤ انہیں ان کی رہائش گاہ میں چھوڑ آؤ اور پھر دوبارہ جب ان کو یہاں بلایا جائے گا تو یہ اپنے آپ کو منوچہر تسلیم کر لیں گے۔ ویسے آپ کو ایک موقع دیا جاتا ہے کہ آپ ہمیں اپنے بارے میں بتائیں کہ اگر آپ منوچہر نہیں ہیں تو پھر کون ہیں' آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے منصوبے کی ابتداء میں صرف چالیس ہی گھنٹے رہ گئے ہیں۔''

''جناب عالی! میرا نام احتشام شامی ہے اور میں کیا ہوں اس بارے میں بتانا بالکل بیکار ہوگا۔''

''آپ کا قیام کہاں ہے؟''

''ہوٹل فانوس میں۔'' میں نے جواب دیا اور کمرہ نمبر بھی دہرا دیا۔

''ٹھیک ہے' میرا خیال ہے آپ کے بارے میں خاصی تصدیق کی جائے گی' ویسے ہم آپ کو زندہ رکھنے کے لئے مجبور نہیں ہیں' اپنا کام ہم دوسرے طریقے سے بھی لے سکتے ہیں۔ چلو لے جاؤ اسے بند کر دو۔'' آخر میں اس نے اپنی شرافت اتار کر اپنے کندھے پر ڈال لی اور دو آدمی مجھے دھکیلتے ہوئے دوبارہ میری رہائش گاہ میں لے آئے

''آہ اب کیا کروں' اس نئی مصیبت سے چھٹکارہ کیسے حاصل ہو؟'' اسی وقت میرے کانوں میں ابرانوس کی آواز ابھری۔

''لو یہ کونسا مشکل کام ہے میری جان'

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

منوچہر بن جاؤ۔''

میرے پورے وجود میں آگ سلگ اٹھی تھی' غصے کی شدت سے میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا' ابرانوس کا ہلکا سا قہقہہ میرے کانوں میں ابھرا تھا پھر اس نے کہا

''دیکھو دوست' مجھے یقین ہے کہ تم عادت کے مطابق مجھے برا بھلا کہنا شروع کردو گے' لیکن ایک بات میں تمہیں بتادوں اگر ان میں کوئی بھی شخص تمہیں انگلی بھی لگاتا تو اس کے ہاتھ کی کوئی انگلی باقی نہیں رہتی۔''

''چلے جاؤ' میں کہتا ہوں چلے جاؤ' یار تم جن زادے ہو میں نے تو کبھی کسی جن زادے کے بارے میں ایسی بات نہیں سنی۔''

''چلو ٹھیک ہے' ایک منٹ میری جان میری بات سن لو۔''

''ابرانوس میں کچھ نہیں سننا چاہتا براہ کرم میرا پیچھا چھوڑ دو۔''

''میرے دوست' تمہیں پتہ ہے کہ بڑے بڑے عامل' عالم ہم جنوں کو قبضے میں کرنے کے لئے پتہ نہیں کتنی زندگی برباد کردیتے ہیں' مجھے بتاؤ میں نے تمہیں کب تکلیف پہنچائی ہے' کوئی جگہ تم مصیبت کا شکار ہوئے ہو' آرام کررہے ہو اچھی طرح سے' اس خوبصورت ملک کی سیاحت بھی کررہے ہو اور خاص طور سے اس حسین لڑکی کا قرب بھی تمہیں حاصل ہے' یہ دوسری بات ہے کہ تم فطرتاً احمق ہو' تم جانتے ہو کہ میں تم سے اتنی دور رہتا ہوں اس کی وجہ کیا ہے' میں تمہیں بداعتمادی کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتا' میں جانتا ہوں کہ تم جب بھی محسوس کرو گے تو تمہارے اندر ایک جھجک پیدا ہوجائے گی اور تم اپنی خواہشات کو وہ شکل نہیں دے سکو گے جو دینا چاہتے ہو' لیکن کسی مصیبت میں میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔''

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے ابرانوس۔''

''ٹھیک ہے کوئی ہرج نہیں ہے' میں تمہاری خواہش کے بغیر تمہاری مدد نہیں کروں گا' لیکن تم مجھے بتاؤ کہ تمہیں کہاں نقصانات اٹھانے پڑے ہیں۔ جب سے میرا اور تمہارا ساتھ ہوا ہے اور میں نے تم سے دوستی کا اظہار کیا ہے تم نے ہمیشہ مجھ سے بیزاری کا اظہار کیا ہے' میری اتنی سی خواہش کا بھی احترام نہیں کرتے' چلو ٹھیک ہے تمہاری مرضی ہے' میرا مشورہ یہ ہے کہ زندگی تو بڑی مختصر سی چیز ہے' تم اس سے لطف لو' مجھے بھی تمہاری دنیا بہت اچھی لگ رہی ہے' ویسے میں تمہیں آخری مشورہ یہی دے رہا ہوں کہ تم منوچہر بن جاؤ' دیکھو تو سہی یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟''

''تمہیں معلوم ہے کہ وہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟''

''یقین کرو نہیں' اب میں جن زادہ ہوں کوئی عالم کامل نہیں' یہ دنیا تو بہت وسیع ہے' ہم جنوں پر بھی پابندیاں ہوتی ہیں' ہم ہر ایک کے ذہن میں نہیں جھانک سکتے۔''

''وہ مجھ سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں جو صرف ان کے مفاد میں ہے۔ مجھے بھلا کیا ضرورت پڑی ہے؟''

''یار ہر چیز کی ضرورت نہیں ہوتی' زندگی کا کوئی مقصد بنے تو اس پر کام کرو' ورنہ تفریح لو۔''

''ٹھیک ہے' لیکن مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔''

''تمہاری مرضی ہے' میں تم سے الگ ہوجاتا ہوں اور اب تم جب تک مجھے آواز نہیں دو گے میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا' جاؤ نکل جاؤ یہاں سے جہاں دل چاہے چلے جاؤ' میں نے اپنی محبوبہ کو بھی تمہارے لئے چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ جب تم اس سے محبت کی باتیں کررہے تھے میں تم سے زیادہ دور نہیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لما' ایا مجھے'۔

''تم نے مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے ابرانوس' میں تم پر جب اعتماد کرتا ہوں تم غائب ہو جاتے ہو۔''

''نہیں اب میں تمہارا راستہ نہیں کاٹوں گا میرا وعدہ۔''

''تم کیا کرتے پھر رہے ہو اس دوران......'' لیکن میرے اس سوال کا ابرانوس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے اسے پھر پکارا' لیکن مجھے تھوڑی دیر کے بعد یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ اب یہاں موجود نہیں ہے' آخرکار میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے خود کو منوچہر تسلیم کر لینا چاہیئے' دیکھوں تو سہی یہ لوگ آخر مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔

وقت گزرتا رہا' شام کو تقریباً ساڑھے پانچ بجے میں نے غسل وغیرہ کیا' کینس کتنی ہی بار یاد آئی تھی' پتہ نہیں اس پر کیا بیت رہی ہوگی' اس نے باطش چنگیزی کی تلاش کے لئے اشتہار دیا تھا ہوسکتا ہے اسے اس اشتہار سے فائدہ ہو' وہ اپنا سراغ پالے گی تو اپنی راہ لے گی' مجھے اس سے کیا مل سکتا ہے' البتہ اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات دل میں گدگدی پیدا کر رہے تھے۔

کئی لڑکیاں میرے نزدیک آئی تھیں اور میں نے دل ہی دل میں ان کے بارے میں سوچا تھا لیکن آگے قدم بڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ ان لڑکیوں نے میری کافی پذیرائی کی تھی جن میں رکمنی' نتاشہ ورما اور نرمل شرما وغیرہ تھیں' لیکن بہرحال میں آگے بڑھ سکا تھا۔ اس کے علاوہ اب کینس میری زندگی میں آئی تھی' لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ خود اپنے حالات پر تو قادر نہیں تھا۔ بہرحال میں نے سوچ لیا تھا کہ اب منوچہر تسلیم کرلوں اپنے آپ کو۔ چالیس گھنٹے کے اندر اندر مجھے کوئی کام سرانجام دینا تھا' پتہ نہیں وہ کیا کام ہے۔

بہرحال ساڑھے آٹھ بجے تک کوئی میرے پاس نہیں آیا' مجھے تعجب ہوا تھا' آٹھ بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے جب دروازہ کھلا اور اس بار جو لوگ سامنے آئے وہ بالکل نئے لوگ تھے' لباس اور چہرے سے مہذب نظر آتے تھے۔ انہوں نے میرے قریب پہنچ کر مجھے حیرانی سے دیکھا پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

''آیئے۔'' میں ان کے ساتھ باہر نکل آیا' کچھ پوچھنا بالکل ہی بے مقصد تھا' آخرکار وہ مجھے اس کمرے میں لے آئے جہاں میں پہلے آچکا تھا' درمیان میں ایک بھاری بھرکم آدمی بھی موجود تھا' اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالی اور پیکٹ میری طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

''سگریٹ پلیز......''

''نہیں شکریہ'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا اپنے بارے میں؟''

''ٹھیک ہے' میں منوچہر ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن آپ کا یہ انداز تو اس قسم کا اظہار کرتا ہے جیسے آپ اپنے آپ کو منوچہر نہ سمجھتے ہوئے بھی اپنے آپ کو منوچہر کہنا چاہتے ہوں۔''

''میں اس موضوع پر بات نہیں کروں گا۔''

''آپ کے بارے میں فانوس سے بھی معلومات حاصل کرلی ہیں۔''

''بس میں اب اور کچھ نہیں کہوں گا اس سلسلے میں۔''

''خیر آپ کو علم ہے کہ آپ کو کیا کرنا ہے؟''

''میری یادداشت اچانک کچھ خراب ہوگئی ہے' براہ کرم آپ لوگ مجھے دوبارہ بتادیجیئے''

''اگر ہم آپ کو اس کام کے بارے بتادیتے ہیں تو کیا آپ ہمارے لئے وہ کام کرنے کو تیار ہو جائیں گے؟''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''ہاں میرا وعدہ ہے۔''

''آپ کو آدھا معاوضہ ادا کیا جا چکا ہے' باقی آدھے معاوضے کے بارے میں بھی آپ کیا کہتے ہیں؟''

''وہ بھی مجھے دے دیں تو اچھا ہے' لیکن ابھی نہیں جب آپ کا کام ہو جائے اس کے بعد' بس میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اس کمرے میں قید نہ رکھا جائے۔ آزادی دی جائے۔''

''ٹھیک ہے' لیکن آپ سچائی سے ہمارا کام کرنے پر رضامند ہو جائیں تب۔''

''اس کا اظہار میں کیسے کر سکتا ہوں۔؟''

''ہاں...... بتایا جاتا ہے آپ کو۔'' اس نے کہا اور میز پر رکھی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ کہیں دور گھنٹی بجنے کی آواز ابھری تھی اور اس کے بعد وہ لوگ ایک تابوت لے کر اندر آئے' میں نے حیرت سے اس تابوت کو دیکھا تھا' پھر انہوں نے تابوت کا ڈھکن دیکھا اور میرے پورے بدن میں گرم لہریں دوڑ گئیں۔ تابوت میں لیٹا ہوا شخص میرا ہمشکل تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں خود بھی اپنے کسی ہمشکل کو دیکھ رہا تھا۔ میرے منہ سے آواز نہ نکل سکی' میں نے حیرانی سے کہا۔

''کیا یہ مر چکا ہے؟''

''ہاں افسوس اسے ہلاک کر دیا گیا ہے؟'' اس شخص نے کہا اور گنجے نے تابوت میں لیٹے ہوئے شخص کے سینے سے کپڑا ہٹا دیا۔ اس کے سینے میں گولی کا نشان صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

''مگر یہ ہے کون؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔

''منوچہر......'' بھاری بھرکم شخص نے کہا اور میرے سر میں کھجلی ہونے لگی' وہ شخص چند لمحات پر خیال انداز میں ایک دیوار کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

''یہ حقیقت ہے مائی ڈیئر احتشام شامی کہ یہ شخص منوچہر ہی ہے اور اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔''

''گویا اب میں منوچہر نہیں ہوں۔؟'' میں نے سوال کیا

''نہیں لیکن...... آپ اس سے کتنے ملتے جلتے ہیں اس کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے' اسے قتل ہوئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہو چکے ہیں' اس کے بدن کو قدیم مصری طریقے سے حنوط کر دیا گیا ہے۔''

''جی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

تابوت کا ڈھکنا بند کر دیا گیا' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے' بہرحال میں نے کہا۔

''اگر منوچہر مر چکا ہے تو آپ لوگوں کو یقین آ گیا ہو گا کہ میں نے آپ سے سچ بولا تھا۔'

''لیکن آپ کی صورت حیرت انگیز طور پر منوچہر سے ملتی جلتی ہے۔''

''اب اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''ہم ایک بار پھر آپ کو تکلیف دینا چاہتے ہیں۔ آپ کے چہرے پر میک اپ تلاش کیا جائے گا۔''

''تلاش کریں تلاش کریں۔'' میں نے کہا اور اس کے بعد وہ لوگ نجانے کیا کیا کرتے رہے' آخر میں میک اپ ایکسپرٹ نے کہا۔

''نہیں جناب یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

''آپ ایسا کریں کھال اتار کر اور دیکھ لیں' ممکن ہے کھال کے نیچے سے کوئی اور چہرہ برآمد ہو جائے۔'' میں نے طنزیہ کہا۔

''آپ کے ساتھ اب تک جو واقعات پیش آئے ہیں مسٹر شامی' ہم ان کے لئے معافی چاہتے ہیں' تاہم آپ نے خود دیکھ لیا کہ ہماری غلط فہمی بجا تھی۔''

''بڑی دلچسپ بات ہے کہ جب میں نے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اپنے آپ کو منوچہر تسلیم کرلیا تب آپ یہ بتارہے ہیں کہ میں منوچہر نہیں ہوں۔''

''ہاں ہم اپنی غلطی کو تسلیم کرچکے ہیں۔'' بھاری بھرکم شخص نے جواب دیا۔

''گڈ...... تو پھر اب میرے لئے کیا حکم ہے؟'' میں نے کہا اور بھاری بھرکم شخص اپنا داہنا گال کھجانے لگا' پھر بولا۔

''منوچہر ہمارے لئے ایک انتہائی اہم شخصیت تھی' ہم ایک ایسا کام کرنا چاہتے تھے جو ایران حکومت کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے' منوچہر بھی ہماری حکومت کا آدمی نہیں تھا' بلکہ وہ ایک ایسا شخص تھا جو معاوضہ لے کر ہر قسم کے کام کردیا کرتا تھا' البتہ وہ ایرانی نژاد تھا اس لئے ہمارا کام کرنے کے لئے دل سے آمادہ ہوگیا تھا اور اس نے ہمارا پیش کردہ معاوضہ بھی قبول کرلیا تھا' مسٹر احتشام' آپ کی مالی حیثیت کیا ہے ہم نہیں جانتے' لیکن اگر آپ ہماری تھوڑی سی مدد کردیں تو ہم آپ کو انتہائی گراں قدر معاوضہ دیں گے اور جس کی آدھی رقم حسب روایت آپ کو اسی وقت ادا کی جاسکتی ہے۔'' اس نے اپنی میز کی دراز میں ہاتھ ڈالا اور ایرانی کرنسی کی بہت سی گڈیاں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔

''یہ اتنی رقم ہے کہ آپ اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ مالی آسودگی میں بسر کرسکتے ہیں۔''

''خوب......'' میں نے گڈیوں پر ہاتھ رکھ دیا' مجھے خوشی بھی ہوئی تھی' وہ سب خوش ہوگئے۔

''آپ کا بے حد شکریہ مسٹر شامی' ہر عقل مند آدمی یہی فیصلہ کرتا اور اب آپ ہمارے بہترین دوستوں میں سے ہیں' ہمارے ہی نہیں بلکہ حکومت ایران کے دوستوں میں' اس منظوری کے بعد آپ کی حیثیت تبدیل ہوگئی ہے اور اب آپ ایک معزز مہمان کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

بہرحال میں نے تمام گڈیاں اپنی جیبوں میں ٹھونس لیں' بھاری بھرکم شخص نے کہا۔

''آپ آرام کیجئے' آپ سے دوسری ملاقات بہت جلد کی جائے گی۔'' عمارت وہی تھی' لیکن کمرہ دوسرا تھا جو پہلے کمرے سے کہیں زیادہ کشادہ اور خوبصورت تھا۔ میں نے نوٹوں کی گڈیاں دیکھیں اور گہری سانس لے کر رہ گیا' بہت بڑی رقم تھی پتہ نہیں آگے کیا ہونے والا ہے۔ بہرحال تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ شخص اندر آیا اور مسکرا کر مجھ سے بولا۔

''میرا نام عدیلی ہے' آپ مجھے عدیل کہہ سکتے ہیں' آپ سے کچھ معلومات کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی بتایئے۔''

''آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟''

''میں آپ کو بتاچکا ہوں اس بارے میں۔''

''بہرحال آپ ایران کب تشریف لائے؟''

''چند دن قبل۔''

''آمد کی وجہ۔؟''

''آپ یقین نہیں کریں گے۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے' بتایئے پلیز۔''

میں نے پوری تفصیل سے اسے یہاں تک آنے کی کہانی سنادی' وہ حیران نگاہوں سے میری صورت دیکھتا رہا' پھر بولا۔

''گویا آپ کا کوئی پیشہ کوئی مصروفیت نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''میں آپ سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ البتہ یقین کئے لیتا ہوں' آپ یہ سمجھ لیجئے کہ اب ایران میں آپ ایک غیر معمولی مہمان کی حیثیت سے تسلیم کرلئے جائیں گے اور کوئی آپ سے یہ سوال نہیں کرے گا کہ آپ غیر قانونی طور پر یہاں داخل ہوئے ہیں' دوسری بات یہ کہ آپ کا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اگر کوئی مالی مفاد یہاں سے وابستہ ہے اور ایرانی حکومت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا' تب بھی ہم آپ سے بھرپور تعاون کریں گے' میں پوری نیک نیتی سے آپ سے یہ الفاظ کہہ رہا ہوں آپ سے' آپ وہ سب کچھ نہ کریں اور یہاں سے چلے جائیں' لیکن ہم آپ کی ہر طرح مدد کریں گے۔''

''ٹھیک ہے' میں نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے وہ بالکل درست ہے۔''

''چلئے بات ختم ہوگئی' اب میں آپ کو آپ کے کام کی تفصیل بتادوں' لیکن یہ ایرانی حکومت کا گہرا راز ہے۔ آپ کا کام صرف اتنا ہوگا مسٹر شامی کہ آپ کو حکومتِ ایران کے خلاف ایک اہم راز حاصل کرنا ہے' اس کی تفصیل یوں ہے کہ ایک خاتون ہیں جن کا نام حریمہ ازلہ ہے' حریمہ ازلہ بے شک ایرانی شہریت رکھتی ہیں' لیکن یہ بات حکومت کے ریکارڈ میں آچکی ہے کہ وہ کچھ غیر ملکی قوتوں کے لئے کام کررہی ہیں' حکومت ایران کا ایک راز وزارت داخلہ سے چوری ہوگیا ہے جس میں حریمہ ازلہ کا ہاتھ بتایا جاتا ہے اور اب یہ بات پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی ہے کہ خاتون حریمہ ازلہ ایک شخص کی منتظر ہیں جسے اس راز کو ٹھکانے لگانے کا کام انجام دینا ہے اور اس شخص کا نام یوسف عارض ہے' یوسف عارض جو نسلاً ایرانی ہی ہے' لیکن نوعمری ہی کے زمانے میں ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ اب یہی شخص اس راز کو دشمن ملک کے ہاتھوں فروخت کا ذریعہ بنے گا۔ خاتون حریمہ ازلہ اس کا انتظار کررہی ہیں ہم ان پر بظاہر تو ہاتھ نہیں ڈال سکے کیونکہ خود ان کی شخصیت بھی مستحکم ہے اور ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے' لیکن یوسف عارض کو ہم نے یوگوسلاویہ سے گرفتار کرلیا اور اب وہ ہمارا قیدی ہے' دلچسپ بات یہ ہے کہ یوسف عارض منوچہر کا ہمشکل تھا اور آپ ان دونوں کے ہمشکل' گویا جو کام ہم منوچہر سے لینا چاہتے تھے اب آپ کو وہ کام انجام دینا ہوگا' آپ کو اس سلسلے میں تھوڑی سی ریہرسل کرادی جائے گی اور اس کے بعد آپ کو ایک شاندار پارٹی میں شریک ہونا پڑے گا۔ جس میں آپ کی ملاقات خاتون حریمہ ازلہ سے ہوگی' تمام تفصیلات آپ کو بتادی جائیں گی اور اب آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ آپ جلد از جلد اپنے آپ کو اس کام کے لئے تیار کرلیں۔''

''میں تیار ہوں۔''

''شکریہ۔ تھوڑی دیر کے بعد کچھ لوگ آپ کے پاس پہنچ جائیں گے جو آپ کو مکمل بریف کردیں گے' مجھے اجازت دیجئے۔''

''میرے پاس یہ رقم محفوظ ہے میں اسے بینک میں رکھوانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے دے دیجئے میں فوراً اس کا بندوبست کردوں گا۔''

بہرحال مجھے اس پر بھروسہ کرنا ہی تھا' میں ان دلچسپ واقعات پر غور کرتا رہا' مزید کچھ دیر کے بعد ایک دراز قامت عورت جس کی عمر چالیس سے اوپر تھی' لیکن جو اپنے بدن کی بناوٹ اور حسین نقوش کی بناء پر اس عمر میں بھی دلکش لگتی تھی میرے پاس آگئی اور مؤدب لہجے میں بولی۔

''آیئے میں آپ کو بریفنگ روم میں لے چلوں۔''

میں عورت کے ساتھ چل پڑا اور عمارت کے اوپری حصے میں پہنچ گیا' جہاں ایک بہت بڑا ہال بنا ہوا تھا' ہال میں تین افراد موجود تھے' ایک طرف ایک بڑا اسکرین لگا ہوا تھا اور اس کے سامنے پروجیکٹر رکھا ہوا تھا۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ تیسرے آدمی نے پروجیکٹر آن کردیا اور تھوڑی دیر کے بعد اسکرین پر ایک چہرہ نظر آیا۔

''یہ خاتون حریمہ ازلہ ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے حریمہ ازلہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے بارے میں مختصر تفصیل بھی بتائی کہ وہ ایران کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے زبردست تعلقات ہیں پھر مجھے یوسف عارض کی شکل دکھائی گئی اور میں واقعی بہت حیران ہوا کہ وہ شخص ہر طرح سے میرا ہمشکل تھا' اس کے بعد اس کے بارے میں ایک فلم چلنے لگی جس میں اسے کھاتے ہوئے بولتے ہوئے سوتے ہوئے دکھایا گیا تھا' کئی بار یہ فلم دکھائی گئی اور مجھ سے کہا گیا کہ میں اسے اپنے ذہن میں اتار لوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' مجھے اس کی آواز بھی سنائی دی تھی' میری اور اس کی آواز میں فرق ضرور تھا لیکن اتنا نہیں اگر میں تھوڑی سی محنت کر کے بولنے کی کوشش کرتا تو ناکام نہ رہتا۔ بہرطور مختلف طریقوں سے مجھے اس سلسلے میں بتایا گیا پھر اس شخص نے کہا۔

''جی اب آپ کیا کہتے ہیں مسٹر یوسف عارض۔'' میں مسکرا دیا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' میں نے آواز بدلنے کی کوشش کی۔

بہرحال ابرانوس کا بھی یہی کہنا تھا کہ زندگی کو انجوائے کیا جائے اور میں اس کے لئے بالکل تیار ہو گیا' آخرکار وہ وقت آ گیا جب مجھے اس پارٹی میں شریک ہونا تھا۔ میں نے اس دوران مکمل طور پر اپنے آپ کو اس کام کے لئے تیار کر لیا تھا جو ریہرسل مجھے کرائی گئی تھی اسے میں نے مکمل طور پر ذہن نشین کر لیا تھا نجانے کیوں اس کام سے تھوڑی دیر پہلے مجھے کینس کا خیال آ گیا' پتہ نہیں اس پر کیا بیتی' اشتہار دینے کے بعد اس کا رابطہ باطش چنگیزی سے ہوا یا نہیں' خیر میرا تو کھیل ہی بدل گیا تھا' آخرکار وہی دراز قامت عورت جس سے اس عمارت میں ملاقات ہوئی تھی میرے پاس آئی اور مجھے چلنے کے لئے کہا۔

''آپ کی شخصیت بے حد خوبصورت ہے مسٹر یوسف عارض' لیکن آپ کے لئے ایک بہت ہی اچھے لباس کا انتظام کیا گیا ہے۔''

میں نے لباس پہنا اور وہ عورت میرے پاس آ گئی' پھر اس نے ایک مخصوص قسم کا پرفیوم میرے لباس پر لگایا اور بولی۔

''یہ یوسف عارض کا پسندیدہ پرفیوم ہے اور خاتون ازلہ یہ بات جانتی ہیں۔''

''ان کے درمیان کیا تعلقات تھے؟''

''یہ میں نہیں جانتی۔''

''حالانکہ یہ بات جاننا ضروری تھی۔''

''آپ کو خود بھی اندازہ ہو جائے گا ویسے اس وقت ان کی عمر تقریباً باون سال ہے''

''ارے واہ تب ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس پڑی۔ پھر اس نے اپنے لباس سے چند انگوٹھیاں نکال کر میرے ہاتھوں میں ڈال دیں۔

''یہ یوسف عارض کی ہیں۔'' بہرحال میں تیار ہو گیا اور وہ کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھ کر بولی۔

'آپ تشریف لے آیئے' آپ کے کام کا آغاز ہو چکا ہے۔''

باہر ایک بہت ہی خوبصورت کار کھڑی ہوئی تھی جس میں ڈرائیور موجود تھا' کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی اور جب گیٹ پر پہنچی تو کسی سمت سے وہ بھاری بھرکم آدمی آ گیا جو اب تک میرا بہترین ساتھی رہا تھا اس نے مجھے خدا حافظ کہا اور ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی' ایران سے میں بہت اچھی طرح واقف نہیں تھا لیکن کچھ راستے میرے جانے پہچانے تھے' جس راستے پر میری کار مڑی اس طرف میں پہلے نہیں آیا تھا' بہت سفر طئے ہوتا رہا اور پھر وہ ایک ایسے خوبصورت علاقے میں پہنچ گئی جسے انتہائی شاندار لوگوں کی رہائش گاہ کہا جا سکتا تھا' اعلیٰ طرز کی کوٹھیاں اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں ان کے آگے دربان

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اور کتے گشت کر رہے تھے' آخر کار گاڑی اسی علاقے کی ایک کوٹھی میں پہنچ گئی جہاں کافی رونق نظر آ رہی تھی۔

گیٹ پر دربان کھڑے ہوئے تھے۔ اندر ایک وسیع و عریض لان بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ بے شمار کاریں پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہوئی تھیں اور بہت بڑے سوئمنگ پول کے کنارے بکھری ہوئی گھاس پر میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ڈرائیور نے کار روکی اور نیچے اتر کر دروازہ کھول دیا' میں نیچے اتر آیا۔ فوراً ہی سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک آدمی نے میرا استقبال کیا اور میں نے جیب سے وہ کارڈ نکال کر اس کے سامنے کر دیا جو چلتے وقت میرے حوالے کیا گیا تھا' اس نے مؤدبانہ انداز میں گردن خم کی اور مجھے اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا' پھر اس نے وہاں کھڑے ہوئے لوگوں سے کہا۔

''جناب یوسف عارض۔'' میں نے مسکرا کر گردن خم کی اور لوگوں کے ہجوم کی جانب بڑھ گیا۔ تاحد نگاہ حسن ارزاں بکھرا ہوا تھا' سوئمنگ پول میں خاص طور سے رنگین پانی ڈالا گیا تھا' اس کی تہہ میں برقی قمقمے جگمگا رہے تھے' ہر طرف نوجوان جوڑے مصروف گفتگو تھے۔ مجھے اس بات کا خدشہ بھی تھا کہ کہیں یوسف عارض کے دوسرے شناسا بھی یہاں موجود نہ ہوں۔ مجھے اس کی شخصیت کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا' لیکن جس حد تک معلومات ہو سکی تھیں وہ یہ تھیں کہ وہ کہیں باہر سے آیا ہے اور خاتون حریمہ ازلہ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔

ایک ویٹر نے شراب کا جام میرے ہاتھ میں تھما دیا اور میں نے ایک گوشہ اپنا لیا۔

مجھے اب کسی شناسا کی تلاش تھی جو مجھے میرے نزدیک پہنچ کر مخاطب کرے' لیکن اس کے ساتھ ہی میری نگاہیں حریمہ ازلہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ فلم کے ذریعے میں نے انہیں اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ خواتین کے غول ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے' لیکن ان میں ابھی تک خاتون حریمہ نظر نہیں آئی تھیں' ہو سکتا وہ ابھی یہاں آئی ہی نہ ہوں' میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا جام ایک گملے میں خالی کر دیا اور اس کے بعد معزز مہمانوں کے درمیان چکراتا رہا' تھوڑی دیر کے بعد مجھے خاتون حریمہ ازلہ نظر آ گئیں' بہت ہی نفیس قسم کے لباس میں تھیں' چہرے پر گہرا میک اپ تھا' آنکھیں بہت حسین اور بے حد کشادہ تھیں' وہ کچھ خواتین سے گفتگو کر رہی تھیں' میں ان کی شناخت کے بعد اپنے لئے جگہ متعین کرنے لگا جہاں میں ان سے ملاقات کر سکتا تھا اور یہ اتفاق ہی تھا کہ انہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا اور تیر کی طرح میری طرف بڑھیں' گویا وہ مجھ سے آزادانہ طور پر ملاقات کر سکتی تھیں' پھر وہ میرے قریب آ گئیں' میں نے مسکرا کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

''کتنی دیر سے میری نگاہیں تمہیں تلاش کر رہی تھیں یوسف' کہاں چھپے ہوئے تھے؟''

''میں بھی آپ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔''

''بہت اسمارٹ ہو گئے ہو پہلے سے کہیں زیادہ۔''

''اور آپ اپنے بارے میں کیا کہتی ہیں؟''

''جیسی تھی ویسی ہی ہوں۔''

''لیکن مجھے جب بھی نظر آتی ہیں' پہلے سے زیادہ حسین اور جوان نظر آتی ہیں۔''

''او ہو شرارتیں بھی سیکھ گئے ہو' تمہاری بے باکی مجھے پسند آئی' آؤ بیٹھیں' بہت دیر سے یہ لوگ مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔''

''جو حکم۔'' میں نے گردن خم کرتے ہوئے کہا اور ہم ایک میز کی طرف بڑھ گئے' میز کے قریب پہنچ کر میں نے ایک کرسی کو گھسیٹا اور وہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بڑے ناز سے بیٹھ گئیں' میں ان کے سامنے ہی دوسری کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

''سب خیریت تو ہے نا' کم از کم مجھے اپنے پہنچنے کی اطلاع تو دے دیتے' میں انتظار کرتی رہی۔''

''اس کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔''

''کوئی دقت پیش آ گئی تھی۔؟'' حریمہ ازلہ نے تشویش کے انداز میں پوچھا۔

''نہیں' اس کے باوجود احتیاط ہماری زندگی ہے۔''

''ہاں اور تم جیسا انسان اپنے اطراف سے ہمیشہ چوکنا رہتا ہے۔ بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر۔''

''مجھے بھی۔''

''میں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی اور اب مجھے جلد ہی تمہیں وہ راز دینا ہے۔''

''بلاشبہ۔''

''تیاریاں مکمل ہیں۔ میرا مطلب ہے متعلقہ افراد سے بات چیت ہوگئی ہے۔''

'ظاہر ہے اس کے بغیر میں آپ کے پاس کیسے آسکتا تھا؟''

''تو پھر کسی جگہ کا تعین کرو اور ہاں قیام کہاں ہے؟''

''ایک پرائیویٹ رہائش گاہ میں۔ ہوٹل میرے لئے ناموزوں ہوتے ہیں۔''

''مجھ سے کب ملاقات کرو گے؟''

''جب آپ حکم دیں۔''

''ٹھیک ہے کل صبح گیارہ بجے میں اپنی رہائش گاہ پر تمہارا انتظار کروں گی۔''

''میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

اسی وقت ایک کوتاہ گردن کا آدمی خاتون حریمہ کے پاس پہنچ گیا اور وہ مجھ سے معذرت کر کے اٹھ گئیں' ہمارے درمیان پروگرام طئے ہوگیا تھا' اب یہ دوسری بات ہے کہ مجھے ان کی رہائش گاہ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا لیکن اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی' کافی دیر تک میں وہاں رکا اور اس کے بعد موقع پاتے ہی وہاں سے باہر نکل آیا۔

وہ کار پارکنگ لاٹ سے باہر نکل گئی تھی چنانچہ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا' ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ دفعتہً لائٹ چلی گئی اور گھپ اندھیرا پھیل گیا اس کے ساتھ ہی ایک موٹا کمبل میرے اوپر آپڑا اور بہت سے ہاتھوں نے مجھے دبوچ لیا۔ میرے حواس ایک لمحے کے لئے گم ہوگئے تھے۔ مجھے پر کمبل ڈال کر دبوچنے والے کئی افراد تھے۔ میری ہر جدوجہد بیکار رہی' انہوں نے مجھے کمبل سمیت اٹھایا اور وہاں سے چل پڑے' میرا دم گھٹا جا رہا تھا' مہمانوں میں شور وغل کی آوازیں بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں' پھر مجھے کسی گاڑی میں ٹھونس دیا گیا اور گاڑی اسٹارٹ ہو کر چل پڑی' وہ لوگ اب بھی مجھے دبوچے ہوئے تھے' گھٹن اس قدر شدید تھی کہ آنکھوں میں شدید اندھیرا چھانے لگا اور رفتہ رفتہ ہوش وحواس رخصت ہوگئے۔

نجانے کتنی دیر کے بعد ہوش آیا اور ہوش آیا تو روشنی نظر آئی' اس روشنی میں میں نے چھت پر لگی ہوئی اس دائرے نما ٹیوب لائٹ کو دیکھا جس سے ٹھنڈی روشنی خارج ہو رہی تھی' حالات آہستہ آہستہ ذہن میں جاگے تو یہ محسوس کرنے کی کوشش کی کہ گاڑی میں ہوں یا باہر نکل آیا ہوں' لیکن صحیح اندازہ نہیں ہو پایا' البتہ یہ ضرور احساس ہوا کہ یہ ٹیوب لائٹ گاڑی کی تو ہو نہیں سکتی' نہ ہی بدن کو ہچکولے لگ رہے تھے بلکہ اب میں ایک آرام دہ مسہری پر پڑا ہوا تھا۔

واقعات مزید یاد آئے تو بے اختیار اچھل کر بیٹھ گیا۔ تبھی میری نگاہ ان تین افراد پر پڑی جو قطار کی شکل میں بت بنے بیٹھے تھے' یہ غالباً مقامی ہی آدمی تھے' بھاری بھرکم جسموں کے

Downloaded from Paksociety.com

مالک لیکن ان کے چہروں سے کوئی خاص اندازہ نہیں ہوتا تھا' میں انہیں دیکھتا رہا' سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہوا ہے۔ شدید جھنجھلاہٹ ذہن پر سوار ہونے لگی تو میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ان تینوں افراد کی نظریں مشینی انداز میں میرے چہرے کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھیں۔

''کیا یہ پاگل خانہ ہے؟'' میں نے سوال کیا' لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا' تب میں آگے بڑھ کر ان کے قریب پہنچا اور وہ تینوں بوکھلائے ہوئے انداز میں کھڑے ہوگئے۔ پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکے اور پھر سیدھے ہوگئے۔

''میں نے پوچھا تھا کہ کیا یہ پاگل خانہ ہے؟''

''نہیں۔'' ان میں سے ایک نے خوفزدہ سے لہجے میں کہا۔

''تو تم تینوں پاگل ہو۔؟''

''نہیں بالکل نہیں' ہم تینوں بھی صحیح الدماغ ہیں۔''

''یہ کونسی جگہہ ہے اور مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

''یہ سب سے مناسب جگہہ ہے اور ہم سب تمہارا احترام کرتے ہیں۔''

''فضول بکواس مت کرو اور یہ بتاؤ کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے' اگر تم نے جواب نہیں دیا تو اس کا جواب جو کچھ بھی ہوگا اس کی ذمے داری تم پر ہوگی۔''

''اس کا جواب میں دوں گا تمہیں۔'' دروازے سے آواز آئی اور ایک شخص اندر داخل ہوگیا' میں نے اسے دیکھا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ ڈاکٹر جین تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی' اس کے پیچھے بھی دو افراد تھے جو دروازے پر رک گئے تھے۔

''تم کون ہو؟'' میں نے ایک دم اپنے لئے لائحہ عمل مرتب کرلیا' میں سوچ رہا تھا کہ کیا ڈاکٹر جین اس طرح کی حرکات کرسکتا ہے' آخر یہ چاہتا کیا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اس سے اجنبیت کا اظہار کرتا رہوں۔ ڈاکٹر جین نے ان تینوں افراد کو پیچھے ہٹا دیا جو میرے سامنے کھڑے ہوئے تھے' پھر بولا۔

''ہاں آرام سے بیٹھ جاؤ اور مجھ سے بات کرو۔''

''میں پوچھتا ہوں کہ تم نے ایک مہذب اور شریف انسان کو اغواء کرنے کی جرأت کیسے کی؟''

''تمہاری تہذیب اور شرافت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے' لیکن میں تم سے ایک بات ضرور کہوں گا کہ جو کچھ تم ہو اس کے بارے میں مجھے معلوم ہے' ہاں اگر تم مجھ سے تھوڑا سا تعاون کرو تو بات بن سکتی ہے۔''

''فضول باتوں سے گریز کرو اور مجھے جانے دو۔''

''نہیں میرے عظیم رہنما' مجھے تیری رہنمائی کی ضرورت ہے' تو جانتا ہے کہ میں نے ساری زندگی تحقیق میں گزاری ہے اور تیرے بارے میں میری تحقیق بڑی عجیب وغریب ہے۔'' اس نے کہا اور میں حیران رہ گیا' سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ بدبخت مجھ سے کیا چاہتا ہے' میں نے کہا۔

''کیا تم سب پاگل ہو؟''

''ہاں...... تو نہیں جانتا کہ تاریخ کی کتاب میں تیرا تذکرہ کس انداز میں کیا گیا ہے' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی تجھ تک پہنچ سکتا ہوں۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ تجھے کہ تمہیں ہوا کیا ہے' اچھا خیر چھوڑو' کیا چاہتے ہو مجھ سے یہ بتاؤ۔''

''بس تیرے بارے میں میری جو معلومات ہیں وہ بڑی عجیب وغریب ہیں' تیرا ظہور تیرہ سو پچھتر قبل مسیح میں ہوا تھا اور تیرہ سو پچیاسی قبل مسیح

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لے عقیدۂ توحید میں تو پیدا ہوا تھا۔ کیا سمجھا؟''

''میں تو کچھ نہیں سمجھا' لیکن میں تجھے ضرور سمجھا دوں گا۔'' میں نے کہا اور اس طرح کھڑا ہو گیا کہ ڈاکٹر جین کو احساس بھی نہ ہو سکا ہاں اب میری لات اس کے پیٹ پر پڑی تو اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی' میری لات سے وہ دور جا گرا اور میں نے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی اور باہر نکل آیا' خوش قسمتی تھی کہ کسی نے راستے میں مزاحمت کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اور میں بھاگتا رہا' راستے بند نہیں تھے' میں عمارت سے باہر نکل آیا' سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا۔ دوڑنے سے لباس بے ترتیب ہو گیا تھا' ایک جگہ رک کر میں نے وحشت زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور دل میں سوچا کہ کہاں جاؤں کیا کروں۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟'' میرے ذہن میں ابرانوس کی آواز ابھری اور میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''یہ سوال میں نے تم سے نہیں کیا؟''

''تمہاری جیبیں مقامی کرنسی سے بھری ہوئی ہیں' پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے' تمہارا دوست جو تمہارے ساتھ ہے۔''

''لعنت بھیجتا ہوں تمہاری دوستی پر تم میرے بدترین دشمن ہو۔''

''کمال کے انسان ہو یار میں نے کیا قصور کیا ہے۔؟''

''اگر تم انسانی شکل میں میرے سامنے آ جاتے تو شاید میرے ہاتھوں سب سے پہلا قتل تمہارا ہی ہوتا۔''

''چلو ٹھیک ہے میں انسانی شکل میں نہیں ہوں' مگر تمہاری نفرت کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''تم نے میری زندگی تلخ کر کے رکھ دی ہے۔''

''میرا خیال تھا کہ میں نے تمہاری زندگی میں دلچسپیاں پیدا کر دی ہیں۔''

''میں نے کہا نا میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔''

''اچھا...... اب میں اور کیا کہہ سکتا ہوں تم سے؟''

''کہو گے کیا' تم نے میری ذات کو کچل کر رکھ دیا ہے' تم میری شخصیت پر حاوی ہو گئے ہو' ایک قدم بھی میں تمہاری مرضی کے بغیر نہیں اٹھا سکتا۔ جب میں کیا کہوں تم سے اور کیا نہ کہوں۔''

''ٹھیک ہے اب تم بتاؤ کیا چاہتے ہو؟''

''سب سے پہلے تم سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''تمہاری مرضی ہے تمہیں پتہ ہے کہ لوگ کسی جن کو قابو میں کرنے کے لئے کیا کیا کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ٹھیک ہے اب میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا' وعدہ کرتا ہوں۔'' اس کی آواز معدوم ہو گئی' میں تھوڑی دیر تک اپنی جگہ کھڑا رہا' میری زندگی میں اب تک جو کچھ بھی ہوا تھا اس نے مجھے یہ قوت ضرور بخش دی تھی کہ میں حالات سے سمجھوتہ کر لیتا تھا' بہرحال میں گردن جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد یہ تصور ذہن میں بیدار ہو گیا کہ اب کیا کروں' میرے لئے ایران میں سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ بلاوجہ کے دشمن بن گئے تھے جو میری تاک میں تھے' آخرکار جب کسی خیال کے تحت میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ہاتھ نوٹوں کی گڈیوں سے ٹکرایا اور میں نے اسے مٹھی میں بھینچ لیا۔ اس سے قبل یہ میری جیب میں نہیں تھی اور مجھے ابرانوس یاد آ گیا' ظاہر ہے یہ اسی کا کارنامہ تھا' دل چاہا کہ گڈی نکال کر باہر پھینک دوں' لیکن پھر عقل نے ساتھ دیا میں نے دوسری جیبیں ٹٹولیں' اچھی خاصی کرنسی موجود

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تھی‘ یہ کرنسی کم از کم مجھے یہاں قدم جمانے کا موقع دے گی‘ چنانچہ میں نے اسے محفوظ کرلیا۔ خدشات تو بے پناہ تھے لیکن کیا کرتا میرے شناساؤں کی تعداد کافی بڑھ چکی تھی اور کوئی بھی مجھے مل سکتا تھا‘ خطرہ مول لئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

ایک بازار سے میں نے کچھ چیزیں خریدیں‘ لباس شیونگ بکس سوٹ کیس وغیرہ وغیرہ اور اس کے بعد ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر چل پڑا۔ نجانے کیوں ذہن میں فانوس ہی کا خیال آیا تھا۔ جانا پہچانا ہوٹل تھا‘ لیکن فانوس کے خیال کے ساتھ ہی کینس کی یاد آئی‘ پھر ایک مصیبت گلے پڑ جائے گی‘ لیکن ٹیکسی ڈرائیور کو فانوس کا پتہ بتا چکا تھا‘ تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی فانوس کے کمپاؤنڈ پہنچ کر رک گئی۔ میں اندر داخل ہوگیا اور پھر ایک اور کمرہ حاصل کرلیا‘ لیکن یہ کمرہ اس منزل پر نہیں تھا جس پر کینس ٹھہری ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں گھس کر میں نے دروازہ بند کرلیا اور فیصلہ کرلیا کہ جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزاروں گا۔ تھکے ہوئے جسم‘ تھکے ہوئے ذہن اور تھکے ہوئے اعصاب کو سکون دینے کے لئے میں نے فیصلہ کیا کہ مکمل آرام کروں‘ لیکن چند ہی لمحات کے بعد کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور اجازت پا کر ہوٹل کا ایک ملازم کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس نے میرا سامان وغیرہ الماری میں سجایا اور ٹپ وصول کر کے چلا گیا‘ ٹپ دیتے ہوئے میں نے پھر کرنسی نوٹوں کی گڈیوں کا اندازہ کیا جو میرے پاس موجود تھیں۔ کافی بڑی رقم تھی اور میں بڑے آرام سے فانوس جیسے ہوٹل میں قیام کرسکتا تھا۔

دو ڈھائی گھنٹے آرام کرنے سے ذہن کو کافی سکون ملا پھر میں نے روم سروس کو فون کر کے اپنے لئے کافی اور دوسری چیزیں طلب کیں اور تھوڑی دیر کے بعد کافی آ گئی۔ میں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا‘ بہتر ہے کہ یہاں سے نکل کر کسی اور جگہہ کا رخ کیا جائے‘ سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ میرے پاس پاسپورٹ وغیرہ نہیں تھے۔ پھر میں نے سوچا کہ مجھے کم از کم ایران سے باہر نکل جانا چاہیئے کیونکہ یہاں جس قسم کے شناسا پیدا ہوگئے تھے وہ مجھے سکون نہیں لینے دیں گے‘ آخر کار رات ہوگئی اور کمرے میں گھسے گھسے طبیعت اکتانے لگی تو میں نے باہر جانے کی ہمت کرلی‘ باہر تو نکلنا ہی ہوگا ہاں یہ دوسری بات ہے کہ اب میں کسی کی برتری قبول نہیں کروں گا۔ دیکھا جائے گا جو کچھ ہوگا۔ دیکھ لوں گا۔

ریفریشنگ ہال میں نکل آیا‘ ڈائننگ ہال کی ایک میز پر بیٹھ کر میں نے اپنے لئے ڈنر طلب کرلیا‘ پتہ نہیں کینس کا کیا ہوا‘ اسے بالطش چنگیزی ملا یا نہیں‘ ایک لمحے کے لئے خیال آیا کہ کینس میرے لئے خطرناک نہیں ہوگی‘ میں کیوں نہ اس سے ملوں‘ انسان کو ہمیشہ ہی کسی شناسا کی ضرورت ہوتی ہے‘ شناسا کے تصور سے ایک نام پھر ذہن میں ابھر آیا‘ اور میں ابرانوس کے بارے میں سوچنے لگا‘ کینس ڈائننگ ہال میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ اس کے کمرے تک پہنچنے کی کوشش کروں اور اس خیال نے اس قدر شدت اختیار کرلی کہ تھوڑی دیر کے بعد میں اپنی جگہہ سے اٹھ گیا۔ کینس کے کمرے کے سامنے پہنچ کر رکا۔

کمرہ تاریک تھا اور یقیناً دروازہ لاک ہوگا اس کا مطلب ہے کہ وہ اس وقت موجود نہیں ہوگی۔ پھر میں وہاں سے پلٹا اور اپنے کمرے کا رخ کیا۔ لیکن جب میں کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوا تو میری بدنصیبی میرا انتظار کررہی تھی۔ وہ دو افراد تھے جو دروازے کے نزدیک ہی کھڑے ہوئے تھے‘ مجھے دیکھتے ہی ان

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں سے ایک نے ایک عجیب سا پائپ نکال کر اس کا رخ میری طرف کیا اور ایک بٹن دبا دیا' اس میں سے زرد رنگ کی ایک پھوار نکلی اور سیدھی میرے چہرے پر پڑی' میں فوراً ہی پیچھے ہٹا لیکن ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں یہ احساس ہوگیا تھا کہ یہ پھوار خواب آور ہے' میں اپنے توازن کو نہیں سنبھال سکا اور سیدھا زمین پر آرہا' اس کے بعد کوئی احساس ہی نہ رہا' لیکن زندہ تھا اور ایک مسہری پر تھا اور سفید چھت پر ایک پنکھا گردش کرتا نظر آرہا تھا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی' میرے ساتھ تو یہ نجانے کتنی بار ہوچکا تھا' میں ادھر ادھر دیکھتا رہا' پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس واحد دروازے کے پاس پہنچ گیا جو لازمی طور پر باہر سے بند تھا۔ میں نے دروازہ بجایا اور دوسری طرف سے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی' پھر کسی نے کہا۔

''کیا بات ہے کیوں شور مچا رہے ہو؟''

''دروازہ کھول کر اندر آؤ۔'' میں نے کہا دوسری طرف خاموشی طاری رہی' لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا' ہاتھوں میں درد شروع ہوگیا تھا چنانچہ میں نے کسی ایسی چیز کی تلاش کی جس سے دروازہ بجانے میں آسانی ہو' اس مسہری کے علاوہ کمرے میں اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی' چنانچہ دو چار لاتیں دروازے پر رسید کرکے واپس مسہری پر آبیٹھا' کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے کہ آہٹیں سنائی دیں اور میں اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ آنے والے وہی دونوں افراد تھے جو مجھے اغواء کرکے یہاں لائے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول دبے ہوئے تھے' ان میں سے ایک نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمہیں یہاں لانے کا مسئلہ دوسرا تھا' اس وقت اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو ہم فائر کردیں گے۔''

''کیا چاہتے ہو تم لوگ؟''

انتخاب

ارسطو سکندر اعظم کو پڑھانے لگا تو سکندر اعظم جو شہزادہ تھا اکتا گیا۔ اس نے ارسطو سے پوچھا۔

''علم کے حصول کا کوئی راستہ آسان نہیں۔''

''ہمارے ملک میں دو قسم کے راستے ہیں۔'' ارسطو نے کہا۔ ''ایک قسم کچے اور دشوار راستوں کی ہے جن پر کسان، مزدور اور عام لوگ چلتے ہیں۔ راستوں کی دوسری قسم شاہی خاندان کے لیے مخصوص ہے۔ یہ راستے پکے اور خوبصورت ہیں۔ لیکن علم کی منزل تک ایک ہی راستہ جاتا ہے جس پر شاہ و گدا اکٹھا چلتے ہیں۔''

☆☆

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ مسند خلافت پر جلوہ فرما ہوئے تو پہاڑیوں کے دامن میں رہنے والے چرواہے نے پوچھا۔ ''مسلمانوں پر یہ کون صالح' پاکیزہ خصلت خلیفہ مقرر ہوا ہے۔؟''

راوی نے پوچھا: ''یہ بات تم لوگوں کو کیسے معلوم ہوئی۔؟''

چرواہے نے کہا: ''جب کوئی نیک اور صالح حکمران مسند نشین ہوتا ہے تو شیر اور بھیڑیے ہمارے جانوروں کو نقصان نہیں پہنچاتے۔''

☆☆

مار

بھول نہ پائے گی چپل کی مار کبھی
ایسا چرچا نہ ہوا تھا سر بازار کبھی
لاکھ حجاموں سے بال بنوائے مگر
ہوا نہ سر ایسا ہموار کبھی

☆☆

Downloaded from Paksociety.com

"آدمی بنو تو بتایا بھی جائے۔"

"بکواس کیوں کر رہے ہو میں تمہیں آدمی نظر نہیں آ رہا۔"

"تم اس وقت کاٹ کھانے والے کتے نظر آ رہے ہو۔" ان میں سے ایک نے کہا اور اچانک ہی میری ذہنی رو بھٹک گئی' میں نے غراتے ہوئے دانت نکالے اور آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اس کمبخت نے فوراً ہی فائر کر دیا' گولی میرے پیروں کے قریب فرش پر لگی اور پھر اچٹ کر نجانے کہاں چلی گئی۔ میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں دیکھا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ جارحیت پر آمادہ ہیں۔

"شرافت کے دائرے میں آ جاؤ' تمہارا مسئلہ ابھی حل ہو جائے گا۔"

"بولو وہ دائرہ کہاں ہے؟"

میرے لباس کی تلاشی وہ لوگ لے چکے تھے اس لئے میری طرف سے مطمئن تھے' میں نے جیبیں ٹٹولیں تو میری جیب میں کچھ بھی نہیں تھا' میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"تم نے میری رقم بھی نکال لی۔"

"وہ تمہاری امانت ہے واپس مل جائے گی۔ چلو چلو آگے بڑھو۔" ان میں سے ایک نے میری قمیص کا کالر پکڑ کر مجھے دھکا دیا اور پستول کی نال میری کمر کے ساتھ لگا دی' میں تن بہ تقدیر ہو کر چل پڑا۔

یہ بھی نئی عمارت نہیں تھی اور میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کونسی جگہ ہے' بہر حال میں نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا اور چلتا رہا' پھر میں ایک کمرے میں پہنچا۔ اس کی آرائش قابل تحسین تھی' جن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی وہ اجنبی تھے' ایک دراز قامت آدمی جس کا سر درمیان سے گنجا تھا اور وہ بہت لمبا تڑنگا تھا' لباس بھی انتہائی نفیس پہنے ہوئے تھا۔ دوسرا شخص بھی جو اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا یقینی طور پر ایرانی ہی تھا۔ یہ صورت میں میرے لئے اجنبی تھا۔ پھر اس شخص نے کہا۔

"بیٹھو۔"

"نہیں بیٹھوں تو۔؟"

"ٹھیک ہے' شریفانہ انداز میں گفتگو کرنے کے قائل نہیں ہو شاید۔؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تو اس کا بندوبست کئے دیتا ہوں۔" دوسرے آدمی نے کہا۔ جس میز کے سامنے وہ بیٹھا ہوا تھا اس کی نچلی سطح پر گھنٹی کا بٹن لگا ہوا تھا جو اس نے دبایا اور دور سے ایک آواز سنائی دی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد عقبی دروازے سے ایک آدمی اندر داخل ہوا' وہ دھاری دار بنیان اور سرخ پتلون میں تھا' بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ رہی تھیں' آنکھوں میں وحشت نظر آ رہی تھی۔ اندر داخل ہو کر اس نے گردن خم کی اور پھر سیدھا ہو کر بولا۔

"حکم میرے آقا۔"

"یہ کہتا ہے کہ شرافت سے گفتگو نہیں کر سکتا' تم اسے مجبور کر سکتے ہو۔؟"

"ایک منٹ میں باس۔" اس نے کہا۔

"ہوش و حواس میں رہ ورنہ' ورنہ......"

لیکن میں ورنہ ورنہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر برق رفتاری سے میرا گریبان پکڑا اور اس کے بعد کمبخت نے مجھے زمین سے تقریباً ایک فٹ اونچا اٹھا لیا۔

"ہاں اب کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"فی الحال صرف اتنا کہ مجھے نیچے اتار دو۔" میں نے کہا اور اس شخص نے ہنستے ہوئے مجھے وہیں چھوڑ دیا' میں نیچے گرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اس نے اپنا ایک پاؤں میری پنڈلی پر رکھ دیا۔

"اے اے کتے پیچھے ہٹ پیچھے ہٹ۔" میں نے کہا۔ پنڈلی درد سے ٹوٹی جا رہی تھی اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اب یہ درد ناقابلِ برداشت ہوگیا تو میں نے زمین پر لیٹے لیٹے دوسرے پاؤں کی ٹھوکر پوری قوت سے اس کی پنڈلی پر ماری' پتہ نہیں میرے اندر اتنی طاقت تھی یا اس وقت میں غصے سے دیوانہ ہوگیا تھا کہ وہ شخص ایک خوفناک دہاڑ کے ساتھ نیچے جاگرا اور اس کے بعد اپنی پنڈلی پکڑ کر بیٹھ گیا' اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس سے سیدھا کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ شاید اس کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی' لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ شدید تکلیف میں مبتلا ہے' میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور اپنا لباس درست کرنے لگا' میز کے نیچے سطح پر لگی گھنٹی دوبارہ بج گئی تھی۔ تین چار آدمی اندر داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے حیرت سے چیختے چلاتے ہوئے خوفناک آدمی کو دیکھا اور پھر میری طرف بڑھنے لگے۔

''اس کا دماغ درست کرو۔'' دراز قامت آدمی نے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ اب مجھے اپنے آپ کو بچانا بہت مشکل ہو جائے گا' چنانچہ جب وہ چاروں میری طرف بڑھے تو میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' میں تم سے بات کرنے کو تیار ہوں۔''

مجبور تھا' لاچار تھا کیا کر سکتا تھا چنانچہ اس شخص نے ان چاروں کو پیچھے ہٹنے کے لئے کہا اور میں واپس کرسی پر بیٹھ گیا جس کی طرف مجھے اشارہ کیا گیا تھا۔

''سنو میرا نام باطش چنگیزی ہے' اگر تم ایران میں زیادہ عرصے سے مقیم ہو تو تمہیں میرے بارے میں ضرور علم ہوگا۔''

میرا منہ حیرت سے کھل گیا اور میں بے اختیار اپنی جگہہ سے کھڑا ہوگیا۔ ''کیا کیا کیا نام بتایا تم نے؟''

''باطش چنگیزی۔''

''اوہ میرے خدا۔''

''مجھ سے واقف ہونا؟''

''اچھی طرح۔ اب تم ایک کام کرو ان لوگوں کو یہاں سے دفع کردو۔'' میں نے کہا

''دیکھو اسے کیا ہوگیا؟'' لمبے آدمی نے چاروں آدمیوں کو مخاطب کر کے کہا جو ابھی اندر آئے تھے۔ اشارہ اس قوی ہیکل شخص کی طرف تھا جسے میرا دماغ درست کرنے کے لئے کہا گیا تھا اور اب میں نے اس کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ وہ چاروں اسے سہارا دے کر باہر لے گئے' تب لمبے قد کے آدمی نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے واقفیت کا اظہار کر کے یہ ثابت کیا ہے تم نے کہ تم اس لڑکی سے پوری طرح متعلق ہو۔''

''نہیں مسٹر چنگیزی' میری اور اس کی ملاقات عجیب و غریب حالات میں ہوئی' پہلے آپ یہ بتایئے کہ وہ ہے کہاں' کیا آپ کی اس سے ملاقات ہوگئی' میرا مطلب ہے اس اشتہار کے جواب میں آپ اس سے مل لئے۔''

باطش چنگیزی مجھے گھورنے لگا' اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ اس کے بعد اس نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دیکھو نوجوان میں تمہیں ایک بات بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں' زندگی کے کسی بھی مرحلے پر میں نے اپنے ہاتھ سے کئے ہوئے کسی بھی نقصان کی کبھی پرواہ نہیں کی' میں تمہارے بدن کو گولیوں سے چھلنی کردوں گا یا پھر اتنے ٹکڑے کروں گا تمہارے بدن کے کہ انہیں گنا بھی نہ جاسکے اور اس پر ذرا بھی افسوس نہیں کروں گا' میں چالبازی برداشت نہیں کر سکتا' شاید تم نے غلطی سے میرے نام سے واقفیت کا اظہار کر دیا تھا اور اب فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔''

جواب میں میں نے بھی اسے اسی کے انداز میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''میکسیکو کے بچے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

معلوم ہوتے ہو تم' گولیاں چلا کر بدن چھلنی کرنا تیا یاؤ کے کاؤ بوائز کی فطرت کا اظہار کرتا ہے اور بدن کے ٹکڑے کرنے والی بات بتاتی ہے کہ تم نسلاً قصائی ہو۔''

میرے ان الفاظ پر مصری شخص مضطربانہ انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''مسٹر مسٹر یہ کیا بدتمیزی ہے' کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم باطش چنگیزی کے سامنے ہو۔''

''ہاں مجھے اندازہ ہے ان سے کہو کہ پہلے یہ میرے بدن میں اتنے سوراخ کر دیں کہ میرا بدن چھلنی ہو جائے اور اس کے بعد میرے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے دھوپ میں سکھا دیں' یار کمال کرتے ہو تم لوگ' دھمکیوں پر دھمکیاں دیئے جا رہے ہو جیسے میں انسان ہی نہیں ہوں۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ باطش چنگیزی نے ہاتھ اٹھا کر مصری شخص سے بیٹھنے کے لئے کہا اور بولا۔

''تم اطمینان رکھو حاذق ریاضی' یہ شخص ابھی میرے سامنے اس طرح زبان کھولے گا کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔'' اس دوسرے نام نے بھی مجھے چونکا دیا تھا' کینس نے بتایا تھا کہ حاذق ریاضی اس کا سرپرست تھا اور وہ اسی کو دھوکہ دے کر فرار ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ دوسرا نام بھی میرے لئے اجنبی نہیں تھا' میں نے گہری نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا اور پھر باطش چنگیزی کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں اب تم مجھے یہ بتاؤ مائی ڈیئر باطش چنگیزی کہ تم نے مجھے اغواء کر کے یہاں کیوں بلوایا ہے؟''

''لڑکی کہاں ہے؟'' باطش چنگیزی نے سوال کیا۔

''کینس کی بات کر رہے ہو؟''

''ہاں وہی۔''

''تب پھر تم انتہائی بیوقوف معلوم ہوتے ہو۔'' میں نے کہا اور حاذق ریاضی ایک بار پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا' باطش چنگیزی نے اس کی طرف دیکھا اور غرائے ہوئے لہجے میں بولا

''بیٹھے رہو' بیٹھے رہو' بار بار کیوں کھڑے ہو جاتے ہو؟''

''مسٹر مسٹر براہ کرم......'' حاذق ریاضی نے ایک بار پھر میری طرف دیکھ کر خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''ہاں میں احمق کیوں ہوں بتاؤ گے تم؟'' باطش چنگیزی بولا۔

''کیونکہ ہوٹل کے جس کمرے سے تم نے مجھے اغواء کرایا ہے اس سے تھوڑے فاصلے پر کینس کا کمرہ بھی موجود تھا' اگر تمہیں اس کی ضرورت تھی تو پھر مجھے اغواء کرنا بیوقوفی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟''

''وہ فانوس میں نہیں ہے۔'' باطش چنگیزی غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''نہیں ہے۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں وہ وہاں سے فرار ہو گئی ہے۔''

''فرار۔'' میں نے اسی طرح حیرت سے پوچھا۔ ''میرا خیال ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے باطش چنگیزی کیونکہ وہ تو تمہاری تلاش میں کافی دنوں سے ماری ماری پھر رہی ہے۔''

''پھر رہی تھی کہو' اب اسے کچھ اور لوگ مل گئے ہیں جو اسے میرے خلاف بھڑکا چکے ہیں لیکن کینس کا حصول میرے لئے بے حد ضروری ہے' تم اس کے ساتھ مسلسل دیکھے گئے ہو اور اس کی گمشدگی میں تمہارا ہی ہاتھ ہے' دیکھو لڑکے میں بہت خطرناک آدمی ہوں' تم سے کہہ چکا ہوں اگر تمہارے ذریعے مجھے معلومات حاصل نہ ہوئیں تو میں تمہیں ہلاک کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں کروں گا۔ چنانچہ بہتر ہے کہ اپنی زندگی بچاؤ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کینس کو تم نے کس کے ایماء پر اغواء کیا ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''سبحان اللہ' سبحان اللہ! باطش چنگیزی میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہاری کسی بھی حیثیت کو تسلیم کرتا ہوں جس کے تحت یہ شخص یعنی حاذق ریاضی بار بار اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے' میں اپنی دنیا کا بادشاہ ہوں' اگر تم کوئی بہت بڑی شخصیت ہوگے تو اپنے لئے ہوگے میں تم سے نہ کوئی مدد مانگوں گا اور نہ ہی تمہارا احترام کروں گا' ہاں انسان کی حیثیت سے کسی کا احترام کرنا بری بات نہیں ہے' لیکن اس کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ تم نے اپنے دو آدمیوں کے ذریعے مجھے بے ہوش کر کے یہاں بلوالیا ہے۔''

''تم یہ جاننا چاہو گے کہ باطش چنگیزی کیا چیز ہے؟''

''ذرہ برابر بھی نہیں' مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' کینس اور میرے بارے میں تھوڑی سی معلومات حاصل کر لیتے تو میری طرف رخ بھی نہ کرتے' سمجھے تم' مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ میں اسے اغواء کر کے یہاں لاتا' میرے بارے میں بس اتنا جان لو کہ میں ایک بے وطن ہوں اور حالات کے ہاتھوں شکار ہو کر ہندوستان پہنچ گیا تھا' جہاں سے فرار ہونے کے لئے مجھے نجانے کیا کیا ذرائع استعمال کرنے پڑے' پھر ایک جہاز میں چھپ کر میں یہاں تک پہنچا اور اسی جہاز میں میری ملاقات کینس سے ہوئی تھی وہ بھی چھپ کر سفر کر رہی تھی' جہاز کے بارے میں پوری تفصیلات نوٹ کر لو دل چاہے تو معلومات حاصل کر لینا' یہاں آ کر وہ ایک بار پھر مجھ سے بچھڑ گئی اور جب میں نے ہوٹل فانوس میں قیام کیا تو یہاں اس سے دوبارہ ملاقات ہوگئی وہ تمہاری تلاش میں تھی یہ مشورہ میں نے ہی اسے دیا تھا کہ اگر باطش چنگیزی کا کوئی پتہ نہیں چلتا تو وہ اخبار میں اشتہار دے دے اور اس کے بعد سے اب تک میری اس سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی' میں تو ہوٹل فانوس کے جس کمرے میں مقیم تھا دوبارہ اس کمرے میں بھی نہیں گیا اور وہیں دوسرا کمرہ حاصل کر کے مقیم ہو گیا۔ یقین کرو نہ تو میرا اس سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے' سب اس لمحاتی ملاقات میں اس نے مجھے مختصراً اپنے بارے میں بتایا تھا۔ جس کی میں نے تصدیق کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی' اس نے حاذق ریاضی کا حوالہ بھی دیا تھا جو اس کے سرپرست کی حیثیت رکھتا تھا اس طرح میں حاذق ریاضی کا نام بھی جانتا ہوں بس اس سے زیادہ مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم اور نہ ہی میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی' کیا سمجھے۔'' میں نے کہا اور مجھے یوں لگا جیسے باطش چنگیزی کے خدوخال میں کسی قدر نرمی پیدا ہوگئی ہو۔

یہ مسکراتی داستان جاری ہے
بقیہ واقعات آئندہ ماہ

لٹریچر

اردو کے ایک معروف شاعر کو گفتگو کے دوران اپنے ہر جملے میں انگریزی کا کوئی نہ کوئی لفظ ٹانکنے کی عادت تھی۔ وہ جب انگریزی کا کوئی نیا لفظ سنتے تو فوراً اپنے کسی ساتھی سے اس کے معنی بھی پوچھ لیتے۔ ایک دن دوران گفتگو لٹریچر کا لفظ سنا تو فوراً اپنے ساتھی سے پوچھ بیٹھے۔ ''یار! یہ لٹریچر کے کیا معنی ہیں؟''

ساتھی نے جواب دیا۔ ''ادب''

اسی شام کافی ہاؤس میں مولانا چراغ حسن حسرت نے شاعر مذکورہ سے کہا۔ ''عزیزم! سنا ہے کہ تم میرے بارے میں بڑی بک بک کرتے رہتے ہو۔''

''مولانا! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو آپ کا بے پناہ لٹریچر کرتا ہوں۔'' لٹریچر کی یہ ترکیب استعمال سن کر مولانا دم بخود ہو گئے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

آزادی کے متوالے

ایس اے ہاشمی

رچرڈ سمجھ گیا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی۔ اس نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ دونوں ٹہلتے ہوئے پہاڑی کے دامن تک گئے پھر واپس آگئے۔ رچرڈ کا فطری تجسس جاگ اٹھا تھا۔ وہ یہ سوچنے بغیر نہ رہ سکا کہ بیئر گارڈن کسی قسم کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز تھا اور بظاہر جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ ان سرگرمیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے تھا۔

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

ایرپورٹ پر مسافروں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ چاروں طرف ملی جلی آوازوں کا شور بلند ہو رہا تھا۔ عمارت کی دوسری جانب جہازوں کی مخصوص آواز پس منظر میں موسیقی فراہم کر رہی تھی۔ ایک دراز قد اور خوش پوش شخص عمارت سے باہر رک کر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی پیشانی کشادہ اور بال سیاہ تھے۔ آنکھوں پر گہرے شیشوں والا چشمہ تھا۔ بائیں ہاتھ میں سیاہ رنگ کا قیمتی بریف کیس نظر آ رہا تھا۔

اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ اس نے جیب سے ایک مستطیل کارڈ نکالا اور اس پر نگاہ ڈالی۔ کارڈ کے وسط میں ارغوانی رنگ کا ایک بیضوی دائرہ بنا ہوا تھا۔ نیچے یہ عبارت تحریر تھی۔

''مسٹر رچرڈ۔ بیئر گارڈن میں قیام کے دوران ہمارا اسٹاف تمہیں مسٹر ڈینیوب کے نام سے جانے گا۔ اوشنگ بلڈنگ کے سامنے ارغوانی رنگ کی ایک کار تمہاری منتظر ہوگی۔ ڈرائیور کا لباس بھی ارغوانی ہوگا۔ تمہیں شناخت میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔''

رچرڈ نے کارڈ جیب میں رکھ لیا اوشنگ بلڈنگ کی طرف چل پڑا۔ عمارت کے سامنے کئی کاریں کھڑی تھیں لیکن ارغوانی رنگ کی کار ایک ہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جو شخص بیٹھا تھا اس کا لباس بھی ارغوانی تھا۔ البتہ اس کے سر پر سفید کیپ تھی، جسے اس نے آنکھوں پر جھکا رکھا تھا۔ کار کے قریب پہنچ کر رچرڈ نے ایک بار پھر جیب سے کارڈ نکالا اور ڈرائیور کے سامنے کر دیا۔ اس نے کارڈ پر سرسری نظر ڈالی اور ڈیش بورڈ پر ایک بٹن دبا دیا جس سے کار کا پچھلا دروازہ کھل گیا۔

''خوش آمدید مسٹر ڈینیوب۔'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔ رچرڈ نرم اور آرام دہ سیٹ میں دھنس گیا اور بریف کیس اپنی بائیں طرف سیٹ پر رکھ دیا۔ اس کے بیٹھتے ہی دروازہ بند ہوگیا اور کار سبک رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔

پر تکلف ویک اینڈ گزارنے کے لیے بیئر گارڈن سے بہترین تفریح گاہ پورے انگلینڈ میں کوئی نہیں تھی۔ وہاں ہر قسم کی تفریح فراہم کی جاتی تھی۔ جائز اور ناجائز۔ اہم بات یہ تھی کہ مہمانوں کی آمدورفت کو خفیہ رکھا جاتا تھا۔ وہاں جانے والوں میں معززین شہر اعلیٰ سرکاری افسر اور بزنس مین زیادہ ہوتے تھے۔ یہ وہ لوگ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ے جو ہمیشہ خفیہ کلبوں کی تلاش میں رہتے تھے۔

رچرڈ پاؤل ورلڈ کمیونی کیشنز کمپنی کا ڈائریکٹر تھا۔ اس نے اپنے بعض دوستوں سے بیئر گارڈن میں ہونے والی عیاشیوں کا ذکر سنا تھا۔ دوستوں کے ذریعے اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بیئر گارڈن کا منتظم ایک جرمن ہے اور کالعدم نازی پارٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ آخر وہ کوشش کرکے دعوت نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اب وہ منزل کی طرف رواں تھا۔

کچھ دیر بعد آس پاس سنائی دینے والا ٹریفک کا شور کم ہوگیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کار اب غیر آباد علاقے میں دوڑ رہی تھی۔ اس کی نظر ڈرائیور پر پڑی تو وہ دم بخود رہ گیا۔ ڈرائیونگ نشست پر بیٹھے ڈرائیور کا سر جو سفید پی کیپ میں چھپا ہوا تھا اب پی کیپ سے آزاد ہوچکا تھا اور ریشم کی طرح ملائم، سنہری بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں جھپکائیں۔ ڈرائیور مرد نہیں ایک لڑکی تھی۔

لڑکی نے ذرا سا سر گھمایا اور پیچھے دیکھا۔ اس کی ایک ہی جھلک رچرڈ کو گھائل کرگئی۔ وہ بھوری آنکھوں والی انتہائی حسین لڑکی تھی۔

''مجھے رچرڈ کہتے ہیں۔'' اس کے منہ سے بے اختیار اپنا اصل نام نکل گیا۔ وہ حسن فتنہ خیز کو دیکھ کر گڑبڑا گیا تھا۔

''میرا نام رین برڈ ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''مگر میرے دوست مجھے صرف رینی کہتے ہیں۔''

''بڑا خوبصورت نام ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔'' رچرڈ نے بے تکلفی سے کہا۔ ''کیا میں خود کو تمہارے دوستوں میں شمار کرسکتا ہوں۔''

''بالکل نہیں۔'' رینی سڑک کو گھورتی ہوئی بولی۔ ''مجھے تمہاری خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔ بیئر گارڈن میں قیام کے دوران میں تمہارے ہر حکم کی پابند ہوں۔ یعنی تمہاری خادمہ ہوں۔'' اس کی آواز سرد لیکن شیریں تھیں۔

رچرڈ دونوں سیٹوں کے درمیان سے نکل کر اگلی سیٹ پر پہنچ گیا۔ ''میرا خیال ہے یہاں کچھ زیادہ تازہ ہوا آتی ہے۔''

''تازہ ہوا۔'' رینی نے کہا اور اس کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ رچرڈ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس شعلہ بدن کو گھورنے لگا۔ اس نے چست لباس پہن رکھا تھا جس نے اس کے حسین سراپا کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔

رچرڈ حیران تھا کہ یہ چیزیں اسے پہلے کیوں نظر نہیں آئیں۔ ''مسز رینی برڈ یا مس رین برڈ۔'' رچرڈ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔'' یہ جملہ سنتے ہی رچرڈ کے منہ سے اطمینان کا سانس نکل گیا قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''میں پہلی بار بیئر گارڈن جا رہا ہوں وہاں کس قسم کی تفریح ہوتی ہے۔''

''وہاں ہر آدمی اپنے مزاج کے مطابق تفریح کر سکتا ہے۔ عام الفاظ میں یہ سمجھ لو کہ جہاں پلے بوائے کلب کی سرگرمیاں ختم ہوتی ہیں، وہاں سے بیئر گارڈن کی سرگرمیاں شروع ہوتی ہیں۔''

''اس کا نام بیئر گارڈن کیوں رکھا گیا ہے۔'' رچرڈ نے پوچھا۔ ''کیا وہاں ریچھ ہوا کرتے تھے۔''

''ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' رینی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کہا جاتا ہے کہ سولہویں صدی کے اوائل میں کسی لارڈ نے یہ عمارت تعمیر کروائی تھی۔ عمارت سے ملحق ایک وسیع باغ ہے۔ جس میں وہ ریچھوں کی لڑائی کروایا کرتا تھا۔ یوں اس جگہ کا نام بیئر گارڈن پڑ گیا۔''

رچرڈ کو اس کی بات کچھ عجیب سی لگی۔ اسے پہلی بار یہ خیال آیا کہ کہیں وہ بیئر گارڈن جا کر غلطی تو نہیں کر رہا تھا۔

☆☆

اس وقت ان کی کار ایک ذیلی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ وہ ایک تنگ اور سنسان سی سڑک تھی۔ آگے پیچھے دور تک کوئی گاڑی نہیں تھی۔ سڑک کے اطراف میں خودرو گھنی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ رینی ڈرائیونگ میں خاصی ماہر تھی۔ کار اس تنگ سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد رفتار میں کمی آ گئی۔

کار دائیں طرف مڑی اور سامنے نظر آنے والے ایک سفید پھاٹک میں داخل ہو گئی۔ پھاٹک کے ساتھ ایک بورڈ نصب تھا۔ جس پر یہ عبارت چمک رہی تھی۔ ''جرشاش مینجمنٹ ٹریننگ اسکول'' رچرڈ یہ عبارت پڑھ کر چونک گیا۔

''اس ویرانے میں ٹریننگ اسکول۔'' وہ حیران انداز میں بڑبڑایا۔

''ہر لکھی ہوئی بات قابل یقین نہیں ہوتی۔'' رینی کار سے نکلتی ہوئی بولی۔ رچرڈ بھی باہر آ گیا اور متجسس انداز میں ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ پارکنگ لاٹ میں چند اور کاریں بھی کھڑی تھیں۔ ہر کار کا رنگ مختلف تھا۔ کلب کی عمارت قدیم طرز کی تھی اور ایک وسیع قطعہ زمین پر بنی ہوئی تھی۔ چاروں طرف پھیلے سبزے کے درمیان کھڑی وکٹورین طرز کی وہ پرشکوہ عمارت، ماضی کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ قرب و جوار کا علاقہ بلند قامت درختوں سے گھرا ہوا تھا لیکن ماحول خوش گوار ہونے کے باوجود وہاں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''اندر چلنے کے بارے میں کیا خیال ہے۔'' رینی، رچرڈ کو گھورتی ہوئی بولی۔ اس نے کار بند کر دی تھی اور اب رچرڈ کا بریف کیس اٹھائے کھڑی تھی۔ رچرڈ چونک گیا۔ پھر خاموشی سے رینی کی رہنمائی میں چل پڑا۔ دونوں دہرے شیشے والے دروازے سے گزر کر وسیع ہال میں پہنچ گئے۔

''خوش آمدید مسٹر ڈینیوب۔'' رچرڈ ایک آواز سن کر پلٹا۔ ایک خوش پوش شخص جو بغلی دروازے سے ہال میں داخل ہوا تھا۔ تیزی سے اس کی طرف آ رہا تھا۔ صورت شکل سے وہ جرمن معلوم ہوتا تھا مگر لہجے سے اس کا اظہار نہیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

...تھا۔

''میرا نام آسکر ہے۔'' اس نے قریب پہنچ کر کہا۔ ''میں اس کلب کا منیجر ہوں۔'' اس کے انداز میں شائستگی تھی۔ رچرڈ نے رسما اس سے ہاتھ ملایا۔ ''میرے ساتھ آئیے۔'' آسکر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھادوں۔''

آسکر نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور مودب ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ ''تشریف لائیے جناب۔ یہ رہا آپ کا کمرہ۔''

وہ ایک خوبصورت آراستہ خواب گاہ تھی۔ اندر تاریکی تھی۔ رچرڈ جھجکتا ہوا اندر چلا گیا۔ رینی نے اس کا بریف کیس سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور دبیز قالین پر بے آواز چلتی باہر نکل گئی۔ رچرڈ اسے روکنا چاہتا تھا مگر منیجر کے خیال سے خاموش رہا۔ جرمن منیجر آسکر آگے بڑھا اور سامنے والی کشادہ کھڑکی کھول دی۔ کمرہ یک دم روشنی میں نہا گیا۔

''ڈنر ٹھیک سات بجے پیش کیا جائے گا۔'' آسکر نے کہا۔ ''وارڈ روب میں آپ کے ناپ کے ضروری کپڑے موجود ہیں۔ ڈنر سے قبل اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ گھنٹی بجا کر طلب کرسکتے ہیں۔''

رچرڈ جواب میں کچھ بھی نہ بولا۔ منیجر اسے خاموش دیکھ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور دروازہ بند کردیا۔ رچرڈ کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوگیا اور باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ سامنے میلوں تک کسی آبادی کا نشان نہیں تھا۔ دائیں طرف پھولوں کا ایک وسیع باغ تھا۔ بائیں طرف گھنا جنگل تھا جو حد نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ وسط میں ایک سبز پہاڑی تھی جو منظر کی دلکشی میں اضافہ کررہی تھی۔

دفعتاً جنگل کے وسط میں سے ایک دبی دبی سی گونج دار غراہٹ سنائی دی۔ آواز زیادہ واضح نہیں تھی لیکن جنگل کی وسعت پر محیط لگتی تھی۔ رچرڈ کے جسم میں جھرجھری سی آگئی۔ وہ آواز کسی خوف ناک درندے کی معلوم ہوتی تھی۔ رچرڈ دوبارہ وہ آواز سننے کی کوشش کرتا رہا مگر جنگل ایک بار پھر سناٹے میں ڈوب گیا تھا۔

☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو کمرے کا دیوار گیر کلاک شام کے چھ بجنے کا اعلان کررہا تھا۔ کروٹ بدلی تو بستر کے سامنے ایک مجسمہ حسن و جمال کو کھڑے پایا۔ کھلے گلے کا بغیر آستینوں والا لباس' سنہری زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی' خوبصورت تراش کے ہونٹ' جن پر دل نواز مسکراہٹ تھی۔ رچرڈ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ ڈنر کا وقت ہونے والا ہے۔'' رینی نے کہا۔ نصف گھنٹے بعد وہ تیار ہوکر رینی کی معیت میں وسیع ڈائننگ ہال میں پہنچ گیا۔ وہاں ان گنت بے جوڑ' جوڑے موجود تھے۔ ادھیڑ عمر مرد اور جوان لڑکیاں۔ یہ وہ تعلق تھا جو صرف دولت کی وجہ سے قائم ہوا تھا۔

''ہیلو رچرڈ۔'' کسی نے آواز دی تو رچرڈ نے گھوم کر دیکھا' اس کے سامنے ہربرٹ کھڑا تھا۔ وہ جرمنی کے ایک مشہور کاروباری ادارے 'جرشاشی گروپ کا سیلز منیجر تھا۔ رچرڈ اسی کی مدد سے بیئر گارڈن تک پہنچا تھا۔

''واہ! ہیلو ہربرٹ۔ تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' رچرڈ نے رسما مسکراتے ہوئے کہا۔

ہربرٹ نے ایک نظر رینی کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''آؤ! تمہیں چند خاص لوگوں سے ملواؤں۔'' اس نے قریب کھڑے ایک جوڑے کی طرف دیکھا۔ مرد دراز قد اور چالیس برس کے لگ بھگ تھا۔ اس کے ساتھ جو لڑکی تھی وہ بھی دراز قد تھی مگر اس کی عمر بیس برس سے زائد نہیں تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''مسٹر جان ڈی۔'' ہربرٹ نے مرد کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ مسٹر ڈینیوب ہیں مسٹر ڈی۔'' رچرڈ نے اس شخص سے ہاتھ ملایا اور رسمی کلمات کا تبادلہ کیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مسٹر ڈینیوب کی طرح جان ڈی بھی ایک فرضی نام تھا۔

''مس روویٹا۔'' ہربرٹ نے ڈی کی ساتھی لڑکی کا تعارف کرایا۔ لڑکی نے اپنا خوبصورت' مرمریں ہاتھ رچرڈ کی طرف بڑھا دیا اور اس کے گلابی ہونٹ وا ہو گئے۔

ویٹر نے انہیں شمپیئن کے گلاس پیش کیے۔ ایک شخص جس کا نام ہربرٹ نے ڈیوڈ بتایا تھا۔ اس کی ساتھی لڑکی کا نام میتھر تھا۔ اس نے اورنج کلر کا چست لباس پہن رکھا تھا۔ آخر میں ڈرائٹ تھا۔ اس کے ساتھ چھوٹے قد کی ایک گڑیا سی لڑکی تھی۔ معصوم سی' خوبصورت اس کا نام آریلا تھا۔

رچرڈ حیران تھا کہ وہ اس بدوضع موٹے یہودی کو کس طرح برداشت کر رہی ہے۔ کیا وہ اس کلب کے منتظمین میں سے ہے۔ ''اچھا رچرڈ! میں اب اجازت چاہوں گا۔'' ہربرٹ نے کہا۔ ''آج ہماری کمپنی کے چیئر مین جرمن سے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ میں ان کا استقبال کرنے جا رہا ہوں۔ وہ ہمارے ساتھ ہی ڈنر کھائیں گے۔''

رچرڈ نے دل ہی دل میں اس کے جانے پر شکریہ ادا کیا۔ رینی کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور ایک کونے کی طرف کھسک گیا۔

ساڑھے سات بجے سب لوگ کھانے کی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ سرے پر تین کرسیاں خالی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ہربرٹ ایک حسین لڑکی کے ہمراہ ہال میں داخل ہوا۔

''لیڈیز اینڈ جنٹل مین۔'' اس نے کہا۔ ''اس محفل کے مہمان خصوصی مسٹر ہوگو خلاف معمول کچھ لیٹ ہو گئے ہیں۔ میں نے ابھی ان سے فون پر بات کی ہے۔ انہوں نے ڈنر شروع کرنے کی اجازت دی ہے۔ وہ اس وقت راستے میں ہیں اور کچھ دیر میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔''

رچرڈ نے مہمان خصوصی پر لعنت بھیجی اور کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ ''تم میری سکریٹری سے نہیں ملے رچرڈ۔ اس کے کانوں میں ہربرٹ کی آواز آئی۔ رچرڈ نے سر گھما کر پہلے ہربرٹ پھر اس کی ساتھی کی طرف دیکھا۔ وہ بھرے بھرے جسم کی ایک پرکشش لڑکی تھی۔ ''اس کا نام انجلا ہے۔'' ہربرٹ نے کہا۔ ''اور اس ویک اینڈ پارٹی کا سارا انتظام اسی نے کیا ہے۔''

''ونڈر فل۔ بہت اچھا انتظام ہے۔'' رچرڈ نے کہا اور شوخ نظر سے انجلا کے سراپا کا جائزہ لینے لگا۔ اسی وقت اسے اپنی ٹانگ کے ساتھ رینی کی ٹانگ رگڑ کھاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ گویا ایک قسم کی وارننگ تھی۔

''مسٹر ہوگو کا طیارہ تاخیر سے پہنچا ہے۔ تمہیں ان سے مل کر بڑی خوشی ہوگی۔'' ہربرٹ نے کہا۔ ''وہ جرشاش گروپ کے چیئر مین ہیں۔''

''پھر تو میں ان سے ضرور ملوں گا۔'' رچرڈ نے کہا۔ ''شاید کوئی کاروباری صورت بھی پیدا ہو جائے۔''

ہربرٹ نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ وہ انجلا کا ہاتھ پکڑے دوسری طرف نکل گیا۔ رچرڈ نے سوالیہ انداز میں رینی کی طرف دیکھا۔

''زیادہ بولنا صحت کے لیے مفید نہیں ہوتا۔'' رینی نے کہا۔ گو اس نے مزاح کے رنگ میں بات کی تھی۔ مگر اس لہجے میں دبی ہوئی وارننگ کو رچرڈ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

چند ثانئے بعد سفید بالوں والا ایک معمر لیکن وجیہ شخص ہال کے دروازے پر نمودار ہوا۔ بارعب شخصیت اور چال میں تمکنت۔ اس کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

حامہ سرخ بالوں والی ایک اسمارٹ لڑکی تھی۔ ہالوں کے دائیں بائیں ہربرٹ اور آسکر چل رہے تھے۔ سب لوگ کھانا چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''خواتین و حضرات۔'' ہربرٹ نے بلند آواز میں آنے والے کا تعارف کرایا۔ ''جرشاش گروپ کے چیئر مین جناب ہوگو۔''

ہوگو نے ہاتھ بلند کر کے کہا۔ ''آپ لوگ کھانا جاری رکھیں مجھے افسوس ہے میں بروقت یہاں نہ پہنچ سکا۔'' وہ اپنی سیکریٹری کے ساتھ جس کا نام ہلگا تھا سرے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''دوستو!'' اس نے کہا۔ ''یہاں ہم نے آپ کی تفریح کے لیے بہت سی چیزوں کا اہتمام کیا ہے۔ کل رات ہم نے آپ کے لیے ایک حیرت انگیز تفریحی پروگرام ترتیب دیا ہے جو آٹھ بجے شروع ہوجائے گا۔ مجھے امید ہے آپ لوگ اس میں شامل ہوں گے۔''

کھانے کے بعد سب لوگ لاؤنج میں جا بیٹھے اور شراب پینے کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ باتوں کے دوران رچرڈ کو یہ احساس ہی نہ ہوا کہ رینی وہاں سے کب اٹھ کر چلی گئی تھی۔ جب اسے اس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تو وہ گڑبڑا گیا۔ کہیں ایسا تو نہ تھا کہ اسے کسی اور نے پسند کرلیا ہو۔ وہ سیدھا کلب کے منیجر آسکر کے پاس پہنچا اور اس سے رینی کے بارے میں دریافت کیا۔ آسکر نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ البتہ اس کے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی۔ رچرڈ کو الجھن سی ہونے لگی۔ کلب کے لوگوں کا رویہ انتہائی پراسرار تھا۔ ہوگو اور ہربرٹ بھی کھانے کے بعد نہ جانے کہاں غائب ہوگئے تھے۔ وہ رینی کو تلاش کرتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی اسے بھینی بھینی خوشبو کا احساس ہوا۔

دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے لائٹ جلائی اور کمرے میں نظر دوڑائی۔ اچانک وہ چونک سا گیا۔ اس کے بستر پر رینی کا وہ لباس پڑا تھا جو اس نے تھوڑی دیر پہلے پہن رکھا تھا۔ یہ ایک عجیب بات تھی۔ اس کے دل میں ایک انجانا سا خوف پیدا ہوا۔ اس نے لباس اٹھایا اور اسے پھیلا کر دیکھا۔ اس کا خدشہ غلط ثابت ہوا۔ اس پر خون کا کوئی دھبا نہیں تھا اور نہ کوئی شکن تھی۔ گویا لباس زبردستی نہیں اتارا گیا تھا۔ لباس میں سے مسحور کن خوشبو آرہی تھی۔ اسی لمحے باتھ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ رچرڈ چونک کر آواز کی سمت مڑا۔ رینی دوسرے لباس میں باتھ روم سے نکل رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خوش گوار مسکراہٹ تھی۔

''تم ...... تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔'' رچرڈ نے کہا۔ رینی خمار آلود آنکھوں سے اسے دیکھتی اس کے قریب آ گئی۔

☆☆

اگلی صبح جب رچرڈ کی آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ رینی اس سے پہلے بیدار ہوگئی تھی اور غسل سے فارغ ہو کر مکمل میک اپ کیے بیٹھی تھی۔ رچرڈ اٹھ کر تیار ہونے لگا۔ ناشتا کمرے میں منگوالیا گیا۔ ناشتے کے بعد دونوں نے سیر کا پروگرام بنالیا۔ وہ نیچے پہنچے تو ہربرٹ آتا دکھائی دیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ پھر پوچھا۔ ''کہاں کی تیاری ہے۔'' جواب میں رچرڈ نے بتایا کہ وہ رینی کے ساتھ گارڈن کی سیر کرنے جارہا ہے۔ ہربرٹ کے چہرے پر ایک لہر سی آ کر گزر گئی۔ وہ رینی کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت تفریح کے لیے جنگل کے درمیان پہاڑی زیادہ مناسب رہے گی۔''

اگرچہ بات نرم لہجے میں کہی گئی تھی مگر رچرڈ کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ وہ مشورہ نہیں حکم تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

رینی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ رچرڈ کچھ نہ بولا۔ یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ وہاں تفریح کی مکمل آزادی نہیں تھی۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جسے چھپایا جارہا تھا۔ دونوں عمارت سے نکل کر پہاڑی کی طرف جانے والے راستے پر ہولیے۔ راستے میں رچرڈ کو یاد آیا کہ گزشتہ روز اس نے جنگل میں کسی درندے کی غراہٹ سنی تھی۔ ''اس جنگل میں درندے تو نہیں ہیں۔'' اس نے پوچھا۔ ''کل جب میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا تھا تو میں نے کسی درندے کی آواز سنی تھی۔'' رینی نے سر ہلا کر اس کی تردید کردی۔

''تمہیں وہم ہوا ہوگا۔ یہاں بھلا درندوں کا کیا کام۔'' اس نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

رچرڈ رک گیا اور رینی کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''رینی! تم کچھ چھپا رہی ہو مگر کیوں۔''

''تمہیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ میں کلب کی ملازمہ ہوں اور کلب سے ملنے والے احکام کی پابندی میرا فرض ہے۔ مجھ سے زیادہ توقع نہ رکھو۔''

رچرڈ سمجھ گیا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی۔ اس نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ دونوں ٹہلتے ہوئے پہاڑی کے دامن تک گئے پھر واپس آگئے۔ رچرڈ کا فطری تجسس جاگ اٹھا تھا۔ وہ یہ سوچنے بغیر نہ رہ سکا کہ بیئر گارڈن کسی قسم کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز تھا اور بظاہر جو کچھ بھی ہورہا تھا وہ ان سرگرمیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے تھا۔

وہ ہال میں داخل ہوئے تو جرمن منیجر آسکر نے ان کا استقبال کیا۔ ''میڈم۔'' اس نے رینی سے کہا۔ ''مسٹر ہربرٹ نے آپ کو یاد کیا ہے۔''

رینی کے خوبصورت چہرے پر ہلکا سا رنگ آکے گزر گیا۔ یہ رنگ خوف کا تھا۔ ''تم چلو۔'' اس نے رچرڈ سے کہا۔ ''میں ابھی آتی ہوں۔''

رچرڈ نے اثبات میں سر ہلایا اور بظاہر بے پروائی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ ہربرٹ نے رینی کو غالباً اس کے بارے میں رپورٹ دینے کے لیے بلوایا ہے۔ رینی کا رویہ بھی اسے خاصا عجیب سا لگا۔ وہ جسمانی اعتبار سے اس کے بہت قریب تھی لیکن ذہنی طور پر بہت دور تھی۔

وہ ان ہی خیالوں میں الجھا اور پرنیم تاریک بیضوی ہال میں پہنچا اور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ بستر پر نظر پڑتے ہی وہ دم بخود رہ گیا۔ وہاں ایک لڑکی اوندھے منہ لیٹی تھی اور اس کی پشت میں خنجر پیوست تھا۔ وہ ذرا سا آگے بڑھا اور جھک کر لڑکی کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اگرچہ وہ اوندھے منہ لیٹی تھی لیکن اس کے چہرے کا بایاں حصہ صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ کمرے میں پھیلی نیم تاریکی کے باوجود رچرڈ نے اسے پہچان لیا۔ وہ ڈارٹ نامی موٹے یہودی کی ساتھی آریلا تھی لیکن وہ اس کے کمرے میں کیسے پہنچ گئی تھی۔

رچرڈ اس سوال پر غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک اسے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف پلٹ پڑا۔ وہاں خوش پوش معمر لیکن وجیہ ہوگو کھڑا تھا۔

''یہ کیا معاملہ ہے مسٹر رچرڈ۔'' اس نے بظاہر نرمی سے پوچھا لیکن اس کی آنکھوں میں جھلکنے والی درشتی اس کے لہجے کی نفی کررہی تھی۔

''شش...... شاید اسے...... کسی نے قتل کردیا ہے۔'' رچرڈ حلق میں پھنسا تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی ابھی سیر سے واپس آیا ہوں۔''

''شاید نہیں۔ یقیناً اسے قتل کردیا گیا ہے۔'' ہوگو نے سرد لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم یہاں کیا کررہے ہو۔''

''یہ میرا کمرہ ہے۔'' وہ ہکلاتے ہوئے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بولا۔

''یہ تمہارا کمرہ نہیں بلکہ ڈارٹ کا کمرہ ہے۔'' ہوگو زہرخند سے بولا۔ ''تم بڑی مشکل میں پھنس گئے ہو۔ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ پولیس لاش کے پاس تمہاری موجودگی ہرگز نظرانداز نہیں کرے گی۔ وہ یہ جاننا چاہے گی کہ تم ڈارٹ کے کمرے میں کیوں داخل ہوئے تھے۔''

رچرڈ نے بوکھلا کر چاروں طرف دیکھا وہ واقعی اس کا کمرہ نہیں تھا۔ بے دھیانی میں وہ غلط کمرے میں داخل ہوگیا تھا۔ ''لیکن...... لیکن میں نے اسے قتل نہیں کیا ہے۔ قاتل یقیناً کوئی اور شخص ہے۔ رینی میری بات کی تصدیق کرے گی کہ ہم ابھی سیر سے لوٹے ہیں۔''

''ہوسکتا ہے مگر پولیس کو اس بات کا یقین دلانا بہت مشکل ہوگا۔'' رچرڈ کانپ کر رہ گیا۔ ہوگو درست ہی کہہ رہا تھا۔ پولیس کو یہ یقین دلانا کہ وہ قاتل نہیں ہے واقعی ایک مشکل امر تھا۔

ہوگو بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ رچرڈ کی خوف زدگی اس سے چھپی نہیں رہی تھی۔ ''میں اس معاملے کو کسی طرح دبانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' ہوگو نے کہا۔ شاید اسے رچرڈ پر رحم آگیا تھا۔ ''اب جلدی سے اس کمرے سے نکل جاؤ۔ میں کوئی تدبیر سوچتا ہوں۔'' ہوگو نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

رچرڈ ہانپتا کانپتا وہاں سے بھاگ لیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں مسٹر ہوگو کا ارادہ نہ بدل جائے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے شراب کا گلاس بنایا' سگار سلگایا اور بستر پر بیٹھ کر صورت حال پر غور کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی رینی واپس آگئی۔ ''کیا کوئی خاص بات تھی۔'' رچرڈ نے پوچھا۔ ''ہربرٹ نے تمہیں کیوں بلوایا تھا۔''

''کچھ نہیں۔'' رینی اپنے مخصوص انداز میں مسکرا دی۔ ''لنچ کے بارے میں بتانے کے لیے بلایا تھا۔''

'اس بارے میں تو منیجر بھی بتا سکتا تھا۔' رچرڈ نے دل میں کہا۔ 'جھوٹی کہیں کی' تم سب کچھ جانتی ہو۔'

☆☆

ایک بجے دونوں لنچ کے لیے نیچے پہنچ گئے۔ لنچ کا اہتمام سرسبز لان میں رنگین چھتریوں کے نیچے کیا گیا تھا۔ دونوں ایک چھتری کے نیچے جا بیٹھے۔ لمحہ بھر بعد ہی رچرڈ نے موٹے ڈارٹ کو لان کی طرف آتے دیکھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہربرٹ کی سیکریٹری انجلا نے گویا آریلا کی کمی فوراً پوری کردی تھی۔ کھانے کے بعد رچرڈ' ڈارٹ کے ردعمل کا جائزہ لینے لگا۔

''تم مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو۔'' ڈارٹ نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں تمہاری ساتھی کی تبدیلی کا سبب اچھی طرح جانتا ہوں۔'' رچرڈ نے کہا۔ ''اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم کیوں پریشان ہو۔''

''یقین کرو! میں نے آریلا کو قتل نہیں کیا۔'' ڈارٹ نے کہا۔ ''انسان تو کجا' میں ایک مکھی بھی نہیں مار سکتا۔''

''ذرا تفصیل سے ساری بات بتاؤ۔'' رچرڈ نے کہا۔ ''ممکن ہے میں تمہاری اس معاملے میں کوئی مدد کرسکوں۔'' اس نے ڈارٹ پر یہ بات ظاہر نہیں کی تھی کہ وہ خود بھی نادانستہ اس میں ملوث ہوگیا تھا۔

''بات تو بے حد مختصر ہے۔ ناشتے کے بعد میں چہل قدمی کے لیے نکل گیا تھا۔ یہ میرا معمول ہے۔ واپس آیا تو آریلا کو بستر پر مردہ پایا۔ اس کی پشت میں خنجر پیوست تھا۔ میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ ہوگو اور آسکر وہاں پہنچ گئے۔ آسکر کے ہاتھ میں کیمرا تھا اس نے آتے ہی کئی تصویریں

Downloaded from Paksociety.com

اتار لیں۔ اب یہ لوگ مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ میرے ہاتھوں پر آریلا کے خون کا کوئی دھبا نہیں۔''

''کیا ان لوگوں نے تم سے بھاری رقم کا مطالبہ کیا ہے۔'' رچرڈ نے پوچھا۔

''نہیں۔'' ڈارٹ نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ''تمہیں معلوم ہوگا کہ بعض سابقہ نازی فوجی افسروں پر جنگی جرائم کے سلسلے میں مقدمات چلائے جارہے ہیں۔ اس ضمن میں میرا نام بھی گواہوں کی فہرست میں شامل ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں نازی جنگی مجرموں کے خلاف گواہی نہ دوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں اگر گواہی نہیں دیتا تو اپنی قوم کے ساتھ غداری کرتا ہوں اور اگر گواہی دیتا ہوں تو یہ لوگ کیس پولیس کے حوالے کردیں گے اور میری تصویریں میری بیوی کو بھیج دیں گے۔ وہ ایک وفادار اور حساس عورت ہے اگر اسے میری حرکتوں کا علم ہوگیا تو ہوسکتا ہے ہے میری وفادار بیوی صدمے سے پاگل ہوجائے یا خودکشی کرلے۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا اور رونے لگا۔

اب سارا چکر اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ کلب کی آڑ میں نازی جنگی مجرموں کے گواہوں کو بلیک میل کیا جاتا تھا۔

''ہوگو نے کہا ہے کہ اگر میں اس کی مرضی کے مطابق ایک تحریر لکھ دوں اور جنگی مجرموں کے خلاف گواہی نہ دوں تو وہ آریلا کی لاش غائب کردے گا اور پولیس میں اس قتل کی رپورٹ درج نہیں کرائے گا۔'' ڈارٹ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔'' رچرڈ نے پوچھا۔ اس کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ تحریر دینی ہی پڑے گی۔'' ڈارٹ نے کہا۔ ''ورنہ میرا خاندان تباہ ہوجائے گا۔''

رچرڈ کا ذہن الجھن کا شکار ہوچکا تھا۔ وہ جنگل کی طرف نکل گیا اور ایک گھنے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر صورت حال پر غور کرنے لگا۔ کافی دیر بعد اس نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو اس کی سماعت میں کسی گاڑی کی آواز آئی۔ وہ گھنے درخت کی آڑ میں چھپ گیا اور دھڑکتے دل سے اس طرف دیکھنے لگا جدھر سے گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ایک اسٹیشن ویگن کو اس کچے راستے کی طرف بڑھتے دیکھا جو اس سے چند قدم کے فاصلے پر دائیں جانب واقع تھا۔ جب گاڑی اس کے قریب سے گزری تو وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ عقبی نشست پر آریلا بیٹھی تھی۔ بالکل صحیح سلامت' تروتازہ' زندہ وتابندہ۔ رچرڈ کی گردن معنی خیز انداز میں ہل گئی۔ گویا وہ سب کچھ ڈراما تھا جو خنجر اس نے آریلا کی پشت میں پیوست دیکھا تھا۔ وہ یقیناً غیر پھلکا خنجر تھا۔ رچرڈ نے کے ذہن میں بیک وقت دو خیال آئے۔ پہلا یہ کہ اسے چپکے سے واپس چلا جانا چاہیے' دوسرا یہ کہ وہاں رہ کر معاملات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس نے پہلے خیال کو رد کردیا اور وہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کرلیا۔ گاڑی اس اثناء میں دور جاچکی تھی وہ درخت کے عقب میں سے نکلا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا عمارت کی طرف چل دیا۔

اسے معلوم تھا کہ ہربرٹ نے چونکہ اسے ڈارٹ کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لیا تھا' اس لیے انتظامیہ کی نظر میں اس کی پوزیشن مشتبہ ہوگئی تھی۔ شام گئے تک وہ ڈارٹ سے تنہائی میں ملنے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ آریلا زندہ ہے۔ لہٰذا وہ کوئی تحریر ہوگو کو نہ دے اس کے کمرے کا فون خراب کردیا گیا تھا اور ربیی ایک لمحے کے لیے بھی اسے نظر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بیے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ سایہ بن گئی تھی اس کا غالباً اسے سخت نگرانی کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ ادھر ہوگو کی پرسنل سیکریٹری ہلگا اب ڈارٹ سے ساتھ نظر آ رہی تھی۔

☆☆

رات کے کھانے کے بعد ہوگو نے مہمانوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ''خواتین و حضرات! کل میں نے ایک حیرت انگیز تفریح کا ذکر کیا تھا۔ اس تفریح کا اہتمام ہم نے باغ کی دوسری جانب کیا ہے۔ یہ جگہ یہاں سے نصف میل دور ہے۔ ویسے تو کوئی شخص اس پروگرام میں شامل ہونے کا پابند نہیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا کھیل آپ نے پوری زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ گارڈن کی پرانی روایت کے مطابق اس کھیل کو دیکھنے والے ایک خاص قسم کا لباس پہنتے ہیں۔ مرد سبز رنگ کا لمبا چوغہ اور سفید ٹوپی جس میں سر اور چہرہ گردن تک چھپ جاتا ہے۔ صرف دو آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ خواتین کے لیے سرخ چوغہ اور سیاہ ٹوپی اور ملازمین کے لیے سیاہ چوغہ اور خاکستری ٹوپی۔ یہ لباس پہننے کے بعد کوئی شخص دوسرے کو پہچان نہیں سکے گا۔''

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس لباس کا ایک دلچسپ پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ مرد بغیر پہچانے کسی ایک لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیں گے۔ لڑکی کو علم نہیں ہوگا کہ اس کا ساتھی کون ہے اور نہ مرد کو پتا ہوگا کہ اس نے کس لڑکی کا ہاتھ پکڑا ہے اور آج کی رات وہی لڑکی اس کی ساتھی ہوگی۔''

یہ سن کر رچرڈ بے چین ہوگیا۔ وہ رینی کے سوا کسی لڑکی کا ہاتھ نہیں پکڑنا چاہتا تھا۔

''حضرات۔'' ہربرٹ کی آواز ابھری۔ ''آپ کے کمروں میں لباس رکھوا دیے گئے ہیں۔ آپ لوگ اپنے اپنے کمروں میں جائیں اور چوغہ اور نقاب پہن کر لاؤنج میں آجائیں۔ جب آپ واپس آئیں گے تو خواتین چوغے اور ٹوپی پہنے تیار ملیں گی۔ آپ آتے ہی کسی ایک لڑکی کا ہاتھ پکڑ سکتے ہیں۔'' اس کے خاموش ہوتے ہی سب لوگ اپنے کمروں میں چلے گئے۔

رچرڈ نے اندازہ کرلیا کہ رینی کا قد سب سے لمبا تھا۔ اس لیے اسے شناخت کرلینا مشکل نہیں تھا۔ وہ بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا اور چوغہ، ٹوپی پہن کر سب سے پہلے لاؤنج میں پہنچ گیا لیکن یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ تمام لڑکیاں صوفے پر بیٹھی تھیں اور ان کے قد کا پتا چلانا مشکل تھا۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ آگے بڑھا اور ایک لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ خوش قسمتی سے وہ رینی تھی۔

چند منٹ کے بعد اندر کے باقی لوگ بھی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے ایک ایک لڑکی منتخب کرلی پھر نقاب پوشوں کا یہ قافلہ تاریکی میں باغ کی طرف روانہ ہوگیا۔ جو شخص رہنمائی کررہا تھا، وہ رچرڈ کے خیال میں ہربرٹ تھا۔ دس منٹ بعد یہ قافلہ ایک سیاہ آہنی پھاٹک کے سامنے رک گیا۔ رات کی تاریکی میں وہ جگہ خاصی پرہول لگ رہی تھی۔

ایک سیاہ چوغے والے نے آگے بڑھ کر پھاٹک کھولا اور سب لوگ آگے بڑھ گئے۔ عقب میں پھاٹک دوبارہ بند کردیا گیا۔ دو سو گز آگے چلنے کے بعد ایک اور پھاٹک نظر آیا۔ جسے ایک بار پھر سیاہ چوغے والے نے کھولا۔ جب لوگ اندر پہنچ گئے تو یہ پھاٹک بھی بند کردیا گیا۔ رچرڈ دل ہی دل میں خوف محسوس کرنے لگا۔ اس کی سانس بے ترتیب ہوگئی تھی۔

اسی لمحے رات کے سناٹے میں کسی درندے کی غراہٹ سنائی دی۔ رچرڈ کے جسم میں خوف کی سرد لہر سرایت کرگئی۔ آواز بہت قریب سے آئی تھی اور یہ آواز وہی تھی جو وہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ ''خواتین و حضرات۔'' اچانک ہربرٹ کی آواز بلند ہوئی۔ ''ہم آپ کو زیادہ دیر تک تجسس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں رکھنا چاہتے۔ ابھی آپ نے جو آواز سنی تھی۔ وہ ریچھ کی تھی۔ خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ریچھ پنجروں میں بند ہیں۔ آج ہم آپ کو ریچھوں اور کتوں کے مقابلے دکھائیں گے۔''

چند لمحوں کے بعد یہ قافلہ ایک عمارت کے سامنے پہنچ گیا۔ وہاں ریچھوں اور کتوں کی مسلسل آوازیں آرہی تھیں۔ عمارت کے سامنے ایک گول اکھاڑہ بنا ہوا تھا اس کا قطر چالیس فٹ اور گہرائی دس فٹ تھی۔ اس کے گرد آہنی ریلنگ تھی جس کے ساتھ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اکھاڑے کے اوپر طاقتور بلب لگے تھے۔ تمام لوگ اکھاڑے کے چاروں طرف پھیل گئے' کچھ ریلنگ کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوگئے اور کچھ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ملازمین مشروبات پیش کرنے لگے۔ روشنی صرف اکھاڑے کے اندر تھی۔ اردگرد کا ماحول تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ البتہ ملحقہ عمارت کے اندر ایک کمرے میں مدھم روشنی ہورہی تھی۔

☆☆

''خواتین وحضرات۔'' کسی نامعلوم جگہ پر لگے لاؤڈ اسپیکر پر ایک آواز ابھری۔ ''لیجیے! مقابلہ شروع ہوتا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اکھاڑے کے اندر بنے آہنی دروازے کھلے۔ ایک دروازے سے سیاہ رنگ کا بھاری بھرکم ریچھ باہر آیا۔ دوسرے دروازے سے دو کتے غراتے ہوئے باہر آئے اور سیدھے ریچھ پر ٹوٹ پڑے۔ ریچھ اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا کئی قدم پیچھے ہٹتا چلا گیا مگر جلد ہی وہ سنبھلا اور اپنے دو پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے ایک کتے کو زوردار دوہتڑا مارا۔ کتا زمین پر گرا چیخا اور الٹے پاؤں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ ریچھ دوسرے کتے کی طرف بڑھا۔ وہ اپنے ساتھی کا حشر دیکھ چکا تھا۔

جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور ریچھ کے سامنے نیم دائرے کی شکل میں بھاگنے لگا۔ ریچھ اپنے تیز نوکیلے دانت نکالے' کتے کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ اچانک دوسرا کتا' چوروں کی طرح ریچھ کے عقب میں پہنچا اور اچھل کر اس کی گردن میں دانت گاڑ دیے۔ دوسرا کتا بھی اچھلا اور سامنے سے ریچھ پر حملہ کرنے لگا۔

ریچھ نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ اس کی گردن سے چمٹا کتا اچھل کر دیوار سے جاٹکرایا۔ دوسرے کتے کو ریچھ نے اپنے پنجوں میں دبالیا اور اس کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی گردن سے نکلنے والے خون نے اس کے سیاہ' گھنے بال بھگو دیے تھے۔ تماشائی تالیاں پیٹنے اور شور مچانے لگے۔ ان میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔

رچرڈ نے دیکھا۔ سبز چوغے والا ایک شخص چپکے سے وہاں سے کھسک گیا تھا۔ اس نے رینی کا ہاتھ دبایا۔ ''میں ذرا باتھ روم تک جارہا ہوں۔'' پھر وہ دبے پاؤں تاریکی میں مدغم ہوگیا۔ اسے یقین تھا کہ اسے جاتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ جس شخص کو اس نے چند لمحے قبل کھسکتے دیکھا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا۔ رچرڈ کا خیال تھا کہ وہ کلب کی عمارت کی طرف گیا ہوگا۔

وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر پھاٹک کی طرف چل دیا۔ عمارت کے عقبی حصے میں ایک اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ یہ وہی گاڑی تھی جس میں رچرڈ نے آریلا کو جاتے دیکھا تھا۔ اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ گاڑی کی موجودگی کا مطلب تھا کہ آریلا اب اس مکان میں مقیم تھی۔ رچرڈ خاموشی اور تیزی سے آگے بڑھتا گیا۔ آس پاس تاریکی اور سناٹا تھا۔ چند ساعت بعد ہی وہ کلب کی وسیع عمارت میں پہنچ گیا۔ داخلی ہال میں ایک بلب جل رہا تھا۔ اس کے علاوہ پوری عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہال

Downloaded from Paksociety.com

پہنچ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ داہنی طرف اسے ایک دروازہ تھوڑا سا کھلا نظر آیا۔ رچرڈ نے قریب جا کر دیکھا تو دروازے پر 'آفس' لکھا ہوا تھا۔ اندر مکمل تاریکی تھی۔

رچرڈ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ اس کے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ وہ لوگ دفتر کا دروازہ کھلا چھوڑ گئے تھے۔ حالانکہ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے کلب کے بارے میں کئی پوشیدہ باتیں معلوم ہو سکتی تھیں۔ اس نے جیب سے ٹارچ نکالی اور دبے قدموں اندر چلا گیا پھر اس نے ٹارچ جلائی اور مختلف چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ ٹارچ کی روشنی کے ساتھ ہی اس کی نظریں بھی تیزی سے گھوم رہی تھیں۔

جب ٹارچ کی روشنی فائلنگ کیبنٹ پر پڑی تو اس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں منجمد ہو گیا۔ کیبنٹ کی اوٹ میں سے ایک سیاہ پستول کی نال جھانک رہی تھی۔ ''خبردار! جہاں ہو وہیں رک جاؤ۔'' نال کے پیچھے سے اک غراہٹ سنائی دی۔ ''اور ٹارچ کی روشنی اپنے چہرے پر ڈالو۔''

رچرڈ بے بسی سے دانت پیس کر رہ گیا۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا اگر وہ حکم کی تعمیل میں دیر کرتا تو گولی اس کے جسم میں سوراخ کر سکتی تھی۔ وہ رک گیا اور سر سے ٹوپی ہٹا کر روشنی اپنے چہرے پر ڈالی۔ ''اوہ رچرڈ۔'' پستول بردار شخص کے لبوں سے طمانیت بھری سانس نکل گئی۔ ''یہ میں ہوں جان ڈی۔'' نام سنتے ہی رچرڈ حیرت زدہ رہ گیا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو جان ڈی۔'' اس نے ٹوپی دوبارہ اپنے سر پر جمالی۔

جان ڈی نے پستول جیب میں رکھ لیا اور کراہتا ہوا بولا۔

''میں سخت مصیبت میں ہوں۔ مجھے سہارا دے کر باہر لے چلو پھر ساری بات بتاتا ہوں۔ م...... میری ٹانگ بیکار ہو گئی ہے۔'' رچرڈ نے اسے سہارا دیا اور اسے لیے باہر درختوں کے نیچے تاریکی میں پہنچ گیا۔ جان ڈی گھاس پر لیٹ کر کراہنے لگا۔ ''اوہ، تمہاری حالت بہت خراب معلوم ہوتی ہے۔'' رچرڈ نے کہا۔ ''میں کسی ڈاکٹر کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔''

''نہیں! ڈاکٹر کو لانے کی ضرورت نہیں۔'' جان ڈی نے کمزور آواز میں کہا۔ ''میں چند لمحوں کا مہمان ہوں۔ میری بات غور سے سنو اگر تم کسی ڈاکٹر کو لینے چلے گئے تو ممکن ہے کہ تمہاری واپسی تک میرا دم نکل جائے۔''

''لیکن ہوا کیا ہے۔'' رچرڈ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تمہیں اس حال تک کس نے پہنچایا۔''

''میں فائلنگ کیبنٹ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک اس کے نچلے حصے سے ایک سوئی نکلی اور میری ٹانگ میں گھس گئی۔ اس سوئی میں زہر بھرا ہوا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ میرے پورے جسم میں سرایت کر رہا ہے۔ میرے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ میں چند منٹ کا مہمان ہوں اور مرنے سے قبل میں اپنا مشن تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔''

''مشن۔'' رچرڈ نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیسا مشن۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم میرے کام کو تکمیل تک پہنچا دو گے۔'' جان ڈی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں اور کشمیریوں کی ایک تنظیم 'مسلم فرنٹ' کے لیے کام کر رہا ہوں۔ ایک یہودی تنظیم 'صیہون الیس' اور بھارت مشترکہ طور پر پاکستان کے اہم دفاعی ٹھکانوں کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں۔ مسلم فرنٹ نے دو سال قبل یہ کیس میرے سپرد کیا تھا۔ آج میں وہ تمام معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں جو اس کلب کے تمام منتظمین کو موت

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کی کرسی پر بٹھا سکتی ہیں اور پاکستان کو تباہی سے بچا سکتی ہیں۔'' وہ ہلکے سے کراہا پھر بولا۔ ''یہ تمام معلومات ان مائیکروفلموں میں محفوظ ہیں۔''

اس نے جیب سے دو مائیکروفلمیں نکالیں جن کا سائز سگریٹ کے فلٹر کے برابر تھا اور رچرڈ کے ہاتھ پر رکھ دیں پھر اس نے دوسری جیب سے ایک چھوٹا سا کیمرا نکالا اور وہ بھی رچرڈ کو دے دیا۔ ''اس کیمرے کو ابھی ضائع کر دو اور فلموں کو کسی ایسی جگہ چھپالو جہاں کسی کی نظر نہ پڑے اگر ان لوگوں کو تم پر معمولی سا بھی شبہ ہو گیا تو تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔''

رچرڈ نے کیمرے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ ماچس کی ڈبیا سے بھی چھوٹا تھا پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دائیں طرف چند قدم کے فاصلے پر جھیل کا پانی جھلملاتا نظر آ رہا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور کیمرے کو پوری قوت سے جھیل کی طرف پھینک دیا۔

''کیمرا تو ٹھکانے لگ گیا۔'' وہ بیٹھتا ہوا بولا۔ ''اب فلموں کو چھپانے کا مسئلہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ میں ان فلموں کو کشمیری تنظیم 'مسلم فرنٹ' تک کس طرح پہنچاؤں گا۔''

جان ڈی نے خون تھوکا پھر انکتے ہوئے بولا۔ ''ایک فلم پر مسلم فرنٹ والوں کا فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ اس نمبر پر فون کرنا۔ دوسری طرف سے ایک لڑکی بولے گی اور 'پرنسز آف فریڈم' کہے گی۔ تم اسے یہ پیغام دینا۔ ''ڈبل روٹی جل گئی ہے۔ اب بسکٹوں پر گزارا کرو۔'' اس پیغام سے وہ سمجھ جائیں گے کہ میں مر چکا ہوں لیکن فلمیں محفوظ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری مدد کے لیے کسی کو بھیج دیں بلکہ میرا خیال ہے مہمانوں یا ملازموں میں ان کا ایک آدمی پہلے سے موجود ہے۔ وہ اسے تم سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہہ دیں گے۔''

''اس سے تو بہتر ہے کہ میں فوراً یہاں سے نکل جاؤں۔'' رچرڈ نے پرخیال لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش جھلک اٹھی تھی۔

''نہیں۔'' جان ڈی نے گردن جھٹکی۔ ''ایسی غلطی نہ کرنا اگر تم نے اچانک جانے کا پروگرام بنایا تو یہ لوگ فوراً سمجھ جائیں گے۔ عجلت میں کوئی کام نہ کرنا اگر تم خیریت سے لندن پہنچ جاؤ تو یہ فلمیں خود تنظیم کو پہنچا دینا۔ اس کے عوض وہ تمہیں ایک لاکھ پونڈ دیں گے۔''

''ایک لاکھ پونڈ۔'' رچرڈ ہکلا گیا۔ ''کیا واقعی۔''

''ہاں! یہ بات پہلے سے طے ہے۔'' جان ڈی نے کہا۔ اسی لمحے عمارت کی طرف قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ''شش' شاید' کک' کوئی اس طرف آ رہا ہے۔'' جان ڈی نے انکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم فوراً واپس چلے جاؤ۔ مم...... میری فکر نہ کرو۔ میرا...... وقت پورا ہو چکا ہے۔''

رچرڈ نے مائیکروفلمیں جیب میں رکھیں اور درختوں کی تاریکی میں باغ کی طرف چل دیا۔

جنگل تاریک اور سنسان تھا وہ پھر ایک لمبا چکر کاٹ کر اس طرف چل دیا جہاں سے ریچھ اور کتوں کی ملی جلی' دبی دبی غراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے دوسرا پھاٹک پھلانگا۔ ایک کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''رک جاؤ! کون ہو تم۔'' وہ ٹھٹک گیا۔

تاریکی میں اس نے ایک سیاہ چوغے والے نقاب پوش کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ رچرڈ اپنی جگہ رک گیا اور نقاب پوش کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ ''وہ! آپ تو مہمانوں میں سے ہیں۔'' نقاب پوش اس کے چوغے کا رنگ پہچانتے ہوئے بولا۔ ''مگر آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔''

جواب میں رچرڈ نے اس کا گلا پکڑ لیا اور اس وقت تک اسے دباتا رہا۔ جب تک وہ بے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جان ہو کر اس کے ہاتھوں میں نہ جھولنے لگا۔ رچرڈ نے اس کی گردن چھوڑی تو وہ دھم سے زمین پر گر پڑا۔ رچرڈ نے ادھر ادھر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ عقب سے ہوتا ہوا۔ دوبارہ اکھاڑے کے ہجوم میں داخل ہو گیا۔ اس وقت وہاں بھورے ریچھ اور دو کتوں کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ کسی نے اس کی جانب توجہ نہ دی۔

☆☆

رینی اپنی کرسی پر موجود تھی۔ رچرڈ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ''سوری۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ باتھ روم سے نکل کر میں جنگل کی طرف چلا گیا تھا۔ شور کی وجہ سے وحشت ہو رہی تھی۔ مجھے اس مقابلے سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں۔''

رینی خاموش رہی۔ تھوڑی دیر بعد آخری مقابلہ ختم ہونے کا اعلان کیا گیا اور نقاب پوشوں کا قافلہ واپس ہوا۔ راستے میں ایک نقاب پوش نے رچرڈ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''مقابلے پسند آئے۔'' اس نے پوچھا۔ رچرڈ نے فوراً آواز پہچان لی۔ وہ ہوگو تھا۔

''ہاں۔'' رچرڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''خاصے سنسنی خیز تھے۔'' اس نے جواب دیا۔

''میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔'' ہوگو نے کہا۔

''تم رچرڈ ہو۔'' خوف کی ایک سرد لہر رچرڈ کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ شاید وہ اس کی غیر حاضری سے واقف ہو چکا تھا۔ ''سفید ریچھ کے مقابلے کے بارے میں تمہارا خیال خیال ہے مسٹر رچرڈ۔'' ہوگو نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

''میری نظر میں سب مقابلے ایک جیسے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا تماشا دیکھا ہے۔'' رچرڈ نے کہا۔

''بہت خوب۔'' ہوگو نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا۔ رچرڈ نے سوچا۔ وہ ہوگو کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن فوراً ہی اس کی خوش فہمی دور ہو گئی۔ رینی نے اس کے کندھے سے سر لگایا اور سرگوشی میں کہا۔ ''مقابلے میں کوئی سفید ریچھ نہیں تھا۔''

نقاب کے اندر رچرڈ کی پیشانی پسینے میں بھیگ گئی۔ ہوگو کی نظر میں اس کی پوزیشن مشکوک ہو گئی تھی۔ اب اسے فوری طور پر دو کام کرنے تھے۔ پہلا مائیکرو فلموں کو چھپانا اور دوسرا 'مسلم فرنٹ' کو فون کرنا لیکن یہ دونوں ہی کام اب آسان نہیں رہے تھے۔

جب وہ کلب کی عمارت کے سامنے پہنچے تو کچھ لوگوں کی پر تشویش آوازیں سنائی دیں۔ وہ ان کی طرف کسی کو اٹھا کر لا رہے تھے۔ رچرڈ فوراً سمجھ گیا کہ وہ جان ڈی ہے۔ ہربرٹ نے نقاب اتار دیا اور قریب جا کر دیکھا پھر حاضرین سے مخاطب ہوا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ شاید انہوں نے زیادہ پی لی ہے۔'' وہ ملازموں کی طرف پلٹ پڑا۔ ''مسٹر ڈی کو ان کے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔''

تین ملازم جان ڈی کو لے کر عمارت کی طرف چلے گئے۔ باقی لوگ ہربرٹ کی ہدایت پر لاؤنج میں اپنے چوغے اتارنے لگے۔ رچرڈ نے رینی کو وہیں چھوڑا اور چوغہ پھینک کر جلدی سے کمرے میں پہنچ گیا اور سیدھا باتھ روم میں گیا۔ مائیکرو فلم پر لکھا فون نمبر ذہن نشین کیا اور فلمیں جیب میں رکھ کر باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی وہ بھونچکا رہ گیا۔ کمرے میں رینی کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ رچرڈ کو اس کی یہ مسکراہٹ عجیب سی لگی۔ جانے وہ طنزیہ مسکراہٹ تھی یا کوئی اور بات تھی۔ ''تم نے میرا انتظار بھی نہیں کیا۔''

''مم...... میں دراصل باتھ روم تک جانا چاہتا تھا۔'' رچرڈ نے جلدی سے کہا۔ اسے فوری طور پر یہی بہانہ سوجھا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

رینی چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر اچانک بولی۔ ''آؤ۔ ذرا سیر کرنے چلیں۔ ڈرائیونگ کا موڈ ہو رہا ہے۔''

''اس وقت۔'' رچرڈ نے حیرانی سے پوچھا پھر فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ چونکہ دفتر کا دروازہ اور فائلنگ کیبنٹ کھلی ہوئی تھی۔ اس لیے انتظامیہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جان ڈی نے وہاں سے خفیہ راز اڑا لیے ہیں اور مرنے سے قبل کسی اور کے حوالے کر دیے ہیں اور چونکہ وہ اکھاڑے سے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ اس لیے زیادہ شبہ اسی پر کیا جا رہا تھا۔ غالباً وہ اس کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتے تھے۔

''چلو! تمہارے ساتھ تو میں جہنم میں بھی جا سکتا ہوں۔'' رچرڈ نے شوخ لہجے میں رینی کو گھورا۔ اس طرح وہ اپنی خاموشی چھپانا چاہتا تھا۔

''میرا خیال ہے لباس تبدیل کر لو اور کوئی ہلکا پھلکا لباس پہن لو۔'' رینی نے سرسری انداز میں کہا۔

گویا لباس کی بھی تلاشی لی جائے گی۔ رچرڈ نے دل میں سوچا اور اونچی آواز سے بولا۔ ''ہاں ٹھیک ہے۔ تفریح کے لیے تو ہلکا لباس ہونا چاہیے۔'' وہ باتھ روم میں گھس گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا پھر اس نے جیب سے سگار نکالا۔ ماچس کی تیلی سے اس کا پچھلا حصہ کھولا۔ دونوں مائیکرو فلمیں اس کے اندر ٹھونس دیں اور سگار کو واپس پیکٹ میں رکھ کر اس نے لباس تبدیل کیا اور باہر آ گیا پھر رک کر پیکٹ سے مائیکرو فلموں والا سگار نکال کر سلگایا اور پیکٹ کو بے پروائی سے میز پر پھینک دیا۔ اب اس کے ایک ہاتھ میں سگار اور جسم پر پینٹ شرٹ کے سوا کوئی چیز نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ سگار ختم ہونے سے پہلے ہی وہ کلب سے کافی دور نکل چکے ہوں گے۔ سگار بظاہر معمولی تھا مگر یہ بات صرف وہی جانتا تھا کہ اس معمولی سے سگار کی قیمت ایک لاکھ پاؤنڈ تھی۔

☆☆

جیسے ہی انہوں نے کمرے سے باہر قدم رکھا، برابر والے کمرے سے ایک لڑکی ہانپتی کانپتی نکلی اور رچرڈ سے لپٹ گئی۔ وہ بظاہر شراب کے نشے میں بدمست تھی۔ رچرڈ دل میں اس کی اداکاری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ کیونکہ اس نے وارفتگی کا اظہار کرتے ہوئے چند لمحوں میں ہی اس کے سارے جسم کی تلاشی لے ڈالی تھی۔

''مس! میں آپ کا ساتھی نہیں ہوں۔'' رچرڈ نرمی سے اسے خود سے الگ کرتا ہوا بولا۔ ''آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔''

لڑکی نے پلکیں جھپکائیں حیرت سے منہ کھول کر اسے گھورا پھر خفیف ہو کر دوبارہ اپنے کمرے میں گھس گئی۔

رچرڈ، رینی کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ سگار اس کے ہاتھ میں سلگ رہا تھا۔ عمارت سے باہر نکل کر دونوں ارغوانی رنگ کار میں جا بیٹھے۔ رینی نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا اور کار کو آگے بڑھا دیا۔ رچرڈ نے دستی گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے پونے گیارہ رہے تھے۔ رچرڈ کا جی چاہا کہ وہ رینی کو سب کچھ بتا دے۔ اس کا دل کہتا تھا کہ وہ اس پر اعتماد کر سکتا ہے لیکن معاملہ بہت نازک تھا۔ یہی سوچ کر اس نے ارادہ بدل دیا۔

رینی خاموش تھی۔ اس کی نظریں سڑک پر جمی ہوئی تھی۔ کار پچیس، تیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ اس وقت وہ مین روڈ پر آ چکے تھے اور کسی قصبے کی مدھم بتیاں اونگھتی نظر آ رہی تھیں۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک فون بوتھ نظر آیا۔

رینی نے کار، بوتھ کے سامنے روک دی۔

''کیا بات ہے۔'' رچرڈ نے پوچھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''ذرا ایک فون کرلوں۔'' رینی نے جواب دیا۔ ''میں اپنے کمرے کی چابیاں شاید اس چوغے میں بھول آئی ہوں جو ریچھوں کے مقابلے کے دوران پہنا تھا۔'' اس نے کار کے خانے سے چند سکے نکالے اور کار سے اتر کر بوتھ میں گھس گئی۔

رچرڈ بھی باہر آ گیا۔ چاندنی' خوش گوار موسم اور رومان پرور ماحول' رچرڈ' رینی کی قربت پانے کے لیے بے تاب ہوگیا مگر فوراً اسے ہاتھ میں پکڑے سگار کا خیال آ گیا۔ وہ نصف تک جل چکا تھا۔ اس نے اسے مسل کر اچھی طرح بجھا دیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ بوتھ کے پیچھے ایک گھنی جھاڑی اگی ہوئی تھی۔ وہ چہل قدم کے انداز میں جھاڑی کے قریب گیا اور بجھا ہوا سگار اس کے وسط میں پھینک دیا۔ وہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں کسی کا دھیان بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔

پھر وہ بوتھ میں گھس گیا۔ رینی بات ختم کر چکی تھی اور ریسیور رکھ کر باہر نکلنے والی تھی۔ رچرڈ کو اچانک خیال آیا کہ وہ بھی مسلم فرنٹ کو فون کرسکتا تھا۔ ''رینی آؤ تھوڑی سی تفریح کریں۔'' اس نے رینی کے کان میں کہا۔ ''لوگوں کو فون کر کے تھوڑا سا پریشان کرتے ہیں۔'' رینی اس پر رضا مند نہ تھی لیکن رچرڈ نے اسے راضی کر ہی لیا۔ اس نے سوراخ میں ایک سکہ ڈالا اور مسلم فرنٹ کا نمبر ڈائل کر ڈالا۔ پانچویں گھنٹی پر ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو! پرنسز آف فریڈم اسپیکنگ۔''

رچرڈ کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ اٹھیں۔ اس نے بہ مشکل اپنا مزاحیہ انداز برقرار رکھا پھر بولا۔ ''تمہاری ڈبل روٹی جل چکی ہے۔ اب بسکٹوں پر گزارہ کرو۔ صرف بسکٹوں پر۔''

''بسکٹ کہاں سے مل سکتے ہیں۔'' دوسری جانب سے بولنے والی لڑکی نے پوچھا۔

رچرڈ اس سوال کے لیے تیار نہ تھا۔ جلدی سے بولا۔ ''گھاس کھا گئی ہو کیا۔ جلی ہوئی ڈبل روٹی کے آس پاس ہی کہیں دیکھو۔''

لڑکی غالباً سمجھ گئی تھی کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ وہ غصے سے بولی۔ ''شٹ اپ۔ نان سینس۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔

رچرڈ کا منہ بن گیا۔ وہ دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''آؤ چلیں مزہ نہیں آیا۔''

تھوڑی دیر بعد ان کی کار بیئر گارڈن کی طرف دوڑ رہی تھی۔ ''رچرڈ ڈیئر۔'' اچانک رینی نے کہا۔ ''تمہیں بہت احتیاط کرنی چاہیے۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا جانی!'' رچرڈ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم کیا کہنا چاہتی ہو۔''

''ہر بات کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔'' رینی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

رچرڈ کا ذہن الجھن کا شکار ہوگیا۔ نہ جانے رینی کا اشارہ کس بات کی طرف تھا۔ فون کی طرف' اپنی طرف یا بیئر گارڈن کی انتظامیہ کی جانب۔ چونکہ اس نے مائیکرو فلموں کو مناسب جگہ چھپا دیا تھا۔ اس لیے وہ خاصا مطمئن تھا مگر خطرہ بہرحال موجود تھا۔

کلب پہنچنے کے بعد وہ رینی کا ہاتھ پکڑے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ اس عرصے میں اس کے کمرے کی تلاشی لی جا چکی ہوگی اوپر پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا اور اندر تاریکی میں قدم رکھا' اچانک دو آدمیوں نے اسے دائیں بائیں سے جکڑ لیا۔

داہنی طرف والے نے اس کے بازو میں کوئی سریع الاثر انجکشن لگا دیا۔ لمحہ بھر کے اندر وہ کسی بے جان پتلے کی طرح دونوں کے بازوؤں میں جھول گیا۔ انہوں نے اسے گھسیٹ کر بستر پر ڈال دیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ دیکھ سکتا تھا لیکن بول سکتا تھا نہ حرکت کرسکتا تھا پھر کمرے کی لائٹ روشن ہوگئی۔ اس نے رینی کو اپنے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سامنے کھڑے دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ دوسرے دو آدمی اس کی حد نگاہ سے باہر تھے۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور حواس پر تاریکی چھا گئی۔

☆☆

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک خستہ حال کوٹھری میں پایا۔ دیواروں پر کائی جمی ہوئی تھی اور فرش سیلن زدہ تھا' چھت کا پلستر اکھڑا ہوا تھا کوٹھری میں صرف ایک دروازہ تھا جو باہر سے بند تھا اور ایک کھڑکی تھی جس میں موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اندر ایک پرانی سی دری ایک میز اور ایک اسٹول تھا۔ چند لمحوں تک وہ دری پر لیٹا پلکیں جھپکاتا رہا۔ باہر تاریکی تھی اور چھت پر مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا جس پر جمی گرد کے باعث روشنی اور بھی مدھم ہو گئی تھی۔

رچرڈ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ پیر ہلا کر دیکھنے لگا۔ اسے خوشی ہوئی کہ اس کا جسم ٹھیک ٹھاک اور سلامت تھا۔ اسے یہ اندازہ نہ ہو پایا کہ وہ کتنی دیر تک سوتا رہا تھا کیونکہ اس کی دستی گھڑی غائب تھی۔ کچھ دیر بعد کوٹھری کا دروازہ کھلا اور ایک دیوہیکل شخص اندر آیا۔ اس کے چہرے پر سفاکی پائی جاتی تھی۔ اسی لمحے دروازے پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ رچرڈ نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہاں ہوگو کھڑا تھا۔ ہلکے رنگ کے بے داغ سوٹ میں اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

رچرڈ کو وہ مسکراہٹ اپنا مذاق اڑاتی محسوس ہوئی۔ اس کا جی چاہا۔ وہ بڈھے ہوگو کی سفید کھوپڑی چکنا چور کر دے لیکن دیوہیکل شخص کی موجودگی نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ ہوگو نپے تلے قدم اٹھاتا اندر آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا جا رہا ہے۔'' رچرڈ نے سلگتے لہجے میں پوچھا۔

''ہم اپنے مہمانوں کو ہر ممکن سہولت فراہم کرتے ہیں لیکن کوئی مہمان جب ہمارے نجی معاملات میں دخل دینے لگے تو ہم اس انداز میں اس کی تواضع کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تمہارے بارے میں ہمیں کچھ قابل اعتراض باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ مثلاً تم اور جان ڈی ریچھوں کی لڑائی کے دوران غائب تھے جان ڈی نے ہمارا دفتر کا تالا توڑا اور بعض اہم کاغذات دیکھتا رہا پھر جب اس نے فائلنگ کیبنٹ کا قفل توڑا تو ہمارے خودکار حفاظتی نظام کا شکار ہو گیا۔ وہ اب ریچھوں کی خوراک بن چکا ہے۔ صرف چند ہڈیاں باقی بچی ہیں۔''

رچرڈ کے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔ ''کیا تم نے اسے ریچھوں کی کچھار میں ڈلوا دیا تھا۔''

''اس کی لاش کو۔ کیونکہ جب ہمارے آدمیوں نے اسے وہاں سے اٹھایا تو وہ مر چکا تھا۔'' ہوگو نے کہا۔ ''تم یا تو اس کے ساتھی ہو یا پھر اس نے تمہیں کچھ معلومات منتقل کی ہیں۔'' اس کا لہجہ یکایک ہی سرد ہو گیا۔ ''مجھے بتاؤ! تم کون ہو۔ کس کے لیے کام کر رہے ہو اور تم ہمارے اور ہمارے کلب کے بارے میں کیا کچھ جانتے ہو۔''

''میں کسی کے لیے کام نہیں کر رہا اور کچھ نہیں جانتا۔'' رچرڈ نے جواب میں کہا۔ اس کے جبڑے بھنچ گئے تھے۔ ''تم مجھ پر تشدد نہیں کر سکتے۔''

''میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔'' ہوگو نے کہا اور دیوہیکل شخص کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور رچرڈ کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ ہوگو نے مزید کہا۔ ''اگر یہ تمہیں اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر سر سے بلند کرے پھر اپنے گھٹنے پر دے مارے تو تم دو حصوں میں بٹ جاؤ گے۔ کیا خیال ہے ہو جائے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہے۔''

رچرڈ کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ ''مسٹر ہوگو! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ......'' اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی ہوگو نے دیوہیکل شخص کو اشارہ کیا۔ اس نے رچرڈ کو گردن سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ اتنا اوپر کہ رچرڈ کے پاؤں بھی زمین سے اٹھ گئے پھر اس دیوزاد نے رچرڈ کی ٹانگوں کے درمیان میں ٹھوکر لگائی۔ رچرڈ تڑپ کر دری پر جا گرا۔ ایک ہی ٹھوکر کافی ثابت ہوئی تھی۔ اس کے حواس پر تاریکی چھا گئی۔

☆☆

اسے جب ہوش آیا تو وہ کوٹھری میں اکیلا تھا۔ اس کی ٹانگوں کے درمیان شدید درد ہو رہا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ صبح کا وقت ہے یا شام کا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور گزرے واقعات پر غور کرنے لگا اگر اسے معلوم ہوتا کہ یہ تفریح اتنی مہنگی پڑے گی تو وہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرتا۔

اس کے درد میں کمی واقع ہوئی تو وہ فرار کی کوئی ترکیب سوچنے لگا۔ دروازہ بھاری اور مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ باہر کوئی محافظ بھی تھا جس کے قدموں کی چاپ اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔ کھڑکی پر جو سلاخیں لگی تھیں وہ خاصی موٹی اور مضبوط تھیں۔ چھت اور فرش پختہ تھا۔ بظاہر کوئی راہ فرار نہ تھی۔ معاً دروازے کے باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی پھر دروازہ کھلا اور دیوہیکل شخص اندر داخل ہوا۔

''باس نے تمہیں صرف ایک دن کی مہلت اور دی ہے۔'' دیوزاد شخص نے درشتی سے کہا۔ ''اگر تم نے زبان نہ کھولی تو پھر تمہارا مقابلہ بھورے ریچھ سے ہوگا۔'' اس کے نوکیلے دانت خنجر کی طرح چمک رہے تھے۔

رچرڈ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دیوہیکل شخص اسے گھورتا ہوا واپس چلا گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے دروازہ مقفل کر دیا تھا۔ رچرڈ کے اعصاب پر سکتہ سا طاری ہوگیا اور حواس معطل ہونے لگے۔ چند لمحوں بعد وہ بستر پر ڈھیر ہوگیا اور اس پر غنودگی چھا گئی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی دروازہ کھلا اور ہربرٹ اندر داخل ہوا۔ رچرڈ نے اسے کینہ توز نظر سے دیکھا پھر لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''مم...... میں باہر جانا چاہتا ہوں۔ تم...... تم مجھے اس طرح حبس بے جا میں نہیں رکھ سکتے۔'' اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

''خوب! تم باہر جانا چاہتے ہو اور تمہارا خیال ہے کہ ہم تمہیں اس طرح قید نہیں رکھ سکتے لیکن مسٹر رچرڈ! تم احمق ہو۔ تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم تمہیں قتل بھی کر سکتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے رچرڈ کی دونوں ٹانگوں کے وسط میں ایک زوردار ٹھوکر ماری۔ رچرڈ کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ وہ درد سے نڈھال ہو کر گر پڑا۔

ہربرٹ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہوگو نے مہربانی سے کام لیتے ہوئے ایک شرط پر تمہیں آزاد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' وہ رکا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی پھر وہ اسے ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''اسے پہچانتے ہو۔''

رچرڈ گنگ سا ہوگیا۔ ہربرٹ کی ہتھیلی پر وہ کیمرا رکھا تھا جو اس نے جان ڈی سے لے کر جھیل میں پھینک دیا تھا۔

''مم...... میں...... میں اس کیمرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے اٹک اٹک کر کہا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی۔

''خوب۔'' ہربرٹ کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ''تو تم جانتے ہو کہ یہ کیمرہ ہے۔ حالانکہ عام طور پر ایسی چیزوں کو پہچاننا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ کیمرا ہمیں کیسے

 DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

حاصل ہوا۔ یہ بھی سن لو۔ جب ہم نے جان ڈی کو درختوں کے نیچے مردہ پڑے دیکھا تو ہمیں یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی ہے۔ وہ ہمارے دفتر سے خفیہ راز چرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہمارے خودکار حفاظتی نظام کا شکار ہوگیا۔ سوئی کے ذریعے جو زہر اس کی ٹانگ میں داخل ہوا تھا۔ اس کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے جسم کو حرکت دینے کے قابل نہیں رہتا۔ اصولاً ہمیں جان ڈی کی لاش دفتر کے اندر ہی ملنی چاہیے تھی لیکن وہ درختوں کے نیچے پڑا تھا۔ گویا کسی نے اس کی مدد کی تھی۔ دوسرا اندازہ ہم نے یہ لگایا کہ اس نے قابل اعتراض چیزوں کو جھیل میں پھینک دیا تھا۔ لہٰذا ہم نے لائن ڈی ٹیکٹر کے ذریعے ساری جھیل کو چھان مارا اور یہ کیمرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ہمارے ماہرین نے جب اس کیمرے کا معائنہ کیا تو اس پر دو آدمیوں کی انگلیوں کے نشان ملے۔ ایک تو جان ڈی کے تھے اور دوسرے...... '' وہ مسکرایا۔ ''وہ تمہاری انگلیوں کے تھے۔''

رچرڈ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ اب اسے اپنے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ انہوں نے کیمرہ تلاش کرلیا تھا تو یقیناً مائیکرو فلمیں بھی ڈھونڈ لی ہوں گی۔ اس خیال نے اس پر رعشہ طاری کردیا۔

ہربرٹ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اس کیمرے کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ جان ڈی نے ہمارے ریکارڈ کی کچھ مائیکرو فلمیں بھی تیار کی تھیں لیکن وہ فلمیں جھیل سے نہیں ملیں اور نہ تمہارے کمرے سے برآمد ہوئیں۔ ہمیں شبہ ہے کہ وہ فلمیں تمہارے پاس ہیں۔ ہوگو نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر تم مائیکرو فلمیں ہمارے حوالے کردو تو ہم تمہیں آزاد کردیں گے۔''

رچرڈ کے دل میں آیا کہ وہ مائیکرو فلمیں ان کے حوالے کردے اور اس عذاب سے نجات حاصل کرلے لیکن فوراً ہی اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ اس نے سوچا کہ اب تک جو اسے زندہ رکھا جارہا ہے۔ وہ صرف فلموں کی وجہ سے ہے اگر اس نے فلمیں ان کے حوالے کردیں تو پھر اس کے بچنے کی رہی سہی امید بھی ختم ہوجائے گی۔

''یقین کرو! میں ان فلموں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے ٹھوس اور حتمی لہجے میں کہا۔

''تم آج رات ایک بجے تک سوچ سکتے ہو اگر پھر بھی تم نے آمادگی ظاہر نہ کی تو تمہارا ٹھکانہ ریچھوں کی کچھار میں ہوگا۔'' وہ واپس مڑا اور محافظ کے ساتھ چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ دروازہ بند ہوگیا تھا۔

☆☆

رچرڈ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ بے بسی کی موت نہیں مرے گا اور اپنی زندگی بچانے کی آخری کوشش ضرور کرے گا۔ وہ اضطراب کیفیت میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا پھر وہ تھک کر بستر پر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔ مایوسی اس کے اعصاب پر غالب آتی جارہی تھی۔ ابھی تک بچ نکلنے کی کوئی معقول تدابیر اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

لیٹے لیٹے نہ جانے کب اسے نیند آگئی لیکن کچھ دیر بعد ہی اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو رینی کو خود پر جھکے ہوئے پایا۔ جانے وہ خواب تھا یا حقیقت۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔

''رچرڈ۔'' اس کی سماعت میں رینی کی میٹھی آواز در آئی۔ ''تم خیریت سے تو ہونا۔''

وہ ایکدم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے واقعی رینی موجود تھی۔ اس کے دل میں آیا کہ وہ رینی کا گلا گھونٹ ڈالے کیونکہ وہ بھی جرشاٹز

Downloaded from Paksociety.com

گروپ کی رکن تھی لیکن وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ ''سنہری ناگن۔'' اس نے غصے سے کہا۔ ''اب تم میرے پاس کیا لینے آئی ہو۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''میری ڈبل روٹی جل گئی ہے۔'' رینی نے پرخیال انداز میں کہا۔ ''میں بسکٹ لینے آئی ہوں۔''

رچرڈ بری طرح چونک پڑا۔ ''کک...... کیا تم۔'' اس کے لہجے میں لکنت تھی۔ حیرانی اور بے اعتباری کی لکنت۔

''ہاں میں مسلم فرنٹ کے لیے کام کر رہی ہوں۔ مجھے کل ہی ان کی طرف سے پیغام ملا ہے۔'' رینی مسکرائی۔ ''جلدی سے اٹھو۔ باہر کار تیار کھڑی ہے جبکہ دونوں محافظ بے ہوش پڑے ہیں۔''

''لل...... لیکن تت...... تم یہاں پہنچیں کیسے۔'' رچرڈ نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''ہوگو نے آخری حربے کے طور پر مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ میں تم سے مائیکرو فلموں کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کروں۔ اس کا خیال ہے کہ تم مجھ سے کچھ زیادہ ہی مانوس ہو گئے ہو۔''

اس کی باتوں میں رچرڈ کو خلوص نظر آیا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے رینی کے ساتھ باہر آ گیا۔ دروازے کے قریب دو محافظ بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ ان سے کچھ ہی دور ارغوانی رنگ کی ایک کار کھڑی تھی جس کا بے آواز انجن بیدار تھا۔ دونوں لپک کر کار کے اندر جا بیٹھے۔ ڈرائیونگ نشست رینی نے سنبھال لی۔

''تمہیں وہ ٹیلی بوتھ یاد ہے جہاں میں نے مذاق میں کسی کو ڈبل روٹی جلنے کی اطلاع دی تھی۔'' رچرڈ نے کہا۔ رینی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''پہلے تم مجھے وہاں لے چلو۔'' رچرڈ نے کہا۔

اندازِ فکر

☆ ڈھونڈنے میں ملنے کی شرط نہیں ہوتی، امید ہوتی ہے اور امید سے جھگڑا نہیں کرتے۔

☆ فتنہ انگیز سچائی سے مصلحت آمیز جھوٹ بہتر ہے۔

☆ نفس کو اس کی خواہش سے دور رکھنا حقیقت کے دروازے کی چابی ہے۔

☆ غصہ کرنے کا مطلب ہے کہ ہم دوسروں کی غلطیوں کا بدلہ اپنے آپ سے لیتے ہیں۔ یہ کتنی حیرت انگیز اور مضحکہ خیز بات ہے

کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں جو ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیرے میں راستہ دکھاتے ہیں۔

☆ بحث میں کسی کو لاجواب کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ بات کی جائے جس کا تعلق بحث سے نہ ہو۔

☆ کسی کی طرف انگلی نہ اٹھاؤ کیونکہ باقی تینوں انگلیاں آپ کی طرف ہیں۔

☆ چلتے ہوئے ہمیشہ خیال رکھو کہ تمہارے پاؤں سے اٹھتی ہوئے دھول سے کسی کی منزل نہ گم ہو جائے۔

''کوئی خاص بات۔'' رینی نے بھویں اچکائیں اور سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

رچرڈ نے اسے سگار کے بارے میں بتانا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ ''میں ایک فون کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے بات ٹال دی۔

کار کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں اور وہ دھیمی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کار فون بوتھ کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ رچرڈ نے کار سے اتر کر ادھر ادھر دیکھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ وہ جلدی سے جھاڑی کے قریب گیا اور ماچس جلا کر دیکھا۔ اس کا پھینکا ہوا سگار سامنے ہی پڑا تھا۔ اس نے سگار اٹھا کر جیب میں رکھا پھر وہ فون بوتھ میں گھس گیا۔ رینی کار میں ہی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بیٹھی تھی۔

رچرڈ کو 'مسلم فرنٹ' کا نمبر ابھی تک یاد تھا۔ اس نے جلدی جلدی نمبر گھمایا۔ ''پرنسز آف فریڈم۔'' اس دفعہ کسی مرد کی آواز آئی۔

''میرا نام رچرڈ ہے اور بیئر گارڈن کے قریب ایک فون بوتھ سے بات کر رہا ہوں۔ چند روز قبل میں نے اس نمبر پر ڈبل روٹی کے جلنے کی اطلاع دی تھی۔ دراصل جان ڈی نے مجھے دو مائیکرو فلمیں دی تھیں وہ دونوں میرے پاس ہیں اور میں رینی برڈ نامی لڑکی کے ساتھ ارغوانی رنگ کی کار میں لندن کی طرف آ رہا ہوں۔''

''رچرڈ۔'' اسی لمحے رینی کی تیز آواز اس کے کانوں میں آئی۔ ''جلدی کرو۔ ایک کار ہمارے تعاقب میں آ رہی ہے۔''

''اف خدایا! میں جا رہا ہوں۔'' رچرڈ نے فون پر کہا۔ ''ایک کار ہمارے تعاقب میں آ رہی ہے۔'' اس نے ریسیور پٹخ دیا اور باہر کی طرف بھاگا۔ کار کا انجن اسٹارٹ تھا اور دروازہ کھلا ہوا تھا۔

جیسے ہی وہ سیٹ پر بیٹھا۔ کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ پیچھے سے آنے والی کار طوفانی رفتار سے ان کے قریب آتی جا رہی تھی۔

''شاید انہیں ہمارے فرار کا علم ہو گیا ہے رچرڈ۔'' رینی نے کہا اور کار کی رفتار مزید تیز کر دی۔

رچرڈ نے پیچھے دیکھا۔ عقبی سیٹ پر ایک پستول پڑا تھا۔ اس نے پستول اٹھا لیا اور رینی سے پوچھا۔ ''کیا اس میں گولیاں موجود ہیں۔''

''ہاں ہیں۔'' رینی نے کہا۔ ''لیکن تمہیں اس کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ یہ لوگ ہماری گرد کو بھی نہیں پا سکتے۔'' اس کے ساتھ ہی کار کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔ وہ واقعی نہایت ماہرانہ انداز میں گاڑی چلا رہی تھی۔ رفتار کی پیمائی سوئی نوے اور سو کے درمیان لرز رہی تھی۔ پچھلی کار تقریباً سو گز پیچھے تھی اور درمیانی فاصلے میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو رہی تھی۔

اچانک پچھلی کار سے ایک فائر کیا گیا۔ گولی کار کی باڈی کو لگی لیکن کوئی نقصان نہیں ہوا۔ چند میل تک دونوں کاریں ایک ہی رفتار سے دوڑتی رہیں۔ پیچھے سے وقفے وقفے سے فائرنگ کی جا رہی تھی۔ معاً ایک گولی پچھلی ونڈ اسکرین کو لگی اور وہ ریزہ ریزہ ہو گئی۔

رچرڈ کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آنے لگی۔ وہ اپنی سیٹ پر دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔ تاہم رینی بالکل پرسکون تھی۔ رینی نے اس کی گھبراہٹ بھانپ لی۔ ''بس چند لمحوں کی بات ہے۔'' رینی نے اسے دلاسا دیا۔ ''ہم لندن کے مضافاتی علاقے میں پہنچنے والے ہیں پھر یہ اتنی آزادی کے ساتھ ہم پر فائرنگ نہیں کر سکیں گے۔''

اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی مخالف سمت سے ایک کار آتی دکھائی دی۔ معاً اس کی رفتار کم ہوئی اور وہ سڑک کے کنارے پر رک گئی۔ جب رینی کی کار کچھ فاصلے پر نکل گئی تو رک جانے والی کار چل پڑی۔ اس کی رفتار یک دم تیز ہو گئی تھی۔ کار کا رنگ سیاہ تھا اور اس میں تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ڈرائیور تھا اور دو آدمی پیچھے تھے۔

رچرڈ کو شبہ سا ہوا کہ پچھلے دونوں آدمیوں کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک عجیب منظر نظر آیا۔

سیاہ کار' تعاقب کرنے والی کار کو کاٹتی ہوئی دائیں طرف لے جا رہی تھی پھر فائرنگ کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں اور اچانک تعاقب کرنے والی کار' سڑک کے کنارے سے لڑھکتی ہوئی دور چلی گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ شعلوں کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔

رینی نے یہ منظر دیکھا تو سڑک کے کنارے کار روک دی اور اسٹیئرنگ سے سر ٹکا کر ہانپنے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گی۔

سیاہ کار ان کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے دونوں آدمی باہر نکلے اور ارغوانی کار کے نزدیک آ گئے۔

''وندر فل پشمینے۔'' ایک نے رینی کو مخاطب کر کے کہا۔ ''تم نے کمال ہی کر دیا۔'' اس کی آواز میں ستائش کا عنصر جھلک رہا تھا۔

''پشمینے!'' رچرڈ نے حیرت سے دہرایا اور پلکیں جھپکاتے ہوئے رینی کو دیکھنے لگا۔

وہ شخص رچرڈ کی طرف دیکھ کر مسکرایا پھر بولا۔ ''مجھے مقبول کہتے ہیں۔ ہمارا تعلق مسلم فرنٹ سے ہے۔ اسی کی طرف سے ہم تمہارے استقبال کے لیے آئے ہیں۔ ہم تمہارا فون ملتے ہی روانہ ہو گئے تھے۔''

''اوہ! تو تم مسلم فرنٹ کے آدمی ہو۔'' رچرڈ کے ہونٹ سکڑ گئے۔ ''مگر اس تنظیم کا مقصد کیا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''اقوام متحدہ کی متفقہ قرارداد کے مطابق مقبوضہ کشمیر میں آزادانہ استصواب رائے اور بھارت کی غلامی سے آزادی۔'' دراز قد' وجیہہ اور پرکشش نوجوان نے اسے بایا۔ اس کے ہونٹوں پر خوشگوار مسکراہٹ تھی۔

''پچھلی کار میں کون بیٹھا تھا۔'' رینی نے پوچھا۔

''کل چار افراد تھے۔ ایک بھی زندہ نہیں بچا۔ ایک ہربرٹ' دوسرا ہوگو' باقی دو غالباً محافظ تھے۔'' مقبول نے بتایا پھر وہ اپنے ساتھی کی طرف پلٹ پڑا۔ ''خالد! یہ کار تم سنبھالو اور تم دونوں پچھلی کار میں آ جاؤ۔''

رینی اور رچرڈ' پچھلی کار میں جا بیٹھے۔ مقبول بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور کار لندن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆

''اوہ میرے خدا!'' رچرڈ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''یہ قیامت کے چند دن زندگی بھر یاد رہیں گے۔''

''جان ڈی کی موت کا بہت دکھ ہوا۔ اسے کشمیری قوم کے کاز سے ہمدردی تھی۔'' مقبول نے کہا۔ ''مسٹر رچرڈ! جان ڈی نے تمہارے پاس کوئی امانت رکھوائی تھی۔'' رچرڈ کا سر اثبات میں ہل گیا۔

''ہاں۔ اس امانت نے ہی تو مجھے موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا اگر رینی مجھے وہاں سے

اندازِ فکر

☆ ہر آدمی کی رائے اس کے ذاتی تجربے کے مطابق ہوتی ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆ کسی آدمی کو جب اس کی بساط سے زیادہ دُنیا مل جاتی ہے تو لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ برا ہو جاتا ہے۔ (حکیم اقلیدس)

☆ پرامیدی سے سفر کرنا جلدی پہنچنے سے بہتر ہے۔ (سرجیمز جیسن)

☆ اگر تم چاہو تو اپنے خیالات کو بدل کر زندگی بہتر بنا سکتے ہو۔ (آسکر وائلڈ)

☆ زندگی کی خوشیاں ہمارے خیالوں پر منحصر ہیں۔ (کنفیوشس)

☆ وہ محبت یقیناً عظیم ہوتی ہے جو ایک دوسرے کی عزت پر مبنی ہو۔ (جانسن)

☆☆

انٹرویو

''آپ کے سیاسی نظریات کیا ہیں؟''

''وہی جو میرے لیڈر کے ہیں۔''

''ان کے سیاسی نظریات کیا ہیں۔؟''

''وہی جو میرے ہیں۔''

''آپ دونوں کے سیاسی نظریات کیا ہیں۔؟''

''ہم دونوں کے سیاسی نظریات بالکل یکساں ہیں۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نکال کر نہ لاتی تو وہ یقیناً مجھے موت کے گھاٹ اتار دیتے۔'' اس نے ممنون نظر سے رینی کی طرف دیکھا پھر جیب سے ادھ جلا سگار نکالا اس کا نچلا حصہ توڑ کر مائیکرو فلمیں نکالیں اور مقبول کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ اس کے ساتھ ہی اسے کچھ یاد آیا۔ ''لیکن......'' وہ اپنا جملہ پورا نہ کر پایا۔

''کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔'' مقبول نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''ہم جو وعدہ کرتے ہیں اسے یاد رکھتے ہیں۔'' پھر اس نے سیٹ کے نیچے رکھا ہوا بریف کیس نکالا اور اسے رچرڈ کی گود میں رکھ دیا۔ ''اس میں پورے ایک لاکھ پاؤنڈ موجود ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''یقین نہ آئے تو گن بھی سکتے ہو اور یہ بریف کیس ہماری طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہے۔ یہ تمہیں ہماری یاد دلاتا رہے گا۔''

رچرڈ نے بریف کیس کا ڈھکنا اٹھایا۔ نوٹوں کی گڈیوں کا حساب لگایا اور بریف کیس بند کر دیا۔ اس کے اندازے کے مطابق رقم پوری ہی تھی پھر وہ پرشوق نظر سے رینی کی طرف دیکھنے لگا لیکن رینی کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔

''میری منگیتر نے تمہیں زیادہ پریشان تو نہیں کیا۔'' مقبول نے شوخ لہجے میں رچرڈ سے پوچھا۔

''تمہاری منگیتر۔'' رچرڈ حیرت سے اچھل پڑا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اس کی سیٹ میں یکایک اسپرنگ نکل آئے ہوں۔ ''سوری! میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے! پشمینے نے تم سے اپنا پورا تعارف نہیں کرایا۔'' مقبول' رینی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ لڑکی جسے تم رینی کے نام سے جانتے ہو' میری ہونے والی بیوی پشمینے ہے۔ ہماری شادی اگلے ماہ ہو رہی ہے۔ تم اس میں ضرور شرکت کرنا۔''

یہ سنتے ہی رچرڈ کا منہ لٹک گیا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ وہ رینی کی رفاقت میں ساری عمر گزار دے گا لیکن جو کچھ اس نے سنا تھا۔ اس کے بعد خوابوں کی شمعیں پگھل گئی تھیں۔ اسے ایک لاکھ پونڈ یک دم بے حقیقت لگنے لگے۔ وہ اس رقم سے بے شک بہت کچھ خرید سکتا تھا مگر رینی اسے کہاں ملتی۔

''آؤ گے نا تم ہماری شادی میں۔'' رینی نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک اچھے دوست کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔'' نا چاہنے کے باوجود رچرڈ کا سر اثبات میں ہل گیا۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو...... یہ آنسو وہ کسی کو دکھا بھی نہیں سکتا تھا۔

''شاید میں نہ آ سکوں۔'' رچرڈ نے دھیمی اور رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اگلے ماہ میری مصروفیات کچھ اہم نوعیت کی ہیں لیکن میں تمہیں شادی کا تحفہ ابھی پیش کیے دیتا ہوں۔''

رینی نے چونک کر رچرڈ کی طرف دیکھا' وہ کسی حد تک اس کی کیفیت کو سمجھ گئی تھی۔

''یہ میری طرف سے قبول کرو۔'' رچرڈ نے ایک لاکھ پاؤنڈ کے نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس رینی کی طرف بڑھا دیا۔

''یوں بھی تم لوگ جس نیک مقصد کے لیے کام کر رہے ہو اس میں میری ذات بھی کسی حد تک شامل ہو جائے گی۔ میں آزادی اور اس کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی قدر کرتا ہوں۔''

پشمینے اور مقبول' رچرڈ کے اس اقدام سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ اس وقت ان تینوں کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

Downloaded from Paksociety.com

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

شاکرہ نے اتنا کچھ سننے کے بعد بھی بہت آرام سے سلجھے انداز میں بات کی تھی۔ اس کے باوجود منظور کا غصہ کم نہیں ہوا تھا وہ کچھ دیر کھڑا انہیں مزید لغویات سے نوازتا رہا' نادیہ نے کچھ بولنے کی کوشش کی اور پیچھے کھڑی اس کی بہنوں نے بھی کچھ بولنا چاہا مگر شاکرہ نے سب کو چپ رہنے کو کہا۔ ریحان نے پہلی بار نادیہ کو ان کی بڑی بہن کی مہندی پر دیکھا تھا اور وہیں اپنا سب کچھ ہار گیا تھا'

معافی

عالیہ توصیف

اس شمارے کی ایک دلگداز کہانی

''**ہم** آپ کو اللہ اور رسول ﷺ کا واسطہ دیتے ہیں ہمیں معاف کردیں ......آپ کی دنیا تو اجڑ گئی ہے ہماری بھی اجڑ جائے گی۔ آپ کے بدلہ لینے سے آپ کا بیٹا واپس نہیں آئے لیکن ہم بھی اپنے بیٹے سے محروم ہو جائیں گے۔ آپ کے بیٹے کی طرح وہ بھی چار بہنوں کا کلوتا بھائی ہے۔ منتوں مرادوں سے ملا ہے۔ وہی اذیت وہی کرب جس سے آپ لوگ گزر رہے ہیں' آپ چاہتے ہیں ہم بھی گزریں ......''

منظور علی شاہ سب کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ وہ جسے اپنی شان' اپنے مرتبے پر گھمنڈ تھا جو اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتا تھا۔

''میرے بیٹے کو اس مقدمے سے خارج کروادیں ...... مجھے نادیہ بیٹی بہت پسند ہے' میں

Downloaded from Paksociety.com

اس کے رشتے کو قبول کرتا ہوں۔ آپ پلیز...... مجھے اور میرے بیٹے کو معاف کر دیں۔ میری عزت اب آپ لوگوں کے ہاتھ ہے۔''

وہ صوفے سے اٹھ کر شاکرہ کے قدموں میں بیٹھ گئے۔

☆☆

''اپنے بھائی کے قاتل سے شادی کرلوں...... نہیں میں مر کے بھی ایسا نہیں کروں گی...... آپ کیسے راضی ہوگئی امی...... وہ ہم آٹھ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ ہم سب کا آخری سہارا...... ابو کے بعد ہمارے لیے وہی سب کچھ تھا...... اور اب...... اسے میں...... ہنہ...... ہنہ......''

صرف نادیہ ہی نہیں کمرے میں موجود ہر آنکھ اشک بار تھی۔ ''ہم اپنا مقدمہ واپس لیتے ہیں۔'' اگلے دن تھانے جا کر شاکرہ نے اپنا مکمل بیان لکھ دیا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو...... قتل اس نے نہیں کیا...... پھر......''

''ہاں مگر وہ قتل کا باعث تو بنا ہے نہ...... وہ بھی میرے اکلوتے بھائی کے قتل کا......''

نادیہ نے روتے ہوئے زیبا کی بات کاٹی۔

''وہ بھی تو ان بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ ہماری طرح آٹھ نا سہی مگر چار بہنوں کا تو ہے ہی۔ وہ آپ کو پسند بھی کرتا تھا۔ آپ چاہتی ہیں اس کی بہنیں بھی بھائی کی پھانسی ہونے پر ہماری طرح تڑپیں۔''

سیما نے روتے ہوئے دونوں کے درمیان بولا۔

''انہیں تڑپنا چاہیے...... بہت تڑپنا چاہیے...... یہ سب باتیں بناتے ہوئے تم لوگ یہ کیوں بھول رہی ہو...... کہ یہ وہی منظور علی شاہ ہے...... میری تم سب کی ہماری امی کی بے عزتی کی۔ کیسی کیسی گھٹیا باتیں اس نے ہمارے لیے ہمارے منہ پر نہیں کیں۔ اس نے اور اس کے بیٹے ریحان علی شاہ نے بدلہ لینے کے لیے ہمارا بھائی ہی ختم کر دیا۔ ہمارا آخری سہارا' ہمارے ابو کی نشانی......''

نادیہ سے اب الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔ کمرے میں ہر ایک رو رہا تھا۔ پچھلے چار مہینوں سے اس گھر کا ہر فرد اپنے آپ سے بے خبر صرف آنسو بہا رہا تھا۔

''ابھی تو میرے بھائی کی قبر کی مٹی بھی نہیں سوکھی اور میں...... اس سے شادی رچا کر بیٹھ جاؤں...... وہ بھی اس سے......''

''نادیہ پلیز...... اب یہ بات دوبارہ مت کرنا...... تمہیں گھر کا ہر بندہ سمجھا سمجھا کر تھک چکا ہے کہ وہ قاتل نہیں ہے...... وہ بھائی کے دوست کی حیثیت سے اس گھر کا ایک فرد تھا۔ امی اسے اپنا بیٹا سمجھتی ہیں...... پھر وہ ہمارے بھائی کو...... کیوں...... قتل......''

شکیلہ کی ہچکی بندھ گئی...... نا جانے وہ سب اپنے آپ کو بہلانا چاہ رہیں تھیں یا پھر نادیہ کو سمجھانا چاہ رہی تھیں۔

☆☆☆

''یار اسد...... بہت دن سے ایک بات مجھے بہت تنگ کر رہی ہے...... مگر ڈرتا ہوں تم کہیں ناراض نا ہو جاؤ......''

''ہنہ...... کیا......''

اسد نے چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''یار...... میں تم سے بات کر رہا تھا اور تم کن...... سوچوں میں گم ہو؟''

ریحان علی شاہ نے اس کو کندھے پر مارتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... بس ہاں تم بتاؤ کیا کہہ رہے تھے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''نہیں اب پہلے تم بتاؤ...... کہ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟...... کہیں پھر...... کوئی مالی پریشانی اور کرایہ داروں کی چخ چخ نے تو نہیں سوچوں میں ڈال دیا۔''

''یار...... تم...... کیا چیز ہو...... سیدھا جا کر مجھے وہیں سے پکڑا ہے...... میں چاہوں بھی تو تم سے کوئی بات چھپا نہیں سکتا......''

اسد اس سے نظریں چرا رہا تھا۔

''ہا...... ہا...... اچھا ہے نا آخر تمہارا ایک ہی تو جگر ہے ریحان علی شاہ، پرانا اور قدیم...... ہاہا وہ بھی تمہاری بات نہیں سمجھے گا تو اور کون سمجھے گا۔''

''ہاں یار یہ بات تو ہے تم واقعی میرے بہت پرانے اور بہت قریبی اور اچھے دوست ہو۔''

اسد نے اس کی بات کی تائید کی۔

''ہاں...... یار...... اسی لیے سوچ رہا ہوں...... کہ اس...... دوستی کو...... صرف دوستی نہیں رہنا چاہیے......!''

ریحان نے معنی خیز جملہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔

''مطلب......'' اسد کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔

''او...... یار پریشان نا ہو چل بات بتا کون سا کرایہ دار تنگ کر رہا ہے وہی پہلے والا تو نہیں...... جس سے میں بھی مل چکا ہوں۔''

''ہاں یار وہی ہے...... گھٹیا انسان...... میرے باپ کی خون پسینے کی کمائی کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھنے لگ گیا ہے۔ کل کرایہ مانگنے گیا تو مجھے گریبان سے پکڑ لیا...... بولا میں اس وقت سو رہا تھا تو کرایہ مانگنے اس وقت کیوں آیا ہے؟ تجھے ایک بار بتا چکا ہوں میری نوکری ختم ہو گئی ہے، میرے پاس کرایہ نہیں ہے...... یار میں نے کوئی یہاں یتیم خانہ تو نہیں کھول رکھا نا...... ابو کے ہوتے یہ سب دم پلٹ گئے ہیں...... میں، یہ لیے...... کیا کروں میں...... صرف دکانوں کے کرایہ سے تو گھر نہیں چل سکتا نا...... ادھر...... فاریہ کی شادی بھی تیار ہے کہاں سے ارینج کروں سب۔''

اسد آبدیدہ ہو رہا تھا۔ وہ کل سے اس کرایہ دار کے ہاتھوں ہونے والی اپنی ہتک کے احساس کے زیر اثر تھا۔

''تم کمال کرتے ہو یار...... اس دو ٹکے کے بندے کی اتنی جرأت...... کیسے ہونے دی تم نے اور مجھے اب بتا رہے ہو...... تم خود کو اکیلا کیوں سمجھتے ہو...... میں ہوں تمہارے ساتھ...... مجھے اسی وقت بتانا تھا...... چار بندوں کو اور ساتھ لے کر آتا اور اس کا دماغ ٹھکانے لگا دیتا...... پیسہ تو اب اس کا باپ بھی دے گا۔''

ریحان غصہ میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

''یار ریلیکس...... پلیز...... تجھے میں اسی لیے نہیں بتا......''

''کیا ریلکس...... دیکھ اسد...... یہ تم اپنی انسانی ہمدردیاں سائیڈ پر رکھا کرو...... تم جتنی شرافت دکھا رہے ہو یہ اتنا ہی سر پر چڑھتے جا رہے ہیں، آج کل شرافت کا زمانہ نہیں رہا...... اس نے پچھلے چھ ماہ سے تم لوگوں کو کرایہ نہیں دیا ہے اور اب گریبان پکڑ لیا تمہارا۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی۔ تم...... تم چلو میرے ساتھ ابھی اور اسی وقت...... چلو......''

ریحان اس کا ہاتھ پکڑے اسے گاڑی میں بٹھانے لگا۔

''مگر کہاں......؟''

''اس کا دماغ ٹھکانے لگانے...... چلو...... اور ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے...... اس کا تو باپ بھی کرایہ دے گا اب۔''

☆☆

Downloaded from Paksociety.com

''آپ..... آیئے..... اندر آیئے.....۔''
''میں اندر آنے کے لیے نہیں آیا.....
پوچھنے آیا ہوں میرا بیٹا کہاں ہے؟''
منظور علی شاہ اکڑ کر دروازے پر کھڑے تھے۔
''جی وہ اسد اور ریحان ابھی ابھی کہیں نکلے ہیں..... ریحان یہیں تھا.....۔''
''جانتا ہوں..... یہیں تھا..... اس کا یہاں بہت دل لگتا ہے..... جب..... اس گھر کے افراد اس کی دل لگی کا سامان کرتے رہیں تو اس کا دل کیوں نہیں لگے گا..... آخر مرد ہے وہ.....۔''
''جی..... آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟''
شاکرہ کی حیرانی نے ان کا غصہ بڑھایا۔
''صحیح کہہ رہا ہوں..... کہاں ہیں تمہاری صاحب زادیاں ذرا بلاؤ انہیں میں بھی تو دیکھوں..... کیوں پاگل ہو رہا ہے وہ..... اور وہ بھی تم جیسے نیچ..... لوگوں کے لیے..... تم جیسے چھوٹے گھروں کی لڑکیاں تاک میں رہتی ہیں' کہاں کوئی امیر مرغا پھنسے اور اسے مٹھی میں کر لیں..... بڑا آسان طریقہ نکال لیا ہے آج کل تم جیسوں نے..... اپنی حیثیت اور اپنی اوقات بھول جاتے ہو..... جھونپڑی میں رہتے ہو مگر خواب محلوں کے دیکھتے ہو..... لگام ڈال کر رکھو انہیں اگر ان کی جوانی نہیں سنبھل رہی.....''
''منظور صاحب..... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میری بیٹیوں کے بارے میں اس طرح کی باتیں نا کریں اور وہ بھی دروازے پر کھڑے ہو کر آپ یا تو اندر شریف لے آئیں..... یا.....''
شاکرہ نے غصہ پر قابو رکھتے ہوئے تحمل سے کہا۔
''یا..... اوہ..... تو گویا..... آپ مجھے دھمکی دینا چاہ رہی ہیں..... سنیں محترمہ..... آپ شاید منظور علی شاہ کو جانتی نہیں ہیں..... اپنے رستے

میں آنے والی چیزوں کو کچل ڈالتا ہے یہ شاہ.....''
''کیا ہوا امی کون ہے..... آپ.....''
''کچھ نہیں نادیہ..... تم جاؤ اندر.....۔''
''اوہ..... تو یہ ہے نادیہ..... اور وہ پیچھے آپ کی باقی صاحب زادیاں..... دیکھو بی بی..... ان سب کو پٹہ ڈال کر رکھو..... اور اسد کو اچھی طرح سمجھا دو کہ وہ میرے بیٹے ریحان سے دوستی ختم کر دے..... آئندہ اس کی طرف آنے کی بھی زحمت نا کرے..... میں ایک اسد کی دوستی کو ہی اتنے سالوں سے برداشت کر رہا ہوں' اس چھوٹے انسان کی اپنے گھر میں آمد و رفت ہی بڑی بات ہے کجا میں اس چھوٹے خاندان کی لڑکی کو اپنے گھر کی بہو بنا لوں..... اپنی حیثیت کے لوگوں میں رشتے ڈلوا ان کے میرے بیٹے پر ڈورے مت ڈلواؤ اپنی بیٹیوں.....۔''
''بس..... منظور صاحب..... پلیز..... آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ میری بیٹیوں پر کیچڑ اچھالیں' میرے گھر کا ماحول اور میری تربیت ایسی نہیں ہے کہ وہ اس طرح کا کوئی کام کریں..... آپ پیسے والے اثر رسوخ والے ہوں گے تو اپنے گھر میں ہم آپ سے مانگ کر کچھ نہیں کھاتے..... اور نا ہی میرا بیٹا آپ کے حکم کا پابند ہے کہ وہ ریحان سے دوستی چھوڑے۔ آپ اس معاملے میں اپنے بیٹے کو سمجھائیں..... ہماری بے عزتی نا کریں۔''
شاکرہ نے اتنا کچھ سننے کے بعد بھی بہت آرام سے سلجھے انداز میں بات کی تھی۔ اس کے باوجود منظور کا غصہ کم نہیں ہوا تھا وہ کچھ دیر کھڑے انہیں مزید لغویات سے نوازتا رہا' نادیہ نے کچھ بولنے کی کوشش کی اور پیچھے کھڑی اس کی بہنوں نے بھی کچھ بولنا چاہا مگر شاکرہ نے سب کو چپ رہنے کو کہا۔ ریحان نے پہلی بار نادیہ کو ان کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بڑی بہن کی مہندی پر دیکھا تھا اور وہیں اپنا سب کچھ ہار گیا تھا' وہ اسد سے اس سلسلے میں بات بھی کرنا چاہ رہا تھا مگر دوستی آڑے آجاتی تھی۔

ریحان نے اپنے والد پر دباؤ ڈالا کہ وہ اسد کے گھر والوں سے بات کریں ورنہ اس گھر کا ماحول ایسا نہیں تھا کہ بہنیں اپنے بھائی کے دوستوں کے سامنے جاتی رہیں۔

☆☆

''یار یہ کیا ہے نہیں ...... نہیں یار میں ......''

''ایک تو اسد تم ڈرتے بہت ہو ...... یار تم نے نہیں ڈرنا بلکہ تم نے صرف ڈرانا ہے ...... اس کرایہ دار سے چھ ماہ کا کرایہ وصول کرنا ہے یا نہیں۔؟''

ریحان نے بہت خوبصورتی سے بات اس کے سر ڈال دی۔

''ہاں یار مگر یہ طریقہ ......۔''

''اگر مگر کچھ نہیں ہوتا ...... تم کہتے ہو تو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں ...... بس تم نے اسے صرف دھمکانا ہے اور کیا ......۔''

ریحان نے پھر اس کی ہمت بنائی۔

''نہیں میں اکیلے چلا جاؤں گا مگر ریحان سوچ لو یار یہ پستول ...... کہیں ......۔''

''کیا اسد یار ...... تمہیں کہا ہے نا ڈرا مت کرو ...... اسے چلانا نہیں ہے صرف دکھانا ہے ...... ویسے بھی یہ خالی ہی ہوگی چلے گی کیسے ...... ایک بار ہمت کرلو اس کرایہ دار کی عقل ٹھکانے آجائے گی۔''

اسد ریحان کی دی ہوئی پستول ہاتھ میں لیے گم سم بیٹھا تھا۔ وہ کسی نتیجے پر پہنچنا چاہ رہا تھا اور بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔

یہ جوانی کا جوش ہے جس میں خون کی گرمی ...... جوش مارتی ہے ...... جواں مردی کا ثبوت دینے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانا مشکل نہیں لگتا۔ یہ دور اس وحشی سمندر کی طرح ہوتا

مسکرایئے

ایک صاحب کو ان کے سیکریٹری نے انٹرکام پر اطلاع دی کہ ایک خوبصورت سی لڑکی آپ سے ملنے آئی ہے۔ تو ان صاحب نے کہا: ''اسے چند سیکنڈ کے بعد بھیج دینا۔''

اس کے بعد انہوں نے ریسیور اُٹھالیا۔ اسی اثناء میں وہ لڑکی اندر داخل ہوگئی۔ وہ صاحب باتیں کرنے لگے۔ ''ہاں بھئی وزیر اعلیٰ اگر بات کرنا چاہتے ہیں تو کہو' میں مصروف ہوں۔ پھر کسی وقت بات کریں اور گورنر صاحب سے کہو۔ میں فارغ ہو کر ان سے ملوں گا اور ہاں وہ پچاس لاکھ کے چیک کا کیا بنا کیش ہوا یا نہیں۔'' اب انہوں نے لڑکی سے پوچھا۔

''جی فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' وہ لڑکی طنزیہ انداز میں بولی۔ ''میں ٹیلی فون کے محکمے میں ملازم ہوں اور آپ کا فون ٹھیک کرنے آئی ہوں' جو کل سے ڈیڈ ہے۔''

☆☆

پکڑ دھکڑ شروع ہونے سے پہلے سیاسی اثر ورسوخ رکھنے والے ایک صاحب کو بینک نے قرضے کی ادائیگی کے سلسلے میں خط لکھا تو انہوں نے جواب دیا۔

''مکرمی! ہم نے اپنے قرض خواہوں کو تین درجوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پہلے درجے میں وہ لوگ اور ادارے شامل ہیں' جن کے قرضے جلد ادا کردیے جائیں گے۔ دوسرے درجے میں وہ ہیں' جن کے قرضے شاید کبھی ادا کردیے جائیں۔ تیسرے درجے میں وہ ہیں جن کے قرضے ادا کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ آپ کے خط کے عاجزانہ اور دوستانہ مضمون کی وجہ سے ہم نے آپ کو تیسرے درجے سے نکال کر دوسرے درجے میں شامل کرلیا ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہے جس میں تند و تیز موجیں پوری طاقت سے چٹانوں سے ٹکراتی ہیں۔ چٹان تو اپنی جگہ قائم رہتی ہے مگر لہریں بکھر جاتی ہیں۔

☆☆

''میں......''

دروازہ کھٹکھٹانے پر اسد کے منہ سے کچھ نکلنے سے پہلے ہی کرایہ دار اپنی بدتمیزی پر اتر آیا۔

''اوئے...... تم...... تیری جرأت کیسے ہوئی یہاں آنے کی چل نکل......''

''نکل...... تو نکالے گا مجھے...... تیرے باپ کی جاگیر ہے کیا؟ بول...... آج میں تیرے سے کرایہ لے کر ہی جاؤں گا نکال پیسے ورنہ......''

اسد کو اپنی اس دن والی توہین یاد آئی۔

''اوئے...... میں صدقے...... چڑیا کے بھی پر نکل آئے ہیں...... تجھے ایک بار بول چکا ہوں کرایہ نہیں ہے میرے پاس اب دفع ہو جا۔''

اس نے پہلے اسد کی تھوڑی پر ہاتھ رکھ کر طنز کیا پھر اسے دھکے دینے لگا۔

''میں نے کہا اپنے ہاتھ اور منہ سنبھال کر بات کرو...... میں تیرے باپ کا نوکر نہیں ہوں...... روز تیرے پاس کرایہ مانگنے آؤں...... آج سیدھی طرح کرایہ نکال ورنہ......'' اسد غصہ میں چلایا۔

''ورنہ...... ورنہ کیا کرلے گا تو بول......''

اسد نے اسی وقت اپنی جیب سے پستول نکال لی...... اور اس پر تان لی۔

''اچھا تو...... تو مجھے اب ان ہتھکنڈوں سے ڈرائے گا چل دفع ہو جا' نہیں دیتا میں تجھے ایک پیسہ بھی...... کیا کرلے گا تو......''

وہ مکمل بدتمیزی پر اتر آیا اور اسد کو دھکے دینے لگا۔ اسد بھی غصہ میں اس پر چلانے لگا اسد نے اس کا گریبان پکڑ لیا پستول ابھی بھی اس کے کھول بھی...... اس نے اسد کو زور سے دھکا دیا'

وہ اسد کے مقابلے میں کیم شیم چھ فٹ کا طاقت ور آدمی تھا۔ اسد لڑکھڑاتا ہوا دور جا گرا اور فوراً اٹھتے ہوئے اس کی طرف لپکا اس نے اسد کے دونوں ہاتھ جکڑ لیے وہ اب اسد سے پستول چھین رہا تھا۔ اس نے پستول چھینتے ہی اسد پر تان لی اور ٹریگر دبا دیا۔ ٹھا...... ایک لمحے کی بھی دیر ہوئے بغیر...... اسد کے سینے سے خون کا فوارہ نکلا اور وہ زمین پر ڈھے گیا۔ کرایہ دار پستول وہیں پھینکتا ہوا موقع سے فرار ہو گیا۔ پستول ریحان کی تھی قتل اسد کا ہوا تھا۔ ریحان سلاخوں کے پیچھے تھا اور منظور علی شاہ...... شاکرہ کے قدموں میں۔

بڑے بول کی شکست اسی طرح ہوتی ہے خدا کے بنائے گئے ایک جیسے انسانوں میں تفریق کرنے والے' جھوٹی شان بنانے والے لوگ اسی طرح آزمائش کے سفر سے گزرتے ہیں۔ وہ شاکرہ جو کل تک چھوٹے خاندان کی نیچ تھی آج اونچی جگہ بیٹھی تھی اور اونچے خاندان کا نواب...... شاکرہ کے قدموں میں بیٹے کی بھیک مانگ رہا تھا۔

☆☆

''تم کیوں امی کو پریشان کر رہی ہو' امی پر ہم سب کی ذمہ داری ہے...... کیا برا ہے اگر تمہارے فرض سے امی سبکدوش......''

''امی...... اور میں...... یہ تو ہر دور میں ہوتا آیا ہے...... عورت ہی کو قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے...... تم سب لوگ اتنی آسانی سے بھائی کی موت کا درد کیسے بھول گئی ہو؟ مجھے نہیں بھولتا...... کل تک ہم نیچ اور گھٹیا خاندان کے تھے۔ آج اس کے بیٹے پر بنی ہے تو ہم اتنے معزز ہو گئے ہیں کہ شاہ صاحب کے خاندان کا حصہ بن سکیں...... عورت ہی سولی پر چڑھی نا...... خون معاف کروانے کے لیے...... رہائی دلانے کے لیے ہنہ...... میری شادی اس سے ہو بھی جائے تو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

امی میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکوں گی کبھی نہیں......"

شائلہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی نایہ نے بولنا شروع کر دیا' اب وہ سسک رہی تھی۔ وہ اس معاملے میں باقی گھر والوں سے کچھ زیادہ ہی حساس ہو رہی تھی شائد اس لیے بھی کہ اسے ریحان سے شادی پر آمادہ کیا جا رہا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی دل کے نہاں خانوں میں ریحان کے لیے پسندیدگی رکھتی تھی مگر کبھی نہیں سوچا تھا کہ خدا اس طرح اسے آزمائے گا۔

"ندا...... آپا...... آپ لوگوں کے دلوں کو کچھ نہیں ہو رہا...... مجھے سولی پر چڑھاتے ہوئے...... کیوں ہوا یہ سب ہمارے ساتھ ہی کیوں ہوا؟ مشکلات آزمائشیں ہمیشہ کم حیثیت لوگوں کے حصے میں ہی کیوں آتی ہیں؟ کیوں ہم سے خدا نے وقت سے پہلے باپ اور اب بھائی...... بھائی بھی چھین لیا کیوں......؟"

وہ مایوں بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ زندگی بہت غیر یقینی چیز ہے' اس میں کبھی بھی کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ زندگی میں بہت سے لمحے ایسے آتے ہیں جب انسان بارہا یہ سوال خود سے کرتا ہے کہ ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ کچھ ہونے یا نا ہونے کے دارومدار میں جہاں تک خدا کی مصلحت ہوتی ہے وہیں کچھ انسانی عمل دخل بھی شامل ہوتے ہیں مگر انسان اپنے اعمال کو پس پشت ڈال کر سارا الزام خدا کی مصلحت کو دے کر چین کی نیند سو جاتا ہے۔ کیا یہ خود غرضی نہیں؟ اور اس پر سوال بھی یہ کہ ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ اس کے چہرے کا رنگ زردی مائل کپڑوں میں کچھ اور ہی زرد لگ رہا تھا۔ اس نے دو دن سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ وہ بس باپ اور بھائی کو یاد کرتی اور روتی رہتی۔

"کاش آپا...... اسد...... ریحان کے

انداز فکر

☆اکثر لوگ حالات سے مجبور ہو کر برے بنتے ہیں۔

☆جو ماتحت اپنے افسر کو سمجھ نہ پائے اس کا تبادلہ ہو جایا کرتا ہے۔

☆چھپانے سے منہ چھپتا ہے کردار نہیں چھپتا۔

☆دوسروں کے چراغ سے روشنی ڈھونڈنے والے ہمیشہ اندھیرے میں رہتے ہیں۔

☆جان پہچان کا سلسلہ ٹوٹ جائے تو لوگ جیتے جی ایک دوسرے کے لیے مر جاتے ہیں۔

☆سیدھی چلنے والی تلوار نیام میں ہمیشہ الٹی جاتی ہے۔

☆ڈاکٹر اگر اچھا نہ بھی لگے تو بھی اس سے دوا لے ہی لینی چاہیے۔

☆موت پر صرف اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے۔

☆موقع ملے تو اس سے ضرور فائدہ اٹھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرنا کبھی نہ بھولو۔

☆عبادت جو مخلوق کے لیے کی جاتی ہے' زمین میں دھنسا دیتی ہے اور عبادت جو خالق کے لیے کی جاتی آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔

☆خوش مزاج شخص وہ ہے' جو دوسروں کو خوش مزاجی دے۔

☆درویشی بادشاہت سے بہتر ہے بشرطیکہ دنیا کا تعلق شامل نہ ہو۔

☆آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو کچھ ہے کہے جو کچھ بھی سنے بیان کر دے۔

☆جو اپنی ضرورتیں بڑھا لیتا ہے' اسے اکثر محرومی کا غم رہتا ہے۔

☆بدترین جھوٹ وہ ہے جس میں کچھ سچ بھی شامل ہو۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بہکاوے میں نا آتا...... کاش اسد اسے پستول نا دیتا...... آخراس نے ایسا کیوں کیا...... میں اسے معاف نہیں کر پاؤں گی یہ شادی روک لیں پلیز...... میں اپنے بھائی کی موت پر کسی چیز کو فوقیت نہیں دوں گی......اور ریحان کا لاکٹ گلے میں ڈال لوں......اسے موت کیوں نہیں آئی...... بھائی کی جگہ وہ کیوں نہیں مرگیا......امیر گھر کا...... تھا کیا فرق پڑنا تھا...... میں صبح و شام اسے دیکھوں گی...... مجھے اس کی شکل سے گھن آئے گی اس کے چہرے پر مجھے اپنے بھائی کا خون نظر آئے گا......میں اسے معاف نہیں کرسکتی...... میں اسے ماردوں گی......"

وہ عجیب ہیجانی انداز میں بول رہی تھی کسی کی کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی مہندی آنے والی تھی اوراس کی یہ حالت......!

"بیٹا...... زندگی بہت مختصراور چھوٹی ہوتی ہے اسے...... ذاتی اناؤں اور چپقلش کی نظرنہیں کرنا چاہیے......معافی بہت عظمت رکھتی ہے...... حضور اکرم ﷺ نے معاف کرنے والے کے بہت درجات بلند کیے ہیں......ہم سب نے اسے معاف کیا یہ سب خدا کی مصلحت تھی۔ تم بھی معاف کردو......"

اس کی خالہ اسے دم کرنے کے بعد سمجھا رہی تھیں۔

"نہیں...... میں نہیں کروں گی...... وہ معافی کے لائق نہیں...... وہ قاتل ہے اسے بھی اسی طرح قتل ہونا چاہیے۔ اسے بھی اسی طرح تڑپنا چاہیے جیسے موت کے وقت میرا بھائی تڑپا ہوگا۔ کوئی سوچے ذرااس کی تڑپ وہ کس اذیت سے گزرا ہوگا......اس اذیت کا ایک فیصد تو اسے بھی پتا چلنا چاہیے...... کیوں کروں میں اسے معاف......"

وہ پاگلوں کی طرح سر ہلا ہلا کر بول رہی تھی۔ اتنا وقت ہو چکا تھا اور ابھی تک اس کے سسرال والے مہندی لے کرنہیں پہنچے تھے۔ ایک گھنٹہ دو گھنٹے تین' چار اور چھ گھنٹے گزر گئے...... تقریب میں آئے لوگ ایک ایک کر کے واپس جانے لگے......فون کر کر کے ہر بندہ ہار گیا تھا کوئی فون وصول نہیں کر رہا تھا۔ رات کا ایک بج گیا تھا فون کی گھنٹی پر سب فون کی طرف لپکے تھے۔

فون رکھنے کے بعد شاکرہ کی آنکھوں سے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔

"منظور علی شاہ اور ریحان کی گاڑی پر...... چند نا معلوم افراد نے حملہ کر کے انہیں لوٹنا چاہا...... ریحان کی مزاحمت پر...... ان لوگوں نے......دونوں......کو گولیوں سے......"

اس سے آگے شاکرہ بیگم کچھ نہیں کہہ سکیں...... نادیہ نیند میں جاتے جاتے...... ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول بیٹھی...... اس کے زرد کپڑے مہندی لگے ہاتھوں کی مہندی سے سرخ...... ہو گئے...... بھیگتی آنکھوں سے ہر منظر دھندلا گیا......!

"معافی بہت عظیم ہوتی ہے اسے معاف کر دو......اس میں اس کا کوئی قصور نہیں......"

سب کے ملے جلے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

کاش...... کاش...... وہ بھی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتی اور اسے معاف کر دیتی...... کاش......معاف کر دینا والا دل بھی کسی کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے......

اس کے حنائی ہاتھ اس کے آنسوؤں کے قطرے جذب کرنے لگے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

میں توھم پرست نہیں تھا' لیکن نہ جانے کیوں خوف کی ایک سرد لھر میرے پورے جسم میں سرایت کر گئی' میں نے سوچا ڈیڈی پر ایک سال کے دوران تیسری مرتبہ فالج کا حملہ ھوچکا ھے اور وہ چلنے پھرنے سے قطعی معذور ھونے کے بعد صاحب فراش ھوچکے ھیں' کھیں ایسا نہ ھوکہ لیونارڈو کی تصویر کی نحوست خدانخواستہ ان کی زندگی کا چراغ...... اور بس اسی اندیشے نے میری رگوں میں جیسے بجلیاں سی بھر دیں اور ......!!

دوسری تصویر

کرم الٰہی چوہدری

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

اگرچہ میں تاریخ اور عمرانیات پر وسیع معلومات رکھنے کے ساتھ ساتھ نوادر شناخت کرنے اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے فن میں ماہر ہوں اور میری پہلی ہی نظر فیصلہ کن ہوتی ہے لیکن اس مجبوری کا کیا علاج ...... کہ میرے ڈیڈی کاروبار میں منفی پہلوؤں کے بارے میں زیادہ سوچتے تھے اور ان کا میرے متعلق یہ خیال تھا کہ کامیاب تجارت کے لیے ضروری ہے کہ گاہک کی جیب سے زیادہ اس کے مزاج کی جانب نظریں رکھی جائیں۔

ڈیڈی کو یہ انداز فکر ان کی فوجی زندگی سے تحفتاً ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ ناولٹیز سنٹر کی داغ بیل تو ڈیڈی نے دوسری جنگ عظیم میں نارمنڈی کے میدان کارزار میں اپنی ایک ٹانگ گنوانے اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

فوج سے ریٹائرڈ کیے جانے کے بعد ڈالی تھی۔
بہر حال میں ان کا اکلوتا بیٹا ہونے کے باوجود زندگی کے مثبت پہلوؤں کو ٹٹولنے کا عادی تھا اور میری یہ خواہش تھی کہ ڈیڈی میری صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے ناولٹیز سنٹر کا جملہ کاروبار میری تحویل میں دے دیں' لیکن وہ ہمیشہ ہی کہتے تھے۔

''تم ابھی نابالغ ہو۔''

ان کی مراد غالباً یہ تھی کہ میں بڑے بڑے سودے کرنے کا عادی تھا اور وہ اسے سخت ناپسند کرتے تھے۔ شاید ان کی اس سے مراد یہ ہو کہ تجارت میں دو چار بار دیوالیا ہوئے بغیر کوئی بھی تاجر با اعتماد تاجر نہیں بنتا' کیونکہ وہ اکثر اشاروں اور کنایوں میں کہا کرتے تھے۔ زندگی کی جنگ میں بھی تین ہی دفاعی لائنیں ہر شخص کے کام آیا کرتی ہیں کامیاب سپاہی وہی ہے جو پسپائی کے لیے میدان کھلا رکھے۔

میرے نزدیک ڈیڈی ضرورت سے زیادہ دور اندیش محتاط اور کسی قدر سنگی بھی ہوگئے تھے اور انہیں یہ قطعی احساس نہیں تھا کہ ایک دن' ناولٹیز سنٹر' کے کاروباری امور مجھے ہی انجام دینا ہوں گے۔ وہ تو بس میری خود اعتمادی کی ساری دیواریں ایک ایک کرکے گراتے چلے جا رہے تھے۔ خود داری اور سرکشی آہستہ آہستہ میری فطرت ثانیہ بنتی جا رہی تھیں اور میں دن رات اس فکر میں تھا کہ ڈیڈی کا اعتماد بحال کرنے کے لیے کون سا کارنامہ انجام دوں' ناولٹیز سنٹر' کی تجارت پوری طرح کنٹرول میں لینے کے لیے یہ بہت ضروری تھا' میں خود غرض' حریص اور انتہا پسند نہیں ہوں اور نہ پہلے کبھی تھا' صرف ایک مجبوری تھی جو مجھے ایسا کرنے پر اکساتی رہتی تھی' اور وہ مجبوری تھی۔ بلنڈا شیفرڈ' جس کے سنہری بال' غلافی آنکھیں اور گل بداماں وجود کی مہک میری نس نس میں موجود تھی اور میں جسے ہمیشہ کے لیے اپنانا چاہتا تھا لیکن ڈیڈی کے نزدیک یہ بھی ایک پاگل پن تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک تم اپنی کاروباری صلاحیتوں کا عملی اظہار نہیں کرو گے' میں شادی کی اجازت بھی نہیں دوں گا۔ بس یہی ساری باتیں میری سرکشی کا باعث تھیں اور انہی کی وجہ سے میں کبھی کبھی انتہائی خود غرض ہو جایا کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ ڈیڈی کی دوسری ٹانگ بھی اگر کسی جنگ کی لپیٹ میں آجائے تو کتنا اچھا ہو۔

زندگی اپنے محور کے گرد تیزی کے ساتھ چکر لگا رہی تھی اور رفتہ رفتہ' ناولٹیز سینٹر' میں رکھے ہوئے تمام نوادر میرے ذہن پر نقش ہو چکے تھے۔ ان نوادر میں وہ تصویر بھی تھی جسے میں نے ایک سال پہلے ڈیٹرائٹ کے ایک نیلام گھر سے پانچ ہزار ڈالر کے عوض خریدا تھا۔ یہ تصویر مشہور مصور لیونارڈو کی نیلام ہونے والی دو نایاب تصویروں میں سے ایک تھی' میرا ارادہ تھا کہ میں دوسری تصویر بھی خرید لوں لیکن نیلام گھر میں میرا ایک حریف بھی پیدا ہو چکا تھا جس نے ہر بولی پر جارحانہ انداز میں میری کوششیں رد کر دی تھیں اور میں دل پر شکست کا داغ لیے ہوئے واپس آگیا۔ میرا خیال تھا کہ ڈیڈی میرے اس کارنامے سے خوش ہو جائیں گے لیکن جب میں نے لیونارڈ کی پینٹنگ ان کے سامنے پیش کی تو وہ اسے ایک نظر دیکھنے کے بعد ہی چلا اٹھے۔

''تم اپنے گاہکوں پر یہ کیسے ثابت کرو گے کہ یہ لیونارڈ ہی کی تصویر ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ڈیڈی' اول تو تصویر پر لیونارڈو کا نام موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی تخلیق میں لیونا ڈور کی شخصیت کا سارا کرب سمٹ کر رہ گیا ہے۔''

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ڈیڈی نے اسے میری پہلی حماقت قرار دیتے ہوئے کہا تھا اگر تم نے جلد ہی اس تصویر سے نجات حاصل نہ کی تو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

یقین ہے کہ ہم کسی مصیبت میں گرفتار ہوجائیں گے' انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ یہ تصویر نحوست اور تباہی و بربادی کے المیوں کو ہمیشہ جنم دیتی رہی ہے۔

اول تو مجھے یقین ہے کہ یہ لیونارڈو کی تصویر نہیں ہے اور اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے تو سوال یہ ہے کہ ایسی تصویر کو خریدنے پر آمادہ کون ہوگا جو اپنی تخلیق کے بعد کم سے کم گیارہ خاندانوں کو گمنامی اور کسمپرسی کی موت مار چکی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ڈیڈی نے مجھے متاثر کرنے کے لیے اس روز کئی عجیب و غریب واقعات سنائے تھے اور میں نے یہ اسی روز طے کرلیا تھا کہ خواہ کچھ ہو' میں اس تصویر کی پوری پوری قیمت وصول کروں گا کہ وہ تصویر میں نے کہاں رکھی ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے دوسرے دن پانچ ہزار' ناولٹیز سنٹر' کے نام بینک میں جمع کرانے کے بعد ڈیڈی سے یہ کہہ دیا تھا کہ لیونارڈو کی تصویر میں نے بیچ دی ہے۔

اس جھوٹ کی وجہ یہ تھی کہ میں لیونارڈو کی تصویر کی قدر و قیمت کے بارے میں خاصا پرامید تھا اور میری چھٹی حس یہ کہہ رہی تھی کہ یہی تصویر میرے خوشگوار مستقبل کا پیش خیمہ ثابت ہوگی' لیکن ایک سال تک یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا تو میں نے بلنڈا اشیفرڈ سے تبادلہ خیال کیا۔ وہ اس پراسرار تصویر سے منسوب کی ہوئی کہانیوں کو سن کر بے چین ہوگئی اور اس نے کہا۔

''ایلن مجھے تو یہ کہانیاں حقیقت ہی معلوم ہوتی ہیں' اب یہ دیکھو نا کہ اس عرصے میں دوبارہ میں خود مرتے مرتے بچی ہوں' تمہیں تو معلوم ہے کہ چھ ماہ قبل میں اسکیٹنگ کے ایک مقابلے میں حصہ لیتے ہوئے زخمی ہوگئی تھی۔ آخری حادثے کے بارے میں بھی تم اچھی طرح جانتے ہو' میری مراد عالمی نمائش والے اس حادثے سے ہے جو آتش زدگی کی وجہ سے پیش آیا تھا اور جس میں کئی قیمتی جانیں ضائع ہوگئی تھیں۔ اس حادثے سے میرا بچ جانا بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھا' اب دیکھو نا جس وقت جمہوریہ مدغاسکر کے پویلین کی چھت گری تھی اس سے چند سیکنڈ پہلے میں اپنی فون کال اٹینڈ کرنے کے لیے باہر جا چکی تھی۔''

بلنڈا نے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا' پھر اس نے انتہائی خوشامدانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''ایلن بہتر یہی ہے کہ اب اس پراسرار تصویر کا قصہ تمام کرڈالو' ورنہ کوئی اور نئی مصیبت سر اٹھائے گی اور پھر خدا جانے اس کا انجام کیا ہوگا۔''

میں توہم پرست نہیں تھا' لیکن نہ جانے کیوں خوف کی ایک سرد لہر میرے پورے جسم میں سرایت کرگئی' میں نے سوچا ڈیڈی پر ایک سال کے دوران تیسری مرتبہ فالج کا حملہ ہوچکا ہے اور وہ چلنے پھرنے سے قطعی معذور ہونے کے بعد صاحب فراش ہوچکے ہیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ لیونارڈو کی تصویر کی نحوست خدانخواستہ ان کی زندگی کا چراغ ......اور بس اسی اندیشے نے میری رگوں میں جیسے بجلیاں سی بھر دیں اور میں نے قطعی طور پر فیصلہ کرلیا کہ ڈیڈی کی زندگی بچانے کے لیے اس تصویر کو ٹھکانے لگا دوں گا۔ چنانچہ بلنڈا کے جانے کے بعد میں نے مشہور اخبار کیلی فورنیا آبزرور کے لیے ایک اشتہاری مضمون تیار کرکے دوسرے دن کی اشاعت کے لیے بھیج دیا۔

چنانچہ اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے اور ایک ہفتے تک تصویر کے خریداروں کا ناولٹیز سنٹر' میں تانتا بندھا رہا لیکن معاملات کسی سے طے نہ ہوسکے۔ ممکن تھا کہ میں پانچ ہزار ڈالر سے بھی کم قیمت میں اس منحوس تصویر کو فروخت کر دیتا۔ کیونکہ بلنڈا کی خواہش یہی تھی' لیکن ایک

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دن بڑا ہی عجیب وغریب اتفاق پیش آیا ہوا یہ کہ دن کے گیارہ بجے کے قریب دو تین جدید ماڈل کی کاریں ناولٹیز سنٹر کے سامنے آ کر رکیں اور پھر میں نے چشم زدن میں شاہانہ کروفر کی ایک حسین عورت کو بندوق بردار نوجوانوں کے جھرمٹ میں اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔

میں نے خوش آمدید کہتے ہوئے ان سب کا پرجوش استقبال کیا اور انتہائی مودبانہ انداز میں پوچھا۔

''میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔''

حسین عورت نے براہ راست تخاطب کا شرف بخشتے ہوئے کہا۔

''میں لیڈی اسمتھ ہوں اور لیونارڈو کی تصویر کا سودا کرنا چاہتی ہوں' کیا تم یہ تصویر مجھے دکھانے کی زحمت گوارا کرو گے۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دور کہیں کسی گرجے کی نقرئی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ کم از کم لیڈا اسمتھ کی آواز اتنی ہی دلکش تھی لیکن میں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا کیونکہ مجھے ڈیڈی کی یہ نصیحت یاد آ گئی کہ کامیاب تاجر وہ ہے جو گاہک کی جیب سے زیادہ اس کے مزاج کا خیال رکھتا ہے۔ چنانچہ کوئی جواب دیے بغیر میں نے لیونارڈو کی تصویر لیڈی اسمتھ کے سامنے رکھ دی۔

وہ اس تصویر کو دیکھتے ہی وارفتہ سی ہوگئیں۔

''اف میرے خدا! کس قدر شاندار تصویر ہے۔ لیونارڈو واقعی عظیم تھا' کاش اس کی ساری تصویریں میرے میوزیم میں ہوتیں۔'' انہوں نے فرط مسرت سے لیونارڈو کی تصویر چومتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''اس شاہکار تصویر کی قیمت کیا ہوگی۔''

''صرف پندرہ ہزار ڈالر۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''کیا کہا۔ صرف پندرہ ہزار ڈالر۔ میرا خیال ہے کہ تم یا تو اس کی اصلی قیمت بھول گئے ہو یا پھر مروت سے کام لے رہے ہو۔ دیکھو بھئی کاروبار میں ان چیزوں کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا میں تمہیں ایک بار اور موقع دیتی ہوں۔ قیمت ذرا سوچ سمجھ کر بتاؤ۔''

میں سمجھا کہ شاید لیڈی اسمتھ طنز کر رہی ہیں۔ لہٰذا میں نے مبہم سا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ زیادہ قیمت ہے تو آپ کچھ کم دے دیجیے۔''

لیڈی اسمتھ میری سادگی پر مسکرائیں اور انہوں نے پندرہ ہزار ڈالر کی رقم گن کر فوراً میرے حوالے کر دی' لیکن جب میں یہ تصویر پیک کر کے ان کو دینے لگا تو میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر کسی الجھن کے آثار ہیں وہ تھوڑی دیر تک خلاؤں میں نظریں جمائے خاموش خاموش سی رہیں اور پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''میں نے سنا تھا کہ ڈیٹرائٹ کے نیلام گھر میں لیونارڈو کی دو تصویریں نیلام ہوئی تھیں اور یہ شاید ان میں سے پہلی تصویر ہے' کیا تم دوسری تصویر کی خریداری میں میرے ساتھ تعاون نہیں کرسکتے۔''

میرے لیے یہ بات نسبتاً آسان تھی اور مجھے یقین تھا کہ دوسری تصویر بھی میرے لیے منافع بخش ثابت ہوگی۔ چنانچہ میں نے لیڈی اسمتھ سے کہا۔

''لیونارڈو کی دوسری تصویر کا نیلام دس ہزار ڈالر میں ہوا تھا' ہوسکتا ہے کہ خریدنے والا اسے فروخت کرنے پر یا تو آمادہ نہ ہو یا اگر ہو بھی تو مطلوبہ قیمت طلب کرے' آپ اپنا وزیٹنگ کارڈ دے جائیے میں دو تین دن میں جملہ تفصیلات سے آگاہ کرنے کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔''

''یہ دوسری تصویر کا ایڈوانس ہے' تم اپنی گفتگو مکمل کرلو اگر دوسری تصویر کے لیے مجھے اتنی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہی رقم اور بھی ادا کرنی پڑی تو میں اسے خوش نصیبی سمجھوں گی۔ البتہ اگر قیمت اس سے زیادہ ہو تو مجھے اس فون پر مطلع کر دینا میں باقی رقم بھی ادا کر دوں گی۔''

لیڈی اسمتھ کے جانے کے بعد میں نے ڈیڈی کو اپنی پہلی تجارتی کامیابی کی خبر فون پر سنائی' وہ پہلے تو اس بات پر برہم ہوئے کہ میں نے انہیں تصویر کے بارے میں دھوکا کیوں دیا تھا اور پھر یہ کہنے لگے کہ ''میں بیماری کے دوران جو رقم علاج پر خرچ کر چکا ہوں' اسے بھی اسی منحوس تصویر کی اصل قیمت میں اگر شامل کر لو تو حساب برابر ہو جائے گا۔ جب کہ میں روحانی اور جسمانی عذاب مفت میں جھیلتا ہوں' انہوں نے یہ بھی کہا کہ دوسری تصویر کا سودا اگر مکمل ہو جائے تو اس نے ناولٹیز سنٹر' میں لانے کے بجائے فوراً لیڈی اسمتھ تک پہنچا دینا۔ یاد رکھو اگر تم نے میرے مشورے پر عمل نہ کیا تو اس مرتبہ یقیناً میری موت واقع ہو جائے گی۔''

میں نے ڈیڈی کی پراسرار باتوں کو نہ سمجھنے کے باوجود ان کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا اور سیٹ کر لیا تھا کہ جوں ہی یہ تصویر ہاتھ آئی اسے لیڈی اسمتھ تک پہنچا دوں گا لیکن افسوس کہ دو تین ماہ تک یہ تصویر ہاتھ نہ آسکی' اس دوران میں نے دور دراز کے شہروں کا سفر کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف ملکی و غیر ملکی کاروباری اداروں کو خطوط لکھ کر ان سے نادر الوجود تصویروں کی فہرستیں طلب کی تھیں لیکن کہیں سے کوئی فہرست موصول نہ ہوئی جس میں لیونارڈو کی دوسری تصویر کا تذکرہ ہو' لیڈی اسمتھ اس دوران جنوبی افریقہ کے سفر پر روانہ ہو گئی تھیں لیکن انہوں نے بہت جلد دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

ڈیڈی کی طبیعت بھی اب قدرے سنبھل گئی تھی اور وہ اس بات پر ایمان لے آئے تھے کہ میں' ناولٹیز سنٹر' کا کاروبار سنبھالنے کے قابل ہوتا

اندازِ فکر

ہر انسان کا اپنا نصیب اور رزق ہوتا ہے والدین اس ڈر سے اپنی اولاد کی شادی نہیں کرتے کہ اس لڑکی کا یقین نہیں ہوتا کہ جو عورت بیوی بن کر اپنے شوہر کے گھر جاتی ہے وہ اپنا رزق بھی اپنے ساتھ اپنے شوہر کے گھر لاتی ہے، بیٹیاں تو خدا کی رحمت ہوتی ہیں۔

☆☆

روشنی کی امید رکھیں مگر صرف امیدوں پر زندگی مت گنوائیں۔

دنیا میں زندگی گزارنے کا وہی طریقہ اپنائیں جو آپ کو پسند ہے لوگوں کی پسند کبھی آسودگی کا باعث نہیں بنتی۔

کبھی ہم قسمت کا ساتھ نہیں دیتے اور کبھی قسمت ہمارا ساتھ نہیں دیتی دونوں صورتوں میں بدقسمتی ہی حصے میں آتی ہے۔

باہر کا موسم کبھی آپ کے اندر اثر انداز نہیں ہو سکتا بغیر آپ کی بغاوت کے۔

خیالات کی آمدنی کم ہو تو لفظوں کی فضول خرچی سے پرہیز کریں۔

شکست کا ایک ہی جواب ہے ''فتح''

گفتگو ختم ہونے کا وقت وہ ہوتا ہے جب دوسرا کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا رہا ہو۔

☆☆

یہ لفظ بھی کیا شے ہیں۔ کبھی سماعتوں میں شہد گھول دیتے ہیں اور کبھی زہر، ادھر آسمان سے اتری ہفت رنگ خوشیوں سے جھولی بھر دیتے ہیں ادھر لمحوں میں تہی دامن کر دیتے ہیں۔

کبھی یوں معتبر بنا دیتے ہیں کہ انسان اپنے پاؤں زمین سے اٹھا لیتا ہے اور کبھی اتنے بے مایہ کر دیتے ہیں کہ دھرتی کے اندر اتر جانے کو دل چاہتا ہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جا رہا ہوں۔ ان کے خیالات میں اچانک تبدیلی کی وجہ وہی تیس ہزار ڈالر کی رقم تھی جو ایک تصویر کی فروخت اور دوسری تصویر کی تلاش کے سلسلے میں ناولٹیز سنٹر' اکاؤنٹ میں جمع ہو چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اگر اسی رقم کا کوئی اور تجارتی کارنامہ میں نے انجام دے دیا تو پھر بلنڈا شیفرڈ کو بہو کی حیثیت سے ڈیڈی بہت جلد قبول کریں گے۔ امید کی یہ ننھی سی کرن میرے راستوں کو منور کرتی رہی اور چھوٹے موٹے کاروبار کے ساتھ ساتھ کسی بڑی ٹپ کا منتظر رہا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ میں لیڈی اسمتھ کو تقریباً بھول سا گیا تھا اور یہ یقین ہو چلا تھا کہ کسی دن بھی لیڈی اسمتھ کے سامنے مجھے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں پندرہ ہزار ڈالر کی رقم واپس کرنی ہوگی۔ لیکن ایک دن کوالا لمپور کی مشہور فرم گفٹ ٹریڈرز کا ایک خط بمعہ فہرست موصول ہوا۔ جس میں لیونارڈو کی دوسری تصویر کا مکمل تذکرہ تفصیلات کے ساتھ موجود تھا لیکن رقم کے خانے پر جب میری نظر پڑی تو میں اچھل پڑا۔

اسی ہزار ڈالر کم تو نہیں ہوتے' جبکہ اس تصویر کو محض دس ہزار ڈالر میں خریدا گیا تھا' میں نے سوچا ستر ہزار ڈالر کا منافع اگر میری قسمت میں ہوتا تو آج ڈیڈی کتنے مسرور ہو جاتے اور پھر مجھے خود پر غصہ آ گیا۔ کاش میں ڈیٹرائٹ کے نیلام گھر سے اس تصویر کو بھی خود ہی خرید لیتا لیکن اب پچھتاوا بیکار تھا اور میں لیڈی اسمتھ کے انتظار میں گھڑیاں گن رہا تھا۔ کیونکہ اس سودے کے لیے ان کی رضامندی بہر حال ضروری تھی۔

بلنڈا شیفرڈ میرے اس کارنامے پر بہت زیادہ خوش تھی اور وہ بار بار مطالبہ کر رہی تھی کہ تم رقم ادا کر کے لیونارڈو کی دوسری تصویر کا سودا فوراً مکمل کر لو' ورنہ اگر حالات نے نئی کروٹ لے لی تو ہو سکتا ہے کہ یہ موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہا لیکن میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے پر آمادہ نہ تھا اور مجھے کلی طور پر یہ یقین تھا کہ لیڈی اسمتھ ایک دن ضرور آئیں گی۔ چنانچہ یہی ہوا ایک دن میں اپنی اسٹینو کو ضروری ہدایات دے رہا تھا کہ لیڈی اسمتھ کی کال آ گئی' وہ پرتگال کے دارالسلطنت لزبن سے بول رہی تھیں۔ میں نے انہیں رسمی علیک سلیک کے بعد اپنی کامیابی سے مطلع کرتے ہوئے جب لیونارڈو کی دوسری تصویر کی قیمت بتائی تو پہلے تو وہ خاصی جزبز ہوئیں اور کہنے لگیں۔

''تم مجھے اس فرم کے مالک کا نام بتاؤ' میں اسے گولی مار دوں گی۔''

لیکن جب میں نے انہیں سمجھایا کہ کسی کے فن کو چاندی کے ترازو میں تولنا بھی فن کی سب سے بڑی بے حرمتی ہے اور اگر اس غلطی کا ارتکاب گفٹ ٹریڈرز نے کیا ہے تو کم از کم آپ جیسی شخصیت کو اس سے دامن بچانا چاہیے وہ مطمئن ہو گئیں اور انہوں نے مجھے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔

''سودا مکمل کر لو۔ میں ایک ہفتے کے اندر اندر پہنچ رہی ہوں۔''

چنانچہ میں نے نقد ادائیگی کی بنیاد پر لیونارڈو کی تصویر کا سودا تین دن کے اندر اندر مکمل کر لیا لیکن جب دو ماہ تک لیڈی اسمتھ و ناولٹیز سینٹر نہیں آئیں تو میں نے ڈیڈی کو حالات سے مطلع کیا۔

خبر سنتے ہی ان پر دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ انتقال سے پہلے بہ مشکل تمام اتنا اٹک اٹک کر یہ کہہ سکے...... 55 ہزار...... ڈالر کا خسارہ...... اف میرے خدا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

دخل در معمولات

محمد بلال

ڈربی نے ریسٹ واچ کی طرف دیکھا۔ سات بج کر اکیاون منٹ ہوئے تھے۔ اس نے معذرت سے کہا۔ "معاف کیجئے گا مسز ویسٹ ٹبی کو دودھ پلانے کا وقت ہوگیا ہے۔"
معمولات میں فرق آجائے تو وہ لوگ فکر مند ہو جاتے ہیں جو قریب ہوتے ہیں اور اس سے بڑے نقصانات ہوتے ہیں

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

مسٹر ڈربی نے 22 بور کا چھوٹا سا پستول جیب میں ڈالا اور سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی ٹائم پیس پر نظر ڈالی سات بج کر سترہ منٹ ہوئے تھے۔ خلاف معمول وہ آج تیرہ منٹ قبل ہی اٹھ گیا تھا اور ان تیرہ منٹوں میں وہ بہت کچھ کر سکتا تھا۔ سب کام بالکل ٹھیک ہو رہا تھا۔ سامنے بستر پر خون میں لت پت اس کی بدصورت بیوی کی لاش پڑی تھی۔ اس کی بروقت چخ چخ کرنے والی زبان بند ہو چکی تھی۔ اسے کچھ زیادہ تکلیف کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بس ایک خفیف سی آواز اس کے حلق سے نکلی تھی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

ڈورتھی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مارے دہشت کے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کے سینہ پر دل کے مقام پر ایک چھوٹا سا سوراخ صاف نظر آ رہا تھا۔ جس سے کچھ دیر قبل ہی خون بہنا بند ہوا تھا۔ بیش قیمت قالین پر خون کے بڑے بڑے دھبے صاف دکھائی دے رہے تھے مگر ڈربی کو اس کی کوئی پروانہ تھی' اسے قتل کرنے کے لیے ڈربی نے 22 بور کا ہلکا پستول استعمال کیا تھا۔ جس سے دھماکے کی آواز بہت خفیف سی ہوتی ہے اور پھر کمرہ بھی تو ساؤنڈ پروف تھا۔ ڈربی چالیس سالہ مضبوط اعصاب کا ایک چالاک شخص تھا پھر اسے ڈورتھی کی آنکھوں سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس نے ڈورتھی کی آنکھیں بند کر دیں اور پھر اس کی لاش کو اٹھا کر قالین پر رکھ دیا اس طرح کہ اس کے کپڑوں پر خون کا کوئی دھبہ نہ لگا۔

کچھ دیر تک وہ سوچ میں گم رہا اور پھر اس نے ربڑ کے گداز گدے پر سے چادر ہٹائی گدے پر چین والا خوب صورت کور لگا ہوا تھا' اس نے ایک جھٹکے سے چین کھول دی سامنے سو پچاس اور پچیس ڈالروں کی خوب صورت گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دو سال قبل ہی کی تو بات تھی ڈربی کی شادی بدصورت مگر بیحد امیر کبیر بیوہ لیڈی ڈورتھی سے ہوئی تھی جو حد سے زیادہ تنک چڑھی اور بدمزاج عورت تھی۔ گز بھر لمبی تو اس کی زبان تھی ابھی دو ماہ قبل اس نے غصے میں آ کر جینی کا بھاری بھرکم گلدان ڈربی کے سر پر پھوڑ دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ ایک ہفتے تک اسپتال میں پڑا رہا لیکن اس کے بعد بھی بات بات پر لعن طعن کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ جس طرح ایک ملازم کو جھڑک دیا جاتا ہے اسی طرح وہ ڈربی کو جھڑکتے ہوئے بھی بالکل نہیں ہچکچاتی تھی۔ جیسے ہی بے چارہ ڈربی دفتر سے تھکا ماندہ گھر پر آتا وہ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتی۔

پچھلے چند دنوں سے ڈربی یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کی زندگی کسی خارش زدہ کتے سے کم نہیں جسے ہر کوئی ٹھوکر مار کر دور ہٹا دیتا ہے مگر پھر بھی ڈربی نے اسے اپنے مفاد کی خاطر دو سال تک برداشت کیا' اسے معلوم تھا کہ ڈورتھی کے پاس کافی پیسہ ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے کئی مرتبہ اس نے ڈورتھی سے پوچھنے کی کوشش کی مگر اس نے ہمیشہ بری طرح جھڑک دیا لیکن آج اس کے سامنے بے شمار نوٹ بکھرے پڑے تھے چند لمحے توقف کے بعد اس نے جلدی سے سب نوٹ دفتر کے بریف کیس میں بھرے اور کچھ ضروری چیزیں بھی لے لیں کپڑے اس نے اس خیال سے نہیں لیے کہ کہیں پڑوسیوں کو اس کے فرار کا شبہ نہ ہو جائے۔ کپڑے تو وہ ہر جگہ بنوا سکتا تھا۔

ڈربی نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے اور جو بریف کیس اٹھا کر کمرے سے باہر جانے لگا جاتے جاتے اس نے ڈورتھی پر الوداعی نظر ڈالی اور مسکرا کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''پیاری اب تم بڑے آرام سے سوتی رہو۔ مجھے یقین ہے کہ دو گھنٹے تک کوئی تمہارے آرام میں مخل نہ ہوگا۔''

ہال میں آ کر اس نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا سات بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ ڈربی اور ڈورتھی دونوں ہی وقت کی پابندی کی وجہ سے خاصے مشہور تھے۔ انہوں نے ہر بات کا ٹائم ٹیبل بنا رکھا تھا۔ مجال ہے کہ چند منٹ بھی ادھر سے ادھر ہو جائیں آج تو ڈربی کے لیے وقت کی پابندی بے حد ضروری تھی تا کہ کسی کو شک نہ ہونے پائے ایک ایک منٹ اور ایک ایک سیکنڈ دیکھ بھال کر صرف کرنا تھا۔ ڈربی جب باورچی خانے میں داخل ہوا تو باورچی خانے کی گھڑی سات بج کر بیالیس منٹ کا اعلان کر رہی تھی۔ اس نے پانچ ٹوسٹ لیے اور مسکرا کر تین ٹوسٹ معمول کے مطابق ڈورتھی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے لیے رکھ دیے۔ تین انڈوں میں سے ایک انڈا فرائی کیا۔ جب وہ ناشتہ کر کے فارغ ہوا تو پھر اس نے گھڑی کی طرف دیکھا سات بج کر اڑتالیس منٹ ہوئے تھے۔ باہر سے اخبار اٹھایا اور بغل میں دبا لیا' اچانک برابر کے مکان کا دروازہ کھلا اور ڈربی کی پڑوسن مسز ویسٹ باہر آئی اور مسکراتی ہوئی بولی۔

''صبح بخیر مسٹر ڈربی' آج آپ نے دو منٹ پہلے ٹبی کو پکارا' کیا بات ہے۔'' ڈربی کا چہرہ ایک لمحے کے لیے فق ہوگیا۔ مگر فوراً ہی اس نے حواس بجا کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''مسز ویسٹ میں نے تو ٹھیک وقت پر ٹبی کو پکارا تھا میرا خیال ہے کہ آپ کی گھڑی غلط وقت بتا رہی ہوگی۔''

مسز ویسٹ نے ڈربی کو اس بات پر ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ ''ایسا ہونا ناممکن ہے میری گھڑی بالکل نئی اور آٹو میٹک ہے اور پھر میں نے رات ہی ریڈیو سے ملائی تھی۔''

ڈربی نے مسکرا کر کہا۔ ''اچھا تو پھر ممکن ہے کہ میری گھڑی غلط ہو۔''

اتنے میں ایک چھوٹی سی سفید بلی آہستگی سے دم ہلاتی ہوئی ڈربی کی طرف آئی اور اس کے قدموں میں لوٹتی ہوئی میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ ڈربی نے اسے گود میں اٹھا کر پیار کیا۔

مسز ویسٹ چہک کر بولی۔ ''بلاشبہ آپ کی بلی آپ سے بہت محبت کرتی ہے۔ دیکھیے نا آپ کے پکارنے سے کس قدر جلد آگئی اور قدموں میں لوٹ کر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔''

ڈربی نے ریسٹ واچ کی طرف دیکھا۔ سات بج کر اکیاون منٹ ہوئے تھے۔ اس نے معذرت سے کہا۔ ''معاف کیجئے گا مسز ویسٹ ٹبی کو دودھ پلانے کا وقت ہوگیا ہے۔''

مسز ویسٹ نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''کوئی بات نہیں وقت کی پابندی بہرحال آپ

اندازِ فکر

ایک شخص کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ رات کے وقت سڑک کے کنارے ایک کھمبے کے نیچے کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا کسی راہ گیر نے پوچھا ''کیا ڈھونڈ رہے ہو۔؟''

اس شخص نے بتایا: ''گھر میں چابیاں کھوگئی ہیں۔''

راہ گیر نے کہا: ''چابیاں گھر میں کھوئی ہیں تو سڑک پر کیوں ڈھونڈ رہے ہو۔؟''

اس شخص نے بتایا کہ گھر میں اندھیرا ہے۔ سڑک پر روشنی ہے۔

(از: جنگل اداس ہے..... منو بھائی)

☆☆

کھانے کی سب سے عمدہ چیز کون سی ہوتی ہے۔ ہر وہ چیز جو مزے دار بھی ہو اور زود ہضم بھی مثلاً ایک کیڑا مینڈک کے لیے، مینڈک سانپ کے لیے، سانپ مارخولے کے لیے، مارخولہ انسان کے لیے اور انسان ایک کیڑے کے لیے۔

☆☆

ایک مرتبہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید رقہ میں فروکش تھا کہ اسی اثنا میں حضرت عبداللہ بن مبارک کے یہاں تشریف لانے کی اطلاع ملی۔ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی لوگ بے تحاشا دوڑ پڑے اور اس قدر کشمکش ہوئی کہ جوتیاں ٹوٹ گئیں۔ ہزاروں آدمی ان کے استقبال کے لیے شہر سے نکل پڑے تھے۔ فضا پر غبار چھا گیا تھا۔

ہارون الرشید کی ایک حرم (ام ولد) نے محل کے برج سے جو یہ تماشا دیکھا تو پوچھا۔

''معاملہ کیا ہے۔؟''

حاضرین نے کہا: ''خراسان کے ایک عالم جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے' رقہ آرہے ہیں۔''

بولیں: ''بخدا بادشاہ تو یہ ہیں۔ بھلا ہارون کیا بادشاہ ہے' جو پولیس اور سپاہیوں کے بغیر لوگوں کو جمع کر ہی نہیں سکتا۔''

(تاریخ علامہ ابن خلکان جلد 1 سے اقتباس)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے لیے ضروری ہے۔''

ڈربی دوبارہ باورچی خانہ کی طرف گیا اور ایک پیالی میں دودھ نکال کر ٹبی کو دیا پھر جب وہ ڈرائنگ روم میں آیا تو آتشدان کے کارنس پر رکھی ہوئی ٹائم پیس میں سات بج کر 5 5 منٹ ہوئے تھے۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ ڈربی نے ریسیور اٹھا کر ماؤتھ میں کہا۔ ''ہیلو میں ڈربی بول رہا ہوں۔''

دوسری طرف سے دفتر کے چپراسی نے 'ہی ہی' کرتے ہوئے کہا۔ ''صبح بخیر مسٹر ڈربی۔ میں نے آپ کو بیدار تو نہیں کیا۔''

''تمہیں نہیں معلوم کہ یہ وقت میرا اخبار پڑھنے کا ہے۔'' ڈربی نے غصے سے کہا۔

دوسری طرف سے قہقہے کی آواز آئی اور پھر چپراسی نے کہا۔

''میں ابھی دفتر والوں سے یہی کہہ رہا تھا کہ مسٹر ڈربی ابھی عام لوگوں سے ہٹ کر ناشتے کے بعد اخبار کا مطالعہ کر رہے ہوں گے اور واقعی میری بات سچ نکلی۔''

ڈربی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''ہاں تمہارا اندازہ درست نکلا۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ میں وقت کا کتنا پابند ہوں' کیا تمہیں دس ڈالر مل گئے۔'' دوسری طرف سے کھسیانی ہنسی کی آواز آئی اور پھر کہا گیا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ مسٹر ڈربی۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی دو ہفتوں کی چھٹیاں پیرس میں بہت لطف دیں گی۔ اچھا خدا حافظ۔''

ڈربی نے خدا حافظ کہا پھر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور قریب ہی ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ ''اب تھوڑی دیر کی بات ہے میں آٹھ بج کر دس منٹ پر گھر سے نکل جاؤں گا ساڑھے آٹھ بجے ایئرپورٹ پر پہنچوں گا۔ آٹھ بج کر پینتالیس منٹ کی بوئنگ پرواز سے پیرس روانہ ہو جاؤں گا اور جب پولیس کو ڈورتھی کی لاش ملے گی اس وقت تک میں ایک نیا نام اختیار کر کے یورپ کے کسی اور ملک میں پہنچ چکا ہوں گا۔''

دفعتاً وہ چونک پڑا' کال بیل بج رہی تھی۔ ڈربی نے اٹھ کر دروازہ کھولا ایک خوش پوش شخص ہاتھ میں بہت سے پیکٹ اٹھائے کھڑا تھا۔ ڈربی کو دیکھتے ہی وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

''معاف کیجیے گا کیا لیڈی ڈورتھی کا مکان یہی ہے۔''

''جی ہاں! فرمایئے کیا بات ہے۔''

''براہ کرم ان کو بلا دیجیے۔''

ڈربی کا چہرہ مارے خوف کے زرد پڑ گیا۔ مگر اس نے اپنے اوسان ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ...... کہ بھئی بات یہ ہے کہ...... لیڈی ڈورتھی ابھی سو رہی ہیں اور میں ان کو جگا کر ناراضگی مول لینا نہیں چاہتا۔ تم مجھ سے کہو کیا بات ہے۔''

اس نے پیکٹ ڈربی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے ہماری کمپنی کو کچھ کاسمیٹکس کے آرڈر دیے تھے مہربانی فرما کر دس ڈالر دے دیجیے۔''

ڈربی نے پیکٹ لے لیے اور دروازہ بند کر کے اندر آ گیا بریف کیس سے سو ڈالر کا نوٹ لے کر اس نے پھر دروازہ کھولا نوٹ اس شخص کو دے کر دروازہ بند کر کے اس میز کی طرف بڑھا جس پر اخبار رکھا ہوا تھا لیکن ابھی وہ میز کے قریب پہنچا ہی تھا کہ کال بیل پھر بجی۔ ڈربی نے واپس مڑ کر دروازہ کھولا وہی شخص کھڑا ہوا تھا۔ کچھ نوٹ اس نے ڈربی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جناب آپ سو ڈالر کا نوٹ دے کر بھول گئے تھے یہ لیجیے بقایا پیسے۔''

ڈربی گھبرا گیا اور اس نے کہا۔ ''ارے میری یادداشت بھی کتنی کمزور ہو گئی ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اور پھر دروازہ بند کر کے ایک طویل اطمینان بھرا سانس لے کر اس نے گھڑی دیکھی آٹھ بج کر دو منٹ ہوئے تھے۔ ہر چیز وقت کے مطابق ہو رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ اخبار کا مطالعہ کرتا رہا اور جب وہ گھر سے باہر نکلا تو آٹھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ برابر میں مسز ویسٹ اپنے چھوٹے سے باغیچے میں کیاریاں درست کر رہی تھی ڈربی کو دیکھ کر اس نے ریسٹ واچ پر نظر ڈالی اور پھر کھرپے سے زمین کو کھودتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر ڈربی! اب آپ ٹھیک وقت پر نکلے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی گھڑی درست ہوگئی ہے۔''

ڈربی نے بطور تعلیم ہیٹ اتارا اور سر خم کر کے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مسز ویسٹ معاف کیجیے گا مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اس لیے میں آپ سے زیادہ دیر تک گفتگو نہیں کر سکتا اچھا خدا حافظ۔''

اور کچھ دیر بعد وہ ایئرپورٹ پر مسافروں کی انتظار گاہ میں بیٹھا ایک رسالہ پڑھ رہا تھا۔ پندرہ منٹ بعد اناؤنسر نے مسافروں کو جہاز میں پہنچنے کی ہدایت کی ڈربی بریف کیس اٹھا کر بڑے ہال سے ہوتا ہوا رن وے کی طرف چل دیا۔ جہاں دیو پیکر بوئنگ پیرس جانے کے لیے تیار کھڑا ہوا تھا۔ ٹکٹ کٹا کر وہ ہوائی جہاز کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ابھی اس نے آدھا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

''مسٹر ڈربی ایک منٹ ٹھہریے۔''

ڈربی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سفید اوور کوٹ پہنے سیڑھیوں کے نیچے ایک اجنبی شخص کھڑا تھا۔ ڈربی جب سیڑھیاں اتر کر اس کے قریب پہنچا تو اس نے۔ ''پولیس انسپکٹر آف انٹیلی جنس بیورو'' کا شناختی کارڈ دکھایا اور جیب سے ہتھکڑی نکالتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر ڈربی مجھے افسوس ہے کہ آپ پیرس کی سیر کا لطف نہیں اٹھا سکیں گے۔ میں آپ کو لیڈی ڈورتھی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔''

ڈربی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ پیشانی پہلے ہی سے عرق آلود ہو رہی تھی۔ وہ بیحد خوف زدہ ہوگیا تھا لیکن اس پر خوف سے زیادہ حیرت غالب تھی بریف کیس بے اختیار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جسے پولیس انسپکٹر نے اٹھا لیا اور ڈربی کو ہتھکڑی پہنا دی۔ ڈربی نے حیرت سے پوچھا۔ ''لیکن آپ کیسے کہہ رہے کہ میں لیڈی ڈورتھی کا قاتل ہوں۔''

انسپکٹر کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور اس نے کہا۔ ''مسٹر ڈربی اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے لیکن مجرم کوئی بھی ہو ایک نہ ایک غلطی ایسی کر جاتا ہے سو آپ نے بھی یہی کیا آپ کو شاید علم ہو کہ آپ کی پڑوسن...... مسز ویسٹ بھی دخل در معقولات میں خاصی دلچسپی رکھتی تھی۔ ہیں وہ محرکات جو آپ کی گرفتاری کا باعث ہوئے اب غور سے سنئے آپ آٹھ بج کر دس منٹ پر دفتر چلے جاتے تو آپ کی بیوی لیڈی ڈورتھی آٹھ بج کر بیس منٹ پر ٹبی کو اٹھا کر بلا ناغہ ٹھیک وقت پر باہر پھینک دیتی تھی۔ آج خلاف معمول آپ کی چہیتی بلی ٹبی باہر نہیں پھینکی گئی تو آپ کی پڑوسن مسز ویسٹ کو تشویش ہوئی اور جب وہ اس کا سبب معلوم کرنے آپ کی خواب گاہ میں پہنچی تو وہاں......!!''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

یہ اسکیم یقینا جاری و ساری قسم کی تھی۔ ادھر ادھر
جو کوئی یہاں آتا تھا اسے اسی طرح پھنسایا جاتا ہو گا
وہ یقینا خوش ہو رہے ہوں گے اور انہیں ہونا
چاہیے تھا۔ مگر اب پیٹر کے سامنے سب سے بڑا مشن
تھا کہ وہ ان لوگوں کا تیا پانچہ کرے۔ اسے یقین تھا
وہ تیس ہزار کی رقم انہی لوگوں کے پاس ہو گی۔ اس
طے کیا کہ کچھ بھی ہو وہ یہ رقم ان سے ضرور اینٹھے

رقم دوڑ

احمد صغیر صدیقی

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

پیٹر مائیکل بار میں بیٹھا شراب سے اپنا غم غلط کر رہا تھا۔ چیزیں اس کے منصوبے کے مطابق نہیں ہوئی تھیں۔ ہالی وڈ والی اسکیم کے لیے رقم جمع کرنے کے بجائے وہ اپنی پہلی والی پونجی بھی گنوا بیٹھا تھا۔ اب اس کے پاس بس اتنی رقم رہ گئی تھی کہ اس سے شراب خرید کر اپنا غم غلط کر سکتا۔ اس نے پانچ ڈالر کا ایک نوٹ بار پر رکھا اور بارٹینڈر کو اشارہ کیا۔ اس نے نوٹ اٹھا لیا اور اس کا خالی گلاس دوبارہ بھر دیا۔ اس نے اس سے ابھی ایک ہی گھونٹ بھرا تھا کہ اس کی نگاہ وارن لینگی پر پڑی۔

وارن ایک دبلا پتلا آدمی تھا۔ دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے وہ اس کے بغل والے اسٹول پر بیٹھ گیا اور آہستہ سے کھانسا۔ ''کہو پیٹر کیسے جا رہے ہو۔''

اس نے پوچھا۔ ''رقم کمانے کے لیے وہی بیکنگ سوڈا ابزنس۔''

''تم تو جانتے ہی ہو۔'' پیٹر نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

''میرے ساتھ کچھ ایسی باتیں ہوئی ہیں کہ......'' اس نے ایک جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

''ہاں میں جانتا ہوں۔'' وارن نے کہا اور بیئر کا آرڈر دیا۔ ''میاں......'' اس نے قدرے پر مزاح لہجے میں کہا۔ ''میرا تو خیال تھا کہ نیویارک سے آنے والے تم ایک ہوشیار آدمی ہو۔ تم ادھر بوسٹن میں کوئی مہینے بھر سے ہو اور ابھی تک بس بیکنگ سوڈا ہی بیچ رہے ہو وہ بھی کوک کے دام سے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کام کی تعریف کی جائے۔''

''میں تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔'' پیٹر بڑبڑایا۔ وارن سے اس کی دوستی ان دنوں میں ہوئی تھی جب وہ بوسٹن میں وارد ہوا تھا۔ اس نے کچھ کاموں میں اس کی مدد بھی کی تھی۔ مگر سب بیکار ثابت ہوئے تھے۔ وارن اسے پسند تھا مگر اس وقت وہ چاہتا تھا کہ یہ آدمی کسی طرح ٹل جائے تاکہ وہ تنہا ہو کر اپنا ماتم اچھی طرح کر سکے۔ ''کیا تمہیں اپنی احمقانہ حرکات کا احساس نہیں۔ پولیس والے تمہیں پبلک اسکولوں کے قریب منشیات بیچنے کے جرم میں پکڑ بھی سکتے ہیں۔'' وارن نے آہستہ سے کہا۔

''مگر میں منشیات تو نہیں بیچتا۔ یہ تو ایک عام گھریلو چیز ہے۔''

وارن نے اس کی بات سن کر اسے گھورا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہر مایوسی سے گردن ہلا کر بولا۔ ''تم میری بات ور سے سنو مجھے رنج ہے کہ میرے بتائے کاموں میں تمہیں کامیابی نہیں مل سکی اب ایک اور اچھا موقع سامنے آیا ہے جس سے تلافی ہوسکتی ہے۔ تمہیں کم از کم دو ہزار مل جائیں گے۔'' پیٹر نے پنے ساتھی کو دیکھا۔ ''وہ کیسے۔''

''یہ کوئی خطرناک کام نہیں ہے۔ بس ایک یکٹ لے کر تمہیں ویگاس جانا ہوگا یہ خاصا قیمتی سامان ہے اور جن کے لیے ہے وہ خاصے ٹیڑھے دگ ہیں۔ ان کے ساتھ تم چکر نہیں چلانا۔''

پیٹر نے نشہ بھری نظروں سے وارن کو گھورا۔ وہ اب تک پانچ گلاس پی چکا تھا۔ اور یہ ستی شراب تھی۔ اس نے اپنے ساتھی کے ہرے پر تذبذب کے آثار دیکھے ویسے یہ معمولی سا کام تھا۔ اسے اپنی توہین سی محسوس ہوئی۔ وہ ہستہ سے مسکرایا۔ اس نے وارن سے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں تم نے درست آدمی سے بات کی ہے۔'' اس نے کہا۔

☆☆

دوسرے روز وارن مہنگی بیئر کو لے کر ایک چھوٹے سے اطالوی ریسٹوران میں لے گیا جو بوسٹن کے شمالی سرے پر تھا پچھلی رات کا خمار ابھی تک پیٹر پر طاری تھا۔ اس کی زبان خشک ہو رہی تھی اور سر دکھ رہا تھا۔ بیرونی کیفیت بہرحال بری نہ تھی۔ اس کے وجیہہ اور کھردرے چہرے کے تاثرات بہرحال نارمل ہی تھے۔ ساتھ ہی اس کا لباس بھی حسب معمول عمدہ اور قابل تعریف تھا۔

سر کی ایک حرکت نے ان دونوں کو ریستوران کے عقبی حصے میں پہنچا دیا' جہاں آٹھ افراد کے لیے کافی' ایک بڑی سی میز کے پیچھے ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بال ہلکے ہو گئے تھے اور آنکھیں پتھرائی ہوئی سی تھیں۔

اندر پہنچتے ہی وارن تیزی سے لپکا۔ اس نے خادموں کی طرح جھک کر اس آدمی کا ہاتھ تھاما اور اس کی پشت پر اپنے ہونٹ رکھ کر بوسہ دیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''بہت شکریہ مسٹر کاربون۔'' اس نے ادب سے کہا۔ ''ہم دونوں بے حد ممنون ہیں میں آپ سے اپنے دوست کو ملانا چاہوں گا' یہ پیٹر مائیکل ہے۔''

وارن نے بھاری بھرکم آدمی کا ہاتھ چھوڑ دیا کاربون نے آہستہ سے اپنے ہاتھ کو حرکت دی یہ اشارہ تھا کہ دونوں بیٹھ جائیں۔

''کیا تمہارے ساتھی کو علم ہے کہ یہ کام کس قدر اہم ہے۔'' بھاری بھرکم کاربون نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' وارن نے کہا۔

''تم۔'' کاربون نے اپنی موٹی سی انگلی پیٹر کی سمت اٹھائی۔ ''کیا تم خود کو اس لائق سمجھتے ہو۔''

''یس سر۔''

کاربون نے اپنی پتھریلی نظریں۔ اس کے چہرے پر جما دیں۔ کچھ دیر اسے تولنے کے بعد اس نے ہنکاری بھری اور فرش پر رکھے ایک بریف کیس کو اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے لفافے نکالے ایک اس نے وارن کو تھمایا دوسرا پیٹر کو۔

''اس میں ہدایات موجود ہیں۔'' اس نے پیٹر سے کہا۔ اس کی آنکھیں کسی ایک کی آنکھوں کی طرف تھیں۔ ''اس میں لاس ویگاس کا ایک بس ٹکٹ ہے۔ تم لکھے ہوئے پتے پر پہنچ کر یہ بریف کیس پہنچاؤ گے اس میں کوئی غلطی نہ کرنا۔ اب اپنی زندگی کی قسم کھا کر مجھے یقین دلاؤ۔''

''معافی چاہتا ہوں میں سمجھا نہیں۔''

''میں نے تم سے زندگی کی قسم کھانے کے لیے کہا ہے۔''

پیٹر نے شانے اچھالے اور بولا۔ ''میں قسم کھاتا ہوں۔'' ''ایسے نہیں بھاری بھرکم آدمی نے کہا۔ ''زندگی کی قسم کھاؤ۔''

''میں اپنی زندگی کی قسم کھاتا ہوں۔''

''ٹھیک۔'' کاربون کے چہرہ پر اطمینان پیدا ہوا۔

''میں نے تمہارے حلف کو یاد کر لیا ہے۔'' اس نے کہا پھر اس نے میز پر رکھے اخبار کو اٹھا لیا اور پیٹر اور وارن دونوں سے لاتعلق ہو گیا۔

اس آدمی نے انہیں جس طرح روانہ کیا تھا وہ بہت ہی تعجب خیز تھا۔ پیٹر کو بے حد حیرت تھی۔ مگر وارن شاید جانتا تھا۔ اٹھتے ہوئے اس نے بے نیاز آدمی کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اس نے پیٹر کو اشارہ کیا کہ وہ بریف کیس لے کر چل دے۔

جب وہ کمرے سے نکل کر سڑک پر پہنچے پیٹر نے اپنا لفافہ کھول کر دیکھا' اس میں اسے بس ٹکٹ اور ہدایات کے رقعے کے ساتھ سو سو ڈالر کے تازہ تازہ بیس نوٹ بھی رکھے ملے۔ ادھر وارن کے منہ سے اطمینان کی آواز نکلی اس کے الفاظ میں ایک ہزار کا نوٹ تھا۔ ''یہ میرا کمیشن ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

پیٹر ہنسا۔ ''ایک گھنٹے کے کام کے لیے یہ معاوضہ برا نہیں۔''

''اور کیا۔'' وارن نے کہا۔ ''نہایت معقول معاوضہ ہے مگر دیکھو اپنا وعدہ یاد رکھنا۔''

''اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔''

''دیکھو۔'' وارن نے کہا۔ ''یہ آدمی بہت برا ہے۔ اس نے تم سے جو حلف لیا ہے وہ بہت اہم ہے۔''

پیٹر کا منہ بن گیا اسے وارن کی باتیں پسند نہیں آئی تھیں' یہ ایک معمولی سی ڈلیوری کا معاملہ تھا یہ کام تو کوئی بھنگی بھی سوٹ پہن کر کر سکتا تھا اس نے تلخی سے کہا۔ ''تمہارا خیال ہے میں بریف کیس لے کر کسی غلط بس میں بیٹھ جاؤں گا اور کھو جاؤں گا۔''

وارن گھبرا گیا۔ ''دیکھو خفا مت ہو۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں صرف احتیاط کی بات کر رہا تھا یہ مسئلہ سیریس ہے اور اس میں بھی شامل ہوں۔ کوئی غلط بات ہوئی تو اس کے آدمی

Downloaded from Paksociety.com

ہم دونوں کو لپٹ جائیں گے۔''

''ظاہر ہے۔'' پیٹر نے کہا۔

''دیکھو کوئی مسئلہ سامنے آئے تو مجھے فون کر دینا۔'' وارن نے اسے ایک نمبر بتایا۔ ''کہو تو لکھ دوں۔''

''مجھے یاد رہے گا۔'' پیٹر نے کہا۔

''اچھا اب جاؤ۔''

جب وارن مڑنے لگا تو پیٹر نے اسے ایک سلوٹ جھاڑا۔ پھر اتنی دیر کھڑا رہا جب تک لینگلی چلا نہ گیا۔ اس کے بعد پیٹر نے سڑک پار کی اور ایک اطالوی ریسٹوران میں گھس گیا۔ وہ سیدھا باتھ روم میں گیا۔

اس نے عجلت کے ساتھ بریف کیس کے تالے پر ہاتھ ڈالا اس کے لیے ایسے تالے معمولی تھے۔ اس نے اسے کھول لیا۔ اس میں موجود چیزیں دیکھ کر اس کا چہرہ کھل گیا۔ بریف کیس میں ایک طرف اعشاریہ دو پانچ کا ایک آٹو میٹک ریوالور سائلنسر کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ ایک طرف سو سو ڈالر کی گڈیاں تھیں کل رقم تین ہزار ڈالر تھی۔ اس نے لمبی سانس لی اور کیس کو دوبارہ مقفل کر دیا۔

اس کی ہتھیلی گیلی ہو رہی تھی اس نے اسے پینٹ سے رگڑ کر صاف کیا۔ پھر وہ سڑک پر آ گیا۔ اس رقم کے ساتھ وہ کافی کچھ کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے بس ٹکٹ کو دیکھا یہ ٹکٹ تین روز بعد کا تھا۔ گویا اس کے پاس کافی وقت تھا وہ نیویارک جا کر پوکر کی لمبی بازیاں کھیل سکتا تھا' ویسے تین ہزار کی رقم اس کی ہالی وڈ اسکیم کو اسٹارٹ کرنے کے لیے کافی تھی جو اس کے دماغ میں بہت عرصے سے تھی۔ لاس ویگاس میں رقم ڈلیور کر کے اس کا ارادہ تھا کہ وہ سیدھا کیلیفورنیا جائے گا۔ اسے امید تھی کہ وہ نیویارک میں یہ رقم با آسانی دگنی کر لے گا۔ بس چند آدمیوں کو بلانا پڑتا۔ اور ایک دو جعلی پولس وردیوں کا بندوبست کرنا پڑتا۔

سڑک پر اس [illegible]

فاصلے پر ایک سرخ بالوں والی لڑکی [illegible] اس کی نظریں اس لڑکی کے عقب پر [illegible] جہاں اس کا ذہن منصوبوں میں غرق تھا۔ اپنے استغراق میں اس آوارہ سے لڑکے کا مقصد کا اندازہ نہ ہو سکا جو سامنے سے آ رہا تھا۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب اس اوباش لڑکے نے ایک دم سے لڑکی کے پاس پہنچ کر اس کے چہرے پر ضرب لگائی پھر اس نے دوسرے ہاتھ سے لڑکی کے ہاتھ میں دبے پرس کو چھین لیا۔ لڑکی زور سے چیخی۔

پیٹر چونک کر جھپٹا' دوسرے لمحے وہ لڑکے پر تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے پرس چھین لیا' دوسرے سے اس نے بریف کیس گھما کر لڑکے کے منہ پر مارا لڑکا چکرا گیا اس نے پیٹر کو دھکا دیا۔ وہ کولھے کے بل گرا۔ وہاں ایک چھوٹا سا پانی کا تلاؤ سا تھا۔ پانی میں گر کر اس نے لڑکے کو بھاگتے دیکھا۔ اس کا لباس بھیگ گیا تھا۔

لڑکی اس کے سر پر کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ لڑکی خاصی خوب صورت تھی' اس کے لباس سے اس کے جسم کے خم نظر آ رہے تھے۔ اس کے کانوں میں ڈائمنڈ کے بندے تھے۔ پیٹر لڑکی کو دیکھ کر مسکرایا۔

''تم ٹھیک ہو۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' لڑکی اب نارمل ہو چلی تھی۔

''اس نے تمہارے چہرے پر وار کیا تھا۔'' پیٹر نے کہا۔

''مگر ہاتھ پوری طرح لگا نہیں۔'' لڑکی نے کہا۔

''چلو پتا مل گیا۔'' پیٹر نے اس کے پرس کو بڑھاتے ہوئے کہا۔

لڑکی ہنسی یہ ایک نگاہ بھری ہنسی تھی۔ پیٹر کو وہ اچھی لگی مگر وہ کھسیایا ہوا بھی تھا۔ ''مجھے افسوس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہے۔'' لڑکی نے کہا۔

''میری وجہ سے تم پانی میں گر گئے چلو اٹھو۔''

لڑکی نے اسے اٹھنے میں مدد دی۔ ''میں تمہاری شکر گزار ہوں۔''

لڑکی نے کہا۔ ''میرا ہوٹل یہاں سے قریب ہے۔ میرے ساتھ چلو میں وہاں تمہارا سوٹ سکھا دوں گی۔'' پھر اس نے اپنا تعارف کرایا۔ لڑکی کا نام لورین پیڈلی تھا۔ وہ بوسٹن میں بزنس کے سلسلے میں آئی تھی۔ پیٹر نے اسے بتایا کہ اس کا نام پال مائیکل ہے۔ راستہ چلتے ہوئے پیٹر کی نگاہیں لڑکی کے کانوں کی سمت اٹھتی ہیں جن میں پڑی بالیاں ہیرے کی تھیں وہ سوچ رہا تھا یہ اصلی ہیرے ہیں وہ انہیں ہتھیانا چاہتا تھا۔ اگر نقلی نکلتے تو وہ انہیں اپنی منگیتر ٹونی کو دے سکتا تھا۔

جس وقت لڑکی اسے ہوٹل روم میں لائی اسے بہت خوشی ہوئی۔ اسے رکھنے کی آفر دی تھی اسے ہیرے ہتھیانے کے لیے رکھنا ضروری تھا پھر لباس کو بھی سکھانا تھا۔

لڑکی نے اسے باتھ روم دکھایا۔ ''پال تم نہالو' میں لباس خشک کرواتی ہوں۔ تمہیں ایک دو گھنٹے رکنا ہوگا' میرا خیال ہے تم اسے میرے ساتھ گزار سکتے ہو' کیا خیال ہے۔'' اس نے کہا۔ تو لڑکی ہنسی اس نے کہا۔ ''میں اس بدمعاش کی وجہ سے ابھی تک دہلی ہوئی ہوں۔''

پال نے گیلا سوٹ اتارا۔ اس نے اپنا پرس اور سوئچ بلیڈ والا چاقو وہ ساتھ رکھنے کا عادی تھا۔ لفافے کے ساتھ وینیٹی پر رکھ دیا۔ اس نے اپنی کمر کے گرد تولیا باندھ لیا اور بھیگا ہوا سوٹ لورین کے پاس لے گیا۔ پھر جب وہ دوبارہ باتھ روم میں چلا تو لورین نے کہا۔ ''ذرا جلدی باہر آجانا۔''

ہوٹل مہنگا تھا اور یہ باتھ روم شاندار تھا۔ اس نے دروازے کے ہینڈل تلے ایک پیڑھی ٹھہرادی۔ احتیاطاً وہ بہت عمدگی سے کام کرنے کا عادی تھا۔ رقم چھوڑنا اس کی عادت نہ تھی۔ وہ خود کو دوسروں سے ایک قدم آگے رکھتا تھا۔ اسی لیے جو کامیابیاں اسے ہوئی تھیں اسے بہت شاق گزریں تھیں۔ دراصل اس کے منصوبے کم ہی ڈھلکتے تھے۔ نہاتے ہوئے اسے تناؤ میں کمی محسوس ہوئی۔ بدقسمتی کے سائے اس پر سے اب ہٹ رہے تھے۔ پہلے صرف ایک معمولی سے کام کے لیے دو ہزار پھر تیس ہزار کی رقم اور اب یہ ہیرے کے بندے۔ یہ کم از کم پانچ ہزار کے تو تھے ہی اور...... ایک حسینہ کی قربت۔

شاور کے اختتام پر اس کی روح ہوا میں اڑ رہی تھی۔ جوں ہی اس نے ٹاول کے لیے ہاتھ بڑھایا اسے معلوم ہوا کہ باتھ روم کا دروازہ غائب ہو چکا ہے۔ اس نے آنکھیں پٹ پٹا کر دیکھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ ہوا کیا ہے...... اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے ادھر دیکھا جدھر اس کا بریف کیس رکھا تھا۔ مگر اب وہ غائب تھا۔

وہ سنسناتے ذہن کے ساتھ منجمد سا ہو گیا۔ چاقو اور پرس البتہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ باتھ روم سے نکلا تو اسے پتا چلا کہ اس کا دروازہ ہال میں پڑا ہے اسے قبضوں سے اکھاڑ دیا گیا تھا۔ جب پیٹر کمرے میں آیا تھا تو اس نے دیکھا تھا کہ ہاں کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے یہاں ایک سوٹ کیس بھی بستر کے پاس دیکھا تھا۔ مگر اب یہ سب کچھ وہ نہ تھا لورین بھی نہیں تھی۔

پیٹر بستر پر دھپ سے بیٹھ گیا۔ تولیا اس کی کمر سے لپٹا ہوا تھا۔ اس نے سوچنا شروع کیا۔ غالباً یہ ایک سیٹ اپ تھا۔

وہ لڑکی اور وہ اوباش لڑکا دونوں ملے ہوئے تھے اور اس کے بریف کیس کے چکر میں تھے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اب وہ ہوٹل میں پھنسا ہوا تھا' اس کے پاس کپڑے بھی نہ تھے اور نہ کوئی امید۔ اس نے سوچا ٹونی کو نیویارک فون کرے اور اس سے آنے کی التجا کرے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ وہ اسے کال نہیں کر سکتا۔ بوسٹن آنے سے قبل ٹونی کے ساتھ اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس نے غصے میں منگنی توڑنے کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ اس نے اسے چکر باز قرار دیا تھا۔

اب مجبوری تھی وہ اس شخص وارن لینگلی کو فون نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے پاس کوئی دوسرا چارہ بھی تو نہ تھا۔ اس نے وارن کو فون کیا۔

☆☆

وارن لینگلی ہوٹل کے کمرے میں بے چینی سے آگے پیچھے ٹہل رہا تھا۔ ''ابھی گھنٹا بھی نہیں ہوا ہے اور تم بریف کیس گنوا بیٹھے ہو۔''

پیٹر چپ تھا اور لینگلی اسے غصے سے گھورے جا رہا تھا۔

''واقعی تم بہت اسمارٹ آدمی ہو...... میں نے تمہیں محتاط رہنے کو کہا تھا تو تم چراغ پا ہو گئے تھے۔ اب دیکھو۔''

پیٹر نے کمزور لہجے میں کہا۔ ''یہ ایک ملی بھگت تھی۔''

''مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔'' وارن نے بات کاٹ دی۔

''یہ بہت بڑی غلطی ہوتی ہے۔''

''اوکے...... پھر۔'' بالآخر پیٹر بھنا گیا۔

''اب کیا کہوں۔'' لینگلی نے ہنکارا بھرا۔

اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے دبایا' ہوٹل میں جس وقت وارن لینگلی آیا تھا وہ ایک ساتھ ایک میلی سی ورک شرٹ ایک ادھڑا ہوا سا کارڈرائے کا پینٹ اور ایک جیکٹ ساتھ لایا تھا۔ کپڑوں سے پیاز اور لہسن کی بو نکل رہی تھی۔ یہ کپڑے پیٹر کے بدن پر فٹ بھی نہ تھے۔ وہ

مسکرائیے

☆☆☆

* جنت میں ایک صاحب دیوار پھاند کر دوزخ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ فرشتوں نے اس سے پوچھا کہ لوگ تو جنت کی آرزو کرتے ہیں تم دوزخ میں جانے کے لیے کیوں بے چین ہو رہے ہو؟

اس شخص نے کہا کہ ابھی ابھی میری بیگم کا انتقال ہوا ہے اور لوگ اس کے حق میں جنت مقام ہونے کی دعا کر رہے ہیں۔

☆☆☆

* ایک چالیس سالہ کنوارے کی شادی نہیں ہو پا رہی تھی اور وہ اپنے دوست کے سامنے شکایت کر رہا تھا کہ یار میں جب بھی کسی لڑکی کو پسند کر کے امی سے ملانے لے جاتا ہوں وہ اسے ناپسند کر دیتی ہیں۔ دوست نے مشورہ دیا کہ تم ایسا کرو کہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرو جو شکل و صورت، عادات واطوار اور مزاج کے اعتبار سے تمہاری امی سے ملتی جلتی ہو۔

چھ ماہ بعد ملاقات ہوئی تو دوست نے سب سے پہلے شادی کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ ''ہاں بالکل ویسی ہی لڑکی مجھے مل گئی تھی۔''

دوست نے شکوہ کیا کہ ''اچھا چپکے چپکے شادی بھی کر لی اور بلایا بھی نہیں۔''

کنوارے نے کہا ''نہیں یار جب میں وہ لڑکی لے کر گھر گیا تو والد صاحب نے کہا کہ اگر تم نے اتنی بدصورت بدمزاج اور بدسلیقہ و پھوہڑ لڑکی سے شادی کی تو وہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے!''

☆☆☆

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

چپ چاپ سامنے جا رہا تھا اور لینگی کا مقابلہ مختلف قسم کے گدھوں سے کر رہا تھا۔ بار بار اس کے اندر خواہش ابھر رہی تھی کہ وہ لینگی کے بچے کے منہ پر دو چار ہاتھ جڑ دے۔

''دیکھو میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' لینگی نے کہا۔

''مسٹر کاربون اپنے آدمیوں سے یہ کام نہیں کرانا چاہتا تھا۔ رقم تمہاری حماقت سے چرائی گئی ہے اب کاربون خود بھی مشکل میں پڑے گا اور وہ مجھے بھی لپیٹے گا مگر تم اچھی طرح سن لو سب سے بڑی مصیبت تمہی کو جھیلنے ہوگی۔''

اوپر سے پیٹر خاصا پرسکون نظر آ رہا تھا لیکن اس کا اندر سے برا حال تھا۔ وہ قریب المرگ ہو رہا تھا۔ اس کی حسیات کہہ رہی تھیں کہ کسی طرح کہیں بھاگ لو مگر اس کے پاس رقم بھی نہ تھی۔ بالاخر اس نے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ یہ معاملہ کاربون کے ساتھ کس طرح طے ہو سکتا ہے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔'' لینگی نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''تم دو گھنٹے بعد مجھ سے جیک کے بارے میں ملو پھر دیکھتے ہیں۔ آنا ضرور اسی میں تمہاری عافیت ہے۔''

وارن لینگی پھر وحشت بھرے انداز میں اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ پیٹر وہیں رکا اپنا سامان بٹورتا رہا۔ اتفاق سے سرخ بالوں والی اپنے جوتے چھوڑ گئی تھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی کام کی ہوتی ہیں۔

جیک کا بار کسی کوٹھری جیسا تھا۔ یہ بوسٹن کے چائنا ٹاؤن کے پاس تھا۔ جس وقت پیٹر وہاں پہنچا اس کے بدن پر وہی لینگی کا لایا ہوا بدتر لباس تھا وہ اس قدر بددل ہو رہا تھا کہ اس نے لباس بدلنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

یہ بار آدمیوں سے بھرا ہوا تھا سب کے سب لچے لفنگے تھے۔ اندر سے اسے لینگی نظر آ گیا۔ اس نے اسے دیکھ کر جگہ چھوڑ دی اور بار کی عقبی سمت میں چل دیا۔ پیٹر اس کے پیچھے تھا۔ فضا میں شور تھا۔ میزوں پر گلاس کھنک رہے تھے ایک عورت چیخی پھر کچھ مردوں کے قہقہے ابھرے۔

پیٹر اور لینگی نے ایک خاموش گوشہ منتخب کیا اس نے بیٹھ کر سخت نظروں سے پیٹر کو دیکھا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں نے کاربون سے ملنے کا وقت لے لیا ہے کل رات میں مگر تمہیں اس کے نقصان کی تلافی کرنی ہوگی۔''

''ک۔کیا مطلب۔'' پیٹر ہکلایا۔

''میں نے ادھر ادھر کچھ بات کی ہے۔'' لینگی نے کہا اور چپ ہو گیا۔ ایک عورت ادھر سے گزری تھی۔ جب وہ چلی گئی تو اس نے کہا۔ ''میں نے تمہارے لیے ایک جاب نکالی ہے۔''

پیٹر نے محسوس کیا کوئی سخت سی ٹھنڈی چیز اسے ہاتھ میں دی جا رہی ہے۔ لینگی اسے ایک ریوالور تھما رہا تھا۔

''اسے سنبھالو۔''

پیٹر نے اسے اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

''کل تمہیں ایک مقامی بلی کو لوٹنا ہوگا۔'' لینگی نے کہا۔

''اس کے پاس دس ہزار کی رقم ہوگی۔ وقت اور جگہ کاغذ پر لکھی ہے یہ لو۔'' اس نے اس کی جیب میں ٹھونس دیا۔

''نہیں میں یہ کام نہیں کرتا۔'' پیٹر نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا......تو پھر اب سے شروع کر دو۔''

''تم سمجھتے کیوں نہیں کہ۔''

''سنو۔'' خونخوار لہجے میں مختصر سے آدمی نے کہا۔ ''تمہیں کاربون کے نقصان کو پورا کرنا ہوگا۔''

''میں یہ کام نہیں کر سکتا۔''

لینگی نے اس کے سینے پر انگلی ماری۔ ''تم کر سکتے ہو اور کرو گے۔'' اس نے بھنچے لہجے میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کہا۔ ''اس سارے مشرقی ساحل پر مسٹر کاربون کے آدمی چھپے ہوئے ہیں۔ تم یہاں سے نیویارک نہیں جا سکتے۔ تمہیں ادائیگی کرنی ہی ہوگی۔''

''مگر وہ رقم تو تیس ہزار کی تھی جو بریف کیس میں تھی۔''

''خوب تو تم نے اسے کھولا بھی تھا۔'' لینگی نے طنز کیا۔ ''چلو اس طرح تم سمجھ سکتے ہو کہ کاربون تم سے کتنا خوش ہوگا۔ تمہارے پاس اس کام کے سوا کوئی اور آپشن نہیں۔'' پیٹر کچھ دیر چپ رہا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ ''گویا بات سمجھ میں آ گئی۔'' لینگی نے کہا۔

''کل رات نو بجے تم اور میں مسٹر کاربون سے ملیں گے اسی ریسٹوران میں۔'' اس نے جانے کے لیے رخ پھیرا پھر بولا۔ ''دیکھو کوئی احمقانہ حرکت مت کرنا تم اگر افغانستان بھی بھاگ جاؤ تو وہ تمہیں وہاں سے بھی پکڑ والے گا۔''

لینگی کے جانے کے بعد پیٹر کوئی منٹ بھر بھناتا رہا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

جس وقت اس کے سینے پر لینگی انگلی مار رہا تھا اسے اندازہ ہوا تھا کہ یہ گٹھ جوڑ کس قدر طویل تھی۔ اگر لینگی نے توجہ دی ہوتی تو وہ اس کی آنکھوں کی چمک ضرور دیکھ لیتا۔

بلاشبہ لینگی اور کاربون نے جو اسکیم بنائی تھی وہ قابل تعریف تھی ...... یعنی پہلے اسے تیس ہزار تھمانے لگے تھے پھر چھین لیے گئے تھے اور یہ اسے دھمکا کر ڈکیتی پر اکسایا گیا تھا۔

یہ کوئی اتفاق نہ تھا کہ لینگی سے ملنے کے بعد اس نے جن کاموں میں ہاتھ ڈالا تھا سب فیل ہو گئے تھے۔ یہ بدنصیبی کا معاملہ نہ تھا بلکہ یہ سب اس لیے تھا کہ وہ ڈلیوری والی جاب قبول کر لے۔

پیٹر نے ہار چھوڑ دیا اور دریا کی طرف چل

مسکرائیے

ہوٹل کے مینیجر نے مہمان گاہک سے کہا ''میرا نوکر آپ کو صبح اٹھا دے گا۔''

گاہک بولا۔ ''نہیں شکریہ! مجھے چھ بجے اٹھنے کی عادت ہے۔''

مینیجر بولا۔ ''تو پھر براہ کرم آپ اسے اٹھا دیجئے گا۔''

☆☆☆

ایک بار ایک ہوائی جہاز کی کمپنی نے دو ہفتے کے لیے ایک پرکشش پیشکش کی کہ اس کے ہوائی جہازوں میں اگر شوہر بیوی ایک ساتھ سفر کریں تو انہیں آدھے کرائے کی چھوٹ دی جائے گی۔

دو ہفتے کی تمام پروازیں ہو چکیں تو کمپنی کے پبلسٹی سیکشن نے مسافروں کی بیویوں کو خط لکھے کہ کمپنی کے جہازوں میں سفر کرنا انہیں کیسا لگا۔

سب بیویوں کی طرف سے ایک ہی جواب آیا۔ ''ہم نے کب سفر کیا؟''

☆☆☆

ایک خاتون ایڈیٹر کو کسی نے محبت نامہ لکھ کر بھیجا۔ خاتون نے جواب دیا: ''مزید محنت کی ضرورت ہے۔ مضمون ناقابل اشاعت ہے۔''

☆☆☆

خاتون کا معائنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نے نسخے کے بارے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''یہ سبز رنگ کی گولی صبح اٹھتے ہی ایک گلاس پانی کے ساتھ کھا لینا۔ نیلی گولی دوپہر کو کھانے کے بعد ایک گلاس پانی کے ساتھ زرد رنگ کی گولی سہ پہر کو پانی کے ساتھ اور یہ سرخ رنگ کی گولی رات کو ایک گلاس پانی کے ساتھ کھا لینا۔''

''میری بیماری کیا ہے۔'' خاتون نے پریشان ہو کر پوچھا تو ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''تمہیں زیادہ سے زیادہ پانی کی ضرورت ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دیا۔ رات کی سرد ہوا اس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔

یہ اسکیم یقیناً جاری و ساری قسم کی تھی۔ ادھر ادھر سے جو کوئی یہاں آتا تھا اسے اسی طرح پھنسایا جاتا ہوگا۔ وہ یقیناً خوش ہو رہے ہوں گے اور انہیں ہونا بھی چاہیے تھا۔ مگر اب پیٹر کے سامنے سب سے بڑا مشن یہ تھا کہ وہ ان لوگوں کا تیا پانچہ کرے۔ اسے یقین تھا کہ وہ تیس ہزار کی رقم انہی لوگوں کے پاس ہوگی۔ اس نے طے کیا کہ کچھ بھی ہو وہ یہ رقم ان سے ضرور اینٹھے گا۔

وہ دریا پر پہنچ چکا تھا وہ برج پر کچھ دور چلا پھر اس نے وہ ریوالور جو لینگی نے اسے دیا تھا دریا میں اچھال دیا۔ اس اسکیم کے بخیے ادھیڑنے کے لیے وہ دس ہزار کی رقم بہرحال حاصل کرلی تھی مگر وہ اسے رہزنی کے ذریعے نہیں چاہتا تھا۔ بے شک وہ ایک فریبی اور چکر باز آدمی تھا مگر وہ رہزن یا ڈکیت نہیں تھا۔ وہ اپنے پاس ایک سوئچ بلیڈ والا چاقو رکھتا تھا مگر یہ صرف دکھاوے کے لیے تھا۔ کبھی اس کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ خطرے میں گھر کر وہ عموماً فرار کو ترجیح دیتا تھا۔ راستہ بنانے کے لیے یہ چاقو کارآمد ثابت ہوتا تھا بس۔

ہوٹل کی سمت چلتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ وہ یہ دس ہزار کس طرح حاصل کرسکتا ہے۔ اس کے خیالات گھوم گھام کر ٹونی کی سمت پہنچ رہے تھے جو اس کی منگیتر تھی۔

☆☆

''کیا تم مجھے بالکل احمق سمجھتے ہو۔'' ٹونی نے پوچھا اس کے لہجے میں غصہ بھرا ہوا تھا۔ اس کی فون کال پر ٹونی نے بہت سرد لہجے میں بات کی تھی۔ اور پھر جذباتی ہو کر پھنکارنے لگی تھی۔ یہ باتیں پیٹر کے لیے طمانیت بخش تھیں اسے امید ہو چلی تھی کہ بک بک کے بعد ٹونی نرم ہو جائے گی۔ اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ابھی بالکل کنارہ کش نہیں ہوتی تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر پیٹر نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بدبودار کپڑوں سے نجات حاصل کی۔ اچھی طرح نہایا اور اب باتھ روب میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے ٹونی کو سمجھایا کہ وہ اسے احمق نہیں سمجھتا میرا خیال ہے شامی کے لیے تیس ہزار کی رقم کافی ہوگی۔

دوسری طرف کچھ وقفہ رہا پھر جواب آیا۔

''پیٹر میرے پاس رقم نہیں ہے۔ ویسے کیا تم واقعی شادی کے لیے سنجیدہ ہو۔''

''بالکل اب وقت آ گیا ہے۔ رقم ملتے ہی اب ہم دونوں گرجے میں ہوں گے۔''

ایک بار پھر وقفہ لیا۔ پھر جواب آیا۔ ''مگر اتنی رقم میرے پاس نہیں ہے۔''

''اچھا تو پھر یوں کرو جتنی رقم تمہارے پاس ہے لے آؤ اور یہاں ہر حالت میں دوپہر تک پہنچو کل کا لمبا دن ہمارے پاس ہوگا۔'' اس نے اسے ہوٹل کا پتا دیا اور فون نمبر بتایا۔

اسے یقین نہ تھا کہ ٹونی کے پاس دس ہزار بھی نہیں ہوں گے۔ وہ ایک کلب میں ہوسٹس تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے تنخواہ سے کہیں زیادہ ٹپس ملتی ہیں۔ ٹونی ایک بہت پرکشش عورت تھی۔ وہ اپنی بھوری آنکھوں سے پتھر کو بھی پگھلا دیتی تھی۔ اسی طرح اس کی مسکراہٹ بھی بے حد دل آویز تھی۔ وہ کلب کی سب سے خوب صورت ہوسٹس تھی کلب کا مالک اس کا مداح تھا۔

پھر تیس ہزار کے خواب دیکھتے دیکھتے اسے نیند آ گئی۔

وہ دوسری صبح کو ہشاش بشاش اٹھا موسم خوشگوار تھا اس نے گھڑی دیکھی دس بج رہے تھے اس نے غسل کے بعد جینز اور سوئٹر پہنا سوٹ ہوتا تو وہ اسے پہنتا۔ مگر اس سرخ بالوں والی حسینہ نے اس کا سوٹ بھی داب لیا تھا۔ پھر وہ بستر پر لیٹ گیا اور ٹونی کا انتظار کرنے لگا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

Downloaded from Paksociety.com

دوپہر کے وقت کمرے میں دستک ہوئی۔
پیٹر نے دروازہ کھولا۔ باہر ٹونی کھڑی تھی۔ اس نے پرشبہ نظروں سے اسے دیکھا اور بولی۔ ''کیا یہ بھی کوئی ٹرک ہے۔ تو پھر جان لو۔ اس کے بعد تعلقات ختم۔ جواب میں پیٹر نے اسے گود میں اٹھا لیا اور ناچنے لگا۔ پھر بولا۔ ''مت پوچھو تمہارے آنے سے کتنی خوشی ہوئی۔'' اس نے اس کے کاندھے سے اس کی پاکٹ کٹ اتاری۔ ''میں بالکل سیدھا ہوں۔''

پیٹر کو معلوم تھا کہ ٹونی دیر تک سونے کی عادی تھی لیکن آج وہ ضرور صبح اٹھی ہوگی تا کہ رقم کا بندوبست کر سکے۔ وہ بوسٹن بذریعہ کار آئی تھی اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس نے اس کی پاکٹ بک سے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ یہ کل سات ہزار کی رقم تھی۔ اس نے ٹونی کو گھورا۔ ''میرے پاس بس پانچ ہزار تھے۔ دو ہزار میں نے چارلی سے لیے ہیں سود پر۔'' رک کر اس نے کہا۔ ''پچھلے دنوں میں نے اس پر ایک معقول رقم گنوائی تھی۔''

''تم اپنی کیڈی نہیں آئی ہو۔'' پیٹر نے پوچھا۔ ٹونی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم مجھے کنجیاں دو۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ''مجھے ایک کام سے جانا ہے۔''

ٹونی نے انکار کر دیا۔ ''تم گاڑی بیچ دو گے۔''

وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے تھپا کر کہا۔ ''او کے مجھے معلوم ہو گیا تم کو مجھ پہ کتنا بھروسہ ہے۔ میں ٹیکسی سے گیا تو خاصی رقم خرچ ہو گی۔'' پھر وہ بہ عجلت کمرے سے نکل گیا۔ اس نے ٹونی سے حاصل کردہ رقم جیب میں ڈال لی تھی۔

جس وقت وہ بولی میں وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا مجھے لینگی اور کاربون کو کسی طرح فائل کرنا چاہیے کہ انہوں نے سے صرف سات ہزار مل سکے ہیں مگر پھر اس نے خوف سے یہ ارادہ مسترد کر دیا۔ پورے دس ہزار کہیں سے پیدا کرنے تھے۔ اس نے ایک اخبار خریدا اور ایک پروگرام کے تحت اسے کھولنے لگا۔

☆☆

گروی رکھنے والے نے ضدی لہجے میں کہا۔ ''تین کاؤنٹر پر رکھا ہوا لیدر کا بریف کیس عمدہ تھا۔'' مگر پیٹر نے کہا اس پر مالک کے نام کے حروف آر آئی درج ہیں جبکہ ان سے میرا نام نہیں بنتا۔

''تم اپنا نام بدل لو۔'' پان بیوکر نے مذاقاً کہا۔

پیٹر نے اسے گھورا۔ یہ ناٹے قد کا آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں کسی شکاری کتے کی طرح تھیں۔ پیٹر نے کہا۔

آدمی نے بریف کیس کو کاؤنٹر سے ہٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ پیٹر مڑا تو اسے آدمی کی آواز سنائی دی۔

''چلو دو سو پچاس دے دو۔''

پیٹر پلٹا۔ ''ٹھیک ہے۔'' اس نے پوچھا۔ ''تمہارے پاس اوور کوٹ بھی ہے کوئی۔''

پان بیوکر دکان میں ایک طرف گیا۔ پھر وہ کپڑوں کی ایک گٹھری سے سیاہ رنگ کا ایک اوور کوٹ لے آیا۔

''یہ سائز 46 ہے۔'' اس نے پیٹر کو تولا۔ ''تمہارے جسم پر آ جائے گا۔''

کوٹ سستی کوالٹی کا تھا۔ اس کے ٹانکے ادھڑ سکتے تھے۔

''دام۔'' اس نے پوچھا۔

''دو سو۔'' بروکر نے کہا۔

پیٹر ہنسا۔ اس نے جیب سے تین سو ڈالر نکالے۔ اور کاؤنٹر پر رکھ دیے۔ ''اس میں بریف کیس اور اوور کوٹ دیتے ہو تو ٹھیک ورنہ میں کہیں اور دیکھتا ہوں۔'' بروکر نے پیٹر کو دیکھا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پھر رقم کو اس نے کیش اٹھایا۔

بریف کیس اور اوور کوٹ کے بعد اب سوٹ کی باری تھی۔ اس سلسلے میں پیٹر نے رقم کا منہ نہیں دیکھا ایک اچھی سی دکان پر جا کر اس نے ایک گہرے رنگ کا سوٹ پسند کیا۔ یہ گیارہ سو ڈالر کا تھا۔ اس نے ٹیلر سے پوچھا۔ ''کیا تم اسے فٹ کر کے مجھے گھنٹہ بھر میں دے سکتے ہو۔''

''نہیں۔'' ٹیلر نے کہا۔ ''تین دن بعد ملے گا۔''

پیٹر نے اسے ایک پچاس کا نوٹ دکھایا۔ مگر فضول اس نے ناگواری سے پچاس کا ایک اور نوٹ نکالا۔

ایک گھنٹہ کا وقت اس نے شرٹ اور ٹائی خریدنے میں لگایا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی رقم کتنی جلدی خرچ ہو رہی تھی۔ یہ تو مٹھی سے پھسل رہی تھی وہ سوچنے لگا معلوم نہیں یہ اخراجات کسی کام بھی آئیں گے یا نہیں۔ اگر وہ ناکام ہوا تو پھر کئی تک اسے پھٹے پرانے لباس ہی میں دینا ہوتا۔

مگر سوٹ پہننے کے بعد اس کا اعتماد بحال ہو گیا۔ کوشش تو اسے کرنی ہی تھی۔ یہ ایک داؤ تھا نتیجہ بعد کی چیز تھی۔

اس کے بعد پیٹر نے بوسٹن کے عمدہ ریسٹوران دیکھنے شروع کیے۔ اس نے کئی ریسٹوران دیکھے پھر فیصلہ کیا اسے ایک ایسے کوٹ ریک کی تلاش تھی جہاں کوئی آدمی متعین نہ تھا ایک ریسٹوران اسے ایسا مل ہی گیا اس نے ایک معمولی درجہ کا اوورکوٹ ایک مہنگے اوورکوٹ کے پاس لٹکا دیا پھر ٹونی کو فون کر کے کہا کہ وہ اس ریسٹوران میں اسے فون کرے اور ڈاکٹر رابرٹ کا نام لے۔

ایک منٹ بعد ایک ویٹر اس کے پاس آیا۔ اس نے میز پر دھرے بریف کیس پر آر ٹی کے حروف دیکھ لیے تھے اس نے پوچھا کیا وہی ڈاکٹر رابرٹ ہے پھر کہا۔ آپ کی کال ہے۔ پھر اس نے اسے ایک کورڈلس تھما دیا۔

پیٹر نے ہینڈ سٹ لے لیا۔ اسے دوسری طرف ٹونی کی ہنسی سنائی دی۔ ''اوہ ڈاکٹر میرے سر میں بہت درد ہے۔ میں کیا کروں۔'' پیٹر نے کہا۔

''دو گولیاں اسپرین۔'' اس نے ہینڈ سیٹ ویٹر کو واپس کر دیا اور کسی آپریشن کی بات کرتے ہوئے وہ تیزی سے اٹھا اور کوٹ ہینگر کی طرف چلا۔ وہاں سے اس نے عمدہ والا کوٹ دبا لیا اور سیدھا باہر کی طرف لپکا۔

''ایک غلطی جو بے خیالی میں ہوئی۔'' وہ ہنسا۔

یہ کوٹ معیاری تھا۔ وہ کچھ دور پیدل آیا۔ پھر اس نے ٹیکسی پکڑی۔ اس کی منزل ڈاگ ٹریک تھی جہاں کتوں کی دوڑ ہوتی تھی۔ راستہ میں اس نے دو جگہوں پر ٹیکسی رکوائی۔ ایک کمپیوٹر کی دکان پر جہاں سے اس نے کچھ سیل بروشر حاصل کیے اور ایک سالانہ رپورٹ کی کاپی لی۔ دوسرا اسٹاپ ایک اسٹیشنری کی دکان تھی۔

وہ کلب جو ٹریک کے اندر واقع تھا یہاں بازیاں لگانے والوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ پیٹر نے ایک ملازم لڑکے کو ایک طرف بلایا اس کے ہاتھ پر بیس ڈالر کا نوٹ رکھا اور پوچھا۔ ''ذرا بتانا ان جواریوں میں سب سے احمق اور زیادہ نشے میں کون ہے۔''

لڑکے نے بیس ڈالر کے نوٹ کو دیکھا پھر اس نے ایک میز کی طرف اشارہ کر دیا۔ جس پر ایک موٹی گردن والا آدمی برا سا منہ بنائے بیٹھا تھا۔ پیٹر نے اسے تولا اور لڑکے کے انتخاب سے مطمئن ہو گیا آدمی کے کپڑے مہنگے تھے مگر وہ خوش ذوق نہیں لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں زیادہ پینے سے مندی مندی سی تھیں وہ اسے احمق بھی محسوس ہوا۔

Downloaded from Paksociety.com

پیٹر اسی آدمی کی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اس نے اپنا بریف کیس کھولا پہلے اس نے رپورٹ پڑھی پھر کاپی پر کچھ لکھنے لگا ایں نے کن انکھیوں سے دیکھا میز والا آدمی اسے تجسس سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا کوئی فارمولا لکھ رہے ہو۔" آدمی نے پوچھا۔

پیٹر ہنسا۔ "نہیں میں کل کے لیے سیل رپورٹ بنا رہا ہوں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے رابرٹ ٹکر کہتے ہیں میں اس کامینڈ کمپیوٹر میں وی پی ہوں۔"

"کمال ہے یہاں ٹریک میں بیٹھ کر تم رپورٹ بنا رہے ہو۔" آدمی نے کہا۔ "مگر اپنا تعارف نہیں کرایا۔"

"ہاں۔" پیٹر نے کہا۔ اس نے اپنا لیڈر کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔ وہ ظاہر کر رہا تھا جسے وہ بہت سے خیالات میں گھرا ہوا ہے اس نے دوستانہ مسکراہٹ سے کہا۔ "آج میرے دوست نے اس کے ضمن میں چند ٹپس دی ہیں۔"

"اچھا۔" آدمی نے بے دلی سے کہا۔

پہلی دو ریسوں میں تو پیٹر مشغول رہا۔ اس نے دیکھا مسز والہ کو دونوں ریسوں میں ناکامی ہوئی تھی وہ اپنی بیٹنگ سلپ پھاڑ رہا تھا۔ جب اس آدمی نے تیسری ریس پر بازی لگائی پیٹر نے اس سے کہا۔ "ذرا میرے نوٹ اور بریف کیس کا خیال رکھنا۔ میں ابھی آیا۔" آدمی نے ناگواری سے سرہلا دیا۔

پیٹر نے پچاس ڈالروں سے تیسری ریس کے ہر کتے پر بازی لگا دی۔ جب وہ واپس آ کر بیٹھا تو آدمی نے اسے گھورا۔ پیٹر نے کہا۔ "میرے دوست نے جو ٹپ دی تھی اس کا کہنا ہے یہ نوے فیصد کارگر ہوگی اب دیکھتے ہیں۔"

اس آدمی نے بے دلی سے سنا۔

مسکرائیے

ڈاکٹر بیڈروم میں داخل ہوا۔ نروس شوہر کمرے کے باہر ہی ٹہل رہا تھا۔

دو منٹ بعد ڈاکٹر واپس آیا اور اس نے ایک خم دار چاقو کا مطالبہ کیا۔ شوہر نے چاقو لا کر دیا' ڈاکٹر دوبارہ بیڈروم میں چلا گیا۔ شوہر بدستور بیڈروم کے باہر ٹہلتا رہا۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر باہر آیا اور ہتھوڑا اور چھینی طلب کی۔ شوہر نے ہانپتے کانپتے دونوں چیزیں لا کر دے دیں لیکن اس کے اعصاب جواب دینے لگے۔ خدا جانے اندر کیا ہو رہا ہے۔

پانچ منٹ بعد ڈاکٹر پھر واپس آیا۔

"آئی ایم سوری لیکن مجھے لوہے کی ایک سلاخ چاہیے۔"

"لوہے کی سلاخ۔" شوہر نے چیخ کر کہا۔ "ڈاکٹر اگر میری بیوی کی حالت اتنی ہی خراب ہے تو آپ اسے اسپتال کیوں نہیں لے جاتے۔ آخر اسے تکلیف کیا ہے۔"

"مجھے اب تک پتا نہیں چل سکا۔" ڈاکٹر نے دلگیر لہجے میں کہا۔

"درحقیقت میں پہلے اپنا بیگ کھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

☆☆

بڑے میاں اکثر لڑکیوں کا پیچھا کیا کرتے تھے کسی نے ان کی بیوی کی توجہ اس طرف دلائی تو وہ بے پروائی سے بولیں۔

"کیا فرق پڑتا ہے آپ نے دیکھا ہی ہوگا، کتے اکثر کاروں کے پیچھے دوڑتے ہیں اگر وہ کار کو پکڑ بھی لیں تو کونسی پریشانی کی بات ہے۔ وہ کار چلا تو نہیں سکتے نا۔"

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تیسری ریس کے اختتام پر اس آدمی نے اپنی سلپیں پھاڑ دیں۔ پیٹر نے ہوشیاری سے اپنے ٹیبر سے صرف وہ پرچی نکالی جو جیتنے والے کتے کی تھی یہ ظاہر یہی لگا تھا کہ اس کے پاس بس وہی ایک سلپ تھی حالانکہ اس میں تو سلپیں تھیں۔ اس نے پھر ایسی کوشش کی کہ میز والا دیکھ لے۔ ''کاش میں نے کوئی بڑی رقم لگائی ہوتی۔'' وہ بڑبڑایا۔ پھر اس نے آدمی سے کہا۔ ''میرے دوست کی ٹپ نے کام دکھایا ہے۔''

اس بار آدمی نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔

''اور کون سی ٹپ دی ہے اس نے۔'' اس نے پوچھا۔

اس نے چھٹی ریس کے بارے میں بھی بتایا ہے اور نویں کے بارے میں بھی۔

''اچھا۔'' آدمی تھوڑا سا جھک آیا۔'' وہ کون سا کتا ہے۔''

پیٹر چپ رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ''سوری بات دراصل یہ ہے کہ میرے دوست نے منع کیا ہے کہ میں یہ ٹپس ادھر ادھر نہ بتاؤں۔''

میز والے کا منہ بگڑ گیا۔ اس نے چوتھی ریس میں ایک بازی جیتی مگر پانچویں میں ایک بڑی رقم گنوا بیٹھا۔ چھٹی سے پہلے پیٹر نے کہا۔

''ذرا میرا بریف کیس اور کوٹ کا خیال رکھنا۔ میں ابھی آیا۔''

اس بار بھی پیٹر نے سارے کتوں پر رقم لگائی۔ ریس کے بعد اس نے وہی حرکت پھر کی کہ وہ آدمی دیکھ سکے اس سلپ کو جو جیتنے والے کتے کی تھی۔

اگلی دو ریسوں میں وہ آدمی چپکے بیٹھا رہا۔ ہر دس سیکنڈ بعد وہ پیٹر کو دیکھ رہا تھا جیسے کوئی فیصلہ کر رہا ہو آٹھویں ریس کے بعد وہ پیٹر سے مخاطب ہوا۔ ''کیوں نہ ہم دونوں شرکت کر لیں۔ تمہارے دوست نے تمہیں نویں ریس میں کون سا کتا بتایا ہے۔''

''دیکھو میں بتا چکا ہوں۔''

''میں خسارے میں ہوں۔'' آدمی نے کہا۔ ''تم کتنی رقم لگاؤ گے۔'' پیٹر نے پوچھا۔

''پانچ ہزار۔'' آدمی نے بتایا۔

''او کے۔'' پیٹر نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے ایک وعدہ توڑتا ہوں۔ تم پانچ ہزار دو۔ تین ہزار میں ملاؤں گا۔ جیتے تو نصف نصف رقم لیں گے۔'' پھر اس سے قبل وہ آدمی کچھ کہتا۔ پیٹر نے جیب سے تین ہزار نکالے۔ آدمی نے پانچ ہزار اسے دے دیے۔

پیٹر جانے کے لیے اٹھا تو اسے لگا کہ یہ آدمی بھی ساتھ جائے گا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''کوٹ اور بریف کیس کا خیال رکھنا۔'' پھر وہ عجلت سے بھاگا۔ وہ آدمی اس جملے کے بعد وہیں رک گیا۔ ظاہر ہے وہ اپنا بریف کیس اور کوٹ چھوڑے جا رہا تھا۔ ضمانت کے لیے یہ چیزیں کافی تھیں۔

پیٹر وہاں سے چلتا ہوا بیٹنگ لائن سے گزرتا ہوا ٹریک کے باہر نکل گیا۔ اس نے اپنے اخراجات گھٹا کر حساب لگایا۔ معلوم ہوا اس کے پاس دس ہزار کی رقم ہے اور سوٹ الگ سے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اپنی چکر بازی میں وہ سو فیصد کامیاب رہا تھا بوسٹن آنے کے بعد یہ اس کی پہلی کامیابی تھی۔ اس کام میں خود اعتمادی کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلسل ناکامیوں سے اس کی صلاحیت دھندلانے لگی تھی۔ مگر اب پھر سے وہ خود کو توانا محسوس کر رہا تھا۔

☆☆

اطالوی ریسٹوران پر پیڈ بالکل ٹھیک وقت پر پہنچا تھا۔ لینگی اس کا منتظر تھا اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ پیٹر سے مل کر اس نے پوچھا۔ سب کچھ منصوبے کے مطابق ہوا کہ نہیں۔ پیٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے اس کی طرف وہ لفافہ بڑھا دیا جو وہ لایا تھا۔ ''مجھے اس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کا سر پھاڑنا پڑا تھا۔'' پیٹر نے ناگواری سے کہا۔
''مگر دس ہزار کی رقم مل گئی ہے۔''
پھر وہ دونوں بیٹھ گئے۔ لینگی کا چہرہ ابھی تک درشت تھا اور پیٹر اس طرح بیٹھا تھا جیسے اسے پھانسی ہونے والی ہو پھر کسی نے اشارہ دیا کہ وہ عقبی حصے کی طرف جاؤں۔
کاربون کمرے میں اکیلا تھا۔ اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ پیٹر کا خیر مقدم کیا پیٹر اس کے سامنے جا بیٹھا تاہم اس نے اس کی طرف آنکھیں نہیں اٹھائیں۔ اس نے دل ہی دل میں الٹی گنتی شروع کر دی تھی ابھی وہ زیرو پر پہنچا تھا کہ وہ بھاری بھرکم آدمی بم کی طرح پھٹا۔
''تم نے ساری رقم گنوا دی۔'' وہ چیخا۔
''رکو بیٹے۔''
''سوری۔'' پیٹر منمنایا۔
''یہ سوری میرے کس کام کی ہے۔'' کاربون گرجا۔
لینگی نے پیٹر کا لفافہ پہلے ہی لے لیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔
''پلیز۔'' اس نے کہا۔ ''یہ پیٹر بے چارہ بہت شرمندہ ہے۔ اس نے کچھ رقم کا انتظام کیا ہے۔''
پیٹر نے نڈھال ہونے کی اداکاری کی۔ اس کے خیال میں کاربون اچھا اداکار نہ تھا۔ اس کی جگہ وہ ہوتا تو رقم کا ماتم دیر تک کرتا اور سامنے والد کو خاصا خوف زدہ کرتا اور سامنے والد کو خاصا خوف زدہ کرتا لینگی سفارش میں لگا ہوا تھا۔ ''بلاشبہ یہ کم عقل آدمی ہے۔ مگر اس نے اپنی سی کی ہے۔'' کاربون نے لفافے سے رقم نکال کر دیکھی۔ ''مگر یہ تو صرف دس ہزار ہیں۔''
''اس سے جو کچھ ہوا کیا ہے اس نے۔'' لینگی نے کہا۔ کاربون نے مٹھی میں دبے چند نوٹ پکڑتے ہوئے کہا۔
''گوہر آدمی۔ پتا ہے تجھے میں ان پیسوں

مسکرائیے

پانچ الفاظ

لڑکا لڑکی سے:
''جلدی سے میرے کان میں وہ پانچ الفاظ کہہ دو جس سے میں ہواؤں میں اڑنے لگوں۔''
لڑکی: ''تو پھر ہوا میں چھلانگ لگا دو۔''

☆☆

بے خبر

برما کے محاذ پر جہاں سپاہیوں کو مچھر دانی لگا کر سونے کا حکم تھا۔ جنرل جارج مچھر دانی لگائے بغیر سوتے تھے۔ ایک دن کسی کیپٹن نے ان کے اردلی سے پوچھا۔
''مسٹر! یہ جنرل صاحب مچھر دانی لگائے بغیر کیوں سوتے ہیں۔''
اردلی نے جواب دیا۔
''سر! شام کے وقت جنرل صاحب نشے میں اس قدر دھت ہوتے ہیں کہ انہیں مچھروں کے کاٹنے کی پرواہ نہیں ہوتی اور صبح کے وقت مچھر اس قدر نشے کی حالت میں ہوتے ہیں کہ انہیں جنرل صاحب کی پروا نہیں ہوتی۔''

☆☆

وجہ تسمیہ

ایک محترم پوپ جیل کے معائنے کے لئے گئے انہوں نے تمام قیدیوں سے ان کا جرم پوچھا۔ قیدیوں نے جرم سے انکار کیا اور کہا کہ وہ بے گناہ ہیں انہیں غلط سزا دی گئی ہے صرف ایک قیدی نے یہ اعتراف کیا کہ وہ مجرم ہے۔
پوپ نے فوراً حکام سے کہا۔ ''اسے فوراً رہا کیا جائے ورنہ اس کی محبت تمام پارساؤں کو بگاڑ دے گی۔''

☆☆

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔''

پیٹر نے اکائی رو کنے کی اداکاری کی۔ بات زیادہ آگے نہیں بڑھائی گئی۔ کاربون نے فرش سے بیس بال کا ایک بلا اٹھایا۔ ''دفع ہو جاؤ۔'' وہ چیخا۔ ''ورنہ میں تیرا بھیجا نکال دوں گا۔ اب تیری صورت نہ دیکھوں۔''

پیٹر گھبرا کر اٹھا اور باہر کی طرف بھاگا۔

ٹونی سڑک پہ ایک طرف کار روکے کھڑی تھی وہ کیڈی کے پاس پہنچا تو ہنسی سے اس کا برا حال تھا۔ سامنے کی سیٹ پر گر کر وہ چیخا۔

''خوب رہی۔''

پھر اس نے خود کو سیٹ میں دھنسا لیا کہ بار سے اسے نہ دیکھا جا سکے۔ ٹونی اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

ذرا ہی دیر بعد انہوں نے کاربون اور لینگی کو ریستوران سے نکلتے دیکھا۔ اس نے ٹونی کو کہنی مار کر بتایا۔ دونوں بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ کاربون کا جسم تنا ہوا تھا جبکہ لینگی کی ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی۔ انہوں نے رخصتی مصافحہ کیا اور چل دیے پیٹر نے ٹونی کو سر کا اشارہ دیا۔ ''تم اس موٹے کے پیچھے جاؤ۔ کام کر لو گی نا۔''

ٹونی پہلے ہی کار سے نکل رہی تھی۔ وہ پیٹر کی طرف مڑی اور بولی۔ ''فکر مت کرو۔'' اس کی آنکھیں شرارت سے دمک رہی تھیں۔

''اب ہماری ملاقات گرجے میں ہوگی۔''

ٹونی نے ایک چست سا اسکرٹ پہن رکھا تھا جو ذرا زیادہ ہی اونچا تھا۔ ٹونی کم ہشیار نہ تھی۔ پیٹر اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ پھر وہ لینگی کے تعاقب میں چل پڑا جو اس سے آگے کار میں جا رہا تھا۔

پیٹر کو اس جگہ کے راستوں کا زیادہ علم نہ تھا۔ اس لیے اس نے اپنی کار اس گلی کے پیچھے لگا لی تھی دونوں کے بیچ بس ایک گاڑی تھی۔ ادھر لینگی فتح سے سرشار سوچ بھی نہیں رہا تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہوگا۔

وہ لینگی کی سفید کار کا تعاقب کرتا ہوا مشرقی بوسٹن پر ایک حصے میں پہنچا۔ اس نے گھر کا پتا نوٹ کیا اور لوٹ پڑا۔ اسے خوشی تھی کہ لینگی کسی اپارٹمنٹ کے بجائے ایک گھر میں رہ رہا تھا۔ بہ صورت دیگر اسے خاصی دقت ہوتی۔

ابھی وہ ہوٹل روم میں پہنچا ہی تھا کہ گھنٹی بجی یہ فون ٹونی کا تھا۔ اس نے بتایا کہ کاربون کا اصلی نام کارل برونکی ہے۔ ''میں اس سے تمہاری بات کرائی۔ مگر اس وقت اس کا منہ ٹیپ سے بند ہے۔''

''خوب اور وہاں صرف تم ہو اور وہ ہے۔''

''ہاں ......'' ٹونی نے کہا۔ ''اور مجھے وہ بریف کیس مل گیا ہے اس میں تیس ہزار کی رقم ہے اس کے پاس سے مجھے پانچ ہزار اور ملے ہیں۔''

''خوب میں آ رہا ہوں۔'' اس نے کہا پھر بتا کر فون کر دیا۔ اس نے کار سنبھالی اور لینگی کے گھر کی طرف چلا۔ گھر کی لائٹیں بجھی ہوئی تھیں، کار ایک جگہ کھڑی کر کے اس کے اندر سے ڈکٹ ٹیپ کا ایک رول اٹھایا جو اس نے پہلے سے خرید رکھا تھا۔ فرنٹ ڈور کے پاس اندھیرے میں کھڑے ہو کر اس ہارن کی آوازیں سننے کی کوشش کی۔ اسے یوں لگا جیسے اندر کوئی عورت بھی بول رہی ہے۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور آواز بنا کر بولا۔ ''میں کارل ہوں۔ دروازہ کھولو۔''

جس وقت دروازہ کھلا اس نے اپنے سامنے اسی سرخ بالوں والی لڑکی کو پایا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ادھر لڑکی کی نظر جوں ہی پیٹر پر پڑی اس کا رنگ اڑ گیا۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی آواز منہ سے نکالتی پیٹر نے لپک کر اسے جکڑ لیا اور اس کا منہ اپنے ایک ہاتھ سے بند کر دیا اس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ملت سے اسے باندھا اس کے بعد وہ بندھی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی یہ مسکراہٹ کسی مکار بھنورے جیسی تھی۔ ''خوب تمہیں یہاں پا کر بہت خوشی ہوئی۔'' اس نے کہا۔

اس نے دیکھا لڑکی نے کانوں میں وہی ہیرے کے بندے پہن رکھے ہیں۔ اس نے سوچا انہیں نکال لے مگر ارادہ بدل دیا۔ تبھی اسے لینگی کی آواز سنائی دی۔ وہ پکار کر پوچھ رہا تھا کہ وہ دروازے پر اتنی دیر سے کیوں رکی ہوئی ہے۔ پیٹر نے سرخ بالوں والی کو گھسیٹ کر ایک طرف ڈال دیا۔

جس وقت لینگی کمرے میں پہنچا ایک ضرب نے سر پر پڑ کر اس کا استقبال کیا' یہ ضرب اس مختصر آدمی کے لیے بہت تھی۔ پیٹر نے ٹیپ سے اس کے ہاتھ پر باندھ دیے۔ پھر اس نے گھر کی تلاشی لی۔

اسے پانچ ہزار کی رقم مل گئی۔ اب وقت خراب کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ٹونی ادھر اس کی منتظر تھی اس نے بیڈ روم سے ایک کمبل لیا اس میں اس نے لڑکی اور لینگی کو لپیٹا پھر وہ انہیں کیڈی کے ٹرنک تک انہیں لایا۔ لینگی بے ہوش تھا مگر لڑکی ہوش میں تھی اور اسے خشم ناک نظروں سے گھور رہی تھی۔

ٹونی نے اسے جو پتا دیا تھا وہ ایک ایسے مکان کا تھا جو بڑا سا تو نہ تھا مگر اس میں ایک گیرج تھا پیٹر نے دستک دی۔ اس نے دیکھا گیرج میں ایک پرانی والوو کار کھڑی ہے۔ ٹونی نے دروازہ کھولا اور پوچھا۔ ''تم اتنی دیر سے کیوں آئے۔''

''کچھ اور کام تھے۔ کیا اس کار کی کنجی اندر ہے۔''

''پتا نہیں۔'' ٹونی نے کہا۔

پیٹر کو یہ کنجی ایک اوور کوٹ کی جیب سے مل گئی اس نے گیرج سے کار نکالی۔ سڑک پر کھڑی کر دی۔ ٹونی اس کی حرکات کو دیکھے جا رہی تھی پھر پیٹر نے کیڈی کا ٹرنک کھولا اس نے زور لگا کر لینگی کو کاندھے پر ڈال لیا۔ وہ اب ہوش میں تھا اور ٹیپ کو پیچھے سے غوں غاں کر رہا تھا۔

پھر اس نے کیڈی کو گیرج میں پہنچا دیا۔

''اب مجھے تم اپنے میزبان کے پاس لے چلو۔'' مسکرا کر اس نے ٹونی سے کہا۔

ٹونی اسے اوپری منزل کے بیڈ روم میں لے گئی وہاں کارل بستر پر پڑا ہوا تھا اس کے ہاتھ پاؤں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ بستر کے ساتھ بندھی تھیں۔ اس کے منہ میں کچھ پرانے موزے ٹھنسے ہوئے تھے۔ اس کے بدن پر بس ایک انڈر ویئر تھی۔ پیٹر نے ٹونی کی سمت سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ٹونی نے کہا۔

''یہ ہتھکڑیاں وغیرہ خود اسی کی تجویز تھی۔''

''میں سمجھ گیا یا غالباً کوئی شیڈ سٹ ہے۔''

پھر اس نے لینگی کو اسی بستر پر لا کر لٹا دیا۔ وہ دوبارہ گیرج کی طرف گیا۔ اس بار اس نے سرخ بالوں والی کو اٹھایا جب وہ اسے لے کر اوپری منزل پر پہنچا تو ٹونی نے آنکھیں مٹکائیں۔

''تمہیں تو اس وقت بہت مزہ آ رہا ہوگا۔'' اس نے کہا۔

''میں سب کچھ اٹھا سکتا ہوں۔'' اس نے کہا اور اس ٹھوکر کو بچا گیا جو ٹونی نے اس کے عقب پر لگائی تھی۔ وہ سرخ بالوں والی کو باتھ روم میں لے گیا اور اسے ٹب میں گرا دیا۔ لڑکی نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ اس کے منہ کے ٹیپ کی وجہ سے وہ گالی منہ سے باہر نہ آ سکی جو اس نے پیٹر کو دی تھی۔ پیٹر مسکرایا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ لڑکی کا رنگ سرخ ہو رہا ہے۔

ٹونی حال دے میں اس کی منتظر تھی۔

اب اس نے پیٹر سے پوچھا۔

''ابھی دکھاتا ہوں۔'' پیٹر نے کہا۔

وہ اسے دوبارہ بیڈ روم میں لے گیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پھر اس نے ایک چاقو نکالا۔ لینگی کا حال بہت پتلا ہو رہا تھا۔ چاقو دیکھ کر اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔ خود کارل بھی ڈھیلا ہو رہا تھا۔ پیٹر نے پہلے کارل بروسکی کی انڈرویئر چاک کی پھر اس نے لینگی کو بھی ننگا کر دیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو۔'' ٹونی نے کہا۔

''میں ابھی پولیس کو ادھر بھیجوں گا۔'' اس نے نفرت سے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں ان سالوں کو پولس کے سامنے ننگا ہونے کا مزہ ملے۔'' رک کر اس نے کہا۔ ''پولیس والے ان سے ضرور پوچھیں گے کہ یہ آخر بندھے ہوئے کیوں ہیں اور ننگے کیوں ہیں۔ وضاحت کرنے میں انہیں ضرور مشکل ہوگی۔ جی چاہتا ہے یہ منظر میں خود بھی دیکھتا۔'' رک کر اس نے چاقو لہرایا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ وہ سرخ بالوں والی حسینہ بھی کپڑوں کا بوجھ اٹھانے میں اس کی بھی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''نہیں۔'' ٹونی نے بڑھ کر چاقو پر ہاتھ ڈال دیا۔

''زیادہ بھکو نہیں۔'' اس نے ترشی سے کہا۔

اور خود ہی باتھ روم کی طرف چل دی۔

''یہ برتاؤ ان لوگوں کے لیے نہایت مناسب ہے۔'' پیٹر نے کہا۔ ''کہ انہیں ہر طرح کی دنیاوی متاع سے خالی کر دیا جائے۔ ہاں خوب یاد آیا۔ ذرا وہ تیس ہزار کی رقم مجھے تو دکھاؤ۔''

بریف کیس کچن میں رکھا تھا اسے دیکھ کر پیٹر کی ہتھیلیاں پسیج گئیں اس نے وہ پانچ ہزار نکالے جو اسے لینگی سے ملے تھے اس نے انہیں بریف کیس کی رقم بھی شامل کر دیا۔

''ٹونی۔ اب تم یہ بریف کیس ٹرنک میں رکھ دو۔''

اس نے کہا۔ ''اس دوران میں گھر کی پھر سے تلاشی لیتا ہوں۔''

ٹونی نے سر ہلا دیا۔ پیٹر جانتا تھا کہ ٹونی نے تلاشی لی ہوگی لیکن اسے معلوم تھا کہ متعدد جگہیں چھوٹ گئی ہوں گی۔ مثلاً فون کے نیچے کتابوں کے اندر وغیرہ۔

اسے ان جگہوں سے کوئی تین سو ڈالر اور ملے۔

ٹونی گیرج سے لوٹی تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ''بس اب چلو۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی ہمیں بہت کچھ کہنا سننا ہے۔''

وہ دونوں ساتھ ساتھ گیرج میں آئے۔ معاً پیٹر رک گیا اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ''ارے..... وہ ہیرے کے بندے تو رہ گئے۔'' اس نے کہا۔ ''میں ابھی آیا۔ تمہیں شادی کا تحفہ دوں گا۔''

ٹونی نے اسے روک دیا۔ اس نے کہا۔ ''تم یہیں ٹھہرو میں جاتی ہوں۔'' اس نے درشت لہجے میں کہا اور چل دی۔

ابھی ٹونی اوپری منزل کی سیڑھیوں پر بھی نہیں تھی کہ اس نے کیڈی اسٹارٹ کر دی اور زناٹے کے ساتھ اسے لے کر سڑک پر نکل گیا۔ اس کے پیٹ میں ایک اضطراری کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے ٹونی کے پاس محض چند سو ڈالر ہی چھوڑے تھے پھر اس نے سر جھٹک کر سوچا۔ مگر اس کے پاس ہیرے کے بندے بھی تو ہیں اگر یہ نقلی بھی ہوتے تب بھی نیویارک تک جانے کا کرایہ تو ان سے مل ہی جائے گا۔ ویسے بھی ٹونی جیسی حسینہ کے لیے اتنا سا کام کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ حسین ہی نہیں ذہین بھی تھی۔

گاڑی بھگاتے دیکھ کر ٹونی نے جس نظر سے اسے دیکھا تھا وہ بھی تشویش کن تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ گویا جانتی تھی کہ وہ کیا کرے گا لیکن اس کے پاس کوئی دوسرا معقول راستہ بھی تو نہ تھا۔ اسے بہر حال اپنی ہالی وڈ والی اسکیم پر عمل درآمد

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کرنا تھا لہذا ٹونی کو اس مدت کے لیے چھوڑنا ناگزیر تھا۔

اس نے چلتے ہوئے سوچا قسمت نے ساتھ دیا تو وہ اس رقم کو دس گنی بنا دے گا جو بریف کیس میں تھی۔ سال چھ مہینے میں جب وہ پلٹے گا تو ٹونی کو نہال کر کے اس کا سارا غصہ دور کر دے گا پھر وہ اس سے واقعی شادی کرلے گا وہ ٹونی کو تحفے میں اتنا بڑا ہیرا پیش کرے گا کہ اس سے اٹھائے نہ اٹھے گا۔

اس وقت وہ جو حرکت کر رہا تھا وہ جیسی بھی تھی اس کے منصوبے کے لیے بہت ضروری تھی وہ ایک سنہرا موقع تھا جس میں وہ ہالی وڈ والی اسکیم کو آگے بڑھا سکتا تھا۔

وہ مستقبل کے بارے میں سوچ کر مسکرانے لگا۔ اس کا رادہ تھا۔ وہ پہلے میامی جائے گا وہاں کچھ روز آرام کرے گا۔ منصوبے کو مزید درست کرے گا اپنے لیے عمدہ لباس لے گا۔ اس کیڈی سے بھی چھٹکارا لینا تھا اس کے بعد وہ ہالی وڈ کے لیے وہ پرواز کر جائے گا اور پھر۔

جیسے جیسے حسینہ اس کے منصوبے اس کے دماغ میں چلے ویسے ویسے اس نے جرم کا احساس اس کے اندر سے ختم ہوتا گیا وہ صبح تک چلتا رہا۔

ورجینیا میں صبح کے وقت وہ ایک روڈ کے ساتھ واقع ہوٹل میں رکا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ وہ تھکن محسوس کر رہا تھا۔

اس نے کار سے اتر کر ٹرنک کھولا۔ اور بری طرح چکرا گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ٹرنک میں کوئی بریف کیس نہیں تھا۔ البتہ ایک رقعہ ضرور پڑا ہوا تھا۔ اس پر ٹونی کی چیری بلاسم لپ اسٹک سے چند سطریں لکھی ہوئی تھیں۔ وہ تحریر یوں تھی۔

"بھگوڑے بہانے باز فریبی جب تک تم مجھ سے شادی نہیں کرتے تمہیں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ جاؤ مرو ٹونی۔"

اگر پیٹر اتنا تھکا ہوا نہ ہوتا تو یقیناً بڑے زور کا قہقہہ لگاتا۔

مسکرائیے

☆ ایک صاحب دفتر سے چھٹی کر کے نکلے تو ایک پرانے دوست سے ملاقات ہوگئی۔ چائے پینے وہ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے اور باتوں میں ایسے منہمک ہوئے کہ وقت گزرنے کا خیال ہی نہ رہا۔

رات دس بجے جب موصوف گھر پہنچے تو بیوی کھانے کی میز پر بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ وہ صاحب کھانے کی بات ٹالتے ہوئے بستر پر جا کر سو گئے۔

رات ساڑھے تین بجے الارم کی آواز سے پھر ان صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ جب انہوں نے گھڑی دیکھی تو غصے میں آپے سے باہر ہوگئے اور بیوی کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔

"یہ کیا حرکت تھی۔"

"ہوں۔" بیوی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"میں نے سوچا کہ دفتر سے گھر آنے میں آپ کو پانچ گھنٹے لگ سکتے ہیں تو گھر سے دفتر جانے میں بھی اتنا ہی وقت لگے گا۔ اس لیے میں نے ساڑھے تین بجے کا الارم لگا دیا کہ آپ وقت پر دفتر پہنچ جائیں۔"

☆☆

عید

ہماری عید ہے ہم ہر طرح منائیں گے
ہمارا شیخ کے فتوے پہ اعتبار نہیں
ہمارے ڈپٹی کمشنر نے چاند دیکھا ہے
ہمیں خبر ہے کہ وہ غیر ذمہ دار نہیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

شکستہ پیماں

محمد صدیق طاہر

میں فوراً ھی چلنے کے لیے تیار ھوگئی کیونکہ ایک ایک لمحہ میرے لئے ناقابل برداشت تھا۔ میں نے اور شین نے گھر والوں سے رخصتی کلمات کھے اور اپنے رھائشی قصبے کے لئے سو میل کے طویل سفر پر روانہ ھوگئے۔ راستے میں تمام وقت میں شین کے بارے میں افسردگی سے سوچتی رھی اور میرے دل و دماغ پر ایسے خیالات چھائے رھے کہ شین اوراس کے گھر والوں کے مزاج اور اخلاق میں کتنا فرق ھے لیکن ......!!

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

’’**میری** کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔‘‘ ڈسٹن مجھے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر بول اٹھا تو اس کے لہجے سے بے بسی ٹپک رہی تھی۔

’’یہ ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کے لیے تم اس قدر مایوس اور پریشان ہو رہے ہو۔‘‘ میں نے پورچ کی سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے آٹھ سالہ بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دیا۔ ’’جب ہم مل کر‘ بیٹھ کر بات کریں گے تو یقیناً کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔ میری جان! ہمیں پوری کوشش کرنا ہوگی کہ ایسا کوئی واقعہ پھر سے رونما نہ ہو۔ تم فکرمند کیوں ہو رہے ہو۔ میں تمہاری ٹیچر کے پاس دوبارہ جاسکتی ہوں۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ وہ یک لخت ہذیانی انداز سے چلایا۔ ’’آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ آپ دوبارہ اسکول نہیں جائیں گی۔‘‘

’’ہاں‘ میں نے وعدہ تو کیا تھا لیکن تم میری بات تو سنو۔‘‘

’’نہیں مام!‘‘ وہ متوحش ہو کر بولا۔ ’’یہی وجہ تو ہے جو وہ مجھے ہتک آمیز سلوک کا نشانہ بناتے ہیں۔ مجھے ماما کے بیٹے کا طعنہ دیتے ہیں کیونکہ ان کے علم میں آچکا ہے۔‘‘

ڈسٹن کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں اس کی تہ میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ مزید کیا کہنا چاہتا ہے۔ اسکول میں لڑکے اسے ہر وقت چھیڑتے رہتے تھے۔ وہ یہ دیکھ چکے تھے کہ ڈسٹن پلٹ کر ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا ہے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ کوئی جھگڑا کھڑا کرے۔ میں اسے لڑکوں سے الجھنے اور لڑنے بھڑنے سے منع کر چکی تھی۔ لوگ عموماً کسی کی صلح جوئی‘ خاموشی اور شرافت کو بزدلی پر محمول کرتے ہیں۔ جو دیتا ہے اسے کمزور سمجھ کر اور دبانے کی کوشش کرتے ہیں حتیٰ کہ سیکنڈ گریڈ کی ٹیچر نے بھی میری سخت مخالفت کی تھی۔ اس روز اس نے مجھے کچھ دیر قبل تھوڑی دیر کے لئے اسکول بلایا تھا تاکہ تبادلہ خیال کیا جاسکے۔ اس کا اصرار تھا کہ میں اپنے بچے کی تربیت کے لئے اپنی سوچ اور طریقہ کار میں تبدیلی کرلوں۔

’’مسز میگریو!‘‘ ٹیچر نے مجھے مخاطب کیا۔ ’’میں نے کبھی بچوں کے والدین کو ایسے مشورے نہیں دیئے اور نہ ہی ان سے یہ پوچھا کہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

وہ اپنے بچے کی تربیت کس طرح کرتے ہیں' نہ ہی میں نے اب تک اس بات کا ذکر کسی سے کیا ہے' لیکن میں آپ سے اتنا ضرور کہوں گی کہ ڈسٹن کو اپنا دفاع کرنے کی اجازت دیں۔ وہ میدان سے بھاگی ہوئی بکری کی طرح بن چکا ہے۔ اسکول کے اسٹاف کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ ہر جگہ اس کی حفاظت کا ذمہ اپنے سر لے۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتی اور سمجھتی ہیں کہ آخر میں وہ ایک لڑکا ہے۔''

اس میں کوئی مبالغہ نہیں تھا کہ یہ ٹیچر بے حد مخلص تھیں۔ حالانکہ وہ پانچویں عشرے کے آخری سالوں میں تھیں۔ ان کے چہرے کے نقوش سبک تھے اور وہ کسی مہربان خاتون کی طرح محسوس ہوتی تھیں۔ سال کی ابتدا میں ڈسٹن کو ان کی کلاس میں داخلہ ملا تو میں نے ان کی خوبیوں کی وجہ سے ایک عجیب سی خوشی محسوس کی تھی لیکن آج انہوں نے اسکا... لئے جو مشورہ دیا تھا اسے میں بھ... ے ... اس کی وجوہات کیا تھیں' مجھے ان کی باتوں سے علم نہ ہوسکا تھا اور پھر انہیں مزید پوچھ بتا دینا میرے لئے بھی ممکن نہ تھا۔

میں نے بڑی نرمی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''ڈسٹن میرا بیٹا ہے۔ ہر ماں اپنے بچے کی تربیت اپنے معیار کے مطابق کرتی ہے۔''

''آپ نے یہ بھی سوچنے کی زحمت کی ہے کہ آپ کے معیار بچے کے لئے کس قدر جذباتی صدمات کا سبب بن رہے ہیں۔ بعض اوقات ایسے بچے سنگ دل بن جاتے ہیں۔ وہ ہر قسم کے احساس سے عاری ہوجاتے ہیں۔ پھر وہ کسی اچھے برے کی کوئی تمیز نہیں کرتے ہیں۔ آپ اسے منع کرتی رہتی ہیں کہ وہ اپنے دفاع کے لئے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اپنی جسمانی طاقت کا استعمال بھی نہ کرے۔ کیا یہ عجیب سی بات نہیں ہے۔ دوسرے لڑکے سمجھ چکے ہیں کہ وہ نرم چارہ ہے' اس کی جب' جس وقت اور جہاں چاہے آسانی سے تضحیک کی جا سکتی ہے۔''

ان کی یہ بات میرے لئے غیر متوقع اور مزاج کے خلاف تھی۔ میں تو اس نشست سے بہت ساری توقعات وابستہ کر کے آئی تھی۔ ان سے گفتگو جاری رکھنا فضول اور بے مقصد تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو قائل نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے میں نے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنا پرس اور سوئیٹر اٹھالیا۔ میں نے کھڑے ہو کر ان کا رسمی طور پر شکریہ ادا کیا۔

''مسز رچرڈ! آج کی نشست بہت اچھی رہی۔ آپ نے جو اپنا قیمتی وقت عنایت کیا' میں اس کی تہ دل سے ممنون ہوں۔''

''مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ میں نے آپ کے خیالات اور طرز عمل سے سخت اختلاف کیا۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں آپ کے جذبے اور موقف کو سمجھ نہیں سکی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کسی مذہبی عقیدے کی وجہ سے اپنے موقف پر سختی سے قائم ہیں۔''

مسز رچرڈ کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ میں نومبر کی سخت سردی میں باہر آ گئی۔ ان باتوں کا تعلق ہرگز کسی مذہبی عقیدے سے نہیں ہے۔ اس کا پس منظر اور وجوہات کچھ اور تھیں جس کی وجہ سے میں ڈسٹن کو اپنے دفاع میں جارحانہ اقدام سے روکتی رہی تھی۔

میں کچھ دیر تک اپنی گاڑی کے اسٹیئرنگ وھیل پر دونوں ہاتھ اور سر پر رکھ کر اپنی آنکھوں موند کر سوچتی رہی اور میرے سینے میں سانسوں کا جو تلاطم تھا' اس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ زندگی کے ان لرزہ خیز واقعات کو گزرے ہوئے تین برس ہو چکے تھے۔ وہ میرے ذہن پر آج بھی اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ میرے وجود کو ہلا دیتے تھے۔ میں ان دیرینہ خدشات کو اپنے دل و دماغ کے گوشوں سے باوجود کوشش کے نکال نہ سکی تھی۔ جب بھی مجھے ان کا خیال آتا تھا' وہ ایک بھیانک خواب کی طرح لگتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ مجھے اپنے شوہر کے ہاتھوں توہین و تذلیل بھگتنی پڑی ہے۔

☆☆

جب کسی مرد سے کسی لڑکی کی ملاقات اور دوستی ہوتی ہے تو ایسی بات نہیں ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح اس کی طبیعت کا اندازہ کر سکے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ جب میں اپنے ہائی اسکول کے آخری سال میں تھی تو اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ پھر میں نے اس سے شادی کر لی۔ اس وقت بھی نجانے کیوں مجھے غیر محسوس طور پر اس کے اظہار محبت اور ضبط جذبات کے پیچھے ایک انجانا سا خوف محسوس ہوتا تھا۔ یہ میرا خیال تھا کہ اس کے یہ تیور اور سرکشی اسے روحانی کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ وہ ناولوں کے سنجیدہ اور طاقتور ہیروز جیسا معلوم ہوتا تھا لیکن اس دوران میں حقیقی زندگی میں تلخیاں گھلتی گئیں۔ بدقسمتی سے میری شادی اور رومانس کا وہ خوشگوار اور خوابناک انجام نہ ہو سکا جو ناولوں اور کہانیوں میں ہوتا ہے۔ میری محبت اور میرے دل کے سارے ارمان پامال ہو کر رہ گئے۔

شادی سے ایک سال قبل تک ہم دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔ پھر ایک روز میری شین کے گھر والوں سے ایک رسمی ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت میں یہ سمجھی تھی کہ مجھے شین کی چھپی ہوئی عصیلی طبیعت کا راز معلوم ہو گیا' جو اب تک ظاہر نہیں ہو سکا تھا۔ جب اس نے مجھے اپنے والدین سے ملانے اور تعارف کرانے کے لئے چلنے کی دعوت دی تو اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس کے والدین گھر کے دوسرے افراد کو بھی مدعو کر لیں گے۔

ہم گاڑی میں گئے تھے۔ اس کی چھوٹی سی گاڑی تھی۔ پارکنگ کی جگہ پر گاڑیاں بے ترتیبی سے آڑی ترچھی کھڑی تھیں۔ اس نے ان کے درمیان سے اپنی گاڑی کو تیز رفتاری سے نکالا تو میں خوفزدہ سی ہوگئی تھی۔ کیونکہ اس نے جس طرح زگ زیگ کیا اور ریش انداز سے گاڑی لکالی' اس سے حادثہ پیش آ سکتا تھا۔ جب میں نے اس کی ریش ڈرائیونگ کے بارے میں پوچھا تو اس کے چہرے پر ناگواری اور تندی سی آ گئی۔ پھر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ میں دل میں پچھتائی کہ میں نے یہ سوال کیوں اور کس لئے کیا۔

شین کے رشتے داروں نے ہمارا جو پرتپاک استقبال کیا تھا' اس سے شین بہت متاثر ہوا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ ایسی ہی پرجوش مسرت محسوس کرتا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اس کے ایک بہنوئی شراب نوشی میں مشغول تھے۔ اس نے بغیر کسی توقف اور جھجک کے شین کی بہن کی برائیاں بیان کرنا شروع کر دیں۔ وہ بھی خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی اپنے شوہر کو ایسے جوابات دیئے کہ فضا میں بدمزگی گھل گئی۔ میں خوفزدہ ہو کر سہم سی گئی۔ کیونکہ اس کے شوہر نے اپنی بیوی کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ خاندان کے افراد میاں بیوی کے اس جھگڑے کو خاموش تماشائی کی طرح بے حسی سے دیکھتے رہے' جیسے کوئی بات نہ ہو۔

اس گھر کی فضا اور ماحول عجیب اور وحشت ناک قسم کا لگا۔ کچھ مرد ٹیلی وژن کے قریب صوفوں پر بیٹھے فٹبال میچ دیکھتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔ جیسے وہ کھیل کے میدان میں بیٹھے ہوں' عورتیں اپنے اپنے کارخانوں کی باتوں میں محو تھیں۔ پھر انہوں نے جلد ہی اپنا موضوع بدل لیا۔ وہ قصبے میں ہونے والی چہ میگوئیوں کی کہانیاں سنانے لگیں۔ ان میں کچھ عورتیں شین کی والدہ کے بیوٹی پارلر میں ملازمت کرتی تھیں۔

بچوں نے پورے گھر کو اپنے سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ بے لگام جانوروں کی طرح نہ صرف پورے گھر میں دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے' بلکہ کھلونوں کے لئے ان میں ہاتھا پائی بھی ہو رہی تھی۔ ان کی چیخ پکار پھیپڑوں کی قوت کو ظاہر کر رہی تھی شین کی والدہ نے عقبی آنگن کے درخت سے ایک ٹہنی توڑی اور ان کے کھیل کے دوران میں ہی ان پر پل پڑیں۔ ان کی ایسی بے رحمی سے خبر لی کہ ان بچوں کے پیروں پر گہرے اولوں کے جیسے نشانات پڑ گئے۔

میرے والدین نے میری تربیت ہرگز اس انداز سے نہیں کی تھی۔ میرا خاندان خاموش طبع اور بڑے رکھ رکھاؤ کا تھا۔ بچوں پر روک تو تھی۔ کبھی کبھار ان کے کولہوں پر مار لگائی جاتی تھی' لیکن بڑی احتیاط کے ساتھ۔ یہ بچے ہوتے تھے' مجرم نہیں' جانور نہیں۔ لیکن شین کی والدہ نے جس طرح بچوں کی پٹائی کی' اس سے لگ رہا تھا کہ وہ سرکش جانوروں پر کوڑے برسا رہی ہوں۔

میں جو کچھ دیکھ اور محسوس کر رہی تھی وہ میرے دل کو دہلا دینے کے لئے کافی تھا۔ میں بے حد جذباتی ہوگئی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں کسی وقت بھی رو پڑوں گی۔ شین نے جیسے میرے بشرے سے میرے دل کی کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے میرے پاس آیا اور بولا۔ ''تم میرے گھر کے ماحول کو دیکھ اور سمجھ چکی ہو۔ چلو۔ اب واپس چلتے ہیں۔''

میں فوراً ہی چلنے کے لیے تیار ہوگئی کیونکہ ایک ایک لمحہ میرے لئے ناقابل برداشت تھا۔ میں نے اور شین نے گھر والوں سے رخصتی کلمات کہے اور اپنے رہائشی قصبے کے لئے سو میل کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

طویل سفر پر روانہ ہو گئے۔ راستے میں تمام وقت میں شین کے بارے میں افسردگی سے سوچتی رہی اور میرے دل و دماغ پر ایسے خیالات چھائے رہے کہ شین اور اس کے گھر والوں کے مزاج اور اخلاق میں کتنا فرق ہے لیکن درحقیقت وہ ایسا نہیں تھا۔ یہی میری پہلی غلط فہمی ثابت ہوئی تھی۔

شین نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کی امی نے جو سلوک بچوں سے کیا' اس میں تشدد کا عنصر تھا۔ میں تشدد سے نالاں رہتی ہوں۔ شین اس روز کے بعد سے ایک عرصے تک بڑی خوبصورتی اور احتیاط سے اپنے غصے پر قابو پانے اور چھپانے میں کامیاب رہا تھا۔ میں نے اس کے جسم پر نشانات دیکھے تو میں چونک پڑی۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ یہ زخم اسے کام کے دوران میں پیش آئے ہیں۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا کہ یہ زخم اسے کسی سے لڑائی میں لگے ہیں۔ اس نے اس بات کو چھپا کر ایک طرح سے مجھے دھوکے میں رکھا تھا۔

اپنی شادی کے ابتدائی دنوں میں' میں اس خوش فہمی میں تھی کہ شین مجھے دل و جان سے چاہتا ہے۔ اس وقت میں یہ بھول گئی تھی کہ ہر شادی شدہ جوڑے کے ابتدائی دن بڑے رنگین' خوابناک اور بے حد جذباتی محبت کے لمحات سے بھرے ہوتے ہیں لیکن یہ ایک رنگ و روغن ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ اترنے لگتا ہے۔ جب میں نے اسے سمجھنا شروع کیا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کی مردانہ نشوونما یا ماحول یا دونوں وجوہات نے مل کر اسے تندخو بنا دیا ہے۔ وہ اپنی زندگی بھر کی عادتوں کو ایک لخت بدل نہیں سکتا ہے' پھر میں نے محسوس کیا کہ اس کے گھناؤنے چہرے پر جو نقاب پڑا ہوا ہے وہ آہستہ آہستہ ہٹ رہا ہے۔ اس میں غصے کو برداشت کرنے کی قوت ہی نہیں تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی سی بات پر بھڑک اٹھتا اور اس کے ہاتھ اپنی طاقت کے مظاہرے کے لئے اٹھ جاتے۔

ایک روز پولیس شین کی تلاش میں گھر کے دروازے پر آئی تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ مجھے تشویش سی ہوئی۔ پولیس نے شین کے بارے میں پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ چونکہ کام بہت زیادہ ہے اس لئے وہ دیر سے گھر آتا ہے۔ میں دل میں حیران تھی کہ آخر شین سے ایسی کیا حرکت سرزد ہوئی ہے جس کے سبب پولیس کو گھر کے دروازے پر آنا پڑا۔

ان دو پولیس افسروں کی تجربہ کار نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ میں اپنے شوہر کے جرم سے ناواقف ہوں۔ لمحہ بھر کے لئے ان دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک افسر نے جو اپنے ساتھی سے عمر میں بڑا تھا' اس نے یہ بات مناسب سمجھی تھی کہ مجھے شین کے کردار سے آگاہ کر دیا جائے۔ اس لئے اس نے کہنا شروع کیا۔ ''مادام! وہ اپنی کمپنی کے کام پر ہرگز نہیں جا رہا ہے۔ دو ہفتے ہوئے اس کی کمپنی میں ایک جھگڑے کے دوران میں فائرنگ ہوئی۔ اس کی اس حرکت کی وجہ سے اس کی دو سابقہ ملازمتیں بھی اس کے ہاتھ سے نکلی ہیں۔ اس مرتبہ اس نے بے تحاشا شراب پی اور تعمیراتی سائٹ پر پہنچ کر کمپنی کے مالک پر طاقتور رائفل سے قاتلانہ حملہ کیا۔ اس نے جو فائر کیا وہ ایک ٹرالر کی کھڑکی سے کیا۔ شاید اس نے تم سے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔''

یہ سنتے ہی میرے پیر کپکپانے لگے۔ پھر میں ایک لمحہ بھی کھڑی نہ رہ سکی۔ میں بے جان سی ہو کر صوفے پر گر پڑی۔

جب شین گھر آیا تب میرا دل و دماغ پوری طرح قابو میں تھا۔ میں نے اس سے الجھنے اور ملامت کرنے کے بجائے اسے مشورہ دیا کہ وہ کل پہلی فرصت میں پولیس اسٹیشن جائے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

عدالت نے اس کے بیان کو تسلیم کرلیا کہ وہ ایک ماہر نشانہ باز ہے۔ اگر اس کی قتل کی نیت ہوتی تو وہ اپنے باس کو باآسانی قتل کرسکتا تھا۔ اس نے یہ حرکت اپنے باس کو خوفزدہ کرنے کے لئے کی تھی۔

''تم بہت خوش قسمت ہو۔'' ہمارے وکیل نے کہا۔ ''وہ اس واقعے کو اقدام قتل کا رنگ دے سکتے تھے۔ چونکہ یہ اس کا پہلا جارحانہ اقدام تھا اس لئے رعایت دی گئی۔ اب وہ ایسے کسی اقدام سے گریز کرے۔''

شین کو ایک آزمائشی مدت کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔ وہ مقدمے کی سماعت سے قبل چھ ہفتے تک جیل میں رہا تھا۔ عدالت نے اس پر بھاری جرمانہ بھی عائد کیا تھا۔

جب وہ سزا بھگت کر عدالت سے رہا ہوا تو میں نے اسے بڑے پیار اور محبت سے سمجھایا کہ وہ اپنے طرز عمل میں تبدیلی کرے۔ ان چھ ہفتوں میں نہ صرف اس کا مزاج اور درشت ہوگیا تھا بلکہ اس کے غصے میں بھی اضافہ ہوچکا تھا۔ یہی وہ دن تھے جب شین نے مجھ پر پہلی بار ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ کسی صورت میں کسی کونسلر سے ثالثی گفت وشنید کے لئے تیار نہ ہوا۔

مجھے اصولی طور پر شین سے کنارہ کشی اختیار کرلینا چاہیے تھا' اس لئے اس کے کردار کے تاریک پہلو ایک ایک کر کے سامنے آتے جارہے تھے لیکن میں باوجود کوشش کے ایسا نہ کرسکی۔ میرے دل میں اس کے لئے جو محبت موجود تھی اس کی جگہ نفرت نہ لے سکی۔ میں اس کے لئے افسردہ سی ہوگئی تھی۔ مجھے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ ان دنوں وہ شدید ذہنی دباؤ کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ اس کے والدین نے اسے کبھی غصے پر قابو پانے کی تربیت نہیں دی۔ میں نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کسی کونسلر سے بات کرنے کے ناتے میرا فرض بنتا ہے کہ اسے اسی بھنور سے نکالوں جس میں وہ گھر چکا ہے۔ اب اسے لوگوں سے کس طرح پیش آنا چاہئے۔

☆☆

ان ہی دنوں میں امید سے ہوگئی۔ ڈسٹن کا وجود میرے وجود میں پرورش پانے لگا۔ ان ہی دنوں مجھے گھپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن دکھائی دی۔ میرا منصوبہ کامیاب رہا۔ باپ بن جانے کی خوشی میں شین مگن ہوگیا تھا۔ اس نے نجانے کتنی ہی مرتبہ بڑے خلوص سے اپنے کئے پر ندامت ظاہر کی۔ معافی مانگی کہ اس کا ہاتھ مجھ پر اٹھا۔ پھر اس نے مجھ سے یہ بھی وعدہ کیا کہ اب وہ دوبارہ یہ حرکت نہیں کرے گا۔

لیکن خوشی کے یہ ایام بہت دنوں تک برقرار نہیں رہ سکے۔ ڈسٹن کی پیدائش کے وقت وہ ایک نئی کمپنی میں ملازمت کررہا تھا' لیکن ابتدا سے ہی اس کی اپنے باس سے بن نہ سکی۔ پھر اس کی اپنے باس سے کچھ زیادہ ہی ان بن ہوگئی تھی۔

شین نے اپنے سابقہ تجربات سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اپنی ملازمت کے دوران میں وہ کسی سے الجھا اور نہ ہی جھگڑا کیا تھا۔ بچے کی پیدائش کی وجہ سے اور بیروزگاری میں جو مالی مشکلات پیدا ہوئی تھیں' اس نے اس کا دماغ درست کردیا تھا' لہٰذا وہ حالات سے سمجھوتا کر کے چل رہا تھا لیکن کام سے لوٹنے کے بعد اس کا سارا دن کا غصہ مجھ پر اترتا تھا۔ میں اسے اپنے دل پر نہیں لیتی تھی اور نہ پروا کرتی تھی۔ اس لئے کہ اسے بڑی کشمکش اور جدوجہد کا سامنا ہے اور پھر ڈسٹن کی پیدائش کے بعد میری مصروفیات بھی بہت بڑھ چکی تھیں۔ اسے اس بات کا کوئی احساس نہیں تھا کیونکہ اس کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہ کام اس کے سامنے نہیں ہوتے تھے۔

جب ڈسٹن کی عمر اٹھارہ ماہ کی ہوئی تب

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

شین نے نجانے کسی ذراسی بات پر اسے پہلی بار مارا تھا۔ اگر ممکن ہوتا تو شاید اس مار کو میں اپنے دل پر سہہ لیتی' لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ میرے بیٹے کو میری نظروں کے سامنے مارے اور مامتا کھڑی دیکھتی رہے۔ اس نے میری غیر موجودگی میں میرے بیٹے کو بری طرح مارا پیٹا جو میرے لئے سوہان روح تھا۔ انتہائی ناقابل برداشت' جیسے ہی واپس آنے پر مجھے علم ہوا' میں نے اسی وقت اپنا اور ڈسٹن کا سامان باندھا' پھر بچے کو لے کر نکلی اور گھر چھوڑ دیا۔ یہ فیصلہ تو مجھے بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا۔ میں نے کبھی شین کے بازوؤں کی کمائی پر انحصار نہیں کیا تھا' جو اس نے ڈسٹن کو بھی مادی اشیا کی طرح اپنی ملکیت سمجھ لیا تھا۔

اس نے کسی نہ کسی طرح میری نئی رہائش گاہ کا پتا لگا لیا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی مجھ پر پل پڑا۔ اس کے تشدد سے میں نیم جان سی ہوگئی۔ پھر اس نے میرے سامنے قسم کھائی کہ اگر دوبارہ میں نے اسے چھوڑا تو وہ مجھے اور بچے کو ہلاک کر دے گا۔ پھر اس نے دھمکی دی کہ مجھے یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ دنیا میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں میں اس سے چھپ کر رہ سکوں۔ اس نے ایک پیشہ ور قاتل کی طرح مجھے یہ دھمکی بھی دی کہ وہ ڈسٹن کو میری نظروں کے سامنے سب سے پہلے قتل کرے گا۔

اس وحشی آدمی میں ایک انسان تو کیا انسانیت کی رمق بھی موجود نہیں تھی۔ میں نے بڑے دکھ' حیرت اور کرب سے سوچا کہ کیا یہ وہی شخص ہے جس سے میں نے ٹوٹ کر محبت کی تھی اور زندگی کا ہم سفر بنا لیا تھا۔ شین نے مجھے جو خوفناک قسم کی دھمکیاں دی تھیں' میں انہیں کیسے نظر انداز کر سکتی تھی۔ یہ خالی خولی دھمکیاں نہ تھیں۔ وہ ان پر عمل بھی کر سکتا تھا۔ اگر اس کی دسترس سے نکل جانے کی کوئی صورت ہوتی تو میں ایک لمحے کی دیر بھی نہ کرتی۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ میں کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتی تھی جو میری اور بچے کی موت کا باعث بنے۔ اس ظالم شخص سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔ میں نے ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں سوچا کہ ضد کرنے' اڑ جانے اور غصے میں آنے کے بجائے دور اندیشی اور معاملہ فہمی سے کام لوں۔ پھر میں نے صاف صاف الفاظ میں بے خوفی سے کہا۔ ''سنو شین! میں صرف ایک شرط پر تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔''

''کیسی شرط......'' وہ لال لال آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے غرایا۔

''تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ اب تم کبھی ڈسٹن پر ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے...... میری ممتا بچے پر کوئی ظلم ہوتا دیکھ نہیں سکتی۔''

وہ میری بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں گہری ہوگئیں' جیسے اس کے دل و دماغ میں کوئی کشمکش ہو رہی ہے۔

میں نے اسے سوچ میں ڈوبا پا کر کہا۔ ''اگر تمہیں میری یہ شرط منظور نہیں ہے تو پھر سن لو...... میں کسی قیمت پر تمہارے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ خواہ تم ہم دونوں کو قتل کر دو۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

میری شرط ناقابل قبول ہونے کی صورت میں وہ کوئی قدم اس وقت اٹھاتا تو میں ڈسٹن کی حفاظت اور دفاع کے لئے موجود تھی۔ میں اس کے پختہ وعدے کے بغیر اس لئے جانا نہیں چاہتی تھی کہ وہ پھر ظلم وستم اور وحشی پن کا سلسلہ شروع کر دیتا اور پھر میں وہاں ہر وقت بچے کی نگرانی اور حفاظت نہیں کر سکتی تھی۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے اس بات کی قوی امید تھی کہ وہ اپنے وعدے کا پاس کرے گا۔

''ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ڈسٹن پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔'' شین نے پراعتماد

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لہجے میں کہا۔

مجھے اس کی بات کا یقین آ گیا۔ میں اسی وقت ڈسٹن کو لے کر اس کے ساتھ گھر چلی آئی۔ میں بہت سرشار تھی۔ اس لئے نہیں کہ شین کی محبت اور قربت پھر سے حاصل ہوگئی ہے بلکہ اس لئے کہ میری معاملہ فہمی کارگر رہی۔ شین نے پھر کبھی ڈسٹن پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس وقت ڈسٹن تین برس کا ہو چکا تھا۔ میں نے دوبارہ اس گھر میں آنے کے بعد کچھ ایسی تدبیریں سوچ لی تھیں کہ میں اور ڈسٹن اس کے غصے سے محفوظ رہیں۔ شین جب ڈسٹن کی کسی حرکت پر زبانی طور پر اپنا غصہ اس پر اتارتا تو میں کسی نہ کسی طرح اس کا رخ اپنی طرف موڑ لیتی تھی۔ میں اس کوشش میں کامیاب رہی تھی۔

ایک روز اچانک کمپنی میں شین کسی بات پر اپنے باس پر غصے کی حالت میں بھڑک اٹھا۔ اس کے دل میں مہینوں سے جو نفرت باس کے خلاف آتش فشاں کی طرح اندر ہی اندر پک رہی تھی' یک لخت پھٹ پڑی۔ شین نے ایک رنچ سے باس کا سر پھاڑ دیا۔ وہ بروقت طبی امداد ملنے کے سبب موت کے منہ میں جانے سے بچ گیا۔

کمپنی کے فورمین نے شین کے خلاف قتل عمد کا مقدمہ دائر کر دیا۔ شین کو ایک سال قید کی سزا ہوئی' جس میں سے چھ ماہ قید بامشقت بھی تھی۔ اپنی رہائی سے تین دن پہلے وہ جیل میں ایک پیشہ ور قاتل سے لڑ پڑا جس کے نتیجے میں اپنی جان گنوا بیٹھا۔

شین کے والدین آخری رسومات میں شرکت کے لئے آئے تو انہوں نے آہ و بکا کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ آخری رسومات کا انتظام کرنے والے ڈائریکٹر سے جاہلوں کی طرح لڑنے جھگڑنے لگے۔ انہوں نے شور مچا مچا کر مجھے خوب کوسا اور اس کے سامنے شین کی موت کا ذمہ دار بھی ٹھہرایا۔ اس المناک موقع پر اس کے والدین کی باتوں اور رویے سے میں دل برداشتہ ہوگئی۔ میں نے انتظام کرنے والے ڈائریکٹر سے کہا۔ ''اب میری کوئی ذمہ داری اور فرض نہیں رہا ہے۔ میری بلا سے یہ جو کرتے اور بکتے ہیں' انہیں بکنے دو۔'' مجھے اس قدر ذہنی کوفت اور اذیت ہوئی تھی کہ میں دعائیہ عبادت میں شریک بھی نہیں ہوئی اور گھر لوٹ آئی۔

میں نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اپنی اور شین کی ہر چیز فروخت کر دی۔ میں کہیں اور رہائش اختیار کرنے کے لئے اطراف کا جائزہ لینے لگی۔ میں نے اپنے پرانے محلے میں کسی کو بھی ہوا تک لگنے نہیں دی کہ میں کسی اور جگہ رہائش کے لئے کوشاں ہوں۔ ڈسٹن کو اپنے باپ کے حوالے سے سوشل سیکورٹی کے مالی فوائد حاصل تھے۔ شین نے ایک چھوٹی بیمہ پالیسی لے رکھی تھی جو اس کے قتل کے باعث دگنی اور مفید ثابت ہوئی۔ مجھے ایک فرم میں فائل کلرک کی جاب مل گئی۔ ڈسٹن کے اسکول کے اوقات میں' میں جز وقتی ملازمت کرنے لگی۔ اس طرح کچھ مدت تک میں کفایت شعاری سے کام چلانے لگی' جس کی وجہ سے زندگی سکون اور آرام سے بسر ہونے لگی۔ سادگی اور کفایت شعاری بھی ایک ہنر ہے۔ میرے نزدیک فضول خرچی کی گنجائش بھی نہ تھی۔ میں ایک حقیقت پسند عورت تھی۔ میں خواب دیکھنے والوں میں سے نہ تھی۔

میں نے ایک دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ اپنی اولاد کو اپنی فکر' اپنے انداز سے پروان چڑھاؤں گی۔ اس کی پرورش اور تربیت کے معاملے میں اس کے ددھیال کا سایہ بھی اس پر پڑنے نہیں دوں گی۔ اسے مہذب اور شائستہ اطوار کا انسان بناؤں گی۔ اسے یہ درس دوں گی کہ کسی بات کو منوانے کے لئے لڑائی جھگڑے اور طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے' اپنی بات معقول دلائل سے بھی منوائی جاسکتی ہے۔ میں نے اپنی ذات

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سے بھی یہ عہد کیا تھا کہ اسے شین ہرگز بننے نہیں دوں گی۔ لہٰذا مجھے سیکنڈ ٹیچر تو کیا' دنیا کی کوئی ہستی اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔

اس وقت میرا نازک اور اولین مسئلہ یہ تھا کہ اسکول میں ڈسٹن کے ساتھ ہونے والے جارحانہ واقعات پر کس طرح قابو پایا جاسکتا ہے۔ بہت سوچ بچار کرنے کے باوجود میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ صرف گزشتہ ماہ کے تین واقعات میرے لئے بہت پریشان کن تھے۔ میں نے ڈسٹن کو لنچ کرنے کے لئے جو رقم دی تھی' وہ چوری کرلی گئی۔ اس کا ہوم ورک ضائع کردیا گیا' ایک روز ایک لڑکے نے اس کے منہ پر مکا جڑدیا تو اس کے ہونٹ پھٹ گئے۔

میرے پڑوس میں ایک خاندان آباد تھا۔ ان کے ایک بیٹے کا نام آرم تھا۔ وہ ڈسٹن کا ہم عمر تھا۔ دونوں بچے فرسٹ گریڈ کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ آرم ایک اچھا لڑکا تھا چونکہ وہ دونوں ہم جماعت بھی تھے' اس لئے ان میں کافی دوستی تھی لیکن ڈسٹن اس کی دوستی سے محروم ہوگیا۔ وہ لوگ گرمیوں کی چھٹیوں میں کہیں اور منتقل ہوگئے۔ یوں آرم نے کسی اور قریبی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ ڈسٹن نے آرم کی جدائی سے صدمہ محسوس کیا۔ میں اس کی دلجوئی کے لئے اسے خود اسکول لے جاکر چھوڑتی رہی۔ یہ سلسلہ ابتدائی دنوں کے لئے تھا۔ دوسرے بچوں نے اسے مذاق کا نشانہ بنانا شروع کردیا۔

یہیں سے اس کے المیے کا آغاز ہوا تھا۔ ڈسٹن کی مصلحت آمیز خاموشی نے انہیں اور دلیر بنادیا۔ پھر وہ لڑکے اکٹھے ہوکر اس پر اس طرح جھپٹتے تھے جیسے وہ درندہ صفت پر خون کے پیاسے ہوں۔ اس کی جان نکال کر ہی دم لیں گے۔ ڈسٹن کا جواب نہ دینا انہیں بری طرح کھل جاتا تھا۔ اس طرح کوئی تین ماہ بیت گئے میں اسے مسلسل برے بھلے کی تمیز کے بارے میں لیکچر دیتی رہی۔ جس کسی نے بھی مقابلے کا مشورہ دیا' اسے میں نے قبول نہیں کیا۔ میں نے اپنے بیٹے کو مشکل حالات میں جھگڑنے کا خطرہ مول لینے سے روکا تھا۔ اسے میری طرف سے اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے ہم جماعتوں پر طاقت آزمائی کرے۔

میں انہی خیالات کے بھنور میں اپنے گھر پہنچی۔ ٹیچر سے جو گفتگو ہوئی تھی اس وجہ سے میں تھک بھی گئی تھی۔ اس لئے میں آرام کرنے لگی۔ جس وقت ڈسٹن گھر آیا تب میں نے فرش پر قدم رکھے۔ میں نے اسے دیکھا تو میرے دل پر چوٹ لگی۔ اس کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ ہورہا تھا کہ آج بھی اس کے ساتھ لڑکوں نے بدترین سلوک کیا ہے۔ جب میں نے اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی دیکھیں تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ وہ پورچ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے پاس جاکر جذباتی انداز سے اسے اپنی آغوش میں بھینچا تو وہ کسمسا کر رہ گیا۔ پھر میں نے اس کی ہمت بندھائی۔ ''گھبراتے نہیں ہیں بیٹے! میں جلد ہی اس مسئلے کا حل نکال لوں گی۔ پچھلے سال تو تمہیں کبھی ایسی پریشانی کا سامنا کرنا نہیں پڑا تھا۔''

ڈسٹن نے میری بات سن کر ایسی نظر سے دیکھا جس میں بیزاری اور بے اعتنائی بھری ہوئی تھی۔ ایسی نظر کسی بچے کی نہیں بلکہ میری عمر کے کسی انسان کی ہوسکتی تھی۔ اپنی اس کیفیت میں وہ آٹھ برس کا بچہ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر گھر میں چلا گیا تو اس سرد ملگجی سہ پہر میں' میں نے اپنے آپ کو بے حد تنہا محسوس کیا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ایک روز آرم کی امی نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ ''ہیلری! مجھے بڑی خوشی ہے کہ آرم اور ڈسٹن آپس میں گہرے دوست ہیں۔ وہ لڑائی میں ڈسٹن کا ساتھ دیتا ہے لیکن آرم ہمیشہ تو اس کے ساتھ نہیں رہے گا۔ ڈسٹن کو اپنے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بازوؤں پر بھروسا کرنا ہوگا۔ آدمی کے بازو ہی اس کے بہترین اور طاقتور ساتھی ہوتے ہیں۔''

ڈسٹن کا اب اسکول میں آرم جیسا دوست نہیں رہا تھا جس کی وجہ سے وہ دل برداشتہ ہوگیا تھا۔ میرے ملاقاتی بھی میرے خیالات سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔

میرے پڑوس کے مکان پر جو برائے فروخت کا بورڈ لگا ہوا تھا' آج اسے وہاں سے ہٹالیا گیا تھا۔ میں نے سوچا' آخر کار یہ مکان فروخت ہوگیا۔ اب ہمیں ایک پڑوس مل جائے گا جو ہمارے لئے بہتر ہوگا۔ ممکن ہے یہاں آنے والے خاندان میں بچے ہوں۔ ڈسٹن کو ایک ایسا دوست مل جائے جو اس کے لئے کسی تحقیر یا خوف کا سبب نہ بنے۔

دوسرے دن ڈسٹن نے بتایا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اسے اپنے حلق میں تکلیف محسوس ہورہی ہے۔ جب میں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کی تو وہ گھبرا سا گیا۔ پھر اس نے اعتراف کیا کہ اس نے جھوٹ بولا۔ پھر میں اسے اپنے ساتھ گھر سے لے کر نکلی۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس کے لئے دعا کرتی رہی کہ کسی طرح اس کی پریشانیاں دور ہوجائیں۔ وہ ایک اچھے طالب علم کی طرح اسکول میں پڑھتا رہے۔ غیر حاضر نہ ہو۔

ہفتے عشرے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میری دعا کو قبولیت بخشی گئی ہے۔ اسکول میں اس کی الجھنیں ختم ہوگئی ہیں۔ اب ڈسٹن اسکول سے واپس آتا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی۔ اس کا لباس اور کتابیں بھی صاف ستھری دکھائی دیتیں۔ پہلے کی طرح اس کی یونیفارم اور بستہ میلا کچیلا نہیں ہوتا تھا۔ پھر میں نے کہا۔ ''میں نہیں کہتی تھی دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے بھی اسے جواب دینے پر مجبور نہیں کیا۔

اس روز جب میں اپنی گاڑی میں اپنے دفتر کے لئے روانہ ہونے والی تھی' تب میں نے پڑوس کے دروازے پر ایک وین کو رکتے ہوئے دیکھا۔ ان دنوں ہمارے کام میں ایک پیچیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ سپروائزر نے بیماری کی وجہ سے رخصت لے لی تھی۔ ہماری فرم چھوٹی سی تھی جو چھت کی دیکھ بھال اور تزئین و آرائش کا کام انجام دیتی تھی۔ دفتری کام ہم دونوں نے سنبھال رکھا تھا۔ اس کی غیر حاضری کی وجہ سے دفتر میں مجھے شام پانچ بجے تک ڈیوٹی دینی تھی۔ یہ ایک ایسی مجبوری تھی جس سے چھٹکارا پانا ممکن نہ تھا۔

اس روز پہلی بار مجھے ایک مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ڈسٹن سے پہلے گھر پہنچ جاتی تھی۔ میں اس متوقع صورت حال کے بارے میں ڈسٹن کو پہلے بتا چکی تھی۔ اس کے پاس اپنی چابی موجود تھی۔ وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ میری غیر موجودگی میں اسے کیا کرنا ہے۔ میرے یہ معلوم کرلینے کے بعد کہ وہ گھر میں موجود ہے اور آرام سے ہے' اسے یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ میں کہاں ہوں گی' تاکہ اسے بھی علم رہے اور وہ مجھ سے ضرورت کے وقت رابطہ قائم کرسکے۔ میں نے ایک بار اسے تین بجے ٹیلی فون کیا' پھر پندرہ منٹ کے بعد رنگ کیا لیکن اس کا کوئی جواب نہیں ملا تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ اس دوران میں فرم کے ایک گاہک نے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ ہمارا عملہ اس کی چھت ادھوری چھوڑ کر چلا گیا ہے اور پھر اس علاقے میں بارش کی پیش گوئی بھی کی گئی تھی۔ میں نے مسز نیوویل کی جگہ اس مسئلے کو فوری طور پر نمٹایا۔ پھر اس کے بعد گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ پانچویں گھنٹی تک میں انتظار کرتی رہی۔ میں ریسیور رکھ کر ڈسٹن کی تلاش میں نکلنے والی تھی کہ اس نے ریسیور اٹھا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لیا۔

''بیٹے! تم کہاں تھے......'' میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے اس سے نرمی سے دریافت کیا۔

اس نے بے حد سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''باہر تھا۔''

ڈسٹن گھر کے عقبی حصے میں کھیلنا پسند کرتا تھا۔ میں اس سے کئی بار کہہ چکی تھی کہ صحن میں کھیل کے دوران میں کوئی مشکوک آدمی تمہاری طرف بڑھے تو تمہیں فوراً گھر کے اندر آ کر دروازہ بند کر لینا چاہئے۔ میری عدم موجودگی کے باعث اس نے عقبی حصے میں کھیلنے کے بجائے باہر رہنے پر ترجیح دی۔ اس کی یہ بات اور فیصلہ مجھے پسند آیا تھا کہ وہ محلے کے لوگوں کی نظروں میں رہے۔ اس کے باوجود نجانے میرے دل میں ایک کھٹکا سا ہوا کہ کوئی گڑبڑ والی بات یقیناً ہوئی ہے۔ میں نے پوچھا۔ ''آج تمہارا وقت اسکول میں کیسے گزرا......''

میرے اس استفسار پر جیسے وہ بری طرح چونکا تھا۔ چند ثانیوں کے توقف کے بعد بولا۔ ''ٹھیک ہی گزرا ہے۔''

دوسرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی تو میں نے ریسیور رکھنے سے پہلے کہا۔ ''تم فکر نہ کرنا۔ میں ساڑھے پانچ بجے سے پہلے گھر پہنچ جاؤں گی۔''

رات کو میں نے ڈسٹن کے رویے میں نمایاں فرق محسوس کیا۔ وہ مجھ سے کترا رہا تھا اور بات کرنے سے بھی گریزاں تھا۔ وہ میرے ہر سوال کے جواب میں بڑی سرد مہری سے ایک ہی بات کہتا رہا کہ سب ٹھیک ہے۔ رات کے کھانے میں میرے ساتھ شریک بھی نہیں ہوا۔ اس نے یہ عذر پیش کیا کہ اسے اسکول کا ہوم ورک کرنا ہے وہ کمرے میں ہی رہے گا۔ میں تنہا بیٹھی اس اچانک تبدیلی کے بارے میں سوچنے لگی۔

میں نے ڈنر کے لئے ڈیپ فریزر میں محفوظ کیا ہوا گوشت تیار کیا تھا۔ سارا دن اسے تیار کرنے میں بڑی کوفت اور جھک ہوئی تھی۔ اس وقت وہ بہت مزے دار لگ رہا تھا۔ میں نے فریج میں سے تازہ سبزیاں بھی نکال لیں تاکہ اس کے ساتھ سلاد بنا کر کھانے کا لطف دوبالا کر لوں۔ میں نے اپنے آپ کو دلاسا دیا کہ میں بلاوجہ پریشان ہو رہی ہوں۔ آج کا دن میرے لئے اس لئے بھی اطمینان کا باعث ہے کہ میں نے مسز نیوویل کی ذمہ داری خوش اسلوبی سے نمٹائی۔ ادھر ڈسٹن نے بھی میری غیر موجودگی میں گھر پر رہتے ہوئے جو کچھ کیا اس میں ایسی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ایک انجانی مگر معمولی سی پریشانی میرے سینے میں خلش بن گئی تھی۔ نجانے کیوں میرے دل کو اطمینان نہیں ہو پا رہا تھا۔

جیسے ہی میں نے سلاد تیار کر کے اسے ایک پلیٹ میں سجایا' گھر کے عقبی دروازے پر کسی نے بڑی شائستگی سے دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو نظروں کے سامنے ایک اجنبی موجود تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پلاسٹک کی بڑی بالٹی اور دوسرے ہاتھ میں مٹی کی صراحی تھی۔ وہ کافی خوبرو تھا۔ قد بھی اچھا تھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو زحمت دی۔'' پھر اس نے اپنا تعارف کرایا۔ ''میں آپ کا نیا پڑوسی برنیٹ ڈیڈرک ہوں۔ جب یوٹیلٹی کمپنی پانی فراہم کر رہی تھی تو لانڈری روم میں ایک پائپ ٹوٹ گیا۔ میں آج رات اسے کسی بھی طرح ٹھیک نہیں کر سکتا ہوں۔ اس لئے میں نے اسے بند کر دیا ہے۔ کیا آپ مجھے اپنے گھر سے تھوڑا سا پانی بھرنے کی اجازت دیں گی۔''

میں نے اس کے چہرے پر دن بھر کی تھکن دیکھی۔ مجھے اس بات کا تجربہ تھا کہ سارے دن کی مشقت سے ہلنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ خواہ ماحول اور حالات کیسے ہی خوشگوار اور سازگار

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کیوں نہ ہوں۔

میں نے ایک پڑوسی ہونے کے ناتے اپنا فرض ادا کیا اور اس اجنبی کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ پھر میں نے ازراہ مذاق کہا۔ ''میں آپ کو پانی دے دوں گی لیکن آپ اسے واپس کرنے کا تکلف نہ کریں۔''

وہ میرے اس مذاق سے محظوظ ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر میں نے بڑے شوخ لہجے میں کہا۔ ''آپ ایسا کیوں نہیں کرتے ہیں کہ ہمارے باغیچے کا پائپ لان سے گھسیٹ کر اپنے گھر لے جائیں اور اپنی ضرورت پوری ہونے تک اسے اپنے پاس رکھیں۔ پائپ کا سرا مضبوطی سے بند کیا جاسکتا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ آج زات درجہ حرارت نقطہ انجماد سے نیچے نہیں گرے گا۔ لہٰذا پائپ میں پانی جم جانے کا خطرہ نہیں ہوگا۔''

اس شخص نے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھا۔ اس کی نظریں کہہ رہی تھیں کہ اس نے میری شوخی اور خوش دلی کا غلط مفہوم نہیں لیا ہے۔ اس نے بڑے پرخلوص لہجے میں کہا۔ ''محترمہ! آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔''

اس کے بعد ہم دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے میں پیوست ہوگئیں۔ اس تصادم نے ہمیں ایک لمحے کے لئے محویت کے عالم میں دھکیل دیا تھا۔ میرے لب نیم وا تھے۔ دوسرے لمحے اس پرکیف صورت حال کا احساس ہوا تو ہم دونوں بیک وقت بے ساختہ ہنس دیئے۔

''میرا نام ہیلری میگریو ہے۔ میں اور میرا بیٹا ڈنر لینے والے تھے۔ کیا آپ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہونا پسند کریں گے۔'' میں نے تعارف کے ساتھ ساتھ اجنبی کو کھانے پر مدعو کرلیا تھا۔ میں نے ایسا کیوں کیا۔ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتی تھی۔

اس نے میز پر سجے ہوئے کھانے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اس میں سے اشتہا انگیز خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ میں نے اسے تھوڑی دیر پہلے ہی بڑی محنت اور توجہ سے تیار کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کی چمک کوندی۔ وہ بڑی بے تکلفی سے بول اٹھا۔ ''میں آپ کو بتا نہیں سکتا ہوں کہ اس وقت مجھے کتنے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد شاید ناقابل برداشت ہوجائے گی۔''

جب میرا نیا پڑوسی واش روم میں گیا تو میں نے ڈسٹن کو بھی اس کے کمرے سے بلالیا۔ میں نے جب ان کا آپس میں تعارف کرایا تو ان دونوں نے رسمی جملے بھی ادا نہیں کیے۔ وہ دونوں جیسے کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ سلاد اور کھانے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی تھی۔

ان کے درمیان جو خاموشی کی دیوار کھڑی ہوگئی تھی اسے گرانے کے لئے میں نے پوچھا۔ ''ڈیڈرک! آپ کی مصروفیات کیا ہیں۔''

فوراً ہی اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''پلیز! مجھے صرف برنیٹ کہئے کیونکہ آپ میری پڑوسن ہیں اس لئے مجھے اچھا لگے گا...... میں آپ کو ہیلری پکاروں گا۔ کیا یہ زیادہ مناسب نہیں ہوگا۔''

میں ایک عورت ہونے کے ناطے اس کی بات کی تہ میں پہنچ گئی تھی۔ ایک عورت مرد کو جتنا سمجھ لیتی ہے' ایک مرد اتنا سمجھ نہیں سکتا ہے۔ اسکول کے زمانے کے بعد میں نے اپنی زندگی میں ایک فطری شرم و حیا کو اپنے اوپر طاری ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ یقیناً وہ ایک مدہوش کن شخصیت کا مالک تھا۔ لڑکیاں نوجوانی کے آغاز سے ایسے ہی مردوں کے خواب دیکھنے لگتی تھی۔ وہ دنیا کی ہر عورت کا آئیڈیل تھا۔ اس کے نقوش میں ایسا تیکھا پن اور ایسی دل میں اتر جانے والی جاذبیت تھی کہ اگر مجھے اپنی رفاقت کے لئے کسی مرد کی ضرورت محسوس ہوتی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تو مجھے یہ کہنے میں کوئی عار اور جھجک نہیں کہ وہ سرفہرست ہوتا لیکن شین کی موت کے بعد اب تک میں نے کسی مرد کو اس طرح قریب آنے کی اجازت نہیں دی تھی اور میں نے دوسری شادی نہ کرنے کا جو عہد کیا ہوا تھا' اس پر مضبوطی سے قائم تھی۔

''میں سوشل سروس کا ایک ورکر ہوں۔'' اس نے جواب دے کر مجھ سے دریافت کیا۔ ''اور تم......''

میں نے اسے چھتوں کی تعمیر و دیکھ بھال کرنے والی فرم میں اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں مختصر طور پر بتایا تو اس نے مجھ پر ایسے سوالات کی بوچھاڑ کردی جس نے مجھے اپنی نظروں میں بہت اہم بنادیا۔ درحقیقت ایسی بات نہ تھی۔ وہ میرے جوابات سے بہت مطمئن ہوا تھا۔

ڈسٹن لور برنیٹ نے ایک دوسرے سے مصافحہ کرنے کے بعد اب تک کوئی بات چیت نہیں کی تھی لیکن جب ڈسٹن نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر تہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور بغیر کسی جھجک کے برنیٹ کی طرف بڑھایا تو میں ششدرہ گئی۔ میں یہ سمجھی کہ ڈسٹن کی ڈرائنگ ہوگی۔ اس کا آرٹ کی طرف رجحان تھا۔ اس کا جوہر بچپن سے ہی ظاہر ہورہا تھا۔ آرٹ کے مضمون میں وہ کلاس میں اول رہتا تھا۔ میری حیرانی بجا تھی کیونکہ اس نے مجھے یکسر نظرانداز کیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اسے میں نے آج ہی بنایا ہے۔'' پھر وہ بے تکلفی سے بولا۔ ''اگر آپ چاہیں تو اسے رکھ سکتے ہیں۔

اپنی بات ختم کرنے کے بعد اس نے معذرت کرتے ہوئے ہم سے اجازت طلب کی۔ میری اجازت پاتے ہی وہ اپنی خواب گاہ کی طرف چلاگیا۔

''بہت شاندار' بہت خوب' لاجواب۔''

برنیٹ نے تصویر کو دیکھتے ہوئے خراج پیش کیا ''آپ کا بیٹا بہت ہونہار ہے۔''

اس کی زبان سے اپنے بیٹے کی تعریف سن کر میں خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ ''مجھے اس کا اندازہ ہے۔'' میں نے بے ساختہ اعتراف کیا اور کہا۔ ''میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ......'' میں اس قدر جذباتی ہوگئی تھی کہ میری جذبات سے مغلوب آواز میرے سینے میں پھڑپھڑا کے رہ گئی۔

میری اور اس کی ملاقات کو ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں ایک نووارد کے سامنے اپنے دکھ درد کا اظہار کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''تم اپنی کسی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے ایک دم سے رک گئی ہو۔'' اس نے مجھے یاد دلایا۔ اس نے بڑی احتیاط سے تصویر میز پر اپنے سامنے رکھ لی۔

میں نے اس کو جواب دینے سے پہلے ایک نظر تصویر پر ڈالی۔ مجھے اپنے جذبات پر قابو پانے کی مہلت مل گئی تھی لیکن ایک اور تلخ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی۔ یہ تصویر ڈسٹن کی پہلی بنائی ہوئی تصویروں سے بالکل ہی مختلف تھی۔ پہلے وہ خوبصورت مناظر بناتا رہا تھا' اس نے جھیلوں' پہاڑوں اور جانوروں کی دلکش تصویریں بنالی تھیں لیکن یہ تو ان سے مختلف تصویر تھی۔ اس نے ایک قید خانے کا منظر بنایا تھا۔ اس کی تمام جزئیات یہی بتارہی تھیں۔ ایک ہال کے پس منظر میں جو منظر تھا وہ لوہے کی سلاخوں کا تھا۔ ان سلاخوں سے باہر ہاتھ ایسے نکلے ہوئے تھے جن پر خانہ بدوشوں کی طرح رنگین پکے نقش تھے۔ وہ سخت کھردرے ہاتھ سلاخوں سے اس طرح نکلے ہوئے دکھائے گئے تھے' لگتا تھا کہ وہ کسی ایسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے بے تاب ہیں جو وہاں سرے سے ہی نہیں۔

میں بھونچکی ہوکر سوچتی رہ گئی کہ اس نے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس چھوٹی سی عمر میں اس دنیا میں کیا دیکھ لیا ہوگا' جس کے ننھے سے ذہن کو دل گداز موضوع نے متاثر کیا۔ پھر اس نے تصور کے کئی مرحلوں سے گزرتے ہوئے اپنے کرب کا اظہار تصویر سے لیا۔ جبکہ اس کے اور میرے درمیان کبھی اس کے والد کی گرفتاری اور ہلاکت کے موضوع پر بات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے بھولے سے بھی کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ اس قدر کمسن تھا کہ ان معاملات کو اس کے علم میں نہ لانا ہی بہتر تھا۔ میں اس بات کو بھی خوب سمجھتی تھی کہ اگر یہاں سکونت اختیار کرنے سے پہلے اس کے کانوں میں ایسی کوئی بات بالغرض پڑی بھی تھی تو اس کمسنی میں اور بھی کم عمری کی بات اس کے ذہن کے گوشوں میں کیسے رہ گئی ہوگی۔

دل چہروں کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر میرے دل پر جو چوٹ لگی' برنیٹ نے میرے چہرے سے بھانپ لیا۔ ''یہ تمہارے بیٹے کا خالص نفسیاتی کیس ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ ''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں سوشل سروسز کا ورکر ہوں لیکن بعض دوسری باتوں کا ذکر کھانے کی وجہ سے نہیں ہوسکا کہ میں جیل کا کونسلر اور پیرول آفیسر بھی ہوں لیکن تمہیں کسی تردد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں پیرول پر رہا ہونے والوں سے اپنے گھر پر کبھی ملاقات نہیں کرتا ہوں۔''

ایک ہی شام کی پہلی ملاقات کے دوران میں اتنے معاملات زیر بحث رہے جو بہت تھا۔ اب سے پانچ گھنٹے پہلے میں اس اجنبی سے ملی تھی۔ میں نے اس سے کچھ دیر اور باتیں بھی کی تھیں۔ برنیٹ گھر جاتے ہوئے ڈسٹن کی تصویر بھی ساتھ لیتا گیا۔ ڈسٹن چونکہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گیا تھا اس لئے میں اس کا کھانا لے کر اس کے کمرے میں چلی گئی۔ اس دوران میں' میں نے بغیر کسی تمہید کے وہ وصوع چھیڑا۔ ''تم نے یہ تصویر کیوں بنائی تھی! اور پھر تم نے یہ تصویر کیوں دی......''

اس نے بڑے سرد لہجے میں دوٹوک جواب دیا۔ ''مجھے کچھ نہیں معلوم۔''

میں اسے کتنی ہی دیر ٹٹولتی رہی لیکن اس نے مجھے مزید کچھ نہیں بتایا۔ مجھے اس روز یہ سمجھ لینا چاہئے تھا' یہ محض اتفاقیہ امر نہیں ہے کہ ڈسٹن نے ایسی ڈرائنگ کیوں بنائی اور مجھے دکھائے بغیر ایک نووارد کو دے دی۔ اس دن کے بعد ہفتے بھر مجھے کسی بات کا شبہ تک نہ ہوا لیکن جب ایک روز ڈسٹن کے میٹریس کے نیچے سے ایک اور تصویر ملی تو میرا دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا۔

☆☆

اب اس میں کسی شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ اس تصویر میں ڈسٹن نے اپنے وحشی باپ کی رعونت کو کاغذ پر منتقل کیا تھا۔ وہ اس تصویر میں شین کے روپ میں ایک لحیم شحیم آدمی انتہائی غصے کی حالت میں ہاتھ اٹھائے ہوئے ایک چھوٹے اور معصوم بچے پر چھایا ہوا تھا۔ اس کی لال لال آنکھوں سے بغض وکینہ جھلک رہا تھا۔ معصوم بچہ اس کے قدموں میں گرا ہوا اس کی مار سے بچنے کی موہوم امید لئے رحم طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس تصویر میں ڈسٹن نے اپنے اس ظالمانہ دور کی تصویر کشی کی تھی' جب ہم دونوں شین کے ساتھ رہتے تھے اور اس کی چیدہ دستیاں برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

مسز نیوویل صحتیاب ہوکر اپنی ڈیوٹی پر آ گئی تھیں۔ ان کی دفتر میں غیر حاضری سے ہم لوگ کام میں بری طرح گھر چکے تھے۔ جس روز میں نے ڈسٹن کے میٹریس کے نیچے سے یہ تصویر پائی تھی' اس روز مجھے ایک دن کی چھٹی مع تنخواہ ملی تھی کیونکہ ان کی غیر موجودگی میں' میں نے تمام امور بخوبی انجام دیئے تھے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں وہ تصویر لے کر کچن میں آ گئی۔ پھر اسے میز پر رکھ دیا۔ یہ ایسی بات نہیں تھی جسے آسانی سے نظر انداز کر دیا جائے میں نے اس روز اس معاملے کو سرسری انداز سے لیا تھا۔ اس لئے کچھ سمجھ نہ سکی تھی کہ ماضی کی ان بھیانک یادوں کا دکھ اور تلخیاں اندر ہی اندر ڈسٹن کے وجود میں پرورش کیوں پا رہی ہیں۔ میں باوجود کوشش کے محسوس نہ کر سکی تھی۔ میرے دل میں جو کسک تھی، میں اسے اپنے دعاؤں کے سہارے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے روئے زمین پر ایسا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا جس سے میں اپنی مالی حالت بہتر بنا سکوں۔ پھر کسی ماہر پیشہ ور کونسلر کے پاس جا کر فیس ادا کر کے اس ضمن میں کوئی مشورہ حاصل کر سکتی۔ میں اپنی احساس محرومی پر ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاتی۔

اس رات برنیٹ میرے گھر آیا تو اس سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ لے کر آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ بنچ باؤل کیک ہے۔ ''اس روز تم نے مجھ سے جس خلوص اور جذبے سے تعاون کیا، میں اس کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔'' اس کی نگاہوں کی گرفت میں میرا چہرہ جکڑا ہوا تھا۔ ''میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اپنی اس مہربانی کے عوض تم مجھ سے ہرگز کوئی رقم قبول نہیں کرو گی۔ اس لئے میں یہ کیک لے آیا ہو۔''

میں نے اپنے سر کو خفیف سی حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے تکلف کر کے مجھے شرمندہ کر دیا۔ آپ نے جو پانی استعمال کیا اس کی قیمت چند پنس بھی نہ تھی۔''

''پانی کی قدر و قیمت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب کہیں سے بھی پانی نہ ملے۔'' وہ دلکش انداز سے مسکرایا۔ اس کی یہ مسکراہٹ میرے دل میں اتر گئی۔ ''اور ہاں...... میں کسی دن تمہارے سامنے کھانا پکانے کے فن کا مظاہرہ کروں گا۔ تم میری مہارت دیکھ کر عش عش کر اٹھو گی۔ جب کئی سال پیشتر میری بیوی نے مجھ سے علیحدگی حاصل کی تو میں نے اس فن میں مہارت حاصل کر لی۔ ویسے بہت اچھی ورزش بھی ہے۔''

چونکہ میرا ذہن ڈسٹن کی تصویر میں الجھا ہوا تھا اس لئے برنیٹ سے باتیں کرتے ہوئے میری نگاہیں بار بار اٹھنے لگتی تھیں۔ جس وقت برنیٹ نے کیک میز پر رکھا تب معاً اس کی نظر اس تصویر پر پڑ گئی۔ وہ تصویر کی طرف تیزی سے بڑھا۔ پھر اسے دیکھتے ہی بول اٹھا۔ ''میرے خدا۔ یہ کیا ہے۔''

میں جانتی تھی کہ برنیٹ ایک سوشل ورکر ہے۔ کوئی نفسیاتی معالج نہیں ہے لیکن وہ اس دلدل میں میرے لئے تنکے کا سہارا تھا۔

''میں اس غلط فہمی میں رہی کہ اسے اپنا باپ یاد نہ ہوگا۔'' میں نے برنیٹ کو بتایا۔ ''میں نے اس کے سامنے شین کا ذکر بھولے سے بھی نہیں کیا۔ شین تو جیل میں ایک قیدی کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا۔ آخری مرتبہ گرفتاری تک شین کا رویہ میرے اور ڈسٹن کے ساتھ بہت ہی خشونت آمیز رہا تھا۔ اب آپ اس تصویر کو دیکھ کر کس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ سوچ سوچ کر میرا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔''

برنیٹ نے مجھے تعجب خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو نہایت واضح بات ہے۔ اسے سمجھ لینے کے لئے کوئی ضروری نہیں کہ ہم نفسیاتی معالج ہوں۔ اس تصویر سے صاف ابھر رہا ہے کہ مصور اپنے آپ کو بالکل کمزور قطعاً بے طاقت محسوس کرتا ہے۔''

''لیکن شین تو مر چکا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس پر ظلم نہیں کر سکتا۔ یہ بات تو ڈسٹن کو بھی معلوم ہے۔ میں یہ بات تو اس پر واضح کر چکی ہوں تاکہ اس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے دل میں ڈر یا خوف کا ذرا سا بھی احساس ہو تو نکل جائے۔''

میری بات سن کر برنیٹ نے مجھے پرخیال نظروں سے دیکھا۔''بچپن میں کسی کے ساتھ کچھ باتیں اس طرح پیش آتی ہیں کہ وہ انہیں ساری زندگی اپنے دل و دماغ سے نکال نہیں پاتا ہے۔ اس کے دل میں جو نفرت کا غبار بھرا ہوا تھا' وہ اب تصویروں میں اظہار سے نکل رہا ہے۔ اس کے دل سے جتنی بھڑاس نکل جائے اس کے لئے بہت اچھا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی رہ جاتی ہے کہ ڈسٹن کسی سے بے جھجک اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کر سکے۔''

برنیٹ کی بات میرے دل کو لگی۔ میں نے اثباتی انداز میں سرہلا کر اس سے جیسے اتفاق کیا۔ اب میں پہلے کی طرح سوچ نہیں سکتی تھی۔ اس کے لئے اس دنیا میں' میں ہی وہ ہستی تھی جو ڈسٹن سے کھل کر بات کر سکتی تھی۔ پھر میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس سے کھل کر بات کروں گی۔ میں دوپہر کے وقت ڈسٹن کو بتا چکی تھی کہ اس کی بنائی ہوئی تصویر کیسے اور کہاں سے ملی۔ پھر میں نے اسے سراہا بھی تھا کہ اس میں تصویر کے ذریعے اپنے احساسات ظاہر کرنے کی بڑی قابلیت ہے' جبکہ اس کی عمر سے بڑے بڑے مصوروں میں ایسی قابلیت پائی نہیں جاتی ہے۔ میں نے اس بات کی بڑی کوشش کی تھی کہ وہ مجھ پر بھروسا کرے اور اپنے جذبات کا اظہار کھل کر کردے۔ ڈسٹن نے جواب میں سنگین خاموشی اختیار کرلی۔ اس نے میری کسی بات کا جواب دینا گوارا نہیں کیا۔ میں اس کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

میں نے دل گرفتہ لہجے میں برنیٹ کو بڑی تفصیل سے آج دوپہر کی باتوں سے آگاہ کردیا تھا پھر کیک کا برتن واپس کرتے ہوئے اس کے تحفے کا شکریہ ادا کیا۔ برنیٹ کے دل پر میری باتوں نے جیسے بہت اثر کیا تھا۔ وہ بے چین اور مضطرب سا ہو گیا۔ اس نے اپنے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔''ہیلری! اصل بات یہ ہے کہ میں بچوں اور ان کی نفسیات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر تم کہتی ہو تو میں اس سے بات کرنے اور سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ ایک باپ' ایک شفیق دوست کی طرح مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ کس طرح سے بات کی جاتی ہے۔ کیا الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود میں اس نازک مسئلے کو کسی نہ کسی طرح حل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

میں نے اپنے دل میں اب تک کسی بھی شخص کے لئے شکر گزاری کے ایسے جذبات محسوس نہیں کیے تھے۔ برنیٹ کی باتیں میرے دل میں امرت بن کر اتر گئی تھیں۔ اس سے میرے دل کو پہلی بار ایک ڈھارس سی بندھی۔ جب سے اسکول میں ڈسٹن کے لئے دوبارہ مسائل جنم لینے لگے تھے تب سے میں بہت مضطرب اور پریشان رہی تھی۔ جب سے برنیٹ ہماری زندگی میں ایک خوشگوار ہوا کے جھونکے کی طرح آیا تھا تب سے ڈسٹن نے اسکول کے لڑکوں کے بارے میں کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح اداس' پریشان اور ہراساں گھر نہیں لوٹتا تھا۔ اس طرح ایک ہفتہ بغیر کسی پریشانی کے گزر گیا تھا۔

میں نے دو ایک مرتبہ اس پہلو پر بھی سوچا تھا کہ کہیں میں ان مسائل کی ذمہ دار تو نہیں ہوں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ میں دیر سے گھر پہنچتی ہوں اور ڈسٹن کو تنہائی کا عذاب سہنا پڑتا ہے۔ اس نے اپنی اس تنہائی کو دور کرنے کے لئے مصوری کو ساتھی بنا لیا۔ دفتر میں مسز نیویول نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے گھریلو معاملات کی بہتری کے لئے ملازمت سے استعفیٰ دے رہی ہیں۔ عورت کے بغیر گھر' گھر نہیں رہتا ہے۔ عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہے۔ انہوں نے اپنے عہدے کے لئے میرا نام تجویز کیا ہے اور پرزور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سفارش کی ہے۔ اس پیشکش سے مجھے ایک طرف فائدہ یہ تھا کہ میری ترقی ہو رہی تھی۔ میری تنخواہ میں اضافہ ہو جاتا۔ اس سے ہمارے مالی حالات بہتر ہو جاتے۔ دوسری طرف ایک سپروائزر کی حیثیت سے دیر تک کام کرنے کی پابند ہو جاتی۔ لیکن کیا ڈسٹن مزید تنہائی برداشت کرنے کا عادی ہو جائے گا۔ کسی الجھن اور احساس محرومی کا شکار تو نہیں ہو گا۔

☆☆

کچھ دنوں کے بعد ایک روز ڈسٹن گھر میں داخل ہوا تو اس کا چہرہ اور آنکھیں اداسی سے بھری ہوئی تھیں۔ مجھے ایک گہرے صدمے کا احساس ہوا۔ میں اب ہر مسئلے کے لئے برنیٹ سے مشورہ کرنے لگی تھی۔ اس روز میں نے اسے اپنی مدد کے لئے بلایا۔ ہم دونوں غیر محسوس انداز سے برنیٹ کے قریب ہو گئے تھے اور اس ہستی کو دل کی گہرائیوں سے پسند کرنے لگے تھے۔

برنیٹ سیدھا ڈسٹن کے کمرے میں چلا گیا۔ میں کمرے کے باہر ہی ٹہلتی رہی۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد دونوں باہر آئے تو ان کے چہرے چمک رہے تھے۔ ڈسٹن کے چہرے اور آنکھوں میں اداسی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

برنیٹ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے خوش مزاجی اور بے تکلفی سے کہا۔ ''ہم دونوں باہر کھیلنے جا رہے ہیں۔ تم ہمارے لئے کھانا تیار کر دو۔''

میں نے برنیٹ کو اپنے بیٹے کے ساتھ فٹبال کھیلتے ہوئے دیکھا تو میرے دل کو ایسی بے پناہ مسرت محسوس ہوئی جس سے میں محروم ہو چکی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کسی کے لئے میرا دل اس طرح بھی دھڑک سکتا ہے۔ پھر میں نے اپنے دل کے تمام نہاں خانوں میں جھانکا تو ایسا لگا کہ اس کی محبت ایک گوشے میں بسی ہوئی ہے۔ میں اس کی محبت میں ایسی گرفتار ہو چکی ہوں کہ اس سے رہائی ناممکن ہے۔ اس مہذب اور شائستہ شخص نے مجھے اپنا اسیر بنا لیا ہے۔

میں نے اپنے آپ کو سمجھانے اور فریب دینے کی کوشش کی کہ اس جذبے اور اس کی مہربانیوں سے میں متاثر ہوئی ہوں۔ یہ شکر گزاری کے جذبات ہیں ان باتوں سے میں اپنے دل کو بہلا نہ سکی تھی۔ جس محبت نے میرے دل میں جگہ بنالی تھی اس کی جڑیں بہت پھیل چکی تھیں۔ مستقبل کے موہوم اندیشوں نے مجھے لرزا دیا تھا۔ کہ اس محبت کا انجام کیا ہو گا...... کیا ہو گا...... اس کا جواب میرے پاس نہ تھا۔

ڈسٹن میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی دنوں میں وہ ہنسنے بولنے لگا۔ اب وہ پہلا جیسا ڈسٹن تھا۔ اسکول کے مسائل کے بارے میں اب تک ایک ہی بات سامنے آئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب ہر مسئلہ ختم ہو چکا ہے۔

میری خوشی دیرپا نہیں رہی۔ ایک روز اچانک میرا سکون واطمینان درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ ڈسٹن کے اسکول سے ایک رپورٹ کارڈ موصول ہوا کہ ڈسٹن مسلسل ایک ہفتے سے غیر حاضر ہے۔

مجھے اس رپورٹ کا نجانے یقین کیوں نہیں آیا۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔ ''کہیں کسی اور کی رپورٹ کارڈ پر غلطی سے تمہارا نام تو نہیں لکھ دیا گیا۔''

میری بات سن کر اس نے کسی مجرم کی طرح اپنا سر جھکا لیا۔ اس کی نظریں فرش پر جمی رہیں۔ اس نے ایک لفظ تک زبان سے نہیں کہا۔

دوسرے دن میں اس رپورٹ کی تصدیق کے لئے اسکول گئی تو مجھے بتایا گیا کہ یہ کارڈ بالکل درست ہے۔ اندراج اور نام لکھنے میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ آفس ریکارڈ میں رخصت کی ایک درخواست تھی کہ اسے خسرہ کی شکایت ہے اس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لئے وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسکول سے غیر حاضر ہے۔ پھر بھی میری تسلی نہ ہوئی۔ میں نے اسکول کی آفس سیکریٹری کے سامنے اصرار کیا۔

''یقیناً آپ لوگوں سے نادانستگی میں کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ گزشتہ سال یقیناً ایسا ہوا تھا۔ ڈسٹن کو دانے نکلے تھے لیکن ان کی وجہ سے وہ صرف ایک دن اسکول سے غیر حاضر رہا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی اسے خرہ کی شکایت نہیں ہوئی۔ لہٰذا اس کے سات روز تک اسکول سے غیر حاضر رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

میرے تسلیم نہ کرنے پر آفس سیکریٹری نے تجویز پیش کی۔ ''کیوں نہ آپ اس سلسلے میں مسز رچرڈ سے بات کرلیں۔''

میں ڈسٹن کی ٹیچر سے ملی تو انہوں نے آفس سیکریٹری کی تائید کی۔ انہوں نے کہا۔ ''ڈسٹن واقعی اسکول سے ایک ہفتہ غیر حاضر رہا ہے۔''

دوسرے دن میں نے دفتر سے چھٹی لی۔ میں ڈسٹن کو بے بی سٹر کے پاس چھوڑ کر اس کے اسکول گئی۔ پرنسپل نے میرے ساتھ مل کر اس درخواست کا معائنہ کیا۔ اس پر تاریخ درست تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ چھٹی کی یہ درخواست اس نوٹ کی پوری نقل تھی جو گزشتہ سال میں نے اپنے ہاتھ سے لکھی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ چیچک کی جگہ خسرہ لکھ دیا گیا تھا۔

''اس سے صاف ظاہر ہورہا ہے کہ اس نے جعلسازی کی ہے۔'' میں نے پرنسپل سے کہا۔ ''یہ تو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ ڈرائنگ بہت اچھی بنالیتا ہے لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ وہ میری تحریر کی نقل بھی کرسکتا ہے لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ اس درخواست کے بالکل وہی الفاظ کیسے یاد رہ گئے جو میں نے تقریباً ایک سال پہلے لکھے تھے۔

مسز رچرڈ مسکرائیں۔ ''جس روز آپ نے مجھ سے ملاقات کی تھی، اس روز اس کی فائل میری ڈیسک پر رکھی رہ گئی تھی۔ غالباً میری توجہ کسی اور طرف ہوگی۔ اس نے وہ درخواست نکال لی۔ ایک سال پہلے لکھا ہوا نوٹ ہمارے ریکارڈ سے غائب ہے۔ جب میں نے ایک پیغام دے کر اسے اسکول کے آفس بھیجا تو اس نے موقع پاکر درخواست فائل میں لگادی۔ یہ حرکت شاید اس نے اس لئے کہ کہ کچھ دن پہلے تک اس کے ساتھ ناخوشگوار واقعات پیش آتے رہے۔ اس لئے اس نے اسکول سے غیر حاضر رہنے کو ترجیح دی۔ اس لئے اسے موردالزام ٹھہرایا نہیں جاسکتا ہے۔''

''کچھ روز پہلے سے آپ کی کیا مراد ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''ان حالات میں تبدیلی کب رونما ہوئی تھی۔''

ان کے چہرے سے مسکراہٹ یک لخت غائب ہوگئی۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ میں ان سے ان کی ذمہ داریوں کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ انہوں نے مجھے بتایا۔ ''ڈسٹن اسکول کے ماحول میں گھلنے ملنے لگا تھا۔''

''وہ کس طرح......'' میں نے تکرار کی کیونکہ ان کی بات میرے لئے ناقابل فہم تھی۔

ڈسٹن کی کلاس ٹیچر نے ایک گہری سانس لی پھر وہ سنجیدگی سے کہنے لگیں۔ ''مسز میگریو! مجھے آپ کے گھریلو حالات کا کوئی علم نہیں ہے۔ میرا قیاس ہے کہ شاید آپ نے ڈسٹن کے معاملے میں کچھ لچک پیدا کرلی۔ آپ نے شاید لڑکے کی دگرگوں حالت کے سبب کیا ہوگا۔ میری آپ سے استدعا ہے کہ اسے یہ حرکت کرنے پر کوئی سخت سزا نہ دیں۔ صرف تنبیہہ کردیں کیونکہ اس کی عمر ابھی صرف آٹھ برس کی ہے۔''

اسکول جانے سے مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا تھا۔ ویسے ٹیچر کی بات درست تھی کہ ڈسٹن صرف آٹھ برس کا ہے۔ لیکن میرے دل

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں ایک پھانس سی گڑ گئی کہ اس نے یہ ہفتہ کہاں اور کس کے ساتھ گزارا۔ میں تو یہ سمجھتی رہی تھی کہ وہ معمول کے مطابق اسکول جاتا رہا ہے۔

شام کے وقت دفتر سے لوٹ کر میں نے اپنے بیٹے سے باز پرس کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ میں نے کئی دنوں کے بعد اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی دیکھی تھیں۔ اس کے چہرے پر ندامت کی سرخی تھی۔ اس نے مجھے مبہم سا جواب دے کر ٹالنا چاہا۔ ''کہیں بھی نہیں ممی۔''

میں اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پانے کے لئے دونوں ہاتھ باندھ لئے۔ میں اس وقت اسے سزا دینا نہیں چاہتی تھی اور اسے سخت سست کہنے پر بھی آمادہ نہ تھی۔ میں اسے صرف یہ سمجھانا چاہتی تھی کہ ایک آٹھ سال کے بچے کو ایک جھوٹی درخواست لکھ کر اسکول میں دینا اور اسکول سے غیر حاضر رہنا زیب نہیں دیتا ہے۔ میں نے اسے پیار اور نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

ڈسٹن چیخ کر بولا۔ ''آپ کوئی بات سمجھ ہی نہیں سکتی ہیں۔ لہذا مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔''

میں کوئی آدھے گھنٹے تک ذہنی کشمکش میں ٹہلتی رہی۔ تب میں نے برنیٹ کی گاڑی کی آواز سنی تو میں برق سرعت سے اس سے ملنے کے لئے باہر لپک گئی۔ میں نے اس سے استدعا کی۔ ''کیا آپ ابھی اور اسی وقت چند لمحوں کے لئے آسکتے ہیں۔ میں ڈسٹن کے بارے میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ پلیز! برنیٹ۔''

''اپنے نئے دوست اور اس کی حسین ماں کے لئے میرے پاس وقت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ خیریت تو ہے! کیا کچھ گڑبڑ ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے اپنی گردن ہلائی۔ معاً میری نگاہ اپنے گھر کی طرف اٹھی۔ میں نے دیکھا ڈسٹن کے کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا ہے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ ''اگر میں تمہارے گھر چل کر بات کروں تو تمہارا حرج تو نہیں ہوگا۔ میں نے اس کے ہاں بات کرنے کا ارادہ اس لئے کیا تھا کہ ڈسٹن جاگ رہا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ ہماری گفتگو اس کے علم میں آئے۔ میں نے برنیٹ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''حرج نہیں ہوگا بلکہ میرے لئے اعزاز اور خوشی کی بات ہوگی۔'' اس کے لہجے سے خوشی ٹپک رہی تھی۔

آج مجھے پہلی بار اس کے گھر میں جانے کا موقع ملا تھا۔ میں نے اس کے گھر کی سجاوٹ دیکھی تو اس کے پھوہڑ پن پر ہنسی آئی۔ اسے اپنا گھر سجانا نہیں آتا تھا۔ اس میں سلیقہ کہاں سے آسکتا تھا۔ مردوں میں یہ خوبی نہیں ہوتی ہے۔ اس نے بہت سارا فرنیچر رہائشی کمرے میں رکھ چھوڑا تھا۔ اس کمرے کو دیکھتے ہی وہ نشست گاہ لگتی تھی۔ اس میں ایک لاابالی کنوارے کا روپ نظر آتا تھا۔

جب میں نے ڈسٹن کی جھوٹی درخواست کے بارے میں بتایا' جس کی بدولت وہ اسکول سے ہفتے بھر کے لئے غائب رہا تو برنیٹ پرانے بھدے کاؤچ پر دھم سے بیٹھ گیا۔ اس نے میری باتیں غور سے سنی تھیں لیکن اس کی نگاہیں چھت پر مرکوز تھیں۔ میرے لئے یہ بات تعجب انگیز تھی کہ اس نے کسی قسم کی فکر اور حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

چند لمحوں کے بعد اس نے اپنی پلکیں جھپکائیں اور اپنے سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلری! اس سارے معاملے کو ڈسٹن کے تناظر سے دیکھو۔ تمام لڑکوں نے اس پر ہلہ بول دیا تھا۔ ان میں سے کسی کو اس کے باپ کے بارے میں علم ہوگیا ہے' اس لئے وہ اس کے وجود پر طنز کرتے ہیں۔ پھبتیاں کستے ہیں۔ بچے بڑے ستم ظریف ہوتے ہیں۔ اگر انہیں اس وقت کا یقین ہوجائے کہ انہیں کسی جارحانہ حرکت پر کسی سزا کا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سامنا کرنا نہیں پڑے گا تو وہ مذاق میں کسی کو بھی چیر پھاڑ سکتے ہیں۔"

"وہ شین کے بارے میں جانتے ہیں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔" میں تحیرزدہ لہجے میں بولی۔

برنیٹ نے میری اس بے یقینی سے اختلاف کیا۔ "کیا ایسا نہیں ہے کہ ڈسٹن کی فائل میں ذاتی معلومات بھی ہوں۔"

"بالغرض اگر ایسا ہو تو یہ باتیں لڑکوں تک کیسے پہنچ سکتی ہیں۔" میں نے تکرار کی۔

"میرا خیال ہے ایک ٹیچر سے بات نکل کر دوسری ٹیچر تک پہنچی۔ پھر دوسری ٹیچر سے اسکول کے کسی لڑکے کے والدین تک...... ویسے یہ اتنا اہم معاملہ نہیں، جس کے لئے تم اس قدر پریشان اور فکر مند ہو رہی ہو......"

"کیا کہا...... آپ کی نظر میں اس معاملے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔" میں ہیجانی لہجے میں چیخ کر بولی۔ پھر میں وحشت کے عالم میں اس کے کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ "اس نے جو دہشت ناک قسم کی تصویریں بنائیں، یہ بھی کوئی اہم معاملہ نہیں ہے۔" اچانک میرے ذہن میں ایک خیال فوری طور پر آیا۔ "آپ کو یہ تمام باتیں کیونکر معلوم ہوئیں۔"

"ڈسٹن نے مجھے بتایا ہے۔ ہم دوستوں کی طرح ہر موضوع پر بات کرتے رہتے ہیں۔" برنیٹ نے جواب دیا

"کیا اس نے آپ کو یہ بھی بتایا کہ اسکول سے جو غیر حاضری کی تھی، وہ وقت اس نے کہاں گزارا۔"

میری بات سن کر وہ مجھے ایک ٹک دیکھنے لگا۔ مجھے میری چھٹی حس نے بتا دیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہم راز ہیں۔

"آپ کو پہلے سے ہی ساری باتوں کا علم تھا۔" میں غصے کے عالم میں چیخ اٹھی۔ "آپ نے ڈسٹن کو دوست بنا لیا تو سب کچھ معلوم ہو گیا تھا اور آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"ڈسٹن مجھ پر اعتبار کرنے لگا ہے اور میں اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا ہوں۔" برنیٹ نے جواب دیا۔

برنیٹ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ پھر رنج او راشتعال کی کیفیت میں بولتی چلی گئی۔ "اور بھی بہت ساری باتین ہیں جو آپ مجھ سے چھپاتے رہے ہیں۔ اس کی ٹیچر نے مجھے بتایا کہ ڈسٹن نے اپنے آپ کو حالات میں ڈھال لیا ہے۔ ان کے کہنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے...... اور ہاں آپ اس دوران میں اسے کیا کیا سکھاتے رہے ہیں۔"

برنیٹ دوبارہ چھت پر نگاہیں مرکوز کئے ہوئے بولا۔ "کچھ ایسے بنیادی اصول ہیں کہ ان زمینی حقائق کو ماننا پڑتا ہے۔ اگر بچے انہیں سیکھ لیں تو......" میں نے درمیان میں دوبارہ اس کی بات کاٹی۔

"آپ اسے کیا سکھاتے رہے ہیں۔ برنیٹ! کیا آپ اسے باکسنگ اور جوڈو کراتے سکھا رہے ہیں۔ آپ کیا نہیں جانتے ہیں کہ لڑائی جھگڑے کی باتیں سنتے ہی میری کیا حالت ہو جاتی ہے۔ میں آپ کو شین کے خاندان کے بارے میں بتا چکی ہوں۔ آپ کو اس بات کا بھی علم ہو چکا ہے کہ اس ماحول میں شین کے اندر تشدد کا رجحان کس طرح پروان چڑھتا رہا تھا۔ بالفرض اگر شخصیت پر موروثی آثرات مرتب ہوتے ہیں تو میں یہ سمجھوں کہ اب ڈسٹن کو صرف ایک ٹریگر کی ضرورت رہ گئی ہے۔"

"ہیلری!" برنیٹ نے مجھے ٹوکا اور سنجیدگی سے کہا۔ "تم بہت جذباتی ہو رہی ہو۔ ایسی بات نہیں ہے۔ تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ اگر ڈسٹن میں پہلے سے تشدد کے رجحانات پل رہے ہوتے تو وہ اب تک تشدد کی راہ اختیار کر چکا ہوتا۔ وہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اب تک جس ذہنی انتشار سے دوچار رہا ہے‘ تم نے اسے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔‘‘

’’آپ نے اسے لڑتا بھڑتا سکھایا...... کہیے کیا آپ نے ایسے نہیں کیا برنیٹ! آپ کو اس طرح نہیں کرنا چاہئے تھا۔ کیا یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ میں آپ پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگی تھی۔‘‘

’’میں اسے اپنے بازوؤں پر بھروسا کرنا اور خود کو متوازن کرلینے میں مدد دے رہا تھا۔‘‘ برنیٹ نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

’’آپ...... آپ ایسا ہرگز نہیں کرسکتے ہیں...... کیا آپ اس طرح ایک بچے کا مستقبل تباہ کرنے پر تل نہیں گئے ہیں۔‘‘ میں تنک کر بولی۔

میں اپنی بات ختم کرکے تیزی سے مڑی اور کمرے سے باہر کی طرف لپکی لیکن برنیٹ نے اس سے کہیں تیزی سے مجھے آلیا۔ پھر میں نے اپنے بازو پر اتنی سخت گرفت محسوس کی کہ ایک قدم بھی آگے بڑھ نہ سکی۔ مجھ میں چھپا ہوا خوف عود کر آیا۔ پھر میں اس کے مضبوط بازوؤں میں سمٹ کر رہ گئی ہوتی اگر میں نے خود کو وحشت کے عالم میں اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش نہ کی ہوتی۔

اس نے میری مزاحمت کی کوئی پروا نہیں کی اور نہ ہی اسے میرے ردعمل کا کوئی احساس تھا۔ پھر اس نے مجھے بے اختیار اپنے بازوؤں کے حصار میں قید کرلیا اور مجھ پر جھک گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ’’اوہ میرے خدایا...... میں کب سے اس لمحے کے لئے بے تاب تھا لیکن ہمیشہ یہ سوچ کر رہ جاتا تھا کہ ابھی وہ حسین لمحہ نہیں آیا...... ہیلری! میری نظر میں تم بہت دلیر‘ اسمارٹ اور بہت ہی حسین وجمیل عورت ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ میں تمہارے عشق میں پاگل ہوچکا ہوں۔ میں کب سے تم پر حال دل منکشف کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔‘‘ پھر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

’’اور ہاں...... پلیز! تم یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہاری محبت اور قرب حاصل کرنے کے لئے ڈسٹن کو ذریعہ بنایا۔ میں ذاتی طور پر اس چھوٹے سے لڑکے کے تمام معاملات میں اس لئے پوری دلچسپی لیتا رہا ہوں کہ اس کی زندگی بن جائے۔‘‘

میں نے اپنے ہونٹوں پر ایک مٹھاس محسوس کی تھی اور میرے کانوں میں جیسے رس انڈیل دیا گیا تھا۔ میں تو اس لمحے آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرنے لگی تھی۔ مجھے یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی جس میں محبت کا سمندر موجزن تھا۔ میں خوابناک لہجے میں بولی۔ ’’ایک لمحے کے لئے بھی میرے دل میں ایسا کوئی خیال کبھی نہیں آیا۔ نجانے کیوں مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ میں اتنی خوش نصیب بھی ہوسکتی ہوں۔ تم ایک عرصے سے میرے دل کی دھڑکن اور خواب بنے ہوئے ہو۔ میرے ذہن میں تمہاری شخصیت کا سب سے پہلے یہ تاثر قائم ہوا تھا کہ ڈسٹن کو تم ہی مسرور کن لمحات فراہم کرسکتے ہو۔ یہی وجہ تھی کہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس معاملے میں میرے اعتماد کو مجروح کروگے۔‘‘

’ہشت......! یہ تم کیا فضول بات لے بیٹھیں۔ میرے ساتھ آؤ......‘‘ اس نے مجھے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار سے نکال کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ’’چلو‘ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد بھی تم اپنی رائے پر قائم رہیں کہ میں نے تمہاری اندیشوں کے مطابق ڈسٹن کو تمہاری مرضی کے خلاف کچھ ہدایات دی ہیں‘ تو میرا وعدہ ہے کہ آئندہ میں کبھی ان معاملات میں مداخلت نہیں کروں گا۔‘‘

اب بھی میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ نس نس میں خون رقص کررہا تھا۔ پورے دن

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ایک میٹھی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے لمس میں ایک لطیف اور انوکھا پن تھا۔ میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیئے سحر زدہ سی چلنے لگی۔ وہ مجھے تہ خانے میں لے جا رہا تھا۔

اس نے زینے کے پاس پہنچ کر روشنی کے لئے ایک سوئچ آن کیا۔ میں کچھ دیر کے بعد ہی سمجھ سکی کہ وہ مجھے کیا دکھانا چاہتا ہے۔

اس تہ خانے کے ایک کونے میں موٹے مضبوط کارڈ بورڈ کا بنا ہوا بڑا سا کارٹن تھا جو سامان وغیرہ رکھنے کے کام آتا ہے۔ کارٹن پرانا ہو چکا تھا۔ ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ جتنا تھا جسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل بھی کیا جا سکتا ہو۔ اس میں ڈسٹن کی کچھ ڈرائنگ رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کے بچپن کا ایک کھلونا جانور تھا۔ یہ میں نے اسے اس وقت لا کر دیا تھا جب وہ چھوٹا سا بچہ تھا اور کچھ عرصہ قبل گھر میں نظر نہ آنے والا کمبل اور تکیہ رکھا تھا۔

''میرے یہاں آنے سے پہلے اس جگہ بجلی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔'' برنیٹ نے کہا۔ ''اس وقت یہاں خاصا اندھیرا ہوتا تھا۔ غالباً ڈسٹن نے ان حالات سے گھبرا کر اس تاریک جگہ کو اسکول کے مقابلے میں ترجیح دی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں میں نے اسے پہلے دن پایا تھا۔ وہ اپنی اس دنیا میں اس طرح کھویا ہوا تھا کہ وہ میری آہٹ بھی سن نہ سکا اور پھر میں اس کے پاس جا پہنچا۔ ہیلری! وہ توجہ اور مدد کا مستحق ہے۔''

اب میرے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ برنیٹ نے مجھے سہارا دینے کے لئے اپنے بازوؤں میں بھر کر سینے میں جذب کر لیا۔ جب میں نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھالا تو وہ مجھے سہارا دے کر اپنے کچن تک لے آیا۔ اس نے میرے لئے کافی تیار کی پھر اس نے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ان حالات میں تم کس طرح

مہکتی کلیاں

☆ اللہ کے سوا کسی سے توقع مت رکھو اور سوائے اللہ کے کسی پر بھروسہ نہ کرو۔

☆ بخل اور ایمان ایک ساتھ دل میں جمع نہیں رہتے۔

☆ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ والدین سے سرکشی ہے۔

☆ زبان کو شکوہ سے روکو خوشی کی زندگی عطا ہوگی۔

☆ یہ نہ دیکھو کہ بات کس نے کی ہے یہ دیکھو کہ بات کیسی ہے۔

☆ تند و تیز لہجہ پرفریب اور گمراہ کن خوشامد سے بہتر ہے۔

☆ زندگی کی عظیم ترین مسرت یہ ہے کہ تم وہ کام کر دکھاؤ جو دوسرے سمجھتے ہیں کہ تم نہیں کر سکتے۔

☆ تحریر ایک خاموش زبان ہے اور قلم ہاتھ کی زبان ہے۔

☆ جن لوگوں کے ذہن میں اچھے خیالات آباد ہوں وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔

☆ کسی کے اخلاق پر اعتماد نہ کرنا جب تک اسے غصہ کی حالت میں نہ دیکھ لو۔

ایک کونسلر سے رجوع کرو گی جبکہ ڈسٹن کی حالت سدھر رہی ہے۔ وہ ایک عرصے سے گھٹن کا شکار رہا تھا۔ اس لئے بھی وہ اسکول سے اس ہفتے غیر حاضر رہا۔ ہیلری ڈرائنگ! تم یقین کرو۔ میرے محبت کے دو بول سن کر وہ اس تیزی سے مجھ پر کھلتا چلا گیا کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اسے سنبھالنے کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ اگر تم پسند کرو تو میں اس کے لئے ایک اچھے تھراپسٹ کا انتظار کر دوں......''

میں نے برنیٹ کے مشورے پر دوسرے دن ہی عمل کیا۔ ڈسٹن کی تھراپسٹ نے ملاقات کا بندوبست کر دیا۔ وہ ایک نفیس قسم کی عورت تھی لیکن ڈسٹن باقاعدگی سے وہاں جانے کے لئے بالکل بھی آمادہ نہ تھا۔

میں نے اس دوران میں دوبارہ اس کی کلاس ٹیچر سے ملاقات کی۔ پھر یہ بات صاف ہوگئی کہ برنیٹ نے ڈسٹن کو لڑائی کے لئے آمادہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نہیں کیا تھا بلکہ اس سے یہ کہا تھا کہ وہ ہر قیمت پر اپنا دفاع ضرور کرے۔ یہ اس کا حق ہے۔ اس طرح وہ لڑکوں کی بے وقوف بنانے والی شرارتوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس مرتبہ میں نے ٹیچر کی تجاویز اور ہدایات پر بھی کھل کر بات کی تو اس نے مجھے بتایا کہ ڈسٹن نے کسی عاجلانہ ردعمل کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا لیکن اس میں اب یہ اعتماد پیدا ہو گیا ہے کہ وہ بوقت ضرورت ایسا کر سکتا ہے۔ گویا اس نے ایک طرح سے نصف نفسیاتی جنگ جیت لی تھی۔ اس دوران میں وہ صرف ایک معمولی سے جھگڑے میں ملوث ہوا تھا۔ اس کے بعد اسے وہ مقام مل گیا جس کا وہ مستحق تھا۔ اس کے ساتھی اب اس کی عزت کرنے لگے تھے۔

سماجی کونسلر نے بھی ٹیچر اور برنیٹ کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔ خاتون کونسلر نے مجھے یہ بھی مشورہ دیا کہ میں متبادل طریقوں کی طرف بھی توجہ دیتی رہوں اور اس سے غافل نہ رہوں۔ اس طرح جو بھی اختلافات ہوں گے وہ آسانی سے حل ہو جائیں گے۔

''وہ ایک چھوٹا سا بچہ ہے لیکن بے حد ذہین بھی ہے۔'' کونسلر نے مجھے بتایا۔ ''وہ دو راستوں پر عمل پیرا ہے۔ اس لئے اس کے سماجی رویے بڑی تیزی سدھرتے چلے جا رہے ہیں۔''

گزشتہ چند ماہ میں' میں اور برنیٹ ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ ایک لمحے کی جدائی بھی شاق گزرتی تھی۔ مگر میں اب بھی کوئی قدم اٹھانے سے گریزاں تھی۔ میرا سابقہ تجربہ بہت تلخ اور بھیانک تھا۔ شادی سے قبل شین کا اصل چہرہ مجھے دکھائی نہیں دیا تھا۔ برنیٹ کے بارے میں' میں سوچتی تھی کہ کہیں وہ بھی دوسرا شین ثابت نہ ہو۔ اس لئے مجھ پر احتیاط لازمی تھی۔ میں اب کوئی غلطی دہرانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ مرد کی ذات ناقابل فہم اور اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوتا تھا۔ برنیٹ کو دل دینے کے باوجود میں اس کی ذات کو غیر محسوس انداز سے پرکھ رہی تھی۔ برنیٹ ہر ویک اینڈ پر مجھے اور ڈسٹن کو آؤٹ ڈور تفریح پر لے جاتا تھا۔ ہم مختلف تفریحی مقامات کے علاوہ زولوجیکل گارڈن اور میوزیم بھی گئے۔

اس نے مجھے جو عزت دی' مقام دیا اس سے میرے دل میں اس کی قدر و منزلت بڑھ گئی تھی۔ اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کہ میں بہک جاؤں۔ محبت کے دامن پر دھبا پڑ جائے۔

ایک شام وہ مجھے ایک کینڈل لائٹ ڈنر پر لے گیا۔ رومان پرور ماحول چاہنے والوں پر جادو کر دیتا تھا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''کیا تم میری محبت کی سچائی کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کر لوگی...... میری محبت بڑی پاک' اعلیٰ و ارفع ہے۔'' ایک پل کے لئے مجھ پر ماضی کے اندیشوں کا حملہ ہوا۔ وہ زہریلے سانپوں کی طرح تھے۔ میرے دل نے کہا کہ ہر مرد شین نہیں ہوتا ہے۔ میں نے اس کے بازوؤں میں تحفظ محسوس کیا۔ میں نے محبت کی گرم جوشی اور لطافت کو جیسے بیک وقت پالیا تھا پھر میری سانسیں الجھ گئیں...... میں نے سرگوشی میں بڑی آہستگی سے کہا۔ ''ہاں...... تمہاری محبت کی سچائی کو میں دل و جان سے تسلیم کرتی ہوں۔ تم میرے' صرف میرے ہو۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر میں نے پھنکارتے ہوئے اندیشوں کے زہریلے سانپوں کا سر کچل دیا۔ میں نے دل میں کہا۔ ''کچھ بھی ہو میں دوبارہ شادی نہ کرنے کے عہد کو توڑ دوں گی۔ پھر ایک بار اپنی محبت کو دل میں جگہ دوں گی۔ کیونکہ دنیا میں کوئی بھی محبت کے بغیر رہ نہیں سکتا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

زہر کا سفر

راحیلہ جبیں بدر

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

یہ ڈاٹا بینک امریکہ کا دورہ کرنے والے ہر غیر ملکی کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ رکھتا ہے۔ جب بھی کوئی غیر ملکی امریکہ کی سر زمین پر قدم رکھتا ہے اسے کسٹمز اور امیگریشن کے فارم پر کرنے پڑتے ہیں اور ان فارموں میں درج شدہ معلومات کمپیوٹر کو فیڈ کردی جاتی ہیں۔ یہ کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ نیشنل نارکوٹکس بورڈ انٹروڈکشن سسٹم پروگرام کے نام سے جانا جاتا ہے۔ میڈونا نے ڈاٹا بینک سے رابطہ تو کرلیا لیکن وہ یہ سوچ رہا تھا کہ......!

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

اسپیشل ایجنٹ ایڈورڈ میڈونا اپنے باغیچے میں پھول کے پودوں کی صفائی میں مصروف‘ اس خیال سے دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ آخر کار اسے پودوں پر توجہ دینے کا موقع مل گیا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور جون کا مہینہ تھا۔ وہ تینتیس سال کا ایک جوان العمر آفیسر تھا اور یو ایس ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن ڈی ای اے کے سیٹل آفس سے وابستہ تھا۔

دوپہر ہو چلی تھی۔ دھوپ میں خاصی تمازت تھی لیکن وہ اس کی پروا کیے بغیر اپنے کام میں جتا ہوا تھا۔ پھر ایک بج کر چند منٹ پر اس کی بیلٹ سے منسلک پیجر اچانک ’ہیپ ہیپ‘ کرنے لگا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے ڈرائنگ روم میں گیا اور اپنے دفتر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ایسے میں اس کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی اور میڈونا کو کسی سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ چند منٹ کے بعد

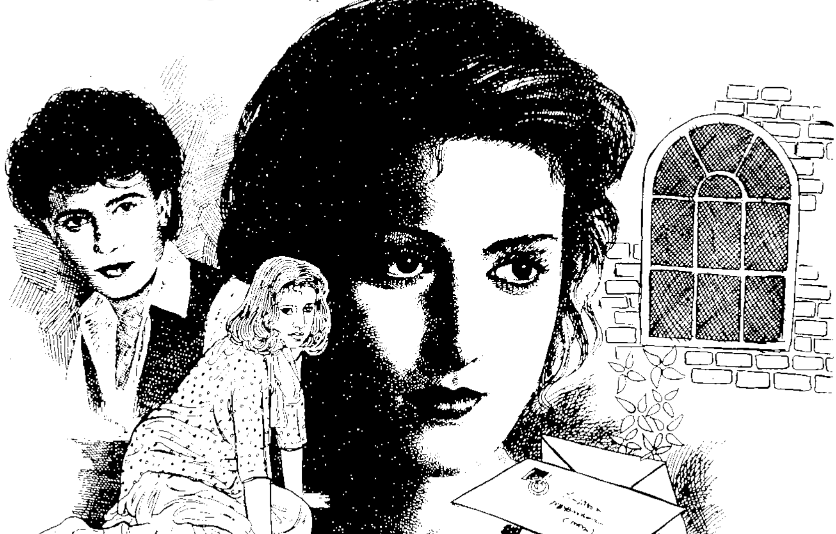

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میڈونا نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور اپنی بیوی کی طرف مڑا۔

''کون تھا۔'' اس کی بیوی نے پوچھا۔

''ابھی ابھی کسٹم نے ٹوکیو سے آنے والی ایک پرواز سے منشیات کے دو اسمگلروں کو گرفتار کیا ہے۔ چند اونس منشیات ہوگی۔'' اس نے جواب دیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس کے ایک گھنٹا بعد وہ سیٹل کے ٹیکو ٹیکو مار ایئرپورٹ پر تھا اور اپنی نظروں کے سامنے یو ایس کسٹمز کے ایک انسپکٹر کو دھات کی ساختہ برف کی ان ایک سو اڑتیس بالٹیوں کو ڈرل کرکے ان کے کھوکھلے پہلوؤں میں سے دو سو بارہ پونڈ خالص ہیروئن برآمد کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا جن کے بارے میں ان اسمگلروں کا دعویٰ تھا کہ یہ پروڈکٹ سیمپلز تھے۔ یہ ریاستہائے متحدہ میں مشرقی ایشیا کی ہیروئن کی سب سے بڑی کھیپ تھی جو پکڑی گئی تھی لیکن...... میڈونا کے ایئرپورٹ پہنچنے سے پہلے ہی ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آچکا تھا۔ ان دو میں سے ایک اسمگلر نے حکام سے باتھ روم جانے کی اجازت مانگی تھی اور اسے اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ سیاہ مونچھوں کا مالک ایک دبلا پتلا چینی تھا جس نے فین پین شنگ کی حیثیت سے اپنی شناخت کرائی تھی۔ اسے باتھ روم گئے ہوئے کئی منٹ ہوچکے تھے اور جب انتظار کے لمحات طویل ہوتے چلے گئے تو انسپکٹر اسے چیک کرنے کے لیے خود باتھ روم میں داخل ہوگیا۔ وہاں فرش پر ایک نقلی مونچھ پڑی ہوئی تھی اور باتھ روم کی ننھی سی کھڑکی پوری کھلی ہوئی تھی۔ وہ غائب ہوچکا تھا جبکہ اس کا ساتھی اسمگلر محافظوں کی سخت نگرانی میں تھا۔

''تم کون ہو۔'' میڈونا نے اس کمرے میں پہنچ کر اس سے سوال کیا۔

''میں ایک الیکٹریکل انجینئر ہوں اور کاروباری دورے پر یہاں آیا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں ہیروئن کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔'' وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہہ رہا تھا۔ ''میں برف کی یہ بالٹیاں ایک دوست کو ڈیلیور کرنے لایا تھا۔ مجھے ان بالٹیوں کو شکاگو لے جانا ہے اور ایک فون کال کا انتظار کرنا ہے۔''

''آپ لوگ ذرا باہر جائیں اور ہمیں تنہا چھوڑ دیں۔'' میڈونا نے کسٹمز کے انسپکٹروں سے کہا۔

سارے انسپکٹرز کمرے سے نکل گئے۔ میڈونا اس کے پاسپورٹ کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے پاسپورٹ پر چسپاں اس کی تصویر کو غور سے دیکھا اور میز کی دوسری طرف براجمان اس شخص پر نگاہ ڈالی۔ وہ پچیس، تیس سال کا ایک منحنی سا چینی تھا۔

''تم چن زنگ منگ ہو۔'' میڈونا نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں ٹامی چن ہوں۔'' وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا اور اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں بہت تیزی سے جگہ بناتی جارہی تھیں۔

میڈونا غور سے کئی منٹ تک اس چینی کو دیکھتا رہا۔ چینی واضح طور پر بے حد خائف نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں کمرے میں پوشیدہ چیزوں کو تلاش کررہی تھیں۔ وہ خائف تھا لیکن کس سے۔ اسے کس سے خطرہ تھا۔

''اطمینان رکھو ٹامی۔'' میڈونا نرمی سے بولا۔ ''کوئی بھی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا لیکن برف کی وہ بالٹیاں ہمارے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ بن گئی ہیں اور مجھے اس مسئلے کا صرف ایک ہی حل نظر آتا ہے۔''

''وہ کیا۔''

''آؤ ہم ایک معاہدہ کرلیتے ہیں۔'' میڈونا نے پیش کش کی۔ ''تم اپنا سفر جاری رکھو اور وہ بالٹیاں شکاگو میں ڈیلیور کردو۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''اور اگر تم ہمیں کھیپ کے مالکان کی شناخت کرادو اور ان کے خلاف گواہی دو تو بیس سال تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سڑتے رہنے سے بچ جاؤ گے۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں کسی طرح بھی ایسا نہیں کرسکتا۔''

میڈونا اسے شعلہ بار نظروں سے گھورنے لگا۔''اس کے سوا تمہارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔'' وہ بولا۔''تم یہ کیوں نہیں سمجھ رہے کہ کھیل ختم ہوچکا ہے۔''

''بہتر ہے۔'' چن نے کافی پس و پیش کے بعد ہامی بھرلی۔''میں شکاگو جاؤں گا اور اس فون کال کا انتظار کروں گا جو متوقع ہے لیکن اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکوں گا۔ میں گواہی نہیں دے سکوں گا۔''

''لیکن کیوں۔''

''کیونکہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔'' چن نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔'اور.....اور میری فیملی کو بھی۔''

''کون تمہیں مار ڈالے گا۔'' میڈونا نے سامنے کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔

چن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میڈونا بے بسی سے محض شانے اچکا کر رہ گیا۔ اس کے دو گھنٹے بعد وہ اس چینی کے ہمراہ ایک پرواز سے شکاگو جارہا تھا۔ چن نے کہا کہ اسے وہاں او ہیئر ہلٹن میں قیام کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ چنانچہ اسے اسی ہوٹل میں لے جایا گیا۔ ڈی ای اے کے تین ایجنٹوں کو ہوٹل کے ہال میں تعین کردیا گیا جبکہ ایک محافظ کو چن کے کمرے میں اس کی نگرانی پر مامور کردیا گیا۔ میڈونا اس سے ملحقہ کمرے میں قیام پذیر ہوگیا۔

رات کے تقریباً گیارہ بجے اچانک میڈونا کا فون گنگنا اٹھا۔ اس نے جھپٹ کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے کوئی شخص چن کے محافظ سے گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ میڈونا نے دیوار کو کھٹ کھٹا کر محافظ کو اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی سیکنڈ کے بعد وہ محافظ اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ [illegible] منٹ کے لیے تنہا رہ گیا۔ دفعتاً میڈونا کے کانوں سے اک پرشور آواز ٹکرائی۔

''دوڑو۔'' وہ چیختا ہوا نگرانی پر مامور ٹیم کے ہمراہ بھاگ کر چن کے کمرے میں داخل ہوا۔

کمرہ خالی تھا۔ چن فرار ہوچکا تھا۔

اس اسمگلر نے ایک سیلڈ رکھڑکی بزور بازو کھول لی تھی اور چھے منزل نیچے ہوٹل کے کنکریٹ کے سائبان پر کود گیا تھا پھر وہاں سے دو منزل نیچے سڑک پر چھلانگ لگائی تھی اور رات کی تاریکی میں تحلیل ہوگیا تھا۔ میڈونا کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے فوراً پولیس اسپتالوں اور ٹرانسپورٹ ٹرمنلز کو بذریعہ ریڈیو چن کے حلیے سے آگاہ کردیا۔ یہ کیسا خوف تھا جس نے اس اسمگلر کو آٹھ منزل کی بلندی سے چھلانگ لگانے پر مجبور کردیا تھا۔

اس کے نصف گھنٹا بعد ایک گشتی پولیس نے ایک زخمی اور پریشان حال ایشین کو دیکھا جو نیویارک کی بس میں سوار ہونے والا تھا۔ اس کی ایک کہنی ٹوٹی ہوئی تھی اور اسے شدید اندرونی چوٹیں آئی تھیں پھر بھی اس نے اپنی تکلیف پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح ہوٹل کے پاس سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی رکوائی تھی اور اس میں سوار ہوکر فرار ہوگیا تھا اور اب جبکہ وہ نیویارک کی بس میں سوار ہونے والا تھا تو گشتی پولیس مین نے بڑھ کر اسے حراست میں لے لیا' وہاں سے اسے سیدھے اسپتال پہنچادیا گیا۔ اگلی صبح میڈونا اسپتال میں اس کے بستر کے پاس کھڑا تھا۔''بیس سال ایک طویل مدت ہوتی ہے' ٹامی۔'' اس نے یاد دلایا۔

جواب میں ٹامی سپاٹ دیوار کو سپاٹ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی یہ خاموشی فیصلہ کن لگتی تھی۔ وہ زبان کھولنے پر جیل جانے کو ترجیح دیتا نظر آرہا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

وہ دہشت زدہ تھا۔ میڈونا کو یہ صاف نظر آ رہا تھا۔
اپنے دفتر پہنچ کر میڈونا نے چن کے فرار ہونے کی حیرت انگیز کوشش اور عدم تعاون سے متعلق ایک رپورٹ لکھی لیکن یہ رپورٹ ظاہر ہے ہر پہلو سے تشنہ تھی۔ اس کے اہم نکات یہ تھے...... برف کی ایک سو اڑتیس بالٹیاں دو سو بارہ پونڈ ہیروئن اور ایک زخمی اسمگلر لیکن ان نکات سے کسی بات کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ میڈونا کو کوئی آئیڈیا نہیں تھا کہ آیا یہ امریکہ پہنچنے والی ہیروئن کی پہلی کھیپ تھی یا بے شمار کھیپوں میں سے ایک تھی اور یہ کہ ہیروئن کس نے بھیجی تھی۔ اس کھیپ کا اصل مالک کون تھا۔

گرمیاں رخصت ہو رہی تھیں اور بار بار پوچھے جانے کے باوجود تائی کے رویے میں کوئی لچک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ بہ دستور خاموش تھا۔ اس دوران میڈنا اس کی ٹکٹوں اور کاغذات کی جانچ پڑتال میں مصروف رہا۔ چن کے پاس سے ایک نوٹ بک برآمد ہوئی تھی جس میں بے شمار ناموں اور فون نمبروں کی کھچڑی سی نظر آتی تھی۔ میڈونا نے اس نوٹ بک کی کاپیاں ڈی ای اے کے دنیا بھر کے تمام دفتروں کو ارسال کر دی تھیں لیکن گزرتا ہوا وقت یہ بتا رہا تھا کہ اس کیس میں ایسا کوئی روزن نہیں تھا جس میں امید کی کوئی ہلکی سی کرن بھی داخل ہو سکتی۔ وہ بے شمار ناموں اور فون نمبروں کی کھچڑی میڈونا کی کوئی مدد نہ کر سکی۔ کسی نے بھی تامی چین یا فنک پن شنگ کا نام نہیں سنا تھا جو اب تک مفرور تھا لیکن میڈونا اتنی آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے ایرپورٹ پر قبضے میں لیے جانے والے سفری دستاویزات کی روشنی میں ایک خاکہ تیار کیا۔ دو مرد، چینی، دھات کے سامان کے ساتھ بینکاک یا ٹوکیو سے ایک ساتھ سفر کر رہے تھے اور ہلٹن ہوٹلوں میں قیام کر رہے تھے۔ یہ خاکہ تیار کرنے کے بعد اس نے یو ایس کسٹمز سروس ڈاٹا بینک سے رابطہ قائم کر لیا۔

یہ ڈاٹا بینک امریکہ کا دورہ کرنے والے غیر ملکی کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ رکھتا ہے۔ جب بھی کوئی غیر ملکی امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے اسے کسٹمز اور امیگریشن کے فارم پر کرنے پڑتے ہیں اور ان فارموں میں درج شدہ معلومات کمپیوٹر کو فیڈ کر دی جاتی ہیں۔ یہ کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ نیشنل نارکوٹکس بورڈ انٹروڈکشن سسٹم پروگرام کے نام سے جانا جاتا ہے۔ میڈونا نے ڈاٹا بینک سے رابطہ تو کر لیا لیکن وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ پروگرام ان دو چینیوں کے بارے میں اسے معلومات فراہم کر سکے گا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ایسا ہو جائے تو یہ ایک کارنامہ ہوگا۔ اسے لاکھوں امیگریشن کارڈز اور کسٹمز فارمز چیک کرنے پڑتے۔ ڈاٹا بینک کی انٹیلی جینس نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس پروگرام سے استفادہ کر سکتا ہے۔

اگست کے اواخر تک اس پروگرام نے میڈونا پہ واضح کر دیا کہ امریکہ کا دورہ کرنے والوں میں کم سے کم انیس غیر ملکی ایسے تھے جو اس کے خاکے سے ملتے جلتے تھے۔ لیکن یہ کوئی بہت حوصلہ افزا بات نہیں تھی۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ انیس غیر ملکیوں کی اس فہرست میں وہ دو چینی کون تھے جو اسے مطلوب تھے۔ وہ سیٹل کے دفتر میں اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا، اس کی اسکرین پر رینگتے ہوئے ناموں کو غور سے دیکھتا رہا۔ یہ انیس افراد اتنی کثرت سے امریکہ کا دورہ کرتے رہے تھے کہ جہاں سے وہ آئے تھے ان ممالک کے نام، ان کی آمد، روانگی، فلائٹ نمبر اور امریکہ میں ان کے قیام اور پتہ وغیرہ کے بارے میں جاننے میں اسے پورا ایک گھنٹا لگ گیا۔ تاہم اندھیرے میں چلایا جانے والا تیر اپنے نشانے پر بیٹھا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے رگ و پے میں زبردست سنسنی دوڑ گئی تھی کہ ہر مشتبہ شخص میں معمولی یکسانیت پائی جاتی تھی۔ ان میں سے بیشتر نے اب تک ایک درجن سے بھی زائد مرتبہ امریکہ کے چکر لگائے تھے اور یہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سب کے سب اپنے ساتھ دھات کی بنی ہوئی برف کی بالٹیاں یا دھات کے گلدان اپنے ساتھ لاتے رہے تھے جنہیں وہ 'سیلز سیمپلز' کہتے تھے۔ ان کی منزل نیو یارک ہوا کرتی تھی اور وہ ہلٹن ہوٹل میں ٹھہرا کرتے تھے۔

فنک پین شینگ نے ایسے چار چکر لگائے تھے۔ ٹامی چن ایک ماہ قبل اپنے ساتھ اٹھانوے بالٹیاں لے کر آیا تھا۔ ان دونوں نے دیگر مسافروں کے ساتھ سفر کیا تھا جن کا کام کمپیوٹر اسکرین پر نمودار ہو رہا تھا۔ وہ مشرق بعید کے ہر گوشے سے آئے ہوئے لگتے تھے۔ میڈونا اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ دم بخود تھا۔ یہ ڈاٹا بیس اس پر واضح کر رہا تھا کہ اس نے منشیات کی بہت ہی وسیع پیمانے پر کی جانے والی اسمگلنگ اور اس کے انتہائی پیچیدہ طریقہ کار کا پتا چلا لیا تھا۔ کئی ماہ کی ناکامی کے بعد آخر کار اب وہ پیش رفت کر سکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر کسٹمز اور امیگریشن کے افسران سے رابطہ قائم کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان مشکوک افراد پر نگاہ رکھیں۔ مبادا وہ اس ملک میں دوبارہ داخل ہوں پھر اس نے طویل فاصلے کے ٹیلی فون کالز کا ریکارڈ طلب کر لیا جو مشکوک افراد نے اپنے ہوٹل کے کمروں سے کیے تھے۔ ان کالوں کی تعداد سینکڑوں تھی اور یہ کالیں ہانگ کانگ اور تائیوان جیسے دور دراز کے ممالک تک کی گئی تھیں۔ ان معلومات سے لیس ہونے کے بعد میڈونا نے ڈی ای اے کے ہیڈ کوارٹرز واشنگٹن کو ایک رپورٹ بھیجی۔ اپنی اس رپورٹ میں اس نے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ اب ممکن ہے چینی سپلائرز صرف ایک آرگنائزیشن کے ذریعے امریکہ میں ہیروئن کی پینسٹھ فیصد مارکیٹ پر چھا جائیں گے۔ پھر اس نے ڈی ای اے کے دفتر واقع نیو یارک سے رابطہ قائم کیا اور اس پر بہت جلد یہ واضح ہو گیا کہ ایشیا کے اسمگلروں کے بارے میں تفتیش ڈی ای اے کی ترجیحات میں سے ایک نہیں ہے۔ ہاں وہ اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک ایجنٹ کو مقرر کر سکتے ہیں اور وہ زیادہ مددگار بھی ثابت نہیں ہوگا۔ اس طرف سے مایوس ہو کر میڈونا نے خود اس کی تفتیش و تحقیق کا بیڑہ اٹھایا۔

مورخہ ۳۰ اگست کو میڈونا کے دفتر میں رکھی ہوئی ٹیلکس مشین نے اسے ایک مختصر سا لیکن اہم پیغام دیا۔ بینکاک میں متعین ڈی ای اے کے ایجنٹوں نیمفر ورفینگ پین شین کا کھوج لگا لیا تھا۔ اسے گولی مار دی گئی تھی اور ڈی ای اے کے ایجنٹوں کو یقین تھا کہ یہ ایک پیشہ ورانہ قتل تھا۔ میڈونا نے محسوس کیا کہ اس کیس کی بعض کڑیاں دنیا کے دوسرے سرے پر بکھری ہوئی ہیں اور یہ کہ ان کڑیوں کو ڈھونڈنے کے لیے اسے وہاں جانا پڑے گا۔ چنانچہ اس نے تھائی لینڈ میں ڈی ای اے کی ٹیم سے ملنے کا اہتمام کیا اور چونکہ یہ شبہ تھا کہ منشیات کی اسمگلنگ کا ہانگ کانگ سے تعلق ہو سکتا تھا' اس نے رائل ہانگ کانگ پولیس سے درخواست کی کہ وہ کوئی سراغ رساں اس کے پاس بھیج دیں۔ میڈونا نے کبھی شمالی امریکہ سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ بینکاک پہنچا تو اسے گرمی کا احساس ہوا۔ وہ نومبر کی ۱۲ تاریخ تھی جب وہ ڈی ای اے کے دفتر میں داخل ہوا اور وہاں موجود کئی ایجنٹوں اور تجزیہ کاروں سے اس نے اپنا تعارف کرایا۔

''مجھے جان پریچارڈ کہتے ہیں۔'' ایک سراغ رساں نے کہا اور مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ وہ انگریز تھا۔ ''میرا تعلق ہانگ کانگ پولیس سے ہے۔''

جواب میں میڈونا گرم جوشی سے مسکرایا اور یہیں سے ان کی دوستی کی ابتدا ہوئی۔ وہ ایک میز پر جا بیٹھے اور جان اسے ہانگ کانگ میں سرگرم عمل چینی اسمگلروں کے گروپ اور ان کے ڈھانچے کے بارے میں بتانے لگا۔ ''بدقسمتی سے۔'' وہ آخر میں بولا۔ ''تم نے جتنی بھی

 DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اوورسیز کالز کی شناخت کرائی تھی ان کا سراغ لگانا ممکن ہی نہیں کہ وہ جرائم کی کس تنظیم کی تھیں۔ ہمارا واسطہ جس سے پڑا ہے وہ جو کوئی بھی ہے بہت چالاک ہے۔''

فینگ کے قتل کے بعد آٹھ عدد پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات تھائی حکام کے ہاتھ لگے تھے۔ جان پریچارڈ اور میڈونا ان پاسپورٹ اور دستاویزات کا معائنہ کرنے لگے۔ ایک پاسپورٹ ہانگ کانگ سے دوسرا سنگاپور سے اور بولیویا کے مقام لاپاز سے جاری ہوا تھا۔

''معلوم ہوتا ہے اس شخص فینگ کے کئی روپ تھے۔'' جان نے تبصرہ کیا۔ ''ایک منٹ۔'' اگلے ہی لمحہ وہ بول پڑا۔ ''یہ کیا ہے۔'' وہ ہانگ کانگ سے جاری کے جانے والے پاسپورٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ پرانا اور خستہ حال تھا تاہم جان یہ دیکھ رہا تھا کہ اس پر چسپاں تصویر فینگ سے مشابہ نہیں تھی۔ ''میں اس شخص کو جانتا ہوں۔'' وہ میڈونا سے بولا۔ ''یہ خود کو لی کوئین عرف ٹائیگر کہتا ہے۔ ایک سابق ریڈ گارڈ...... ہم اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔''

''مجھے اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔'' میڈونا نے خواہش ظاہر کی۔

''آج سے ٹھیک ایک سال پہلے ہانگ کانگ کسٹم بوٹ نے ماہی گیری کے ایک ٹرالر کو پکڑا تھا جس میں آٹومیٹک پستول اور سائیلنسر سمیت دو سو پچانوے پونڈ تھائی ہیروئن برآمد ہوئی تھی۔ اس چھاپے کے دوران جہاز کے کپتان نے جو تعاون کرنے والا شخص تھا نارکوٹکس کے افسران کو یہ بتایا کہ جہاز پر لدے ہوئے اس مال کے آرگنائزر ہانگ کانگ کے باشندے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ان کی گرفتاری عمل میں آئے۔ وہ سب کے سب فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ٹائیگر ان ہی بھگوڑوں میں سے ایک تھا۔''

میڈونا پرخیال انداز میں اس پاسپورٹ کو اپنی انگلیوں سے کھٹکھٹانے لگا۔ آخر کار اسے ایک ایسا ثبوت مل گیا تھا جسے فینگ کے قتل سے جوڑا جا سکتا تھا اور ہانگ کانگ اور سیٹل کیس کی گتھیاں بھی سلجھائی جا سکتی تھیں۔

جان پریچارڈ کا تعلق بیڈفورڈ شائر سے تھا جہاں وہ پولیس آفیسر ہوا کرتا تھا۔ اسی نے رائل ہانگ کانگ پولیس جوائن کیا تھا اور صرف آٹھ ماہ قبل نارکوٹکس بیورو میں اس کا تبادلہ ہوا تھا۔ اب یہ اس کا کام تھا کہ وہ میڈونا کے کیس اور مقامی اسمگلروں کے درمیان رابطہ کا سراغ لگاتا۔ اس کی بہت سی خوبیوں میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ ہانگ کانگ کی زبان بول سکتا تھا۔

اس روز وہ دونوں بینکاک کے ایرپورٹ پر تھے۔ میڈونا واپس امریکہ پرواز کر رہا تھا۔ ایرپورٹ کے باہر بلا کی گرمی تھی۔ ''ایک اندھا دوسرے اندھے کی رہنمائی کر رہا ہے۔'' میڈونا نے ہنس کر کہا۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' جان نے اسے خبردار کیا۔ ''ہم ڈی ای اے ایجنٹ کسی بھی لمحہ کسی بھی جگہ ان ظالموں کا شکار ہو سکتے ہیں۔''

''بالکل۔'' میڈنا نے اپنا سفری بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارا مشورہ یاد رکھوں گا...... خدا حافظ۔'' یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ ٹرمنل کی طرف بڑھ گیا۔

جب جان واپس اپنے دفتر پہنچا تو اس کی میز پر ایک ضخیم سی خفیہ رپورٹ رکھی ہوئی تھی۔ یہ جو اس کی یونٹ نے انتھک کاوشوں کے بعد تیار کی تھی۔ اسکا تعلق پچھلے سال جون میں سیٹل ایرپورٹ پر پکڑی جانے والی برف کی بالٹیوں اور ہانگ کانگ سے ان کے مشکوک رابطہ سے تھا۔ جان کے پانچ سادہ لباس والوں نے جو سب کے سب چینی تھے اس ٹریول ایجنسی کا سراغ لگا لیا تھا جہاں سے ان اسمگلروں نے سیٹل کے لیے ایرلائن کے ٹکٹ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

خریدے تھے لیکن وہ ٹکٹ کیش دے کر خریدے گئے تھے۔ جان کو ہانگ کانگ اور تائیوان کیے جانے والے ان فون کالز کی تفتیش جاری رکھنی تھی جو ٹامی مین کی نوٹ بک سے نقل کیے گئے تھے لیکن وہ اس کی تفتیش کو پس پشت ڈال کر ماہی گیری کے ٹرالر کے ریکارڈز اور اس کے متعلق تفتیشی رپورٹ کا مطالعہ کرنے لگا۔ یکایک وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ ایک ٹاپ سیکرٹ رپورٹ تھی جس میں ہانگ کانگ میں سرگرم عمل مجرموں کی ایک نئی انجمن کی سرگرمیوں کی تفصیل تھی۔ اس کا نام بگ سرکل گینگ تھا۔ یہ گینگ تین سو پچاس درندہ صفت مجرموں پر مشتمل تھا۔ ماضی میں ان کا مرکز چین کا ایک مقام گوانزو ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۷۰ کے اواخر میں اس گینگ نے اپنی مجرمانہ سرگرمیاں ہانگ کانگ منتقل کر دی تھیں لیکن ایسے شواہد موجود تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ چین میں موجود اپنے گروپ کے ارکان سے ان کا اب بھی گہرا رابطہ تھا اور یہ لوگ ان کے ذریعہ بینکاک اور برما کے سرحدی مقام میغار سے ہیروئن منگواتے تھے۔ ٹائیگر لی ان کا ایک لیڈر تھا۔

جان پریچارڈ نے اپنی تحقیق جاری رکھی۔ اسے نومبر ۱۹۸۳ کے ایک کینیڈین کیس کی فائل میں اس بگ سرکل کے جرائم کا حوالہ ملا۔ اس رپورٹ کے بموجب ٹورنٹو پولیس نے دو آدمیوں کو گرفتار کیا تھا جن کے قبضے سے آٹھ پونڈ ہیروئن برآمد ہوئی تھی۔ یہ ہیروئن سوٹ کیس کے مصنوعی تہ میں چھپی ہوئی تھی اور ان کی منزل نیویارک تھی۔ ریکارڈ سے پتا چلتا تھا کہ وہ دو اسمگلر کینیڈا پرواز کرنے سے پہلے سنگاپور میں رکے تھے۔ سنگاپور میں اپنے قیام کے دوران ان دو میں سے ایک نے ہانگ کانگ کے ایک فر کے تاجر کو فون کیا تھا۔ اس کا نام کون یولنگ تھا۔

''مسٹر کون، مجھے یقین ہے کہ تم فر کے علاوہ دیگر چیزوں کی بھی تجارت کرتے ہو۔'' جان نے بلند آواز میں کہا اور مزید انہماک سے فائل کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس سراغ رساں کے مطابق جسے کون یولنگ سے پوچھ گچھ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ کون عرف جانی کون نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ محض ایک ایکسپورٹر تھا۔ شنگھائی میں پیدا ہوا تھا اور اب اپنی بیوی کے ساتھ مرکزی ہانگ کانگ کی بندرگاہ کے اس پار کولون میں ایک نہایت عالیشان اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ پولیس کو اس کے اس بیان پر یقین نہیں آیا تھا کہ سنگاپور سے فون کرنے والا کوئی ایسا شخص ہوگا جو اس کے گھر میں ٹھہرے ہوئے کسی مہمان سے گفتگو کرنا چاہتا ہوگا لیکن پولیس کے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ وہ ٹورنٹو میں پکڑی جانے والی ہیروئن سے اس کا تعلق ثابت کرسکتی۔

جان نے تھکے تھکے سے انداز میں فائل ایک طرف رکھ دی اور سینڈوچ زہر مار کرنے لگا۔ کون یولنگ ...... عرف جانی کون ...... یہ نام اس کے دماغ میں لڑھک رہا تھا۔ اس نے یہ نام پہلے بھی کہیں سنا تھا۔ کب۔ کہاں۔ یہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ ایک بار پھر فائل کا مطالعہ کرنے لگا جو ماہی گیری کے ٹرالر سے برآمد ہونے والی ہیروئن اور اسلحہ کی رپورٹ پر مشتمل تھی اور تب اسے معلوم ہوا کہ اس ٹرالر کے کپتان نے اپنے بیان میں جانی کون کا ذکر کیا تھا۔ وہ ٹرالر کے عملے کو اجرت دیا کرتا تھا۔ اب وہ مفرور تھا۔ قیاس اغلب تھا کہ وہ تائیوان فرار ہو گیا تھا۔

جان نے فائل ایک طرف دکھ کر دوسری فائل اٹھائی۔ اس میں موجود رپورٹ کے مطابق پولیس نے تلاشی کا وارنٹ لے کر جانی کون کے اپارٹمنٹ پر چھاپا مارا تھا اور ریکارڈ کے کئی بکس اٹھا لیے تھے جو ایسے نصف درجن کمپنیوں سے متعلق تھیں جنہیں جانی کون ہانگ کانگ میں کنٹرول کرتا تھا۔ اس کے بہی کھاتوں کی چھان بین سے یہ بات سامنے آئی کہ اس کی آمدنی لاکھوں ڈالر تھی

Downloaded from Paksociety.com

اور یہ فر کی تجارت سے ہونے والی آمدنی نہیں تھی۔ اس کے پے رول پر ساٹھ ملازمین کے نام تھے جن میں سے بیشتر بگ سرکل گینگ کے ممبر تھے۔ ٹائیگر لی ان میں سے ایک تھا۔

یہ ساری کڑیاں ملتی تھیں۔ جان اور میڈونا نے امریکہ میں ہیروئن کی وسیع پیمانے پر اسمگلنگ کے آپریشن کو بے نقاب کیا اور اب وہ دنیا کے خطرناک ترین منشیات فروشوں کا تعاقب کر رہے تھے۔

دسمبر میں جان پریچارڈ ٹامی چن کے مقدمے کے لیے شہادتیں پیش کرنے کے لیے سیٹل پہنچ گیا۔ اسے ٹامی کے خلاف یہ شہادت پیش کرنی تھی کہ ٹامی نے بینکاک کے ایک ایرلائن سے سیٹل کی ٹکٹ خریدیں اور فینگ پین شین کے ہمراہ امریکہ جاتے ہوئے وہ ہانگ کانگ میں رکا تھا۔ جب وہ سیٹل پہنچا تو میڈونا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''جان ہم جانی کون اور اس کے دیگر ساتھیوں کے قریب نہیں پہنچ پا رہے ہیں۔'' وہ مایوسی سے بولا۔ ''برف کی ان بالٹیوں کے پکڑے جانے کے بعد سے اب تک یہ لوگ کم سے کم ایک ٹن ہیروئن یہاں پہنچا چکے ہوں گے اور ہمیں اس کا علم تک نہیں۔''

''ہم پیش رفت کر رہے ہیں۔'' جان نے جواب دیا۔ ''ابھی ہم ٹامی کی نوٹ بک میں درج شدہ فون نمبروں سے فارغ نہیں ہوئے ہیں۔ ممکن ہے ان ہی نمبروں میں ہمارا جواب پوشیدہ ہو۔''

مقدمے کے دوران جان نے کمرہ عدالت میں تقریباً چالیس سال کے ایک دبلے پتلے چینی کو دیکھا جو تماشائیوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ اس کے جسم پر نہایت بیش قیمت سوٹ تھا' وہ تنہا بیٹھا نوٹس لے رہا تھا اور کسی سے بھی گفتگو نہیں کر رہا تھا۔ جان اسے غور سے دیکھنے لگا اور جب اس چینی نے ٹامی سے نظروں کا تبادلہ کیا تو جان یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک تھی۔ جان دھیرے دھیرے اس کے قریب پہنچ گیا اور تب اس نے دیکھا۔ اس اجنبی کے پہلو میں ایک فولڈر رکھا ہوا تھا اور اس پر ایک نام چھپا ہوا تھا جان وہ نام پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ لکھا تھا۔ ''سوانینڈ کار بھاری' سا لیشٹرس' کولون' ہانگ کانگ۔''

جان کو یاد آ گیا' یہ وہی وکلا تھے جنہوں نے کینیڈا اور پھر ماہی گیری ٹرالر کے مدعا علیہان کے مقدمے کی پیروی کی تھی اور اب ٹامی چن کے مقدمے کی پیروی کر رہے تھے' کیوں۔ کیا یہ محض اتفاق تھا۔

۲۳ دسمبر کو عدالت نے ٹامی چن کو بیس سال کی سزا سنا دی جو اسے وفاقی جیل میں کاٹنی تھی۔ ۲۵ دسمبر کو جان واپس ہانگ کانگ پہنچ کر پولیس ہیڈ کوارٹرز کے دفتر میں بیٹھا سینڈوچ کھا رہا تھا اور گرما گرم کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ ساتھ ہی اپنے سراغ رسانوں کی رپورٹ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ جیسے جیسے مطالعہ کر رہا تھا ویسے ویسے اس بات کا قائل ہوتا جا رہا تھا کہ وہ لوگ صحیح راستے پر بڑھ رہے تھے۔ اس وقت جانی کون سے متعلق رپورٹ اس کے زیر مطالعہ تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق' جانی کون ایک غیر قانونی پناہ گزیں تھا۔ جس نے ۱۹۱۳ میں خود کو پناہ گزیں ثابت کر کے حکومت سے اپنے قیام کی اجازت لے لی تھی۔ اس کے پانچ سال بعد وہ ہانگ کانگ سے جنوبی ویت نام چلا گیا تھا اور سائیگاؤن کو اپنے آپریشن کا مرکز بنا کر اسمگل کی ہوئی جیولری' فر اور گھڑیاں امریکی فوجیوں کو بیچنے لگا تھا۔ ۱۹۷۴ سے وہ تھائی لینڈ میں ہیروئن اسمگل کرنے لگا تھا۔ ۱۹۸۰ تک ہانگ کانگ میں واقع اس کی کمپنیوں میں تین سو ملازمین کام کرنے لگے تھے۔ چین میں مزید ڈیڑھ سو ملازمین تھے۔ نیویارک میں بھی اس کی دو فرمیں تھیں۔ ایک فر کی تجارت کرتی تھی' اور دوسری

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اسٹیٹ ایجنسی تھی جو چائنا ٹاؤن میں واقع تھی۔ اب وہ بیالیس سالہ جانی کون عمدہ ترین ریشم کا ہاتھ کا سلا ہوا سوٹ پہنتا تھا اور انتہائی عالی شان ہوٹلوں میں کھانا کھاتا تھا۔ اس کی کلائی میں بڑی ہوئی ڈائمنڈ کی گھڑی کی قیمت تیس ہزار ڈالر تھی۔ اس کے ناخن نہایت نفاست سے ترشے ہوئے تھے لیکن جان پریچارڈ جانتا تھا کہ بہ ظاہر انتہائی مہذب نظر آنے والا یہ شخص اور اس کے گرگے کتنے بے رحم تھے۔ اس کے ساتھی جو سابق ریڈ گارڈز تھے نہ صرف ہیروئن اسمگل کرنے میں بلکہ مسلح ڈکیتی اور قتل کرنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ جان کو شبہ تھا کہ خود جانی کون نے فینک کو ہلاک کرنے کا حکم دیا تھا۔

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ جنوری کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ جان پریچارڈ رات رات بھر اپنے اسکواڈ روم میں تنہا بیٹھا لیمپ کی روشنی میں وہ درجنوں فون کالز کو چیک کرتا رہتا جو ٹامی چن کی نوٹ بک سے حاصل کیے گئے تھے۔ جلد یا بدیر اس تلاش کا اختتام ہونا تھا اور ہوا بھی یہی۔ جنوری کے اواخر میں ایک رات اسے ایک سراغ مل ہی گیا۔ ۱۹۸۳ میں کون کے ایک ساتھی نے ہانگ کانگ سے تائیوان ایک کال بک کرائی تھی وہی فون نمبر ٹامی چن کی نوٹ بک میں بھی موجود تھا۔ جان نے فوراً میڈونا سے سیٹل کے ہیڈ کوارٹرز میں رابطہ قائم کیا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ صبر سے کام لو۔''

اس نے ماؤتھ پیس میں کہا اور ساری تفصیل اس کے گوش گزار کر دی۔ اس کے بعد وہ سورج طلوع ہونے تک سرکاری رپورٹ ٹائپ کرتا رہا۔ شہادتوں کی کڑیاں بالکل واضح تھیں۔ جانی کون کی تنظیم جون میں ہیروئن کی کھیپ سیٹل بھیجنے کی ذمہ دار تھی اور یقیناً اسی تنظیم نے اس وقت اسے اب تک ہیروئن کی نہ جانے کتنی کھیپ امریکہ بھیجی ہو گی جانی کون کی سنڈیکیٹ کو بے نقاب کرنا بذات خود ایک بہت بڑا کارنامہ تھا لیکن یہ محض آغاز تھا۔ ہانگ کانگ کی پولیس کے پاس صرف ایک گواہ تھا۔ ماہی گیری کے ٹرالر کا کپتان...... اور جب تک دوسرے گواہ نہ ملتے گرفتاری، الزام اور سزا یہ سب ایک خواب تھا۔

☆☆

''مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ تم لوگ میرے یہاں آنے سے پہلے کیا کرتے رہے تھے۔'' اسپیشل ایجنٹ رچرڈ لا میگنا تند لہجے میں بولا۔ ''گروپ ۱۴ ڈی ای اے کا سب سے طاقتور گروپ بن کر رہے گا۔''

اس وقت وہ نیویارک کی فیڈرل بلڈنگ کے دفتر میں کھڑا اپنے ایجنٹوں کو گھور رہا تھا۔ اسے خبروں کے اوائل میں اس گروپ کا چارج لینے کے احکامات دیے گئے تھے اور وہ اس گروپ کی کارگزاریاں سن کر دہشت زدہ ہو گیا تھا یہ گروپ ہیروئن کی اسمگلنگ اور اس میں کی جانے والی سازشوں کو بے نقاب کرنے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا لیکن اس گروپ نے اب تک اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی کارگزاری صفر تھی۔ گرفتاریاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دیگر تمام ایجنسیوں کے مقابلے میں یہ ایجنسی بڑی تھی۔ یہ لوگ فیلڈ میں نکل کر عملی اقدامات کرنے کے بجائے محض کاغذی کارروائیاں کرتے رہے تھے۔ حد تو یہ کہ اس گروپ کے پاس نگرانی کرنے کے لیے کوئی کار تک نہیں تھی۔ اس گروپ میں شامل پانچ ایجنٹ میں سے تین ایجنٹ یہاں سے نکلنے کے چکر میں تھے۔ اسی عمارت میں موجود یو ایس اٹارنیز ان ایجنٹوں کو کسی کیس کے پیچھے لگانے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے ان سے ذاتی گارڈ کا کام لیتے تھے۔ چنانچہ یہ گروپ بالکل ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا لیکن اب حکومت نے اس گروپ کو موثر بنانے کی ٹھان لی تھی اور ایک انتہائی قابل اور باعمل شخص کو اس کا چارج دے دیا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لامیکنا واحد سرکاری افسر تھا جو نہ صرف ایشیائی امور کا ماہر تھا بلکہ ایشیا کی کئی زبانیں بول سکتا تھا۔ اس نے ایشیا میں ساڑھے چھ سال گزارے تھے۔ پہلے ہانگ کانگ میں اور پھر بینکاک میں۔ وہ ایک سخت کوش اور نہایت بااصول افسر تھا اور اپنے ماتحتوں سے بھی ان ہی خوبیوں کی توقع رکھتا تھا۔

''جیسے ہی کوئی یو ایس اٹارنی تمہیں گارڈ کی ڈیوٹی دینے کے لیے طلب کرے۔ ویسے ہی مجھے خبر کرو۔'' وہ پھنکارا۔ ''تم میرے ماتحت ہو' ان کے نہیں۔ میں دیکھوں گا کہ وہ کس طرح تم لوگوں سے اپنا کام لیتے ہیں۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''اب ہم گرفتاریاں کریں گے۔''

اس نے بے شک گرفتاریاں کیں لیکن وہ اسی پر اکتفا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے گروپ ۴۱ کو از سر نو منظم کرنے کے لیے بوکلین اور کوئینز کے ڈی ای اے ایجنٹوں کو اپنے گروپ میں شامل کرلیا اور انہیں بالکل الرٹ کردیا۔ ان ہی میں سے کیون نامی ایک انتیس سالہ ایجنٹ تھا جسے اس نے کون کے تفتیشی امور کا سربراہ بنایا تھا۔ اس ٹیم کو کام شروع کیے ایک ہی ہفتہ ہوا تھا ۱۹ جنوری کو رات کے آٹھ بجے لامیکنا کو نیویارک کے کینیڈی ایئرپورٹ کے کسٹمز انسپکٹر کی ایک کال موصول ہوئی۔ اس کال کے مطابق کسٹمز نے ایک چینی عورت کو گرفتار کرلیا تھا اور اس کے قبضے سے چوالیس پونڈ ہیروئن برآمد کرلی تھی۔ یہ ہیروئن دھات کے بنے ہوئے تصویروں کے بڑے بڑے فریم میں پیک کی گئی تھی جنہیں مین ہیسٹن کے ایک ہوٹل میں ڈیلیور کیا جانا تھا۔

لامیکنا فوراً کینیڈی ایئرپورٹ پہنچ گیا اور اس نے عورت سے پوچھ گچھ شروع کردی۔ اس عورت کے بیان کے مطابق وہ ٹوکیو سے وارد ہوئی تھی اور تصویروں کے فریم اپنے ایک دوست کے کہنے پر لائی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ان میں ہیروئن چھپی ہوئی تھی۔

''تمہیں یہ فریم کہاں پہنچانے تھے۔'' لامیکنا نے اس سے اس کی زبان میں پوچھا۔

''مجھے یہ فریم ہوٹل لے جانے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پھر کوئی شخص مجھ سے رابطہ کرتا اور آکر یہ سارے فریم لے جاتا۔''

''ٹھیک ہے۔'' لامیکنا نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ''ہم اس شخص کا انتظار کریں گے۔''

اس کے پاسپورٹ کے مطابق وہ باون سال کی تھی اور تائیوان کی رہنے والی تھی۔ بہت خوش پوش اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اور بہت بے چین نظر آرہی تھی۔ لمحے دھیرے دھیرے گزرتے رہے۔ دو گھنٹے کے بعد اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ لامیکنا نے اسے فون کے جواب دینے کا اشارہ کیا۔ ساتھ ہی یہ ہدایت کی کہ وہ نہایت پرسکون انداز میں گفتگو کرے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں لیکن وہ عورت فون اٹھا کر پھٹ پڑی۔ وہ نہایت تیزی سے چینی زبان میں گفتگو کرنے لگی تھی۔ لامیکنا حیرت سے پلکیں جھپکانے لگا۔ اتنی رواں چینی اس کے پلے نہیں پڑ رہی تھی تاہم وہ سمجھ گیا کہ عورت فون کرنے والے کو اپنی گرفتاری سے مطلع کررہی تھی اور یہ بھی بتا رہی تھی کہ اس کے اردگرد سارے افسران موجود تھے۔ اس نے جھپٹ کر ریسیور اس عورت سے لے لیا اور کریڈل پر پٹخ دیا۔ ''بہت ہوچکا۔'' وہ پھنکارا۔ ''تمہارا کھیل ختم ہوگیا۔'' پھر اس نے کیون کو مخاطب کیا۔ ''اسے لے چلو۔''

عورت ان کی رہنمائی میں چل پڑی۔ اس نے مزید ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لیکن لامیکنا اپنے احساسات کو جھٹکنے میں ناکام رہا۔ اس گرفتاری میں کوئی قدر مشترک تھی اور وہ اس سے مانوس تھا۔ اگلے روز وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ڈی ای اے کی پچھلی رپورٹ پڑھ رہا تھا۔ ایسے میں چند ماہ پہلے سیٹل میں برف کی بالٹیوں کی ضبطی کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

رپورٹ اس کی نظروں سے گزری۔ یکا یک وہ اپنی نشست پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کیسوں میں حیرت انگیز مشابہت تھی۔ پچھلے اسمگلر بھی چینی تھے اور دھات کی بنی ہوئی بالٹیوں میں ہیروئن چھپا کر لائے تھے۔ اس مرتبہ بھی اسمگلر ایک چینی خاتون تھی اور وہ بھی دھات کے بنے ہوئے فریم میں ہیروئن چھپا کر لائی تھی۔ کیا ان دونوں کیسوں کا آپس میں کوئی تعلق تھا۔ اس نے فوراً سیٹل ہیڈ کوارٹر میں میڈونا سے رابطہ قائم کیا اور شروع سے آخر تک ساری بات اسے کہہ سنائی۔ میڈونا نے نہایت سکون سے یہ تفصیل سنی اور پھر گویا ہوا۔ ''اس کے سفر کا روٹ معلوم کرو' یہ بھی کہ وہ کہاں کہاں کا چکر لگا کر پہنچی ہے۔''

''ٹوکیو سے نان اسٹاپ۔'' لامیکنا نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کے ٹکٹ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ بینکاک سے چلی تھی۔''

''یہ وہی روٹ ہے جو ٹامی چن اور فینگ پین شین نے اختیار کیا تھا۔'' وہ بولا۔ ''کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ وہ تھائی لینڈ میں کس ہوٹل میں ٹھہری تھی۔''

''وی مونٹین میں۔'' لامیکنا نے جواب دیا۔

''یہ وہی ہوٹل ہے جہاں ٹامی چن اپنے بینکاک میں قیام کے دوران ٹھہرا تھا۔'' اس نے آگاہ کیا۔ ''یہ کون کی ایک اور کھیپ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ٹامی چن کی گرفتاری اور جان پریچارڈ کی تفتیش سمیت اب تک کی پیش رفت سے اسے آگاہ کر دیا۔

''لیکن۔'' وہ آخر میں بولا۔ ''جب تک ہمیں حکومت کی تائید اور حمایت حاصل نہ ہو ہم اس معاملے میں پیش رفت نہیں کر سکتے۔''

''ٹھیک ہے۔'' لامیکنا نے جواب دیا۔ ''میں ہیڈ کوارٹرز سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔''

اس کے تین دن بعد لامیکنا مشرقی ڈویژن کے جسٹس ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ اسسٹنٹ یو ایس اٹارنی مس کیتھرین پامر سے ملنے پہنچ گیا۔ وہ تقریباً تیس سال کی اک خوش رو خاتون تھی اور منشیات کی اسمگلنگ اور اس میں ہونے والی سازشوں کے مقدمات میں زیادہ تجربہ نہیں رکھتی تھی۔ اس نے حال ہی میں یہ ڈیپارٹمنٹ جوائن کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ وکلاء کی ایک فرم سے منسلک تھی جہاں بوریت کے سوا کچھ نہ تھا۔ لامیکنا اس کے دفتر کا جائزہ لیتے ہوئے ایک لمحے کے لیے چکرا گیا۔ دفت رکی دیواریں بیس بال کے کھلاڑیوں کے پوسٹرز سے مزین تھیں۔ کیتھرین کی شخصیت میں اٹارنی والا طمطراق بھی نہ تھا۔ لامیکنا آج تک کسی ایسے اٹارنی سے نہیں ملا تھا۔

''لگتا ہے تم بیس بال کی زبردست فین ہو۔'' اس نے تبصرہ کیا اس کے لہجے میں بہ دستور حیرت تھی۔

''تمہارا خیال بالکل درست ہے۔'' وہ مسکائی۔ ''میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں۔''

لامیکنا اسے سیٹل اور کینیڈی ایئرپورٹ پر ضبط کی جانے والی ہیروئن کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ ''اب تم دیکھ سکتی ہو کہ ایشین اسمگلر کس طرح نیویارک کی ہیروئن کی مارکیٹ پر چھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' وہ آخر میں بولا۔ ''ہمیں اس آپریشن کو ناکام بنانے کے لیے بہت سوچ سمجھ کر لائحہ عمل بنانا پڑے گا۔ کامیابی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں مزید سپورٹ کی ضرورت ہے۔ گروپ ۴۱ محض ایک سی کلاس ٹیم ہے۔ ہمارے ہاں سہولتوں کا فقدان ہے۔ کیا ہم تم پر بھروسا کر سکتے ہیں۔''

''ہمیں کس بات کا انتظار ہے۔ کیتھرین مسکرا کر بولی۔ ''میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

لامیکنا کو یوں محسوس ہوا گویا اس کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ وہ یو ایس اٹارنی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے دفتر کے تعاون کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ نہ وہ، نہ میڈونا۔ اسسٹنٹ یو ایس اٹارنی ہی تفتیش کی راہیں متعین کرتا ہے اور تلاشی کے وارنٹ جاری کرتا ہے اور آخر میں فرد جرم عائد کرنا اور مقدمہ لڑ کر جیتنا بھی اسی کا کام ہوا ہے۔ اب یہ سب کچھ کیتھرین کو کرنا تھا۔ کیتھرین کی طرف سے تعاون کی یقین دہانی کے بعد لامیکنا نے میڈونا سے رابطہ قائم کرلیا اور اس سے نیویارک پہنچنے کی درخواست کی۔

دو ہفتے کے بعد میڈونا بذریعہ طیارہ نیویارک پہنچ گیا۔ وہ اپنے ساتھ جانی کون کے خلاف جان پریچارڈ کے نوٹس سمیت پتے اور فون نمبر لے کر آیا تھا جو ٹامی چن کے قبضے سے برآمد ہوئے تھے۔ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ چینی اسمگلروں کا طریقہ کار ایک ہی تھا چنانچہ وہ اور میکنا ہیروئن کی اسمگلنگ کے کیس کی تفتیش میں جت گئے۔ آخر کار ۱۸ جون کی شب محوخواب میڈونا کے سرہانے رکھے ہوئے فون کی گھنٹی سناٹے میں بج اٹھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دوسری طرف سے ہانگ کانگ سے جان پریچارڈ بول رہا تھا۔ ''ان لوگوں نے اسے مار ڈالا۔'' میڈونا کو اس کی آواز سنائی دی۔

''کیا۔'' میڈنا کی نیند غائب ہوگئی۔ ''کون۔ کس نے کس کو مار ڈالا۔''

''ہمارے گواہ کو۔'' جان نے جواب دی۔

''تمہارا مطلب ہے۔''

''ہاں۔'' جان نے اس کا جملہ اچک لیا۔ ''پیشہ ور قاتلوں کی ایک ٹیم نے ماہی گیری کے ٹرالر کے کپتان کو مار ڈالا۔ اسے اعشاریہ چار پانچ کے ریوالور سے پیٹھ میں گولی ماری گئی ہے۔ قاتل فرار ہوگئے ہیں۔ جانی کون کے خلاف کیس کی پوری عمارت زمین بوس ہوگئی ہے۔''

''یہ بہت برا ہوا۔'' میڈونا نے تاسف سے کہا۔ ''ہم جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے ہیں۔''

نیویارک میں بھی لامیکنا اور اس کے گروپ ۴۱ کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہورہی تھی۔ کیون روزانہ اپنے ایجنٹوں کے ہمراہ سڑکوں کی خاک چھانتا رہتا۔ یہ لوگ ایشین اسمگلرز کے رابطوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے ساتھ ہی نئے مخبروں اور ایجنٹوں کو بھرتی کررہے تھے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود وہ جانی کون کے مقامی ڈسٹری بیوٹرز کا سراغ لگانے سے قاصر تھے۔ سیٹل ایرپورٹ پر ایک امیگریشن انسپکٹر نے ایک تائیوانی مسافر کو روک لیا تھا جس کا ویزا جعلی تھا لیکن اگر ڈی ای اے اس میں دلچسپی نہ لیتی تو اس مسافر کو محض واپس بھیج دیا جاتا چنانچہ اس امیگریشن انسپکٹر نے فی الفور میڈونا سے رابطہ قائم کرلیا۔

''اس کا نام۔'' میڈونا نے اپنی فہرست کا اوپر سے نیچے جائزہ لیتے ہوئے فون پر پوچھا۔

''ین چنگ لینگ۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''عرف آہ لنگ۔''

''اسے روک لو۔'' میڈونا تقریباً چیخ پڑا۔ ''میں پہنچ رہا ہوں۔''

میڈونا کے کمپیوٹر میں اس کا پورا ریکارڈ موجود تھا۔ وہ ایک ساؤتھ امریکن تھا جسے چینی والدین نے گود لے لیا تھا اس کے پاسپورٹ سے اس کی مختلف تاریخ پیدائش اور مختلف قومیت ظاہر ہوتی تھی۔ وہ جنوری سے اب تک تقریباً بیس مرتبہ نیویارک کے پھیرے لگا چکا تھا۔ دو مرتبہ دھات کے بنے ہوئے مگ اپنے ساتھ لایا تھا۔ دو مرتبہ فینگ پین شین اور ایک مرتبہ ٹائیگر لی کے ہمراہ آیا تھا۔

میڈونا ان معلومات سے لیس آندھی کی طرح ایرپورٹ پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ آہ لنگ تقریباً چالیس سال کا ایک منحنی سا شخص تھا۔ اس کے بال نہایت نفاست سے سنورے ہوئے تھے۔ انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ چہرے پر میک اپ کے نشانات تھے۔ وہ بظاہر ایک جوکر لگتا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تھا لیکن اس میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔
''تم لوگوں کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ بولا اور بار بار یہی الفاظ دہراتا رہا۔ ''میں ایک تاجر ہوں۔ چیزیں ایکسپورٹ کرتا ہوں۔ یہ رہا میرا کارڈ۔''

میڈونا نے اس کے تائی کے پتے پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر کارڈ میز پر پھینک دیا۔ ''تمہارا نام میری فہرست میں شامل ہے۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ 'لہٰذا ہم برف کی ان بالٹیوں اور ان گلدانوں کی بات کرتے ہیں جو تم نے مسٹر کون کے لیے ڈیلیور کیے تھے۔''

اس کے بعد وہ اسے پڑھ کر سنانے لگا کہ وہ کس کس تاریخ کو نیویارک اور شکاگو آیا تھا اور کس کس ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور کب وہاں سے روانہ ہوا تھا۔ ''ہم تمہارے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔'' میڈونا تند لہجے میں بولا۔ ''تم خود دیکھ سکتے ہو میرے پاس جو ثبوت ہے وہ تمہیں عمر بھر کے لیے جیل میں سڑا سکتا ہے۔'' اس نے فہرست اس کے منہ پر کھینچ ماری۔

آہ لنگ نے فہرست اٹھا کر ان تاریخوں کا جائزہ لیا اور اس کی رنگت اڑ گئی۔ وہ واضح طور پر کانپنے لگا تھا۔ یکا یک وہ اپنی کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور دیر تک لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ ''ایک طرح سے آخر کار وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''یہ اچھا ہی ہوا کہ کھیل ختم ہو گیا ایک طرح سے...... میں جانتا تھا کہ جلد یا بدیر یہ ہونا تھا۔''

''تم جانی کون کے لیے کام کرتے رہے ہو۔'' میڈونا نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کب سے۔''

''۱۹۸۳ سے میں اس کے لیے کام کرتا رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ پھر خود ہی بتانے لگا کہ اس نے فینگ کو کس طرح کون سے متعارف کرایا تھا۔

''فینگ ایک ایسا شخص تھا جسے میں اپنا بھائی سمجھتا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''اس نے امریکہ کے تین چکر لگائے تھے اور جب اس کا آخری چکر ناکام رہا تو ان لوگوں نے اسے ہلاک کر ڈالا۔''

ایجنٹوں کو اس کے بریف کیس میں ایک لفافہ ملا جس میں نصف درجن فوٹو تھے۔ میڈونا نے وہ سارے فوٹو میز پر سجا دیے۔ ''وہ کون لوگ ہیں۔''

آہ لنگ کے پاس تعاون کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دوسری صورت میں اسے بھی ٹامی چن کی طرح جیل میں سڑنا پڑتا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے ہچکچایا اور پھر اس نے فیصلہ کن انداز میں اپنی انگلی ایک تصویر پر رکھ دی۔ ''یہ کون ہے۔ وہ بولا۔ ''جانی کون۔''

تصویر والے شخص کی شکل چپٹی تھی' سر پر نقلی وگ اور منہ پر نقلی مونچھیں تھیں۔ ''اور یہ ٹائیگر لی ہے۔'' اس نے دوسری تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ اس طرح وہ بقیہ لوگوں کی بھی نشاندہی کرتا چلا گیا۔ یہ سارے کے سارے بگ سرکل گینگ کے ممبران تھے۔

''جب سے انہوں نے جنگ فینگ کو شوٹ کیا ہے' میں اپنے بریف کیس میں ان لوگوں کی تصویریں لیے پھر رہا ہوں۔'' وہ مزید بولا۔ ''میں اس انتظار میں تھا کہ موقع ملے اور میں یہ تصویریں کسی کو دکھا دوں۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''یہ تصویریں تو محض آغاز ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ بگ سرکل گینگ کس طرح کام کرتا ہے۔ ان کا طریقہ کار کیا ہے' پچھلے چند سالوں میں اس نے کتنی ہیروئن امریکہ اسمگل کی ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کون یہ ہیروئن سپلائی کرتا ہے۔''

☆☆

۲۴ اور ۲۶ ستمبر کو سیٹل کے نواح میں واقع ایک ہوٹل کے کمرے میں جہاں سخت پہرہ تھا' آہ لنگ' میڈونا اور لامیکنا کے درمیان خفیہ بات

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

چیت ہوئی۔

''کیا تم ہم سے تعاون کرنے کو تیار ہو۔'' میڈونا نے پوچھا۔

آہ لنگ خاموش رہا پھر کافی دیر کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں۔''

دونوں ایجنٹ اس کی طرف جھک گئے۔

''ایک اور قدم بڑھانے کے بارے میں کیا خیال ہے' آہ لنگ۔'' لامیکنا نے پوچھا۔ ''کیا تم ہمارے لیے کام کروگے۔ تم حسب سابق اپنا کام کرتے رہو اور سب کی رپورٹ ہمیں دیتے رہو۔ مال کب جہاز پر لادا گیا' سپلائر کون کون ہیں' نئے روٹ کون کون سے ہیں اور سب سے بڑھ کر' جانی کون کے بارے میں بتاتے رہو۔ اس کے بدلے ہم تمہاری ہر طرح سے مدد کریں گے لیکن ہم تمہیں دھوکا میں رکھنا نہیں چاہتے اگر تم نے ہم سے دھوکہ کا ی تو زندہ نہیں بچوگے۔''

آہ لنگ ایک بار پھر کافی دیر تک خاموش رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں یہ کام کروں گا۔'' وہ پرسکون لہجے میں بولا۔

☆☆

آہ لنگ' ہانگ کانگ لوٹ گیا اور وہاں جان ریچارڈ سے ملا۔ اس نے ایک بار پھر بگ سرکل گینگ کے ہر ممبر کی تصویر کی شناخت کرائی۔ چنانچہ جان اور پولیس کے تجزیہ کار مل کر جانی کی تنظیم کا ایک چارٹ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس چارٹ میں وہ ساری معلومات تھیں جو انہیں درکار تھیں۔ یہ چارٹ مکمل ہوا تو کسی دیو قامت مکڑے کے جال سے مشابہ تھا جو پوری دنیا پر پھیلا ہوا تھا۔ صورت حال دہشت ناک تھی۔ اس میں ہالینڈ اور جرمنی میں ہیروئن کے تقسیم کنندگان کے پتے اور ان کے خفیہ ٹھکانوں کی بھی نشاندہی کی گئی تھی۔ منیلا اور پناما میں ہیروئن کے گودام تھے۔ پیرا گوئے میں گھڑی سازی کا کارخانہ' تائیوان میں ایک کیسینو' ٹکیو میں ایک بار اور ایک کلب اور چین میں فراکیسپورٹ کرنے والی کمپنیاں تھیں اور بقول آہ لنگ ان میں سے ہر دھندے کی آڑ میں ہیروئن اور کوکین کا دھندا ہوتا تھا۔

۱۹۸۶ کے پورے موسم خزاں کے دوران آہ لنگ نہایت دیانتداری سے جان ریچارڈ اور میڈونا کو اپنی رپورٹ ارسال کرتا رہا۔ کبھی کبھی تو اس کی کال رات گئے آتی اور میڈونا کو نیند سے بیدار کردیتی۔ دوسرے موقعوں پر آہ لنگ ہانگ کانگ میں متعین ڈی ای اے کے ایجنٹوں سے ایک بے نام عمارت کی سنسان بغلی گزرگاہ میں خفیہ طور پر ملتا اور اپنی رپورٹ ان کے حوالے کردیتا۔ یہ عمارت خاصی محفوظ تصور کی جاتی تھی لیکن لگتا تھا کہ جانی کون' آہ لنگ کو اپنے سے بے حد قریب رکھتا تھا اور آہ لنگ نے اس عرصے میں کوئی نیا بزنس نہیں دیا تھا جانی کون اپنی آرگنائزیشن کے ممبران سے اکثر و بیشتر صلاح مشورے کرتا رہتا تھا اور آہ لنگ نے پچھلے کئی ماہ سے اسے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ ان باتوں نے میڈنا کو مضطرب کردیا تھا۔ کیا وہ آلنگ کا پردہ فاش ہوگیا تھا۔ یہ ناممکن تھا لیکن میڈونا اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو آہ لنگ یقیناً مارا جائے گا۔

کیتھرین پامر نہایت پابندی سے ہر ہفتہ میڈونا سے رپورٹ طلب کرتی اور میڈونا اسے ہر وہ اطلاع فراہم کرتا جو اس کی میز سے ہوکر گزرتی لیکن معلومات اتنی کم اور ناکافی تھیں کہ وہ کوئی کارروائی نہیں کرسکتے تھے۔ اس دوران دن رات کی محنت اور بھاگ دوڑ میڈونا کی صحت پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ جب وہ شیو کرنے کے لیے آئینے میں اپنا عکس دیکھتا تو اسے اپنے چہرے پر تھکن کے نمایاں اثرات نظر آتے اس کے چہرے سے شادابی رخصت ہوگئی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑگئے تھے جو شب بیداری کی

Downloaded from Paksociety.com

تھے۔

۱۱ جنوری ۱۹۸۷ کو رات کے گیارہ بجے اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ دوسری طرف سے ساؤتھ امریکہ کا ڈی ای اے ایجنٹ بول رہا تھا۔ ''ابھی ابھی تار واشنگٹن پہنچا ہے۔'' میڈونا کو اس کی آواز سنائی دی۔ ''پیراگوئے میں متعین یو ایس ایجنسی نے رپورٹ دی ہے کہ پولیس نے ایک شخص کو کوکین اسمگل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا ہے اور جانی کون کیس پر کام کرنے والے ہمارے ایجنٹوں کو یہ ٹیلیکس بھیج دیا گیا ہے۔''

''اس کا نام۔'' میڈونا نے پوچھا۔

''رکی چن۔'' جواب ملا۔

رکی چن ہانگ کانگ کا رہنے والا تھا۔ اس کی عمر پینتیس سال تھی۔ جان پریچارڈ اور آہ لنگ نے اسے بگ سرکل گینگ کے اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے شناخت کرلیا۔ پولیس کی پوچھ گچھ کے دوران چن نے اقرار کیا کہ وہ ہانگ کانگ سے پرواز کرکے نیویارک سے ہوتا ہوا پیراگوئے پہنچا تھا اور یہ کہ اس کے پاس پچیس ہزار ڈالر کیش تھے جو کون نے منشیات کی خریداری کے لیے اسے دیے تھے۔ میڈنا کو فوراً یہ خیال آیا کہ اگر چن تعاون کرنے کو تیار ہوجائے تو بگ سرکل گینگ اور اس کے لیڈران کے خلاف فرد جرم عائد کرنے کے لیے ایک اہم گواہ مل جائے گا لیکن سوالیہ تھا کہ کیا جنوبی امریکہ اس ملک پیراگوئے کے حکام اسے اس کے حوالے کردیں گے۔ اب تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جنوبی امریکہ کے درمیان مجرموں کے تبادلے کا کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا ایک حل کیتھرین نے ڈھونڈ نکالا۔ وہ جانتی تھی کہ کوئی بھی مسافر خواہ مختصر سے وقفہ کے لیے ہی امریکہ کی سرزمین پر رکتا ہے اور دس ہزار ڈالر سے زیادہ کیش لے کر نکل جاتا ہے تو اسے امریکی کسٹمز کے حکام کو یہ بتانا پڑتا ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو امریکی قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

''میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اس نے کسٹمز کو نہیں بتایا تھا۔'' وہ بولی۔

''میں چیک کرتا ہوں۔'' لامیکنا نے جواب دیا اور اسی وقت کسٹمز سے رابطہ قائم کرلیا۔ ''چن نے نیویارک کسٹمز کو نہیں بتایا تھا کہ اس کے پاس پچیس ہزار ڈالر تھے۔'' چند لمحوں کے بعد اس نے کیتھرین کو آگاہ کیا۔

''اب میں اس کے خلاف قانونی کارروائی کرسکتی ہوں۔'' کیتھرین ٹھوس لہجے میں بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے اک ہفتہ کے اندر امریکی حکام سے گفت وشنید کرکے ایک معاہدہ تیار کرلیا جس کے تحت پیراگوئے کے حکام چن کو ان کے حوالے کردیتے اور وہ ڈی ای اے کے ایجنٹوں کی تحویل میں اسے دیا جاتا۔ چن کو اس بات کا علم ہوچکا تھا اور وہ جنوبی امریکہ کی جیل سے رہائی پانے کے تصور سے بہت خوش تھا کیونکہ وہاں مجرموں کی خاصی درگت بنائی جاتی تھی۔ وہ سب کچھ بتانے کو بھی تیار تھا۔

۹ مارچ کو اسے ڈی ای اے کے ایجنٹوں کے حوالے کردیا گیا جو اسے لے کر نیویارک پرواز کرگئے۔ اس کے اگلے روز کیتھرین پامر کے دفتر میں بیٹھا جانی کون کی سلطنت اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں واقع اس کی جائیدادوں کا پول کھول رہا تھا۔ اب کیتھرین کو اس پر فرد جرم عائد کرنے کے لیے صرف ایک قدم اٹھانا تھا۔

اپریل میں میڈونا اور لامیکنا کو اطلاع ملی کہ جانی کون نے آہ لنگ کو کئی ماہ کے بعد پہلی بار ملنے کے لیے سنگاپور طلب کیا تھا۔ ''اس سے کہو کہ وہ بے حد محتاط رہے۔'' میڈونا نے اطلاع بہم پہنچانے والے ایجنٹوں کو خبردار کیا۔ آہ لنگ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

۱۴ اپریل کو سنگاپور پرواز کر گیا اور بذریعہ ٹیکسی ایک عالی شان ہوٹل میں وارد ہوا۔ جانی کون نے اپنے سوئٹ کے دروازے پر اس کا استقبال کیا اور پھر ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''چائے پیو گے۔ اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' آہ لنگ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد چائے آ گئی۔ آہ لنگ چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ جانی کون سگریٹ کے دھوئیں کے اس پار سے آہ لنگ کا جائزہ لے رہا تھا۔

''ہمارے درمیان ایک غدار گھس آیا ہے۔'' اچانک وہ بول پڑا۔ ''کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ کون ہے۔''

آہ لنگ کو یوں محسوس ہوا گویا برفیلی انگلیوں نے اس کے حلق کو جکڑ لیا ہو۔ ''میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ منمنایا۔ ''ادھر کچھ عرصہ سے قسمت ہمارا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے' اسے ڈھونڈ نکالنا ہوگا۔''

جانی کون نے سلگتا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ''ہمارے آدمی پکڑے جا رہے ہیں' سپلائرز کا مجھ پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اب وہ ادھار مال نہیں دے رہے ہیں۔ اب پیشگی ادائیگی کرنی پڑے گی۔ کیش میں۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''اب میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ چن' پیراگوئے میں پکڑا گیا ہے اور ہمارے آدمیوں کو شبہ ہے کہ وہ نیویارک کی ایک اٹارنی سے مل گیا ہے اگر یہ بات درست ہے تو وہ ہماری پہنچ سے دور نہیں ہے۔ ہمارے آدمی اس کا پتا چلائیں گے کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔ اسے بھی دوسروں کی طرح جہنم رسید کر دیا جائے گا۔''

آہ لنگ سن ہو کر رہ گیا۔ جانی کون کو اور کیا کیا معلوم تھا۔ کیا وہ اس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

کیا وہ اس سوئیٹ سے زندہ سلامت نکل سکے گا۔

جانی کون اس کی طرف دیکھ کر دھیمے سے مسکرایا۔ ''میں نے ان وجوہات کی بنا پر تمہیں سنگاپور طلب نہیں کیا ہے۔'' وہ بولا پھر رک کر ایک گہری سانس لی۔ ''چن کی گرفتاری نے ہمیں پورے پاناما میں اپنا کاروبار بند کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔'' اس نے چند لمحہ کے وقف کے بعد کہا۔ ''اب ہمیں نئے طریقے اختیار کرنے پڑیں گے۔ نئے روٹ دریافت کرنے پڑیں گے۔ اب تمہیں پہلے سے کہیں اہم اور فعال کردار ادا کرنا پڑے گا۔''

آہ لنگ نے سکون کی ایک گہری سانس لی۔ ''ہیروئن کی ترسیل اب بھی ہمارے منصوبے میں ہے۔'' جانی کون دوبارہ گویا ہوا۔ ''اس کی مقدار کم سے کم ایک ٹن ہوگی۔ اس کی خرید وفروخت اور انتظام میں وقت لگے گا۔ تم سمجھ رہے ہو۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' آہ لنگ نے اپنی اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

''ہم یہ ہیروئن تھائی لینڈ سے کنٹینر میں بذریعہ شپ' پہلے منیلا اور پھر امریکہ کے مغربی ساحل بھیجیں گے۔'' جانی کون دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا۔ ''تم لاس اینجلس میں گودام کی سہولت فراہم کرو گے۔ ہم تم پر انحصار کر رہے ہیں۔''

پورے جولائی آہ لنگ' جانی کون کے ایک ٹن ہیروئن کے انتظام اور ترسیل کے بارے میں پابندی سے امریکی حکام کو رپورٹ کرتا رہا۔ اسی مہینے اس نے دو مرتبہ نیویارک کے چکر بھی لگائے اور کیتھرین' میڈونا اور لامیکنا کو تفصیل سے آگاہ کیا۔ اس دوران خود میڈونا نے بھی ہانگ کانگ کے دو چکر لگائے اور جان ریچارڈ سے مل کر مقدمے کی کاغذی کارروائی کی نوک پلک سنواری۔ اب مقدمہ کو گرینڈ جیوری کے سامنے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کرنے میں صرف چند ہفتے رہ گئے تھے۔ آہ
نے انہیں بتایا کہ جانی کون اب بھی ہیروئن'
اور نیویارک ڈیلیور کرنے کے انتظامات میں
ہوا تھا۔

۲۹ اگست آہ لنگ' ہانگ کانگ میں متعین
ایجنٹوں سے ملا اور اس نے انہیں رپورٹ دی کہ جانی کون نے اپنی تازہ ترین کھیپ کی ترسیل کے لیے تھائی لینڈ میں ہیروئن خریدی اور اسٹور کرنی شروع کر دی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اسے اس کھیپ کی ڈیلیوری کی تکمیل میں مدد کرنے کے عوض ایک ملین ڈالر ملیں گے۔ اس نے اس امر کی بھی تصدیق کی کہ اسی سے سو پونڈ تک ہیروئن مہینہ میں ایک بار چین کے راستے امریکہ اور یورپ پابندی سے بھیجی جا رہی تھی۔ اسی دوران جانی کون نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ٹامی چن کو ہر صورت میں صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ اس خطرے کے پیش نظر کیتھرین اور لامیکنا اپنے گواہ چن کو تحفظ دینے کی پوری کوشش کر رہے تھے اور اسے وفاق کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔

ستمبر کے اوائل میں کیتھری اپنا مقدمہ گرینڈ جیوری کے سامنے پیش کرنے کے لیے بالکل تیار ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ وہ جانی کون اور بگ سرکل گینگ کے دیگر بارہ بڑے مجرموں کے خلاف فرد جرم عائد کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ ایسے میں ۲۳ ستمبر کو ایک اور گواہ کسی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی گود میں آ ٹپکا۔ بگ سرکل گینگ کا ایک طاقتور ممبر بارہ پونڈ ہیروئن سمیت لاس اینجلز میں پکڑا گیا۔ اس نے یہ ہیروئن اپنے طور پر امریکہ لانے کی کوشش کی تھی جو اس کے سامان سے برآمد ہوئی۔ اس کا نام لاؤ شوینگ تھا۔ اس کی گرفتاری کی اطلاع ملتے ہی میڈونا سیٹل سے پرواز کر کے وہاں پہنچ گیا اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہ وہی خوش پوش اجنبی تھا جس کی نشاندہی جان پریچارڈ نے

تقریباً دو سال پہلے ٹامی چن کے مقدمے کے دوران عدالت میں کی تھی۔ وہی بھینگی آنکھوں والا۔ اس کی ایک آنکھ اب بھی چھت کو گھور رہی تھی اور دوسری گھبراہٹ کے عالم میں پٹ پٹ جھپک رہی تھی۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم ہماری مدد کرنے کو بے چین ہو۔'' میڈنا نے نرمی سے کہا۔ ''کیا واقعی ایسا ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد اثبات میں سر ہلایا۔ ''کیونکہ میں جیل میں سڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔''

''یہ بہت اچھی بات ہے۔'' میڈونا نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

لاؤ شوینگ نے اسے بتایا کہ آرگنائزیشن کے قاتل کس طرح بدعنوان پولیس افسروں اور پرائیویٹ سراغ رسانوں کے ذریعہ گواہوں کا سراغ لگاتے تھے۔ ''خود میں نے مقدمے کے بعد ٹامی چن کو پیغام بھیجا تھا کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔'' اس نے کہا اور ایک لمحہ توقف کیا۔ ''ممکن ہے اب میں بھی ہلاک کر دیا جاؤں۔''

پھر اس نے ایک اور قتل کا ذکر کیا۔ ''جب جانی کون کے ایک باغی نے بگ سرکل سے نکل بھاگنے کی کوشش کی تو پیراگوئے تک اس کا تعاقب کیا گیا جہاں قاتلوں نے ایک ہتھوڑی سے اس کی کھوپڑی توڑ دی اور اس کی لاش نذر آتش کر دی۔''

''تم گواہی دینے کے لیے تیار ہو۔'' میڈونا نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔

میڈونا نے سب سے پہلے جان پریچارڈ کو ہانگ کانگ اور پھر لامیکنا کو نیویارک فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی۔ اس کے دو دن کے بعد لاؤ' کیتھرین کے سامنے بیٹھا اپنی کہانی دہرا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

رہا تھا۔ ۱۵ دسمبر کو نیویارک میں ایک گرینڈ جیوری اس کیس کا جائزہ لینے کے لیے بیٹھی اور اس نے جانی کون کو مختلف مواقع پر ہیروئن کی کثیر مقدار امریکہ اسمگل کرنے کا ملزم پایا۔ ۱۲ دسمبر کو کیتھرین پامر نے اپنا کیس گرینڈ جیوری کے سامنے پیش کیا۔ اس کے دو دن کے بعد گرینڈ جیوری نے جانی کون سمیت اس کے چودہ ساتھیوں پر فرد جرم عائد کردی اور اس کو سر بہ مہر کر کے انتہائی صیغہ راز میں رکھ دیا گیا تاکہ جانی کون اور اس کے ساتھیوں کو اپنی گرفتاری تک اس کا علم نہ ہو سکے۔ اس کے بعد نہایت سرگرمی سے جانی کون کی تلاش شروع کردی گئی اور انٹرپول سمیت تقریباً ایک درجن ممالک کی ڈرگ انفورسمنٹ پولیس' شکاری کتوں کی طرح اس کی بو سونگھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن جانی کون کا کوئی پتا نہ چل سکا۔ وہ ہمیشہ حرکت میں رہتا تھا۔ صرف آہ لنگ سے اس کا مواصلاتی رابطہ تھا۔ اپنے ایجنٹوں سے اس کی ملاقات کے اوقات بدلتے رہتے تھے۔ وہ ان سے ۱۲ جنوری کو ٹوکیو میں ملا' فروری کے اوائل میں تائی میں پھر ۲۵ فروری کو اس نے آہ لنگ کو ٹوکیو میں ملنے کا حکم دیا۔ ہیروئن کی پہلی کھیپ ...... تقریباً نو سو پونڈ بینکاک سے منیلا بھیجی جانے والی تھی لیکن جانی کون کے ساتھ ایک مسئلہ تھا جسے حل کرنے کے لیے آہ لنگ کی ضرورت تھی یہ کیش کا مسئلہ تھا۔ اتنی وافر مقدار میں ہیروئن کی خریداری نے جانی کون کو نچوڑ دیا تھا۔ اب اسے نیویارک اور سان فرانسسکو میں واقع اپنی جائیداد فروخت کرنے کی ضرورت آن پڑی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ جائیداد کی فروخت سے اسے بیس ملین ڈالر مل جائیں گے۔ اس کام کے لیے آہ لنگ کو امریکہ جانا اور گاہکوں کو تلاش کرنا تھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہیروئن کی بہت بڑی مقدار پہنچنے والی ہے۔'' لامیکنا نے کیتھرین سے کہا۔

پھر اس نے کیون اور میڈونا سے مل کر ایک منصوبہ تشکیل دیا۔ جس کے مطابق کون سے یہ کہا جاتا کہ اسٹیٹ ایجنسی کے اٹارنی یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ جانی کون جائیداد کی فروخت کے کاغذات پر دستخط کرنے خود امریکہ آئے اور ان کے سامنے دستخط کرے اور جیسے ہی وہ امریکہ آئے گا اسے گرفتار کرلیا جائے گا۔ اس دوران جان پریچارڈ کی پولیس' بگ سرکل گینگ کے دیگر ممبروں کو ہانگ کانگ میں گرفتار کرسکتی تھی۔

جان پر بہت رڈ نے یہ منصوبہ آہ لنگ کو سمجھا دیا۔ وہ یہ کہ آہ لنگ' جانی کون کی ہدایت کے مطابق نیویارک کا سفر کرے گا اور وہاں سے واپس آ کر جانی کون کو بتائے گا کہ جائیداد خریدنے والا اس بات پر مصر ہے کہ جائیداد کا مالک کاغذی کارروائی کے موقع پر وہاں موجود ہو۔

☆☆

آہ لنگ نے اپنا کردار بہت عمدگی سے نبھایا لیکن جانی کون مشکوک ہوگیا۔ ''کیا واقعی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔'' آہ لنگ نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔

''میں وکیلوں کو کس بات کی فیس دیتا ہوں۔'' وہ برہمی سے بولا۔

آہ لنگ نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔

''ٹھیک ہے۔'' کچھ دیر کے بعد جانی کون نے سر ہلایا۔ ''میں نیویارک جاؤں گا۔'' اور پیسے نے اسے کسی مقناطیس کی طرح کھینچ لیا۔ اس ملاقات کے چند ہی یوم کے بعد اس نے آہ لنگ کو فون پر حکم دیا کہ وہ اس سے ۱۳ مارچ کو نیویارک کے ہلٹن ہوٹل کے بار میں ملے۔

''کس وقت۔'' آہ لنگ نے پوچھا۔ ان کی یہ گفتگو ٹیپ ہو رہی تھی۔

''رات کے ٹھیک آٹھ بجے۔'' اس نے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جواب دیا۔

''کس روٹ سے اور کس فلائٹ سے۔''

آہ لنگ نے دریافت کیا۔

''یہ باتیں صیغہ راز میں ہی رہنے دو۔'' اس نے کہااور اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کردیا۔

''وہ اب بھی مشکوک ہے۔'' بعدازاں آہ لنگ نے ایجنٹوں کو بتایا۔ ''بہت ممکن ہے کہ وہ نہ جائے۔ وہ بے حد شکی مزاج واقع ہوا ہے۔''

جانی کون کی متوقع آمد سے دو دن پہلے میڈونا سیٹل سے پرواز کر کے نیویارک پہنچ گیا۔ آج تک کسی بھی ایجنٹ نے جانی کون کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے کئی روپ تھے اور یہ بتانا بہت مشکل تھا کہ اصلی روپ کون سا تھا' لامیکنا اور میڈونا نے اس کی چند تصویروں کو جو ان کے پاس تھیں تمام ایجنٹوں میں تقسیم کردیں۔

''انہیں ذہن نشین کرلو۔'' لامیکنا نے ہدایت کی۔ ''اور ہاں' محتاط رہنا۔ وہ شاذونادر ہی کسی نگران کے بغیر باہر نکلتا ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی آدمی سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا ہے اور اس پر نگاہ رکھتا ہے اور ہمیشہ مسلح ہوتا ہے۔''

میڈنا نے ہانگ کانگ میں جان پریچارڈ سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ ''وقت کا خاص خیال رکھنا۔'' اس نے کہا۔ ''جیسے ہی جانی کون ہماری تھیلی میں بند ہوگا' ویسے ہی ہم تمہیں ہانگ کانگ میں اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کا سگنل دے دیں گے۔ کوئی سوال۔''

''کوئی نہیں۔'' جان نے جواب دیا اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔

☆☆

۱۳ مارچ' اتوار کی ایک سرد اور بے کیف شام تھی۔ نیویارک کے ہلٹن ہوٹل کے اندر اور باہر' ہر نیم تاریک گوشوں میں گروپ ۴۱ کے ایجنٹ چھپے ہوئے تھے۔ بار کی ایک میز پر میڈونا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی دستی گھڑی پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ آٹھ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ اس کی میز کے دوسری طرف لامیکنا اور قریب ہی کیون بیٹھا کا بلی سے میز کی سطح کو کھٹ کھٹا رہا تھا۔ وہ بظاہر بے پروا نظر آرہا تھا لیکن اسے اپنے پیٹ میں کوئی گانٹھ سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یہ بات یاد آرہی تھی کہ جانی کون کی نگرانی کرنے والے ہمیشہ مسلح ہوتے تھے تو کیا وہ اب تک ہوٹل میں پہنچ چکے تھے اور سب لوگوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

آٹھ بجے کا وقت گزر گیا۔ لاؤنج بھر گیا تھا لیکن ایک گوشے میں تنہا بیٹھے ہوئے آہ لنگ کے پاس کوئی نہیں پہنچا۔ میڈونا کے دماغ میں جیسے کوئی ریل سی چل رہی تھی۔ اس نے دنیا بھر میں منشیات کے اس سب سے بڑے اور منظم ترین آرگنائزیشن کو بے نقاب کرنے میں شب و روز ایک کردیے تھے۔ اسے مشکل ہی سے یقین آرہا تھا کہ اب یہ کھیل ختم ہونے والا تھا۔ سارے ایجنٹ اپنی اپنی جگہ بے چین اور مضطرب تھے۔ ان کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ گزرنے والا ہر لمحہ ان کے اضطراب میں اضافہ کررہا تھا۔ سب کے سب اپنی جگہ بے حد چوکنا اور مستعد تھے۔ میڈونا کے خیالات منتشر ہورہے تھے۔ یکا یک اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ خیالات کا تانا بانا بکھر گیا۔ ایک چینی اس کے قریب سے گزرا تھا۔ اس کی متلاشی نگاہیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ فربہ جسم کا مالک' نہایت خوش پوش تھا۔ اس کی دستی گھڑی نگاہوں کو خیرہ کررہی تھی اس کی آنکھیں سیاہ اور بے حد چوکنی تھیں۔

میڈونا نے اپنی سانس روک لی' کیا وہ کوئی تاجر تھا یا...... یا...... اس نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے کوئی باڈی گارڈ نظر نہیں آیا۔ اس کے سینے میں اضطراب کا سمندر سمٹ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

آیا۔ جانی کون کبھی مسلح باڈی گارڈ کے بغیر نہیں نکلتا تھا۔ اس نے کیون کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ کیون نے ایک آنکھ دبائی اور بدستور میز کھٹکھٹاتا رہا۔ وہ چینی لحہ بھر بعد ان کی طرف لوٹا۔ یکایک اسے آہ لنگ نظر آ گیا۔ اس نے آہ لنگ کو متوجہ کیا اور ریستوران کی طرف اشارہ کیا۔ میڈونا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا لیکن اس نے اپنی کیفیت کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ آہ لنگ خاموشی سے اٹھا اور بار سے نکل گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد ہی میڈونا لامیکنا اور کیون ان کے تعاقب میں اٹھ گئے پھر ریستوران میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے داخلی گزرگاہ کے قریب ہی ایک میز منتخب کر لی جہاں سے وہ دروازوں پر نگاہ رکھ سکتے تھے اور آہ لنگ اور جانی کون سے اتنے فاصلے پر تھے کہ ان کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر سکتے تھے۔ میڈونا دزدیدہ نظروں سے ان دونوں کو آپس میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ ایک گھنٹہ کے طویل صلاح مشورے کے بعد جانی کون اٹھ گیا۔ اس نے اپنے جسم پر اوورکوٹ ڈالا اور سڑک کی طرف کھلنے والے دروازے سے نکل گیا۔

''اب چلو' اسے پکڑ لیتے ہیں۔'' لامیکنا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ تیزی سے باہر نکلے۔ جانی کون اتنی دیر میں ان سے ایک بلاک آگے نکل گیا تھا اور اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا جنوب کی سمت چلا جارہا تھا پھر وہ جونہی باون ویں شاہراہ کے نکڑ پر پہنچا تو انہوں نے اسے گھیر لیا۔ کیون نے نہایت پھرتی سے اپنا ریوالور نکالیا۔ ''وفاقی ایجنٹس' مسٹر کون۔'' لامیکنا پھنکارا۔ ''تم زیرحراست ہو۔''

جانی کون آہستہ سے مڑا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے یکسر عاری تھا۔ ''تمہیں غلط فہمی ہوگئی ہے۔'' وہ نہایت اطمینان سے بولا۔ ''میں دو نگ ہوں۔''

اس کا جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ ڈی ای اے کی ایک کار تیزی سے قریباً کر رک گئی۔ ''اسے ہتھکڑیاں پہنا دو۔'' لامیکنا نے چیخ کر حکم دیا۔ ''اور ہم اب یہاں سے نکل چلتے ہیں۔''

ایک ایجنٹ نے نہایت پھرتی سے جانی کون کو ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ وہ اب بھی سراپا احتجاج بنا ہوا تھا لیکن ایجنٹوں نے اسے اٹھا کر کسی گٹھری کی طرح کار کی پچھلی نشست پر پھینک دیا اور کار نہایت تیزی سے روانہ ہوگئی۔ اس کا رخ ہیڈ کوارٹرز کی طرف تھا۔ اس دوران لامیکنا اسے اس کے حقوق پڑھ کر سناتا رہا۔

رات آدھی بیت چکی تھی جب میڈونا نے ہانگ کانگ فون کر کے جان کو جانی کون کی گرفتاری کی اطلاع دی۔ اس کے دو گھنٹے کے اندر اندر جان نے میڈونا کو فون پر اطلاع دی کہ ہانگ کانگ کی پولیس نے تقریباً تمام مقامی مجرموں کو جیل میں ٹھونس دیا ہے۔ کیتھرین پامر نے اگلی صبح جانی کون کے خلاف کاغذی کارروائی مکمل کر لی اور پھر ہانگ کانگ میں پکڑے جانے والے اس کے ساتھیوں کو امریکی حکام کے حوالے کرنے کے کاغذات مرتب کرنے میں مصروف ہوگئی اور جب فارغ ہوئی تو اس قدر تھک گئی تھی کہ وہیں اپنے دفتر میں ایک کاؤچ پر سوگئی۔

۱۴ مارچ کو صبح ۱۰ بجے جانی کون کو بروکلین میں واقع وفاقی عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہ بے حد پراعتماد نظر آرہا تھا لیکن جب اس پر عائد الزامات کی فہرست سنائی گئی اور جب یہ بتایا گیا کہ اس کے تمام ساتھی بھی گرفتار ہو چکے ہیں تو اس کی خود اعتمادی کافور ہوگئی۔ وہ اچانک بے حد تھکا تھکا سا نظر آنے لگا تھا پھر جب کیون اسے واپس جیل لے جانے لگا تو وہ رک کر اس کی طرف مڑا۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی اور پتھر جیسی سختی تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''سب کے سب مارے جائیں گے۔'' وہ پھنکارا۔ ''تم بھی۔''

کیون محض شانے اچکا کر رہ گیا۔ وہ اسے گیدڑ بھبکی سمجھا تھا لیکن بعد از ڈی ای اے کے ایجنٹوں کو اس کی اس سازش کا علم ہو گیا جس کے تحت کیون کو اغوا کر کے زہریلے انجکشن کے ذریعے ہلاک کرنا تھا پھر ایک موقع پر کیتھرین کے دفتر میں ایک بریف کیس نظر آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے کھولتی وہاں موجود ڈی ای اے کے ایجنٹوں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اس بریف کیس میں ایک رائفل تھی جو بریف کیس میں موجود ایک میکنزم کے تحت اس کے کھلتے ہی چل جاتی۔ یوں کیتھرین مرنے سے بال بال بچ گئی۔

☆☆

لیڈر کی گرفتاری کے بعد بگ سرکل گینگ تاش کے پتوں کی مانند بکھر گیا۔ ۱۸ مارچ کو رپچارڈ نے اس گینگ کے ایک بہت اہم رکن کو منیلا سے ہانگ کانگ پہنچنے پر گرفتار کر لیا۔ اسے ۲۵ مارچ کو امریکہ پہنچا دیا گیا۔ جہاں اس نے اپنی کوٹھری میں گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ اسی دوران ڈی ای اے کے ایجنٹوں نے جانی کون کے ایک مقامی تقسیم کار کو نیویارک کے چائنا ٹاؤن سے گرفتار کر لیا اور ٹامی چن اور آہ لنگ کے لیے حفاظتی انتظامات مزید سخت کر دیے۔ انہیں کسی ایک مقام پر رکھنے کے بجائے ان کے مقامات تبدیل کیے جاتے رہے۔ اس کے علاوہ ایجنٹوں نے جانی کون کے کئی خطوط پکڑے جو اس نے اپنی کوٹھری سے تحریر کیے تھے۔ ان خطوط میں ان افراد کو قتل کرنے کے عوض بھاری رقوم کی پیش کش کی گئی تھی جو اس کے خلاف گواہی دینے والے تھے لیکن اس کی وہ دہشت جو کبھی بگ سرکل گینگ پر چھائی ہوئی تھی اب زائل ہو چکی تھی۔ حتیٰ کہ ٹامی چن نے بھی رہائی کے عوض سلطانی گواہ بننا قبول کر لیا تھا۔

آخرکار ایک سال کے بعد عدالت نے ۲۹ ستمبر کو ملزم جانی کون کو مجرم پاتے ہوئے ستائیس سال کی سزا سنا دی جو اسے وفاقی جیل میں کاٹنی تھی۔ کیتھرین پا مرکو یو ایس' جسٹس ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے اور جان رپچارڈ کو یو ایس جسٹس ڈیپارٹمنٹ اور ہانگ کانگ کے گورنر کی سفارش پر وہاں کی حکومت کی جانب سے پبلک سروس کے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا گیا۔ امریکی حکومت نے بہت کم موقعوں پر یہ ایوارڈ کسی غیر امریکی کو دیا تھا۔

یہ لامیگنا اور کیتھرین کی جدوجہد کا ثمر ہے کہ آج ریاست ہائے متحدہ امریکا میں ہیروئن کے تقریباً تمام بڑے بڑے ایشین اسمگلرز اور ان کے گروہ بے نقاب ہو چکے ہیں۔ شاذونادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ ہیروئن کی کھیپ امریکا پہنچے اور ڈی ای اے کے ایجنٹوں کو اس کے ذرائع اور روٹ کا علم نہ ہو سکے اور وہ اس کے خلاف کارروائی نہ کریں۔ اسی بہار میں میڈونا نے جان رپچارڈ کو اپنے ہاں مدعو کیا اور وہ اپنی نئی نویلی دلہن کے ہمراہ ہنی مون منانے سیٹل پہنچ گیا۔ دونوں ایجنٹ میڈنا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے شمپین سے شغل کر رہے تھے کہ جان نے اپنا گلاس بلند کیا۔ ''چیرز۔'' وہ بولا۔ ''اس کیس کے نام اور ڈریگون کے سال کے نام۔''

''ڈریگون کا سال۔'' میڈونا نے حیرت سے دہرایا۔ ''یہ کیا ہوتا ہے۔''

''حقیقت میں تو کچھ بھی نہیں۔'' جان نے اپنا گلاس ایک گھونٹ میں خالی کر کے کہا۔ ''لیکن چینی نجومیوں کا کہنا ہے کہ یہ خوش بختی کا سال ہوتا ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

فریبِ عقل

محمد مقصود خان

لیکن اب جبکہ مجھے آواز دی جاچکی تھی اور آواز دینے والی بھی قریب آچکی تھی تو نہ جانے کیوں مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ اسٹریٹ لائٹ کچھ دور تھی' ملگجے اندھیرے میں' میں اس کا صحیح جائزہ تو نہیں لے پایا لیکن یہ اندازہ واضح طور پر ہورہا تھا کہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

مڈل کلاسیوں کو عموماً پوش علاقے میں رہنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ وہ جہاں دیگر معاملات میں اونچے اور آسودہ حال لوگوں کی نقل کر کے اپنی طنابیں خود ہی کسے رکھتے ہیں وہاں رہائش کے لیے بھی انہی کے علاقوں کو ترجیح دیتے ہیں اور اس چکر میں عمر بھر اپنا ذاتی مکان نہیں بنوا پاتے۔ کرایوں پر ہی دھکے کھاتے رہتے ہیں۔

میں بھی چونکہ ایک مڈل کلاسیا ہوں اس لئے مدت سے اس بیماری کی لپیٹ میں تھا' یعنی میں بھی انہی لوگوں میں سے تھا جنہیں حسرت ہوتی ہے کہ کوئی ان سے ان کا ایڈریس پوچھے تو وہ قدرے شان بے نیازی سے کہہ سکیں۔ ''وہ جی ...... ڈیفنس میں خیابان بلاک تو دیکھا ہوگا آپ نے۔ بس ون ایچ میں آجایئے۔''

پوچھنے والا جب 'ون ایچ' پر پہنچتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ تو ون ایچ کا صرف ون ٹینتھ یعنی ایک بٹا دس حصہ ہے جس میں موصوف رہائش رکھتے ہیں۔

پوش اور اونچے علاقے عموماً وہی ہوتے ہیں جو کسی زمانے میں جنگل کہلاتے ہیں مگر رفتہ رفتہ دولت مند طبقہ وہاں آباد ہونا شروع کر دیتا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے اسے علاقے کی قسمت پلٹ جاتی ہے۔ ضرورتیں تو امیر اور غریب سب ہی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ان میں سے بھی کچھ لوگ ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور کچھ محض لالچ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے مکانوں کے لان' ٹیرس' گیراج یا ایک آدھا فالتو کمرے کو تھوڑی بہت شکست و ریخت کے بعد' پورشنوں کا نام دے دیتے ہیں' جنہیں کمر توڑ کرائے پر حاصل کرنے کے لیے مجھ جیسے مڈل کلاسیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔

ہم بھی اچھے بھلے گولیمار میں رہ رہے تھے۔ گھر میں اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے' دولت کے سوا سب کچھ۔ یعنی میری دو بڑے بھائی اور ان کے قطار در قطار بچے' میرے معمر والدین اور دو پیاری پیاری بھابیاں جو غصے میں اپنے بچوں پر چلاتی تھیں تو گولیمار سے گرومندر تک ان کی آوازیں سنی جاسکتی تھیں۔ میں کنوارا تھا اور تادم تحریر کنوارا ہوں (آہ۔)

میرے دونوں بھائی سرکاری ملازم ہیں۔

Downloaded from Paksociety.com

ایک سال ان کے مئی جون کے مہینے کچھ زیادہ ہی اچھے لگ گئے اور انہوں نے اچانک گھر میں اعلان کر دیا کہ وہ رہائش تبدیل کر رہے ہیں۔ اور انہوں نے سوسائٹی میں ایک پورشن پسند بھی کر لیا ہے' ایڈوانس بھی دے دیا ہے۔ دوسروں پر تو اس خبر کے نہ جانے کیا اثرات مرتب ہوئے تھے لیکن میرا تو یہ عالم تھا کہ دل بلیوں اچھلنے لگا تھا اور خوشی سے رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ اس قسم کے علاقوں سے مابدولت صرف سیر و تفریح ہی کی حد تک آشنا تھے۔ البتہ ان کے متعلق افسانے بہت سن رکھے تھے۔ جن کی روشنی میں سب سے خوشگوار پہلو یہی نظر آتا تھا کہ وہاں لفٹ بے حساب ملتی ہے۔ ادھر سیٹی بجاؤ ادھر لڑکی جیب میں۔

انہی سہانے خوابوں کے سائے میں ہم سوسائٹی میں آ گئے۔

میں خود بھی ایک پرائیویٹ دفتر میں ملازم ہوں۔ دفتر سے آنے کے بعد گلیوں میں چکر لگانا میں نے معمول بنا لیا۔ شام ڈھلے جب لڑکیاں اپنے کتوں کو ٹہلانے نکلتیں تو میں اپنے بھتیجوں کو ٹہلانے کے بہانے نکل کھڑا ہوتا۔ ایک مدت تک میں اسی امید پر اپنی ناتواں ٹانگوں کو تکلیف دیتا رہا کہ کسی نہ کسی روز راہ میں کوئی حسینہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے گی' یونہی کسی بہانے سے قریب آئے گی اور دھیرے سے کہے گی۔ ''میں روز آپ کو دیکھتی ہوں' مجھے آپ بہت اچھے لگتے ہیں۔''

لیکن یہ خواب شرمندہ تعبیر ہی رہا۔ صرف ایک روز ایک خاتون سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا لیکن گفتگو جو صرف انہوں نے ہی کی' خاصی ناروا قسم کی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ وہ محترمہ فٹ پاتھ پر ہمارے آگے آگے جا رہی تھیں' اور ہم ان کی شاخ گل کی طرح بل کھاتی کمر پر نظر جمائے دنیا و مافیا سے بے خبر پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ غیر ارادی طور پر شاید ہماری رفتار کچھ تیز ہو گئی تھی۔

ہم 'ٹیاؤں کی نہایت زوردار آواز سن کو چونکے تھے۔ پتہ چلا کہ ہمارا پاؤں ان کے کتے کی دم پر آ گیا تھا۔ کیونکہ وہ ذرا کان کھجانے کے لئے راستے میں بیٹھ گیا تھا۔ چنانچہ پہلے تو کتے نے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہماری خبر لی' بعد میں محترمہ نے۔

چنانچہ جب خواتین کی جانب سے لفٹ کے دروازے مستقل طور پر بند رہے تو ہم نے سوچا کہ شاید وہ انجان حسینائیں بچوں کو ہمارے ساتھ دیکھ کر کتراتی ہیں۔ چنانچہ ہم نے بھتیجے بھتیجیوں کو ساتھ لانا چھوڑ دیا لیکن مسئلہ پھر بھی حل نہ ہوا۔ ہم رہے پیاسے کے پیاسے۔ لاکھ ساون آ گئے۔ دل کی بیتابی بڑھتی گئی۔ معلوم یہی ہوا کہ جو کچھ سنا تھا وہ سب افسانے ہی تھے۔ محض افسانے۔ یا پھر ہم مڈل کلاسیوں کے چہروں پر ہی کوئی خاص مہر لگی ہوتی ہے جو اونچے اور آسودہ حال طبقے کی لڑکیوں کو دور ہی سے نظر آ جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتی ہیں کہ اس کے پلے کچھ نہیں۔ تین ہزار روپے ماہوار پانے والے کلرک سے تو وہ اپنے کتے کو بھی فری ہونے کی اجازت نہیں دیتیں۔ ورنہ اور کسی معاملے میں تو مابدولت اتنے گئے گزرے نہیں تھے۔ لباس معقول ہوتا تھا۔ شکل بھی غنیمت ہی تھی۔ رنگ ذرا سانولا تھا لیکن یہ کوئی ایسی خوفناک بات نہیں تھی۔ رنگ تو وحید مراد کا بھی سانولا تھا۔ اس کے باوجود کسی زمانے میں وہ لڑکیوں کا کریز تھا۔ اسی حقیقت کو یاد رکھتے ہوئے ہم اپنی رنگت کے بارے میں کبھی تشویش کا شکار نہیں ہوئے تھے۔

ویسے اپنے متعلق ایک مرتبہ میں نے اپنے دفتر کی ایک لڑکی سے رائے پوچھی تھی' جو کسی زمانے میں مجھے چاہتی تھی اور ہمارے عشق کے چرچے بڑے صاحب سے لے کر چپراسی تک سن چکے تھے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ میں کسی پاکستانی ہیرو سے تو مشابہ نہیں ہوں البتہ امیتابھ بچن سے کچھ کچھ ضرور ملتا ہوں اور وہ اس طرح کہ ہم دونوں ہی کے قد لمبے تھے اور بس۔ کتنی بڑی مشابہت تلاش کی تھی کمبخت نے۔ وہ ہر معاملے میں بڑی ستم ظریف تھی۔ عشق مجھ سے کرتی رہی' ہوٹلوں' سینماؤں اور دعوتوں میں بڑے صاحب کے ساتھ جاتی رہی اور شادی ایک تیسرے آدمی سے کر لی جو صرف ایک مرتبہ دفتر آیا تھا' بڑے صاحب کو اپنے ہوٹل کا ٹھیکہ دینے۔ بہرحال مجھے اس کا شکوہ نہیں۔ اس قسم کے دکھوں کا میں عادی ہو گیا ہوں۔ ایک مسافر جاتا ہے تو دل کے دروازے کھول کر دوسرے مسافر کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔ معاف کیجئے میں ایک بار پھر بھٹک گیا۔ میں تو آپ کو وہ واقعہ سنا رہا تھا جس نے میری راتوں کی نیند اڑا دی اور میری زندگی میں ایک عجیب انقلاب برپا کر دیا۔

ایک روز جب کہ رات کا اندھیرا چھانے لگا۔ میں گھر لوٹ رہا تھا۔ ابھی میرا گھر کچھ ہی دور تھا کہ سنسان گلی میں ملگجے اندھیرے سے آواز آئی۔ ''سنئے۔''

آواز نسوانی تھی۔ اپنی خوش فہمیاں چونکہ کافی حد تک دور ہو چکی تھیں' اس لئے میں یہ سمجھتا رہا کہ آواز کسی اور کو دی گئی ہے۔ میں چلتا رہا لیکن فوراً ہی پکارا گیا۔ ''سنئے تو سہی۔''

اب مجھے رکنا پڑا۔ آواز دینے والی میرے قریب آ گئی۔ ویسے میں لڑکیوں سے بالکل نہیں گھبراتا اور اس قسم کی سچویشن کے انتظار میں تو نہ جانے کب سے دم سوکھ رہا تھا کہ راستے میں کوئی آواز دے کر روکے اور ہم دل و جان ہتھیلی پر رکھ کر پوچھیں۔ ''جی ...... فرمائیے کیا حکم ہے۔''

لیکن اب جبکہ مجھے آواز دی جا چکی تھی اور آواز دینے والی بھی قریب آ چکی تھی تو نہ جانے کیوں مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ اسٹریٹ لائٹ کچھ دور تھی' ملگجے اندھیرے میں' میں اس کا صحیح جائزہ تو نہیں لے پایا لیکن یہ اندازہ واضح طور پر ہو رہا تھا کہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ ان کی گود میں ایک بچہ تھا نہ جانے کس کا۔

''آپ نے مجھے پکارا'' میں نے پھنسی پھنسی سی آواز میں پوچھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے بلا جھجک کہا۔ ''میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

آپ کو روز دیکھتی ہوں۔ آپ ہر شام اس گلی سے گزرتے ہیں نا۔''

''جی ہاں۔ دراصل مجھے سیر کا شوق ہے۔'' میں نے گڑبڑا کر کہا۔

''آپ نئے آئے ہیں یہاں۔''

''جی ہاں۔''

''کہیں ملازمت کرتے ہیں۔''

''جی ہاں۔''

''تبھی میں نے آپ کو کبھی دن میں نہیں دیکھا۔'' اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔ 'دیکھئے...... میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''شوق سے پوچھئے۔ مگر ذرا جلدی پوچھئے۔'' میں نے کہا۔

''کیا آپ میری بات مان لیں گے۔''

''آپ کہیے تو سہی۔'' میں نے قدرے جھنجلا کر کہا۔ دراصل اس کے یوں پے در پے سوالات سے مجھے الجھن سی ہو رہی تھی۔ میں نے اسی الجھن آمیز لہجے میں مزید کہا۔ ''شاید آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ میں شام گلیوں کے چکر لگانا چھوڑ دوں۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں میں کسی بری نیت سے نہیں۔''

''نہیں...... نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ میری بات کاٹ کر مضطرب لہجے میں بولی۔

''تو پھر آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔''

''وعدہ کریں کہ آپ مانیں گے۔'' اس نے اصرار کیا۔

''اچھا بابا۔ وعدہ رہا۔'' میں نے حوصلہ ہار کے کہا۔

تب اس نے لڑکھڑاتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''آپ مجھ سے شادی کر لیں۔''

یہ سن کر اس کی زبان کی طرح میری ٹانگیں لڑکھڑا گئیں۔ اس نے گویا مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ کون تھی اور ایسے کون سے حالات تھے جنہوں نے اسے خود گلی میں نکل کر ایک اجنبی سے شادی کی درخواست کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے بھی کچھ پوچھنے کے بجائے گھبرا کر آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''زندگی کا اتنا اہم فیصلہ میں اتنی جلدی نہیں کر سکتا۔ میں سوچوں گا۔''

''میں کل یہیں انتظار کروں گی۔'' اس کے لہجے میں ہزاروں امیدیں تھیں۔ میں چل دیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اتنا نروس ہوا تھا۔ تیزی سے میں نے اپنے گھر کا گیٹ کھولا اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ عجیب بات تھی کہ وہ لڑکی اپنے آپ کو میری پناہ میں دینا چاہ رہی تھی۔ میری بننا چاہ رہی تھی اور میں خوف کھا رہا تھا۔

بعض معاملات میں روایتی کیسا جزو لاینفک بن جاتی ہیں۔ اگر اس نے پہلے میرے راستے میں رقعہ پھینکا ہوتا۔ مہینے دو مہینے بعد کہیں ملاقات پر راضی ہوتی کہ میں اپنے گھر والوں کو اس کے گھر رشتہ مانگنے بھیجوں تو پھر خواہ وہ ماضی کی تمام غلاظتیں پہلو میں دبائے میرے آنگن میں چلی آتی' میں اسے سر آنکھوں پر بٹھاتا۔ لیکن اس کے پاس شاید اتنی مہلت نہیں تھی۔

رات گئے تک مجھے نیند نہیں آئی۔

دوسری شام میں گھر سے نہیں نکلا۔ شام ڈھل چکی تو چھت پر چڑھ کر میں نے ڈرتے ڈرتے اس گلی کی طرف دیکھا۔ ملگجے اندھیرے میں دیوار کے قریب ایک نسوانی ہیولا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں گھبرا کر نیچے اتر آیا۔ میرا دل ایک بار پھر بری طرح دھڑک رہا تھا۔

اس شام سے میں نے گلیوں میں نکلنا چھوڑ دیا۔ اور اب میں سوچتا ہوں کاش وہ اتنی بے باک نہ ہوتی۔ یا یوں کہوں۔ کہ کاش وہ اتنی جلدی میں نہ ہوتی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

جائز قتل

سید ذوالفقار حیدر

انسان کو جب کسی چیز کا چسکا پڑ جاتا ہے تو یہ عادت مشکل ہی سے چھوٹتی ہے۔ اس کی لذت اسے اپنی گرفت میں جکڑتی چلی جاتی ہے۔ اس شریف آدمی کو بھی ایک عجیب اور خوفناک لت لگ گئی تھی جو آخر کار اسے کمرہ عدالت تک لے گئی۔

ایک بے گناہ قاتل کے جرم کا دلچسپ احوال

عدالت کی پبلک گیلری میں جم پارکر کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ ہومی سائڈ سراغ رساں تھا۔ میں خود ایک رپورٹر کی حیثیت سے وہاں موجود تھا۔ میں اس کے پہلو میں خالی سیٹ پر جا بیٹھا۔ وہاں جوزف گارشیا نامی اکیس سال کے ایک شخص کی ہلاکت کے سلسلے میں تفتیش ہو رہی تھی۔ جس کا ٹھکانا نا معلوم تھا۔ پہلا گواہ ڈونالڈ نامی ایک جوان پٹرول مین تھا۔ کورونر نے اس سے درخواست کی کہ اسے جوزف کی لاش جن حالات میں ملی تھی انہیں وہ بیان کرے چنانچہ ڈونالڈ نے کہنا شروع کیا۔

''یہ پرسوں رات کا ذکر ہے تقریباً ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ میں براڈوے کے علاقے میں گشت کرتا ہوا جنوب میں مارکیٹ کی سمت بڑھ رہا تھا۔ پھر جونہی میں گلی کے نکڑ پر پہنچا مجھے گلی میں دھینگا مشتی کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنی ٹارچ روشن کر لی۔ روشنی جونہی ان پر پڑی میں نے دیکھا دو افراد آپس میں گتھم گتھا تھے۔ ایک شخص نے پیچھے سے دوسرے شخص کا سر جکڑ رکھا تھا۔ روشنی پڑتے ہی پیچھے والے شخص نے دوسرے شخص کے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ دوسرا شخص بالکل بے جان ہو گیا۔ پہلے شخص نے اسے چھوڑ دیا اور وہ شخص زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں ان کی طرف بڑھا لیکن پہلے شخص نے بھاگنے یا کوئی حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بس اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جب میں قریب پہنچا تو وہ مخاطب ہوا۔ ''آفیسر اس شخص نے مجھے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔

''اور ہلاک ہونے والے کو بعد میں جوزف گارشیا کی حیثیت سے شناخت کر لیا گیا۔'' کورونر پوچھ بیٹھا۔

''جی ہاں' سر۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا۔

''اور وہ دوسرا شخص جس سے گارشیا گتھم گتھا تھا...... کیا تم اس شخص کو شناخت کر سکتے ہو۔''

ڈونالڈ نے چند فٹ کے فاصلے پر ایک کرسی پر براجمان ایک شخص کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ ''وہ رہا جناب' رابرٹ ہمل۔'' وہ بولا۔

وہ تقریباً پچاس سال کا ایک فربہ اندام شخص تھا جو کم گو لگتا تھا۔ وہیں کمرے میں ایک طرف اس کیس کا انچارج اسسٹنٹ سرکٹ اٹارنی اور دوسری طرف سینٹ لوئیس کا ایک نامی گرامی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

وکیل مارکوئس بیٹھا ہوا تھا۔
''پٹرول مین ڈونالڈ۔'' کورونر مخاطب ہوا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ رابرٹ کے پاس اعشاریہ تین آٹھ کا ایک پستول تھا۔''
''جناب' اس کے پاس تو نہیں لیکن ہاں' وہیں زمین پر ایک پستول پڑا ہوا تھا جو اس نے پھینکا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کے پاس پستول کو رکھنے کا لائسنس تھا۔''
اس موقع پر وکیل مارکوس گویا ہوا۔ ''آفیسر کیا آس پاس کوئی دوسرا اسلحہ بھی تھا۔''
''جی ہاں جناب۔ ایک کھلا ہوا چاقو بھی گلی میں پڑا ہوا تھا۔ بعد میں یہ ثابت ہوا کہ وہ چاقو جوزف گارشیا کا تھا۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا۔
رابرٹ کا دعویٰ تھا کہ گارشیا نے وہ چاقو اس پر تان لیا تھا۔ اس کے جواب میں اس نے اپنا پستول نکال لیا تا کہ اپنا دفاع کر سکے اور گارشیا کو حکم دیا کہ وہ اپنا چاقو پھینک دے لیکن گارشیا اس کی طرف بڑھتا رہا۔ رابرٹ کا کہنا ہے کہ وہ اس شخص کو شوٹ کرنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ اس نے پستول کا دستہ اس کے ہاتھ پر مارا۔ گارشیا کے ہاتھ سے چاقو نکل گیا اور وہ گارشیا سے گتھم گتھا ہو گیا۔
''کیا گارشیا کی کلائی پر کوئی نشان تھا جس سے مسٹر رابرٹ کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہو کہ انہوں نے پستول کے دستے سے گارشیا کی کلائی پر ضرب لگائی تھی۔'' مارکوئس نے پوچھا۔
''جی ہاں' جناب۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ ثابت ہوتا ہے۔''
وکیل اپنی نشست سے اٹھ کر ڈونالڈ کی طرف بڑھا۔ ''آفیسر' کیا گارشیا کا کوئی پولیس ریکارڈ بھی تھا۔''
''جی ہاں' جناب۔'' ڈونالڈ بولا۔ ''وہ ایک مرتبہ راہ گیروں کو لوٹنے کے جرم میں گرفتار ہوا تھا اور اس نے سزا کاٹی تھی۔''
''ان لٹیروں کا طریقہ کار کیا ہوتا ہے۔ کیا یہ لوگوں کو طاقت کے بل پر نہیں لوٹتے۔''
''جی ہاں' جناب یہ لٹیرے عام طور سے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

غیر مسلح ہوتے ہیں ان کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے شکار کو پیچھے سے دبوچ لیتے ہیں۔ ایک ہاتھ سے اس کی گردن جکڑ لیتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے اس کی جیبیں خالی کر لیتے ہیں۔''

''کیا تمہیں مسٹر رابرٹ کا یہ بیان سچ نہیں لگا کہ وہ اپنے حریف کو شوٹ کرنا نہیں چاہتے تھے اور انہوں نے احتیاطاً اس کے ہاتھ پر اپنے پستول کے دستے سے ضرب لگائی تھی۔ جبکہ ان حالات میں وہ اس کے سینے میں گولی مارنے میں پوری طرح حق بجانب تھے لیکن انہوں نے ایسا کرنے کی بجائے اپنا دفاع کرتے ہوئے اسے دبوچ لیا اور ہر چند کہ ان کا ارادہ اسے نقصان پہنچانے کا نہیں تھا۔ ان کی گرفت کچھ زیادہ ہی سخت ہوگئی جس کے نتیجے میں وہ مر گیا۔ اس کی یہ موت یقیناً ایک حادثہ تھی۔''

پٹرول مین ڈونالڈ نے اس نکتے پر غور نہیں کیا تھا۔ یہ بات وکیل مارکوس کے لیے اطمینان بخش ثابت ہوئی۔ اس نے یہ بات جیوری کے ذہن میں شبہ ڈالنے کے لیے کہی تھی۔ کورونر نے اپنے سامنے بکھرے ہوئے کاغذات کو الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کے مطابق موت گلا گھٹنے سے واقع ہوئی ہے۔''

اس کے بعد ارکان جیوری کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے کمرہ عدالت سے نکل گئے اور میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ اس کیس میں جم پارکر کی دلچسپی کا کیا سبب ہوسکتا تھا۔ بظاہر یہ ایک عام سا کیس تھا جس میں ایک لٹیرا اپنے شکار کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور تفتیش ایک معمول کی چیز تھی جس کا مقصد اس شکار کو الزام سے بری کرنا تھا۔ حکام کے سوال و جواب سے بھی یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مسٹر رابرٹ کے حق میں فیصلہ سننا چاہتے تھے یا اس کے متمنی تھے۔

مجھے اپنے نیوز آئٹم کے لیے اس شخص کا نام عمر اور پتا نوٹ کرنے سے زیادہ دلچسپی نہیں ہونی چاہیے تھی جسے ابھی ابھی قتل کے الزام سے بری کیا گیا تھا کیونکہ اس کی شخصیت کوئی ایسی متاثر کن نہیں تھی کہ میں اس پر توجہ دیتا لیکن اس کیس میں جم پارکر کی دلچسپی نے مجھے متجسس کر دیا تھا۔ رابرٹ دیکھنے میں ایک خوشحال اور سیدھا سادا کاروباری لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی پیشہ ور لٹیرے سے اتنی کامیابی سے اپنا دفاع کر سکتا تھا کہ وہ مر گیا تھا۔

''سارجنٹ، تمہیں ڈرنک پیش کروں۔'' میں نے جم پارکر کو مخاطب کیا۔

''ہاں چلو، چلتے ہیں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم بار میں پہنچ گئے۔ میں نے کہا۔ ''سارجنٹ، کیا اس کیس کے پیچھے کوئی کہانی پوشیدہ ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم اس کہانی کو شائع نہیں کر سکتے۔''

''میں شائع نہیں کروں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن میں متجسس ہوں۔''

''اس کیس میں میری دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ اس شخص رابرٹ نے ایک مرتبہ پہلے بھی ایک شخص کو ہلاک کر دیا تھا۔'' وہ بولا۔

میری بھویں کمان بن گئیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اور کم و بیش ایسے ہی حالات میں رابرٹ نے ایک لٹیرے کو ایک گلی میں اسی طرح گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔''

''خدا کی پناہ۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ''تو کیا اس کی تفتیش ہوئی تھی۔''

''یہ تو معمولی ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ واقعہ آج سے بارہ سال پہلے پیش آیا تھا۔ اس لٹیرے کے جرائم کی فہرست بہت طویل تھی اور یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ رابرٹ نے اس سے پہلے اس لٹیرے کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تفتیش سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ وہ لٹیرا کسی موٹے شکار کے انتظار میں ایک دہلیز میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

چھپا ہوا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اس وقت رابرٹ وہاں سے گزرا اور وہ لٹیرا رابرٹ کو دبوچنے کی غلطی کر بیٹھا۔ رابرٹ بظاہر گداز جسم کا مالک ہے لیکن طاقت میں کسی گوریلے سے کم نہیں۔ اس وقت رابرٹ کے پاس کوئی پستول بھی نہیں تھا۔ اس نے اس لٹیرے کی گردن اپنے شکنجے میں کس لی اور وہ پھڑپھڑا کر وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اسی واقعہ کے بعد رابرٹ اپنے تحفظ کے لیے پستول رکھنے لگا۔ اس کے لیے اس نے باضابطہ اجازت نامہ حاصل کیا تھا۔''

''تمہارے خیال میں کیا ان دونوں واقعات کا آپس میں کوئی تعلق ہے۔''

''میرے خیال میں وہ واقعہ بھی اسی طرح کا ایک واقعہ تھا۔ ایک لٹیرا اچانک ہی رابرٹ پر حملہ آور ہوا تھا اور رابرٹ نے اسے اپنے دفاع میں ہلاک کر دیا۔ یہ واقعہ بھی ویسا ہی تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس مرتبہ جب گارشیا اس پر حملہ آور ہوا تو اس نے قصداً اس کا گلا گھونٹ دیا۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ رابرٹ نے گارشیا کو اپنے اوپر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی۔''

سارجنٹ جم ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا پھر گویا ہوا۔

''میں نے پچھلے بارہ سالوں کے دوران قتل کے معموں کی چھان بین کی ہے۔ ان میں سے سات مقتول لٹیرے تھے۔ وہ گلیوں میں مردہ پائے گئے تھے۔ ان میں سے بعض کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا اور بعض کی گردن توڑ دی گئی تھی۔''

''میرے خدا۔''

''اگر ان سب کو رابرٹ نے ہلاک کیا تھا تو ان کی کل تعداد نو بنتی ہے۔''

''لیکن اس نے ایسا کیوں کیا۔''

''میرے خیال میں بارہ سال پہلے رابرٹ ایک نارمل انسان تھا لیکن جب اس نے اپنے دفاع میں پہلی بار ایک لٹیرے کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا تو میرے خیال میں اسے مزا آیا۔ تم نے جنونی قاتلوں کے بارے میں تو سنا ہی ہوگا۔''

''لیکن ...... لیکن۔''

''لیکن کیا۔ ایک شخص کسی بار میں اپنے نوٹوں کی نمائش کرتا ہے۔ کیا کوئی قانون اسے ایسا کرنے سے روک سکتا ہے۔ ایک لٹیرا اسے لوٹنے کے لیے اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ شخص لٹیرے کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اگر کوئی اسے ایسا کرتے ہوئے نہیں دیکھتا تو وہ خراماں خراماں ٹہلتا ہوا نکل جاتا ہے اور اگر پکڑا جاتا ہے تو سچی بات بتا دیتا ہے اور قانون اسے ایک مجرم کے خلاف اپنا دفاع کرنے پر شاباشی دیتا ہے۔ یہی ایک جنونی کا خواب ہے۔ وہ جان جاتا ہے کہ جائز قتل کیسے کیا جاتا ہے۔ قانون کہتا ہے کہ آپ اپنی جان اور مال پر ہونے والے حملے کے خلاف اتنی ہی طاقت سے مزاحمت کر سکتے ہیں جو ضروری ہو۔ اگر آپ اس سے زیادہ طاقت استعمال کریں گے تو تھیوری کے تحت مجرم قرار پائیں گے لیکن اس طرح کے کیس میں یہ کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور دوبارہ گویا ہوا۔ ''اگر ہم یہ ثابت کر بھی دیں کہ اس نے قصداً لٹیرے کو اپنے اوپر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی جو کہ ہم کر نہیں سکتے جب تک وہ خود اپنی زبان سے اس کا اقرار نہیں کر لیتا تب بھی اسے اپنے دفاع کرنے کا قانونی حق حاصل ہے۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم ایک جنونی قاتل کے معاملے میں بالکل بے دست و پا ہو۔''

''یہ بات درست ہے۔'' وہ بولا۔ ''اگر وہ ہر ہفتے ایک شخص کو ہلاک کرے جب بھی وہ بالکل محفوظ ہے۔ ہم صرف اس سے ہر مرتبہ پوچھ گچھ کر سکتے ہیں اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ کچھ بھی نہیں۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

الٹے پھیر

سلیم اختر

امریکی معاشرے کی ایک ایسی عورت کا قصہ جس نے اپنے سابقہ شوہر کو قتل کر دیا تھا لیکن اپنے جرم کو راز رکھنے کی خاطر اسے ایک مزید قتل میں شریک کار بننا پڑا۔ اس شمارے کی ایک مجرم کہانی

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

صرف ایک راز تھا جو رتھ نے اپنی شادی کے پانچ سال کے دوران پیٹر سے میں چھپائے رکھا تھا۔ یہی کہ اس نے اپنے پہلے شوہر ڈیوڈ کو ہلاک کیا تھا۔ پیٹر کو یہ معلوم تھا کہ رتھ کی پہلی شادی خوشگوار ثابت نہیں ہوئی تھی۔ رتھ نے اسے صرف اتنا ہی بتایا تھا۔ لہٰذا وہ محض اتنا ہی سوچ سکا تھا کہ ڈیوڈ طبعی موت مرا ہوگا۔ اس سے زیادہ اسے سوچنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔

وہ راز اب تک رتھ کے سینے میں دفن تھا اور کبھی کبھی اسے مضطرب کر دیتا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ اکثر نیند سے چونک کر بیدار ہو جاتی تھی لیکن اب وہ کیفیت نہیں تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس راز کی سنگینی میں بتدریج کمی واقع ہوتی چلی گئی تھی۔ صرف اس کے بھائی ارنی کی واپسی ہی اس راز کو دوبارہ دہشت انگیز بنا سکتی تھی اور ارنی واپس آ گیا تھا۔ پڑوس میں اس کی موجودگی رتھ کو مسلسل یہ یاد دلا رہی تھی کہ وہ ایک جھوٹی زندگی بسر کر رہی تھی۔ ارنی کے سوا کوئی شخص بھی اس حقیقت سے واقف نہیں تھا کہ ڈیوڈ کیسے مرا تھا۔ وہ رتھ کے گواہ کی حیثیت سے پیش ہوا تھا اور اس نے موقعہ واردات سے رتھ کی عدم موجودگی کا جعلی ثبوت بھی فراہم کیا تھا۔ وہ حد درجہ چرب زبان واقع ہوا تھا اور اس نے اپنی چرب زبانی اور دلائل سے عدالت کو قائل کر دیا تھا کہ رتھ بے گناہ تھی۔ اگرچہ اس واقعہ کو چھ سال بیت چکے تھے مگر رتھ کو آج بھی ایک ایک بات یاد تھی۔ اسی شام ارنی ٹہلتا ہوا اس کے گھر میں داخل ہوا تھا جب رتھ ہاتھ میں پستول تھامے سکتے کے سے عالم میں کھڑی تھی اور اس کا شوہر ڈیوڈ فرش پر بکھرا ہوا تھا۔ ارنی حیرت یا صدمے سے دوچار ہوتا ہوا بالکل نہیں لگا تھا۔ وہ ایک سابق کمانڈو تھا اور موت اس کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ یہ منظر دیکھ کر محض ہولے سے مسکرایا تھا اور اس نے کہا تھا۔ ''اوہ' اچھا تو یہ اس کے نصیب میں تھا۔''

اس کی سفاکی رتھ کو اپنے حواس میں لے آئی۔ ''یہ معمول سے زیادہ مجھ پر تشدد کر رہا تھا۔'' وہ بولی۔ ''یہ مجھے پھر مارنے اٹھا تھا۔''

''افسوس کہ تم اب تک اسے برداشت کرتی رہیں۔'' ارنی نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں بہت پہلے ہی اسے ٹھکانے لگا دینا چاہیے تھا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

"میں...... میں سچ مچ اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتی تھی۔" وہ بولی۔ "اس نے مجھے تھپڑ مارا۔ پھر میرا گلا دبانے لگا۔ میں نے اپنا ہاتھ پیچھے لے جا کر دراز کھول لی اور پستول نکال لیا پھر اس کی نال اس کے پہلو سے لگا دی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے ٹرائیگر کیسے دبا دیا۔ ٹرائیگر جیسے خود ہی دب گیا۔ یہ سچ ہے۔"

"فکر مت کرو، بچی...... ہم معاملہ سنبھال لیں گے۔" ارنی نے کہا تھا۔

یہ ارنی کا ہی آئیڈیا تھا کہ اس قتل کو خودکشی کا رنگ دے دیا جائے اور اس کا محرک بلانوشی، قمار بازی، بے راہ روی اور مالی بدحالی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈیوڈ اس وہم میں مبتلا تھا کہ اسے ایک ایسا مرض لاحق تھا جس کا کوئی علاج نہیں۔ چنانچہ انہیں اس کی لاش اس حالت میں ملی تھی کہ اس کے ہاتھ میں پستول تھا پھر ارنی نے گواہی دی۔ "میری بہن اور اس کے شوہر میں علیحدگی ہوگئی تھی اور وہ میرے گھر میں قیام پذیر تھی۔ اگر وہ وہاں ہوتی تو شاید ڈیوڈ کبھی خود کو ہلاک نہ کرتا۔ جب وہ تنہا ہوتا تھا تو بہت کڑھتا تھا۔

اس کا انداز بیان ایسا تھا کہ عدالت کو یقین آ گیا۔ بعد میں اس نے رتھ سے کہا تھا۔ "دیکھا تم نے اگر کام خوش اسلوبی سے کیا جائے تو انسان قتل کر کے بھی صاف بچ سکتا ہے۔"

رتھ نے غصے سے جواب دیا تھا۔ "یہ قتل نہیں تھا، محض ایک حادثہ تھا۔"

"اب تم یہ کہو گی کہ تم نے اسے سرے سے گولی ماری ہی نہیں تھی۔" وہ بولا تھا۔ پھر اس نے رتھ کا شانہ تھپتھپایا تھا۔ "فکر مت کرو۔ میں واحد گواہ تھا اور میں کبھی اپنا منہ نہیں کھولوں گا۔"

اس کے بعد وہ کہیں چلا گیا تھا۔ وہ شروع ہی سے سیماب صفت واقع ہوا تھا۔ کچھ عرصے تک دونوں کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی تھی لیکن وہ رتھ کو دوبارہ نظر نہیں آیا تھا لیکن ایک طویل عرصے کے بعد اب وہ لارچسٹر واپس آ گیا تھا اور اس مرتبہ اس کی بیوی بھی اس کے ہمراہ تھی۔ سنہری زلفوں، سرد آنکھوں اور خشک

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

چہرے کی مالک ایک گھمنڈی عورت۔ رتھ کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب ارنی نے پہلی مرتبہ اسے فون کیا تھا تو وہ پیٹر کی طرف پلٹی تھی۔ ''میرے بھائی کا فون ہے۔ وہ جنوبی افریقہ سے واپس آ گیا ہے۔ اس نے شادی کر لی ہے۔ انہوں نے لارچسٹر کے باہر ایک کاٹیج کرائے پر لے لیا ہے۔'' اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔

''کیا تم انہیں یہاں نہیں بلاؤ گی۔'' پیٹر نے شفقت بھرے انداز میں پوچھا تھا۔ ''تم فون پر اس سے بہت بحث کرتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ کیا وہ آنا نہیں چاہتا۔''

'ہاں۔'' رتھ نے جواب دیا۔ ''میرے خیال میں اس کی بیوی بدمعاش قسم کی عورت ہے۔ وہ جو کرنا چاہتا ہے اس کی بیوی اس کا الٹ کرتی ہے۔''

☆☆

اس ڈنر پارٹی کو خوشگوار پارٹی کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ارنی اور اس کی بیوی جینی کے رخصت ہونے کے بعد پیٹر نے کہا۔ ''میرے خیال میں تمہارے بھائی نے ایک غلط عورت کا انتخاب کیا ہے۔ تمہارا کہنا درست تھا' جو ارنی کرنا چاہتا ہے جینی اس کا الٹ کرتی ہے۔ وہ خوش وخرم نہیں لگتے۔ ہے نا۔''

خود رتھ کی پہلی شادی بھی خوشگوار ثابت نہیں ہوئی تھی اور ارنی کی واپسی نے اس احساس کو دوچند کر دیا تھا۔ اس نے اپنے دل میں ارنی کے لیے ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوتا محسوس کیا۔

اگلی صبح ارنی کا فون موصول ہوا۔ ''پیٹر موجود تو نہیں ہے۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''نہیں پیٹر موجود نہیں ہے۔ آ جاؤ۔'' رتھ نے جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ارنی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے چہرے سے تلخی ہویدا تھی۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ تم نے پیٹر کو کبھی نہیں بتایا ہوگا کہ تم نے کیسے میرا مطلب ہے ڈیوڈ کیسے مرا تھا۔''

''نہیں۔'' رتھ کا لہجہ کانپ گیا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی تھی' کیا ارنی اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کرے گا۔

ارنی جیسے اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ''کوئی بات نہیں۔'' وہ بولا۔ ''میرے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے۔ حالانکہ جینی بہت فضول خرچ واقع ہوتی ہے۔ لیکن تم میرے لیے کچھ کر سکتی ہو۔ احساس کا بدلہ احسان ہی ہوتا ہے۔ ہے نا۔''

رتھ اس کے چہرے کو ٹٹولنے لگی کہ وہ چاہتا کیا ہے۔

''میں جینی کو ہلاک کرنے والا ہوں۔'' ارنی نے عام سے لہجے میں دھماکا کیا۔ ''آخر ہم ایک مرتبہ بچ نکلے تھے تو دوبارہ کیوں نہیں۔''

''نہیں۔'' رتھ کے منہ سے نکلا۔ ''نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

ارنی اس کی بات پر توجہ دیے بغیر بولا۔ ''جینی کی لاش اس طرف ملے گی کہ اس کے ہاتھ میں پستول ہوگا۔ وہی خودکشی...... بالکل ڈیوڈ کی طرح...... اور تم موقع واردات سے میری عدم موجودگی کی شہادت دو گی جس طرح میں نے دی تھی۔''

''وہ' وہ کیسے۔'' رتھ کو یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اس کی رگوں میں خون کے بجائے پگھلی ہوئی برف دوڑ رہی ہو۔

ارنی مسکرایا۔ ''ہم یہاں سے ساتھ نکلتے ہوئے دیکھے جائیں گے۔ تمہاری کار میں بظاہر شاپنگ کرنے نکلیں گے۔ اب سنو...... تم مجھے میڈ ورتھ پر ڈراپ کرو گی اور میں جنگل کے راستے سے واپس کاٹیج پہنچ جاؤں گا اور جینی کو ہلاک کر دوں گا۔ پھر میں تم سے لارچسٹر میں جا ملوں گا اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پھر ہم دونوں شاپنگ سے فارغ ہو کر یوں لوٹ آئیں گے گویا راستے میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے۔"

رتھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے اپنا سر چکراتا ہوا لگ رہا تھا۔ "اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔" ارنی کہہ رہا تھا۔ "جینی ایک بگڑی ہوئی عورت ہے۔ حد سے زیادہ بگڑی ہوئی۔ پولیس کو اس کی لاش اسی طرح ملے گی کہ اس کے ہاتھ میں پستول ہوگا۔"

"ارنی ...... یہ یہ پاگل پن ......" رتھ پریشان ہو کر بول پڑی۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"لیکن میری اچھی بہن۔ تم نے بھی تو ایسا کیا تھا۔ خود میں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ یاد ہے۔" اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ "ہم جو شاپنگ کرنے جا رہے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ میں جینی کی سالگرہ کے موقع پر اسے کوئی تحفہ دینا چاہتا ہوں اور تم تحفے کے انتخاب میں میری مدد کر رہی ہو۔ کہو کیسے رہی۔"

"تم ...... تم مجھے ایسا کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔" رتھ نے منت کی۔

ارنی اسے گھورنے لگا۔ "مجھے افسوس ہے تمہارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

☆☆

لارچسٹر میں ورتھ اسٹور کے باہر کار میں بیٹھی ہوئی رتھ سے نصف گھنٹے میں چھٹی مرتبہ اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ اس نے ارنی کو اپنے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر ڈراپ کر دیا تھا۔

"انتظام کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔" ارنی نے کار سے اتر کر کہا تھا۔ "میں واپس لارچسٹر جاؤں گا اور تم سے تین بجے ورتھ اسٹور کے باہر ملوں گا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوگئی تو ...... تم نصف گھنٹے سے زیادہ میرا انتظار مت کرنا۔"

اور اب چار بج رہے تھے۔ رتھ نے ایک گھنٹہ اس کا انتظار کیا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اب ارنی نہیں لوٹے گا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور سیدھی گھر پہنچ گئی۔ باہر سیڑھیوں پر پیٹر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ رتھ کے کار سے اترنے پر وہ اس کے پاس آ گیا۔ "آج تم جلدی گھر لوٹ آئے۔" رتھ بولی۔

"ہاں۔" پیٹر نے جواب دیا۔ "ایک بری خبر ہے۔ مجھے فون پر اطلاع ملی تھی لہٰذا میں نے سوچا کہ گھر چلوں۔"

"بری خبر۔" رتھ کی نظریں پیٹر کے چہرے پر مرتکز تھیں۔

"وہ جینی۔" پیٹر بولا۔ "ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔ مجھے افسوس ہے وہ مر گئی۔"

"مر گئی۔" رتھ کی زبان لڑکھڑا گئی۔ "مگر کیسے۔"

"تمہارے اور ارنی کے جانے کے بعد جینی اپنی کار لے کر کہیں نکل گئی تھی لیکن تم تو جانتی ہی ہو کہ وہ کس طرح ڈرائیو کرتی ہے۔ میڈ ورتھ کے مقام پر کتنا خطرناک موڑ ہے۔ وہ ایک بھاری بھرکم لاری سے جا ٹکرائی اور اسپتال لے جاتے ہوئے راستے میں ہی ختم ہوگئی۔" پیٹر نے اپنی بیوی کی آنکھوں میں جھانکا لیکن وہاں جذبات کا شائبہ تک نہیں تھا بلکہ ایک نوع کا اطمینان تھا۔ "یہ میرے اور تمہارے درمیان ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ ارنی کو زیادہ دکھ ہوگا۔ جینی بس ایسی ہی تھی۔ ارنی جو کرنا چاہتا تھا وہ اس کا الٹ کرتی تھی۔"

رتھ نے اسے تیز نظروں سے دیکھا پھر ایک پژمردہ مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔ "ہاں' وہ ایسی ہی تھی۔ ہے نا۔ اب ہم اندر چلیں اور چائے پئیں۔"

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تم سے دور نہیں

چوتھی قسط

غزالہ جلیل راؤ

اشرف المخلوقات ھی ھر کھانی کا مرکز ھوتا ھے باقی بھت سے ذی روح ھیں لیکن سب کے سب انسان کے تابع۔ ان کی ھر کھانی انسان سے منسوب ھوتی ھے۔ میں نے ھر دور کو دیکھا ھے۔ اس سے لطف اندوز ھوا ھوں۔ اسے لکھا ھے۔ میں نے انسان کو تاریخ سے روشناس کرایا ھے' مجھ میں بھت سے راز پوشیدہ ھیں۔ میں ماضی کا شناور ھوں۔ میں حال کا مسافر ھوں اور میں ھی سب سے پھلے مستقبل میں جھانکوں گا۔ ایسے تو میری شناوری میں بھت سے نت نئے تجربات ھیں' میں سائنس داں ھوں۔ میں ماھر نفسیات اور بھت کچھ ھوں۔ بڑے دلچسپ تجربات ھیں میری زندگی میں لیکن جس چیز کو میں نے سب سے زیادہ محسوس کیا ھے وہ ھے 'تضاد' ھاں انسانی فطرت کا تضاد حالات کی وجہ سے۔ ماحول کی وجہ سے۔ کھیں مشکلوں کے دریا سے گزر کر سکون کے مرغزار اور کھیں سکون کی وادیوں کے سفر کا اختتام خارزاروں پر۔

قارئین عمران ڈائجسٹ کے لیے ایک انوکھی داستان

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

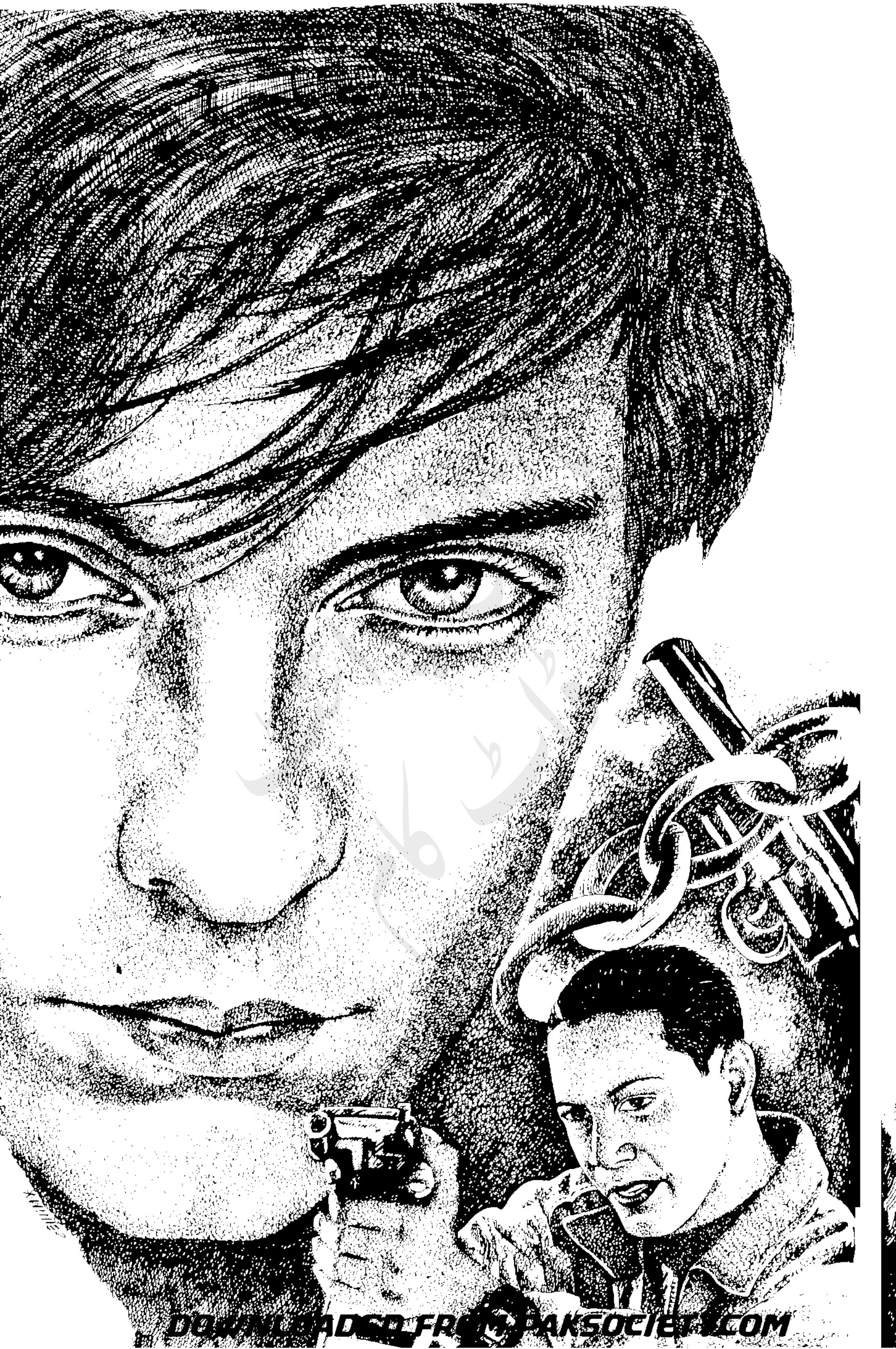

Downloaded from Paksociety.com

ایک تھکا تھکا سا احساس' ایک بوجھل سی کیفیت دونوں پر طاری تھی۔ وہ سست سست قدم بڑھاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ یکایک شرمین نے کسی خیال کے تحت کہا۔ ''ایک عجیب بات میرے ذہن میں آئی ہے عارض۔ فال کے لفافوں میں جو تحریریں نکلتی ہیں وہ بڑی عالمانہ اور فلسفے سے بھرپور ہوتی ہیں۔ کیا یہ تحریریں اس بابا کی ہوتی ہیں۔''

''دلچسپ خیال ہے۔ واقعی اس بارے میں تو کبھی سوچا ہی نہیں۔ یہ بابا مجھے ہمیشہ پر اسرار محسوس ہوا ہے۔ بند کتاب کی مانند جس کا کوئی ورق سامنے نہ ہو۔''

''تم نے ایک انوکھا' خیال میرے دل میں پیدا کیا ہے۔ بڑی انوکھی تحریریں ہوتی ہیں چلو ہم تجسس کیوں کریں جو بھی ہے۔ کلاس لینے کو دل نہیں چاہ رہا۔ آؤ کینٹین میں بیٹھتے ہیں۔''

کینٹین میں بیٹھ کر عارض نے کہا۔ ''شرمین میں پندرہ دن تک کالج نہیں آسکوں گا۔''

''کیوں......'' شرمین چونک پڑی۔

''بس یار۔ ایک کام آپڑا ہے۔ آؤٹ آف سٹی جا رہا ہوں۔''

''مگر کیا۔''

''واپس آکر بتاؤں گا۔ ابھی تم سے بھی تذکرہ نہ کرتا لیکن جانتا تھا کہ میری گمشدگی سے تم پریشان ہو جاؤ گی۔''

''پریشان تو میں اب بھی ہو گئی ہوں۔''

''کیوں۔''

''ایسی کون سی بات ہے جو تم مجھے نہیں بتا رہے۔ اور پھر اتنے سارے دن کے لیے جاؤ گے۔ میں کیا کروں گی۔''

''سوچتا ہوں تو بڑا عجیب سا احساس ہونے لگتا ہے شرمین۔ صرف یہ نہیں ہوتا کہ روکھی سوکھی کھال جائے موٹا جھوٹا پہن لیا جائے۔ بعض اوقات اپنے ہر احساس کی قربانی دینی پڑتی ہے۔''

''کیسی الجھی الجھی باتیں کر رہے ہو۔ اوہ۔ شاید بوڑھے بابا کے فال کے تحریر تمہارے ذہن پر نا خوشگوار اثر ڈالا ہے۔''

''نہیں لیکن وہ بہت بڑا سچ تھا۔''

''اب بتاؤ نا۔ کیا بات ہے۔ کہاں جا رہے ہو اور کیوں۔''

''سوری شرمین۔ ابھی نہیں بتا سکوں گا پلیز۔ چلو چائے منگاؤ۔'' عارض نے کہا۔ پورے دن عارض عجیب سی الجھن میں رہا تھا۔ شرمین اس کی وجہ سے پریشان ہو گئی تھی۔ عارض نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ اس کا راز دار اور۔ ہی کون۔ ایسی کونسی بات ہے جو عارض نے اسے بھی نہیں بتائی تھی۔

گھر آئی تو اس الجھن کا شکار تھی لیکن آج کا دن ہی کچھ نحوست بھرا تھا۔ سائرہ بیگم کے چہرے پر بھی پریشانی نظر آرہی تھی۔ اعصاب بھی بوجھل سے تھے' ایک اجنبی سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مزید الجھ گئی۔

''امی۔'' وہ پریشان سے بولی۔

''ہوں۔'' سائرہ بیگم کی آواز ابھری۔

''ابو۔'' اس نے نواب احمد کو آواز دی اور انہوں نے کرسی اٹھا کر اسے دیکھا اور مدھم لہجے میں بولے۔

''ہوں۔''

''کیا ہو گیا ابو۔ کوئی پریشانی ہے کیا ہو گیا ہے سب کو۔ کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں آپ۔'' نواب احمد نے گہری سانس لی' اور بولے۔

''بیٹا اپنی اندرونی کیفیت کا جائزہ لے رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کسی بڑی بیماری کا شکار ہونے والا ہوں۔ طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے۔''

''اوہ۔ ابو۔ چلئے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔''

''ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے بیٹے۔ ڈاکٹر تم خود ہو۔ ہمارا علاج تو خود کر سکتی ہو۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''ابو پلیز۔ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ۔''

''ہاں وہی بتانا چاہتا ہوں شرمین۔ بیٹے ہماری عمر جیسے بھی گزرنی تھی گزر گئی۔ اپنی ذات کے لیے انسان اپنے آپ سے سمجھوتہ کرلیتا ہے لیکن اولاد اس چیز سے کہ اس کے لیے بہتر سے بہتر راستے تلاش کرتے پاؤں نہیں تھکتے۔ عمر کے اس حصے میں آکر احساس ہوتا ہے کہ اپنی اکلوتی بیٹی کے لئے میں کچھ نہیں کرسکا۔ اپنی اس کوتاہی کا شدید احساس ہے مجھے۔ بس اس پریشانی کا شکار ہوں۔''

''ابو ایک بات کہوں۔ برا تو نہیں مانیں گے۔''

''نہیں بیٹا۔ بولو۔''

''ابو۔ بات یہ ہے کہ بزرگ اپنے بچوں پر اعتماد نہیں کرتے۔ وہ خاص طور سے اپنی بیٹیوں کے بارے میں زیادہ سوچتے ہیں۔ ابو۔ ہم بھی اپنی تقدیر آسمانوں سے لے کر آتے ہیں۔ آپ ہمیں کسی منصب پر پہنچادیں۔ ہماری تقدیریں سب کچھ ہوتی ہے۔ کوئی عمل ہوتا ہے والدین کے پاس جو ہماری تقدیروں میں ردوبدل کردے۔''

''کتابی باتیں کررہی شرمین۔ کاش تم میری آنکھوں سے حقیقت کی دنیا کو دیکھتیں۔ اور کمال صاحب عدالتوں میں کیس لڑتے ہیں اور میں لرزتا رہتا ہوں۔ اس سے پہلے بھی زندگی ہی تھی۔ محکمہ پولیس میں تھا تو ایسے ایسے کیس آنکھوں کے سامنے آتے تھے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اور پھر ان سب کا نچوڑ ایک ہی ہوتا تھا۔ اگر تمہارے پاس دولت ہے تو تم بیٹی کو اچھے سے اچھا گھر دے سکتے ہو۔ ورنہ پھر۔''

''پھر کیا ابو'' شرمین نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''زمانے کی ٹھوکریں۔ اور ماں باپ کی بے بسی۔''

''ابو۔ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔''

''خدا نہ کرے ایسا ہو۔ مگر بیٹا۔''

''جی۔ جی۔ کہیے۔''

''بیٹا۔ اپنی اولاد سے مخلص باپ کے لیے میں ہی بہت کچھ ہوتا ہے۔ تمہارے پاس صرف گھر کی چہار دیواری کا تجربہ ہے اور میرے پاس ان جلے ہوئے سمجھو، وہ تیزاب پڑے ہوئے چہروں کا تجربہ ہے جسے دیکھا نہیں جاسکتا۔ یہ سب صرف محض دولت کی شکار ہوتی ہیں۔ صرف غریب کی ماری ہوئی۔''

''ابو'' شرمین نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''بہت دن سے یہ دھواں میرے سینے میں سلگ رہا تھا شرمین۔ بہت دن سے میں رکتا آگ میں سلگ رہا تھا لیکن......''

''آپ بولتے رہیں ابو۔ میں سن رہی ہوں۔''

''جمال احمد۔ کھوٹا سکہ۔ ایک ناکارہ وجود۔ جسے صرف ماں کی وصیت کی زنجیر اس گھر میں روکے ہوئے تھی۔ ورنہ میں کبھی کا اس سے چھٹکارا حاصل کرلیتا لیکن قدرت کے عمل ناقابل فہم ہوتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی سایہ وہ دیتی ہے اور کہاں سے دیتی ہے انسان کے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں ہوتا۔''

''کیا مطلب ابو۔ میں نہیں سمجھی۔''

''وہی بتارہا ہوں تمہیں۔ انسان بہت کم عقل ہے۔ قدرت اس کے راستوں کا تعین کرتی ہے اور اس کی اپنی ساری سوچیں سوکھے پتوں کی طرح اڑ کر کہیں سے کہیں چلی جاتی ہیں اس طرح کہ میں دنگ رہ جاتا ہوں۔''

''ابو پلیز۔ آپ کی باتیں بڑی الجھی ہوئی ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔'' حساس شرمین الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''جمال۔ جو میرے لئے بس ایک رشتہ رہ گیا تھا۔ صرف ماں کی وصیت سے زیادہ کچھ نہیں لیکن وہ مجھ پر غور کررہا تھا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

عہدِ وفا

ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا مُنفرد ناول، مُحبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

بُجھ نہ جائے دِل دیا

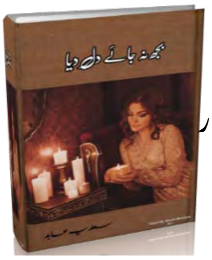

سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، مُحبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

قفس کے پنچھی

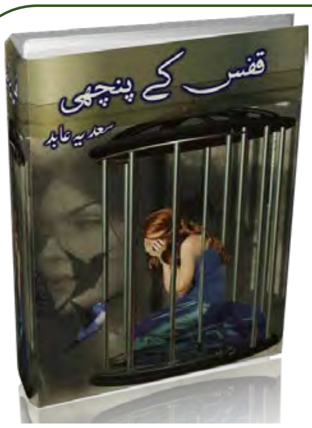

سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے جلد، **کتابی شکل** میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔

آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

جہنم کے سوداگر

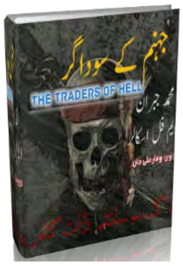

مُحمد جبران (ایم فِل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دُنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

شہیدِ وفا

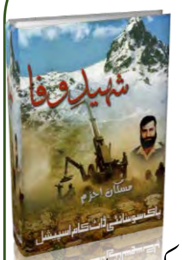

مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے مُحبت کی داستان، دہشت گردوں کی بُزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

آپ بھی لکھئے:

کیا آپ رائٹر ہیں؟؟؟۔ آپ اپنی تحاریر پاک سوسائٹی ویب سائٹ پر پبلش کروانا چاہتے ہیں؟؟؟

اگر آپکی تحریر ہمارے معیار پر پُورا اُتری تو ہم اُسکو عوام تک پہنچائیں گے۔ **مزید تفصیل کے لئے یہاں کلک کریں۔**

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام، پاکستان کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی کتابوں کی ویب سائٹ، پاکستان کی ٹاپ 800 ویب سائٹس میں شُمار ہوتی ہے۔

Downloaded from Paksociety.com

''چاچو۔''

''ہاں۔سید بھائی۔''

''جی ابو۔''

''کہنے لگا بھائی جان۔آپ کچھ پریشان پریشان رہتے ہیں۔مجھے اس کی وجہ نہیں بتائیں گے۔کچھ ایسا پیار بھرا لہجہ تھا کہ میں موم کی طرح پگھل گیا اور اس نے اسے اپنی بتیا سنادی وہ خاموش ہوگیا۔اور آخرکار اپنی سوچ اپنے مزاج کے مطابق وہ سوچ سمندر کی گہرائیوں سے ایک موتی نکال لایا۔''

''ایک منٹ ابو۔''شرمین نے دخل دیا اور نواب احمد جیسے کسی خواب سے چونک پڑے انہوں نے سوالیہ انداز میں شرمین کو دیکھا۔

''ہوں۔''

''وہ بپتا کیا تھی۔کیا آپ کی غربت۔''

''کسی حد تک۔''

''اوہ۔''شرمین کی آواز کچھ طنزیہ تھی۔

''خدا کی قسم شرمین اپنی ذات اور تمہاری ماں کی حد تک میں کبھی اپنی غربت سے شاکی نہیں رہا۔''

''پھر ابو۔''

''تم میری جان' صرف تم۔'' شرمین کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن اس نے آگے کچھ نہیں کہا۔چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد نواب احمد نے دوبارہ سلسلہ گفتگو شروع کیا۔

''اس نے میرے سامنے ایک تجویز پیش کی۔بیٹا۔میں ہمیشہ اس کے عمل سے منحرف رہا۔کبھی اس کے مزاج سے اتفاق نہیں کیا لیکن یہاں آکر اس نے جس کردار کا مظاہرہ کیا اس نے نہ صرف مجھے متاثر کیا۔بلکہ میں اور سائرہ سوچنے پر مجبور ہوگئے۔''

''میں نے تو پہلے بھی کہا تھا ابو کہ چاچو اتنے برے نہیں ہیں۔وہ جو کچھ بھی ہیں اپنے گھر سے ہم سب سے مخلص ہیں۔''

''ہاں۔اب میں بھی اعتراف کرتا ہوں۔خیر سنو۔جمال احمد تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔''

''مجھ سے۔''شرمین چونک پڑی۔

''ہاں۔تم سے۔''

''لیکن۔ابو۔مجھ سے وہ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔اور کیا آپ یہ بات جانتے ہیں کہ وہ مجھ سے کیا کہیں گے۔''

''ہاں۔''

''اوہ۔یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے' آپ۔مجھے بتائیں وہ کیا باتیں ہیں۔آپ جانتے ہیں کہ مجھے ان سے باتیں کرتے ہوئے گھبراہٹ ہوتی ہے۔''

''وہ جو بات کرے گا تم سے کرے گا۔میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں اور سائرہ اس سے متفق ہوگئے ہیں اور تمہیں ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں جمال کی تجویز سے سخت اختلاف ہوگا لیکن بیٹا یہ وقت کی ضرورت ہے۔تمہاری یہ مخالفت مناسب نہیں ہوگی۔''

''اور آپ مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔''

''وہ یہی چاہتا ہے۔''

''کمال ہے۔بات میری ہے اور چاہت دوسروں کی۔آج ہر طرف سے الجھی ہوئی کہانیاں سننے کو مل رہی ہیں۔''

''ہر طرف سے۔کیا مطلب۔''

''ہم۔میرا مطلب ہے آپ کی طرف سے۔''شرمین نے فوراً بات سنبھال لی۔ورنہ اسے عارض کی جانے کی بات یاد آگئی تھی۔اس کے بعد خاموشی چھاگئی تھی۔شرمین کا ذہن خلفشار کا شکار رہا تھا۔پھر جمال آگیا۔شرمین اتنی بے چین تھی کہ خود جمال کے پاس پہنچ گئی۔

''اس سے پہلے چاچو کہ آپ مجھے بلائیں میں خود آپ کے پاس آگئی۔بتایئے کیا بات ہے۔''

''بھائی جان نے تمہیں کچھ بتایا ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''نہیں۔ میرا ذہن شدید الجھن کا شکار ہے۔''
''کچھ بھی نہیں بتایا۔''
''نہیں پلیز چاچو۔ مجھے اور الجھن کا شکار نہ کریں۔''
''بیٹھو شرمین' اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے دل و دماغ دونوں کو متوجہ کر کے سننا اور جو فیصلہ کرو سوچ سمجھ کر کرنا۔''
''ایسی کیا بات ہے چاچو۔''
''دیکھو بیٹا۔ باہر کی دنیا میں' میں جیسا بھی ہوں' میں نے گھر کے کسی فرد کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ باہر کی دنیا میں چاہے کچھ بھی کیا۔ میرے گھر کے سب لوگ بہت اچھے ہیں۔ میں نے ہمیشہ یہ اعتراف کیا ہے کہ میں برا آدمی ہوں لیکن یہ میرا گھر ہے اور تم لوگوں کے سوا دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ میرے بھائی جان بہت پریشان ہیں۔ وہ جس الجھن کا شکار ہیں میں جانتا ہوں اور میں اس الجھن کا حل تلاش کرنے میں مصروف تھا۔ مگر میرے راستے میں جرم کے راستے ہیں اور میں انہیں پر چل سکتا ہوں۔''
''آپ کی ایک بات بھی ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔''
''میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ ایک شخص ہے جس کا نام طارق بلبن ہے۔ بیرون ملک سے یہاں آیا ہے۔ بے انتہا دولت کا مالک ہے۔ اس کی زندگی سے ایک کہانی چمٹی ہوئی ہے۔ میں تمہیں اس کہانی کا ایک ایک لفظ سناتا ہوں۔''
جمال احمد نے پوری کہانی کا ایک ایک لفظ شرمین کو سنایا جسے اس نے پوری طرح ذہن نشین کیا تھا۔ شرمین حیرت سے منہ کھولے یہ سب سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر دلچسپی کے آثار تھے۔
جمال احمد خاموشی سے تو وہ پرشوق لہجے میں بولی۔
''زبردست۔ یہ تو بہترین فلم اسکرپٹ ہے۔ یا ٹی وی سیریل۔ مگر آپ نے یہ مجھے کسی خاص مقصد سے سنایا ہے۔''

''ہاں۔''
''ایں۔ یعنی۔ مجھے کیوں۔''
''تمہیں اس کے کردار یاد ہیں۔''
''ہاں۔ کیوں۔''
''اس دلچسپ کہانی میں تمہیں سب سے خوبصورت کردار ادا کرنا ہے۔''
''مجھے۔ ٹی وی اسکرین پر۔''
''نہیں۔ لائف اسکرین پر!'' جمال نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ اور شرمین حیرت سے منہ کھول کر رہ گئی پھر لاڈ بھرے لہجے میں بولی۔
''میں نے کبھی تمہیں پریشان نہیں کیا۔ اس وقت میں تمہیں جو کچھ بتا رہا ہوں پوری سنجیدگی سے بتا رہا ہوں۔''
''کیا چاچو......۔''
''فائق اور ازلہ کی بیٹی بیلا کا کردار تمہیں ادا کرنا ہے۔ تمہیں......''
''چاچو۔ خدا کی قسم کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آپ کوئی سیریل بنا رہے ہیں۔''
''تم سمجھ کیوں نہیں رہیں شرمین۔ تمہیں بیلا کی جگہ لے کر اس کے سامنے جانا ہے۔''
''میں یہ کیسے کر سکوں گی چاچو۔''
''میں بتاؤں گا تمہیں۔ میں تمہیں تربیت دوں گا۔''
''اسے پتہ نہیں چلے گا چاچو کہ میں بیلا نہیں ہوں اور دوسری بات یہ کہ کیا اسے اصل بیلا کبھی نہیں ملے گی۔''
''ہاں۔ اسے اصل بیلا کبھی نہیں ملے گی۔''
جمال کے لہجے کی سفاکی شرمین سے چھپی نہیں رہ سکی۔
''مگر کیسے چاچو۔'' شرمین نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔
''اس لئے کہ میں ان سب کو ختم کر چکا ہوں۔'' جمال نے بدستور سفاک لہجے میں کہا اور شرمین کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''ختم۔ قتل۔''

''ہاں۔ میں ان سب کو قتل کر چکا ہوں۔''

''آپ۔ آپ نے ان سب کو مار دیا۔ چاچو آپ قاتل بھی ہیں۔''

''میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں شرمین' اسے مجھ تک ہی رہنے دو۔ تم طارق بلبن کی پوتی بن کر اس کے پاس پہنچ جاؤ گی۔ اربوں روپے کی دولت کی مالک بن جاؤ گی لیکن اس کے لیے تمہیں زبردست اداکاری کرنی ہوگی۔ اسے یقین دلانا ہوگا کہ تم اس کی پوتی بیلا ہو۔ میں تمہیں کہانی کے ہر پہلو سے آگاہ کروں گا۔ ایک اور فیصلہ کیا ہے میں نے میری بیٹی۔'' جمال نے رک کر شرمین کے زرد چہرے کو دیکھا پھر بولا۔

''اور چونکہ اب تم ایک ایسے گہرے راز سے واقف ہو چکی ہو جو اگر افشا ہو جائے تو مجھے بھی کسی حد تک جانا ہوگا۔ اس کے لیے تک سے تم کالج بھی نہیں جاؤ گی۔ میں اپنا کام فوراً شروع کرنا چاہتا ہوں اس لئے میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا جہاں مجھے تمہاری تربیت کرنی ہے۔''

شرمین کو کئی بار جمال احمد کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا جن کے لئے نواب احمد پریشان رہتے تھے لیکن اس لئے جمال احمد کو صرف چاچو سمجھتا تھا۔ آج پہلی بار اسے جمال احمد ایک اجنبی مجرم کی شکل سی نظر آرہا تھا۔ بھیانک اور سفاک مجرم۔ قاتل۔ اس کے بدن کی لرزشیں بہ آسانی دیکھیں جاسکتی تھیں۔

''لیکن بیٹا۔ میں تمہارا چاچو ہوں۔ تمہارے ابو کا بھائی۔ تمہارا محافظ۔''

''چاچو۔'' بمشکل اس کے لرزتی آواز ابھری۔

''ہوں۔ بولو میری بیٹی۔''

''چاچو۔ ابو کو یہ سب کچھ معلوم ہے۔''

''ہاں جانو۔''

''انہوں نے آپ کو اجازت دیدی ہے۔''

''دینا تھی بیٹے۔ میں نے ان سے یہ بات کہہ دی تھی کہ یہ سب میں شرمین کے اعلیٰ مستقبل کے لئے کررہا ہوں۔''

''مگر یہ تو جرم ہے چاچو۔''

''میں مجرم ہوں شرمین۔ یہی میرا ذریعہ زندگی ہے۔ یہی میرا نظریہ زندگی۔ میں نے کس سے کہہ دیا کہ آخر انہوں نے میری نیت پر شک کیا تو۔ پھر یہی ایک اور جرم کروں گا۔ اتنی بھیانک جرم کہ زمین و آسمان لرز اٹھیں گے۔ اور وہ جرم ہوگا اس گھر کی تباہی۔'' شرمین کے حلق سے خوف بھری آواز نکل گئی تھی۔

''اور سنو میری بچی۔ اب تم گھر کے دروازے سے قدم باہر نہیں نکالو گی۔ چلتا ہوں میری بچی۔'' جمال احمد دروازے سے باہر نکل گیا۔ شرمین سے بدن کی لرزشیں نہیں روکی جارہی تھیں۔ اس کا سارا بدن پسینے سے تر تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کو دیکھ رہا تھا جس سے جمال باہر گیا تھا۔ اس کے چچا۔ جسے وہ بڑے پیار سے چاچو کہتی تھی۔ وہی اس کا بھائی تھا اور میں اسے یہی درجہ دیتی تھی لیکن اب۔ اب جمال تھا۔ ایک سفاک اور بھیانک قاتل جس نے بیلا کا قتل کردیا تھا قاتل۔ قاتل۔ اور وہ۔ ہم سب کو بھی قتل کردے گا۔ کیونکہ وہ مجرم ہے۔ قاتل ہے اور میں اس کے ارادے سے واقف ہوگئی ہوں۔ وہ مجھے بھی قتل کردے گا۔ وہ جو شخص اندر سے مجرم ہوتا ہے وہ نہ چاچو ہوتا ہے نہ بھائی ہوتا ہے۔

''اور۔ چاچو کہتے ہیں کہ جو کچھ وہ کررہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے انہیں آپ کی اجازت حاصل ہے۔''

سائرہ بیگم کی آنکھیں جھک گئیں۔ وہ کچھ لمحے سوچتی رہیں پھر بولیں۔ ''شرمین' میں نے ساری زندگی تمہارے ابو کی اطاعت کی ہے۔ میرے ماں باپ نے جب مجھے رخصت کیا تھا تو میری ماں نے کہا تھا۔ بیٹا دنیا کی ریت یہی ہے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

شوہر کی خوشی ہی نجات کا راستہ ہوتی ہے۔ تم بھی ایسا ہی کرنا تمہارے ابو نے مجھے سب کچھ بتایا تھا میرے پاس گردن خم کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا اور پھر جس جذبے سے وہ یہ سب کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں تمہارے پیار کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں یہ جانتی ہوں۔''

''تب آپ میری بات بھی سن لیں امی۔ آپ خدا کے لئے میرے مستقبل سے خوفزدہ نہ ہوں یوں سمجھ لیں میں نے زندگی کے لئے ایک ساتھی منتخب کرلیا ہے۔ وہ ہم جیسا ہی ہے۔ امی' مجھے ریشم کے لحاف نہیں چاہئیں۔ مجھے فوم کے گدے نہیں چاہئیں۔ یہ ٹوٹی چار پائیاں میرا مزاج ہیں امی مجھے گھر سے رخصت کریں تو کسی ایسی ہی جگہ کریں جہاں ہمارے گھر جیسی چار پائیاں موجود ہوں۔ میں ریشم کی سیج پر زندہ نہ رہ سکوں گی۔''

''یہ فلمی باتیں مت کرو۔ روشنی میں زندگی ہوتی ہے۔ تاریکی میں آدمی مجبوراً جی لیتا ہے جب روشنی کو قریب سے دیکھو گی تو اس کی قیمت معلوم ہوگی۔''

''اس کا مطلب ہے آپ لوگ پوری طرح ہوس کا شکار ہو چکے ہیں۔ میرا خیال ہے اب ابو سے بات کرنا بھی بیکار ہوگا۔ کیونکہ وہ جمال چاچو کی زبان سے اپنی فیصلے کا اظہار کر چکے ہیں۔''

''ہاں۔ ایسا ہی ہے۔''

''اب مجھے خود سوچنا ہوگا کہ کیا میں ایسا کرسکتی ہوں۔''

''میرا مشورہ ہے شرمین کہ تم ہم سے تعاون کرو۔''

''میں سخت حیران ہوں امی۔ آپ لوگ یہ لہجہ اختیار کریں گے۔ مجھے یقین نہیں آرہا واقعی مجھے یقین نہیں آرہا۔''

''آجائے گا بیٹے۔ اچھی طرح یقین آجائے گا۔ اس دنیا میں ہر کام ہوجاتا ہے۔'' جمال کی آواز دروازے کے باہر سے سنائی دی تھی۔

شرمین ایک دم ساکت ہوگئی لیکن جمال دروازے سے اندر نہیں آیا تھا۔ دونوں ماں بیٹیاں اس کے اندر آنے کا انتظار کرنے لگیں لیکن جمال اندر نہیں آیا تھا نہ ہی اس کی آواز دوبارہ سنائی دی تھی۔

شرمین پر یہ وقت بہت کٹھن گزر رہا تھا۔ یہ سب کیا ہے۔ پہلے صرف جمال چچا مجرم ذہنیت کے حامل تھے۔ اب سارا گھر میں جرم کرنے پر آمادہ ہے۔ جمال تو جرائم پیشہ تھا۔ اس کے بارے میں بہت سے واقعات شرمین کے علم میں آچکے تھے لیکن گھر میں اسے لاڈلے بیٹے کی حیثیت دی جاتی تھی اس کی۔ برائیوں کے باوجود سب اس سے پیار کرتے تھے لیکن سب اس کے رنگ میں رنگ جائیں یہ کیسے ممکن ہوگیا تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ ایک آواز اس کے کانوں میں ابھری۔ ایک بھاری لیکن مستحکم آواز۔

تجربے اور جذبات کے مرکب کا نام نظریہ ہے۔ اس لئے دنیا کو جسم کی خاطر حاصل کرو' اور آخرت کو دل کے لئے۔

موت سے تمام مسائل اور شادی سے تمام مسرتوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ محبت انسان کے اندر ایک شدید جذبے کا نام ہے جسے نکال دیا جائے تو انسان اور حیوان میں فرق نہیں رہتا۔

ایثار یہ نہیں ہے کہ موٹا جھوٹا پہن لیا جائے۔ روکھا سوکھا' کھالیا جائے۔ ایثار یہ ہے کہ اپنی خواہشات مسرتوں اور چاہتوں کی قربانی دی جائے۔

یہ وہ تحریریں تھیں جو فال کے حیثیت سے طوطے نے نکالیں تھیں لیکن یہ کس قدر اس کے حسب حال تھیں۔ یہ تو اس کے مستقبل کی پیشن گوئیاں تھیں۔ اس کے تاریک مستقبل کی پیشن گوئیاں۔ نہ صرف اس کے بلکہ عارض بھی انہیں کی لپیٹ میں تھا۔ یہ تحریریں اس کے ذہن سے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بری طرح چپک گئیں۔

یہ تمام خیالات اس کے لئے شدید بے چینی کا باعث بن گئے۔ انہوں نے تفریحاً میں فال کھلوائے تھے لیکن۔ انہیں تو ان کا مستقبل بتا دیا گیا تھا۔ ایثار یہ نہیں ہے کہ موٹا جھوٹا پہن لیا جائے روکھی سوکھی کھالی جائے ایثار تو یہ ہے کہ اپنی خواہشوں اور مسرتوں اور چاہتوں کی قربانی دی جائے' آہ کیا یہی قربانی ہے جو مجھے دینی ہے۔ بوڑھا بابا واقعی کوئی درویش ہے جس نے آنے والے وقت کو بھانپ لیا تھا اور اس کے سامنے رکھی ہوئی تحریروں میں شرمین کی کہانی درج تھی' کیا سمجھے آپ لوگ' غلط تو نہیں کہا تھا میں نے بتایئے میں نے غلط تو نہیں کہا تھا کہ انسان کی کہانیوں میں کتنا تضاد ہے' کہیں کچھ کہیں کچھ لیکن آپ کا یہ قصہ گو انہی تضاد کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور آپ کو انہی کی کہانیاں سناتا ہے لیکن ہزاروں کہانیوں میں سے کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا انتخاب واقعی پر لطف ہوتا ہے' جیسے کہ میں آپ کو یہ کہانیاں سنا رہا ہوں۔

یعنی ایک طرف شرمین اور عارض' رشید احمد سائرہ بیگم' جمال احمد کا معاملہ ہے تو دوسری جانب بھی کئی کردار موجود ہیں جن میں مرکزی کردار علی شاہ' شاداب وغیرہ وغیرہ ہیں' علی شاہ اور شاداب کی کہانی کہاں تک پہنچی تھی' یہاں تک نا کہ فضل خان اور شاہدہ نے ایک انوکھا انکشاف کیا تھا' شاہدہ بھی پر جوش لہجے میں بولی۔

''جی صاب اس نے اکیلے ہی بیگم صاب کو نہیں دیکھا' میں نے بھی دیکھا ہے' ہم دونوں انہیں اوپر والے بیڈ روم کے شیشوں کے پیچھے سے دیکھ رہے تھے۔ صاب شیشے تو کھلے ہوئے نہیں تھے لیکن کمرے میں روشنی تھی اور بیگم صاب ان شیشوں کے پاس ہی کھڑی ہوئی تھیں' صاب میں نے انہیں اچھی طرح پہچان لیا تھا' میں نے تو سوچا تھا کہ بھاگ کر ان کے پاس جاؤں مگر فضل خان نے روک دیا' فضل خان کہنے لگا کہ ہوسکتا ہے بیگم صاحبہ ہم سے بھی چھپنا چاہتی ہوں' یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کہیں سے ہمارے علم کے بغیر اندر آ گئی ہوں اور اب خود صاحب کے سامنے آنا چاہتی ہوں ہم اس طرح ان کے سامنے جائیں گے تو ان کا راز کھل جائے گا اور انہیں اچھا نہیں لگے گا اس لئے صاب ہم ان کے پاس نہیں گئے۔''

''مگر میں نے تو اس گھر کا کونہ کونہ دیکھ رکھا ہے شاہدہ' مجھے تو وہ کہیں بھی نظر نہیں آئی۔''

''میں آپ کو بولا صاحب اگر آپ حکم کرو تو ہم ان کے پاس چلے جائیں۔''

''جاؤ دیکھو کوشش کرو اگر وہ مل جائے تو اسے مناؤ اس سے کہو کہ میں اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔''

فضل خان اور شاہدہ دونوں خوش ہوگئے اور اس کے بعد وہ اندر گھس گئے' تب علی شاہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنے اس نئے کمرے میں آگیا جو نچلی ہی منزل میں تھا اور اس نے آج کے بعد اسی میں قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ فضل خان اور شاہدہ کا انتظار کرنے لگا' جانتا تھا کہ کیا جواب لائیں گے' لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے' پہلے تو نہ کبھی اس موضوع پر غور کیا تھا اور نہ کبھی کوئی ایسی کہانی سنی تھی کہ کوئی روح اس طرح کسی کے گھر میں آزادانہ بھٹکتی پھر رہی ہو۔

''میں تمہیں بری روح ہی کہہ سکتا ہوں شاداب' کسی کے اعتماد کو دھوکہ دے کر تم نے سزا پائی ہے۔''

وہ کرسی کی ٹیک سے پشت لگا کر سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے' تہہ خانے میں شاداب کی راکھ آج تک پھیلی ہوئی تھی' اچانک ہی اس نے سوچا کہ اس راکھ کو سمیٹنا بھی ضروری ہے۔ حالانکہ تہہ خانے میں نہ تو کہیں ہوا کا گزر تھا کہ راکھ بکھر جائے لیکن ہلکی پھلکی آکسیجن کو ہر جگہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہوتی ہی ہے' دروازہ کھلے گا تو راکھ ہر طرف منتشر ہونا شروع ہو جائے گی۔ اسے سمیٹ لینا چاہیے' وہ کمرے میں نگاہیں دوڑانے لگا' ایسا کوئی بکس وغیرہ ملنا چاہیے جس میں وہ راکھ سمیٹی جاسکے۔ وہ سوچتا رہا پھر اس نے فیصلہ کیا کہ فضل خان اور شاہدہ کا انتظار کیا جائے چنانچہ وہ وہیں بیٹھا رہا پھر فضل خان اور شاہدہ واپس آ گئے' ان کے چہروں پر مایوسی جھلک رہی تھی۔

''نہیں صاب اس ٹائم وہ گھر پر نہیں ہیں' بہرحال سمجھ گیا اصل بات کیا ہے صاب گھر کے پچھلے حصے پر جو کیاری ہے اس میں پیچھے کی طرف کوئی ایسا راستہ موجود ہے جس سے اندر آیا جاسکتا ہے۔ بیگم صاب اسی راستے سے اندر آیا اور تھوڑا دیر ادھر ادھر گھوم کر واپس نکل گیا' ہوسکتا ہے وہ اپنا کچھ سامان لینے آیا ہو' پر آپ فکر مت کرو وہ زندہ سلامت ہے ہم دونوں کو یہ بات معلوم ہے آپ ہمارا بات کا یقین کرو جب ہم انہیں دیکھے گا نا تو ہم ان کے پاس پہنچ جائے گا' ان کے پیروں پر سر رکھ دے گا اور بولے گا کہ صاب ہمارا بہت پریشان ہے آپ غصہ تھوک دو' ہم آپ کے بیچ صلح کرا دے گا' معاف کرنا صاب ہم نے بڑا بات کیا ہے پر ہمارا دل چاہتا ہے کہ اس گھر کا خوشیاں واپس آ جائیں۔''

''شکریہ فضل خان' اگر ایسا ہو تو تم اپنی مرضی کے مطابق جس طرح بھی چاہو کر لینا میں تمہارا ساتھ دوں گا۔''

علی شاہ کے الفاظ پر فضل خان اور شاہدہ خوش ہو گئے تھے۔ پھر وہ وہاں سے چلے گئے تو علی شاہ اپنی جگہ سے اٹھا' اب اسے کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جس میں وہ راکھ سمیٹ کر رکھی جاسکے۔ اسے ایک بہت بڑا پیتل کا گلدان نظر آیا جس میں نقلی پھول لگے ہوئے تھے۔ گلدان کافی بڑا تھا اس میں وہ راکھ سمٹ سکتی تھی' یعنی شاداب اس گلدان میں آ سکتی تھی' اس نے فیصلہ کیا کہ اس گلدان میں شاداب کی راکھ کو سمیٹ لیا جائے اور یہ نقلی پھول اس میں لگا دیئے جائیں لیکن اس کے لئے رات کا وقت ہی مناسب تھا اور جب فضل خان اور شاہدہ اپنے کوارٹر میں پہنچ گئے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھا' اس نے گلدان خالی کیا اور اس کے بعد تہہ خانے کی جانب چل پڑا۔ یہ احساس اس وقت بھی اسے ہو رہا تھا کہ کوئی دبے قدموں اس کے ساتھ چل رہا ہے۔ بلکہ آج تو اسے ایک دو بار ایسا بھی لگا جیسے کوئی پاس سے گزر جائے تو اس کے بدن کی ہوا لگتی ہے۔ وہ چونکا ضرور تھا لیکن خوفزدہ نہیں ہوا' راکھ سمیٹنے کے لئے بھی اس نے بندوبست کر دیا تھا' ایک چھوٹی سی جھاڑو اس کے پاس موجود تھی' اس کے علاوہ راکھ اٹھانے والا ایک پلاسٹک کا برتن بھی۔

تہہ خانے کے اندر پہنچ کر اس نے روشنی کی اور پھر جھاڑو کے ذریعے راکھ سمیٹنے لگا' اس وقت بھی اس کے دل میں رحم کا کوئی جذبہ نہیں تھا بس ایک خوفناک تاثر اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ راکھ زیادہ نہیں بکھری تھی اس نے اسے بڑے اطمینان کے ساتھ جمع کر کے پیتل کے گلدان میں منتقل کیا اور پھر ایک ایک ذرہ صاف کرنے کے بعد پیتل کے گلدان کو ڈھک دیا اور دوبارہ واپس باہر آ گیا' غسل خانے سے چھوٹی بالٹی میں پانی لیا اور ایک کپڑا ساتھ لے کر دوبارہ تہہ خانے میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد تہہ خانے کا فرش بالکل صاف ہو گیا تھا۔ آخرکار وہ تمام چیزیں اٹھائے باہر آ گیا۔ پیتل کے گلدان میں شاداب محوِ خواب تھی' باہر آ کر اس نے بڑے اہتمام سے نقلی پھول اس گلدان میں لگائے پھر سوچنے لگا کہ گلدان کہاں رکھا جائے ویسے گلدان ڈرائنگ روم میں ہی تھا' اس نے اسے اس کی اصل جگہ رکھ دیا تاکہ فضل خان وغیرہ کو بھی شک نہ ہو' اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گیا اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

شاداب کے بارے میں ہی سوچنے لگا۔

ایک دن دو دن تین دن گزر گئے' ڈرائنگ روم جب بھی جاتا اس کی نگاہ گلدان پر پڑ جاتی اور اسے یوں لگتا جیسے کوئی چیز اس کے دل کو مسل رہی ہے۔ یہ تو غلط ہے اس کا احساس اسے گلدان کی جانب متوجہ کرتا اور شاداب کی تصویر اس کی آنکھوں میں ابھر آتی' اس گلدان کو یہاں سے ہٹانا ضروری ہے' اس نے دل میں سوچا اور پھر فیصلہ کرنے لگا کہ اس گلدان کو کہاں پھینکا جائے۔ اب کوئی ایسا خطرناک بات نہیں تھی وہ اسے کہیں بھی لے جا کر پھینک سکتا تھا۔ اس وقت وہ بالکل اتفاقیہ طور پر اپنے گھر کے پچھلے حصے پر بنے ہوئے چھوٹے لان پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ چوڑی کیاری کی طرف اٹھ گئی' یہاں فضل خان نے گوڈی کی تھی اور کیاری میں کوئی نئے بیج ڈالنے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ ایک دم چونک پڑا۔ گلدان کی راکھ کو آرام سے اس مٹی میں ملایا جا سکتا ہے' فضل خان کچھ بھی کر رہا ہو یہ کام آرام سے کیا جا سکتا ہے' چنانچہ وہ گلدان کے نقلی پھول نکال کر اسے باہر لے آیا اور پھر اس نے پوری کیاری میں گلدان کی راکھ بکھیر دی اور اسے پھرتی سے برابر کرنے لگا' اس کام میں اسے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی تھی' فضل خان شاید اندر کہیں مصروف تھا' گلدان پوری طرح صاف کر کے اس نے وہیں لگے ہوئے نلکے سے اسے دھویا اور اس کے بعد اسے لئے ہوئے واپس ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

جب اس نے گلدان میں نقلی پھول سجائے تو دل کو ایک اطمینان کا احساس ہوا گویا روز روز شاداب کے خیال سے نجات مل گئی تھی۔ اس کے بعد چند دن انتہائی پرسکون گزر گئے' کوئی ایسی بات ذہن یا دل میں نہیں آئی تھی' عنایت صاحب نے کئی بار اظہار ہمدردی کیا تھا اور کہا تھا کہ تعجب کی بات ہے کہ بیگم صاحبہ ابھی تک واپس نہیں آئیں اور نہ ہی انہوں نے اپنا کوئی پتہ نشان دیا۔

''آپ خود دیکھ لیجئے عنایت صاحب' کتنی بڑی غلطی ہوئی تھی ہم سے' ہم انسان کو سمجھنا دنیا کا سب سے مشکل ترین کام ہے' ہم اسے نہیں سمجھ پائے تھے کہ وہ کس قماش کی عورت ہے۔''

''میں تو بہت شرمندہ ہوں شاہ صاحب کہ وہ میرے ذریعے یہاں آئی تھی۔'' عنایت صاحب نے ٹھنڈے سانس لے کر کہا اور علی شاہ دوسری جانب متوجہ ہو گیا۔ فضل خان بھی ذرا الجھا ہوا سا تھا' اس رات بھی جب وہ ایک گلاس دودھ لے کر اس کے پاس آیا تو کہنے لگا۔

''صاب ہم اپنے ملک جانا چاہتا ہے۔''

''صاب ہم بغیر پڑھا لکھا لوگ ہے ہمارے ملک میں چھوٹی موٹی باتوں کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا' تھوڑے فاصلے پر پیر بابا کا مزار ہے فاتحہ خوانی کرتا ہے اور بس' لیکن صاب تھوڑے دن سے ہمارا بیوی ڈرنے لگا ہے۔''

''شاہدہ۔ ڈرنے لگی ہے کیوں۔''

''آپ کو کیا بولے صاب آپ ناراض ہو جائے گا یا پھر ہمارا بات پر ہنسے گا۔''

''جو بول سکتے ہو بولو فضل خان' تم جانتے ہو میں زیادہ فضول باتیں نہیں سنتا۔'' علی شاہ نے کرخت لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے صاب' ہم اس دن آپ کو بولا کہ ہم نے بیگم صاب کو شیشے کے پیچھے دیکھا اور ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ اسی گھر میں چھپا ہوا ہے' پر صاب میرے کو کچھ اور شک پڑتا ہے۔''

''صاب آپ کو کیا بولے' بیگم صاحبہ اس کے بعد بھی ہمیں بہت بار نظر آیا ہے' دو تین بار ہم اس کو دیکھ کر اس کے پیچھے دوڑا' پر جب ہم اس کے پاس پہنچتا ہے تو وہ غائب ہو جاتا ہے جبکہ صاب ہم آپ کو خدا کا قسم کھا کر بتاتا ہے کہ ہم پوری طرح ہوش میں ہوتا ہے اور پھر ہم ہی نہیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

شاہدہ نے بھی اس کو دیکھا ہے' شاہدہ میرے کو بولتا ہے صاب کہ وہ بیگم صاب نہیں ان کا' ان کا بھوت ہے۔''

''فضل خان تمہیں دھوکہ ہوا ہے۔'' علی شاہ نے کھوکھلی آواز میں کہا جبکہ اس بات کا اسے خود بھی احساس تھا کہ شاداب موت کے بعد بھی اس پورے گھر پر مسلط ہے' اس نے لاکھ کوشش کی لیکن فضل خان کو نہیں روک سکا' فضل خان روتا ہوا گیا تھا۔ اس نے کہا۔

''صاب خدا کا قسم کھاتا ہے ہم کہ ہم آپ کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ پر صاب ہمارا بیوی مرجائے گا' وہ خوف سے تھرتھر کانپتا ہے' ہم خود بیگم صاب کا سایہ کو ادھر ادھر جاتے ہوئے دیکھتا رہا ہے' پر صاب ایک بات آپ کو بولے' تھوڑا ٹائم ہم اپنے ملک میں گزارے گا اس کے بعد شاہدہ کو ادھر چھوڑے گا اور آپ کے پاس واپس آجائے گا۔ ہم آپ سے وعدہ کر کے جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے فضل خان جیسا تم مناسب سمجھو۔'' علی شاہ نے کہا اور اب وہ خود بھی پریشان ہونے لگا تھا۔

یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی' میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا' پہلے میری ماں نے مجھے دھوکہ دیا' اس کے بعد بہن نے اور اس کے بعد بیوی بھی بالکل وہی نکلی' یوں لگتا ہے کائنات میں بسنے والی ہر عورت ایک ہی مزاج رکھتی ہے۔ کئی دن گزر گئے' اب وہ صرف رات کو گھر آجاتا تھا اور کمرے میں سو جاتا تھا' کھانا وغیرہ باہر ہی کھالیتا تھا اب تو عنایت صاحب بھی کچھ نہیں کہتے تھے کیا کہتے بیچارے' وہ سوچ رہا تھا کہ کیا زندگی اسی طرح گزر جائے گی' کیا ایسا طریقہ کار اختیار کیا جائے کہ تھوڑی سی رونق زندگی میں پیدا ہو' پھر صبح جب وہ غسل خانے وغیرہ سے فارغ ہو کر تیار ہوا اور جب باہر نکلا تو اس نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا۔ وہ کیاری جس میں اس نے شاداب کی راکھ ملائی تھی پھولوں سے لدی ہوئی تھی دور سے ہی خوشنما رنگ کے پھول نظر آرہے تھے' ہوسکتا ہے فضل خان نے کسی نئے قسم کے پھول کے بیج ڈالے ہوں' بس یونہی ٹہلتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ گیا اور دوسرے لمحے اس کا دل دہشت سے کانپ اٹھا' کیاری میں جو پھول کھلے ہوئے تھے وہ دنیا کے سب سے حیرت ناک اور انوکھے پھول تھے۔ وہ انسانی شکل میں تھے اور یہ شکل شاداب کی تھی۔

تقریباً پچیس سے لے کر تیس پھول کھلے ہوئے تھے اور سب کے سب ایک ہی شکل کے' آنکھیں ناک منہ ہونٹ مکمل طور پر شاداب کی تصویر پیش کرتے تھے' اس کے حلق سے دہشت بھری چیخ نکل گئی۔

''انتہا ہے' انتہا ہے' کیا کرنا چاہیے مجھے کیا عنایت صاحب کو اپنا رازدار بنالوں ان سے کہوں کہ کس طرح میں نے اپنی بیوی کو قتل کردیا ہے اور اس کے بعد وہ میری زندگی کی گاہک بن گئی ہے لیکن' قتل کا یہ اعتراف تو خود میرے لئے بہت بھیانک ہوسکتا ہے' پورا دن وہ کشمکش کا شکار رہا' شام کو گھر واپس آنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اور جاتا بھی کہاں' کیاری کی طرف سہمی ہوئی نظر ڈالی' پھولوں کی پتیاں ہوا سے بکھر گئی تھیں' اب تو فضل خان یہاں موجود نہیں تھا جو یہاں کی صفائی کردیتا' اس نے سوچا کہ کچھ نئے ملازموں کو رکھا جائے' بڑی آسانی سے یہ کام ہوسکتا تھا' عنایت صاحب سے کہنے کی دیر تھی' عنایت صاحب فوری طور پر اس کے گھر میں ملازم کا بندوبست کردیتے' ویسے اس نے بتادیا تھا کہ اس کا ملازم اپنی بیوی کے ساتھ گاؤں گیا ہے جسے وہ ملک کہتا ہے۔

دوسری صبح جاگا تو اس نے کیاری میں پھر وہی پھول کھلے ہوئے دیکھے' وہ دور سے کھڑا ان پھولوں کو دیکھتا رہا اور اس کے دل میں نفرت کا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

طوفان امنڈتا رہا۔

''میں تجھے کامیاب نہیں ہونے دوں گا شاداب' نہیں کامیاب ہونے دوں گا میں تجھے۔'' شام کو وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور پھر اس نے اپنی مزاج کے خلاف بازار سے خریداری کی' یہ تیزاب کی بوتلیں تھیں' تیز ترین تیزاب' اپنے ساتھ لاکر اس نے پوری کیاری تیزاب سے ڈبو دی' مٹی سے دھواں اٹھ رہا تھا' کونپلیں جل رہی تھیں اور ایک عجیب سی بو فضا میں پھیل گئی تھی' اسے یوں لگا جیسے کوئی چیخ رہا ہو' چیخوں کی آواز اندر گھر سے آ رہی تھی' اس نے بغور اس آواز کو محسوس کیا ہاں وہ آواز سو فیصدی شاداب ہی کی تھی۔ ایک نگاہ اس نے کیاری پر ڈالی اور پھر اٹھ کر اندر چل پڑا۔ آواز دوسری منزل سے آ رہی تھی' اسے خدشہ ہوا کہ آس پاس سے گزرنے والے آواز نہ سن لیں' اوپری منزل کی سیڑھیاں طے کرنے لگا' جیسے ہی وہ اوپر پہنچا آوازیں بند ہوگئیں اور گہرا سکوت چھا گیا۔

اوپری منزل والے بیڈ روم میں داخل ہوگیا۔ دروازے سے عین سامنے ایک آرام چیئر پڑی ہوئی تھی' یوں لگا جیسے کوئی آرام چیئر سے اٹھا ہو' آرام چیئر کئی لمحوں تک ہلتی رہی تھی۔

''بدلہ لے رہی ہو مجھ سے شاداب' لیکن یہ بدلہ لینے کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ سیدھا سادہ کام کرو میرے سینے میں خنجر اتار دو' پستول حاصل کرو اور گولیوں سے چھلنی کردو مجھے' بدلہ تو اسی طرح لیا جاسکتا ہے' یہ جو تم گھر میں بھٹک رہی ہو اس سے کیا حاصل ہوگا' میری مانو انتقام کے طور پر مجھے ہلاک کردو۔''

اسی وقت دروازے کھلا اور ایک سایہ سا باہر نکل گیا' وہ کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ دوسرے دن وہ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا تھا' سوچتا رہا تھا' گھر میں یہ سب کچھ ہوتا رہے گا' کیا فائدہ گھر میں تنہا رہنے کا' فضل خان اور شاہدہ بھی چلے گئے تھے' عنایت صاحب سے کہہ کر نئے ملازم بھی رکھے جائیں تو چار دن میں وہ بھی بھاگ جائیں گے' ایک ہی طریقہ ہوسکتا ہے کہ میں خود گھر چھوڑ دوں' کسی ہوٹل میں مناسب کمرہ حاصل کرکے وہاں قیام کروں' یہ ہوسکتا ہے' چنانچہ میں اس نے تیاریاں کیں اور ایک سوٹ کیس تیار کیا' پھر فون ڈائری اٹھا کر اس میں اچھے ہوٹلوں کے نمبر دیکھنے لگا' ایک فوراسٹار ہوٹل میں اس نے کمرہ بک کرلیا اور کچھ دیر کے بعد وہ اپنی قیمتی کار میں بیٹھ کر چل پڑا۔

کار ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں پارک کی اور کاؤنٹر پر پہنچ گیا' ضروری کارروائی کے بعد وہ دوسری منزل کے ایک کمرے میں منتقل ہوگیا۔

اس بدلے ہوئے ماحول میں اسے سکون کا احساس ہوا اور وہ لباس تبدیل کرکے مسہری پر دراز ہوگیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے دل سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا ہو' ذہن کو ہر احساس سے بے نیاز کردیا تھا' بہت دن کے بعد وہ ایک بھرپور نیند سویا' جاگنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ چار دن بالکل کسی سے رابطے کے بغیر گزارے جائیں' عنایت صاحب کو فون کردوں گا کہ کسی سے میرا تذکرہ نہ کریں یہ نہ بتائیں کہ میں کہاں ہوں' عنایت صاحب بہت اچھے انسان تھے انہیں احساس تھا کہ اس وقت میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ دوسرے دن اس نے کوئی گیارہ بجے کے قریب انہیں فون کیا اور عنایت صاحب نے بے چین سے لہجے میں کہا۔

''سر آپ خیریت سے تو ہیں ناں۔''

''ہاں عنایت صاحب۔''

''سر میں نے گھر بہت سے فون کئے کسی نے فون ہی ریسیو نہیں کیا۔''

''میں گھر پر ہوں کہاں عنایت صاحب۔''

''کیا مطلب سر۔''

''ہاں میں گھر پر نہیں ہوں' شاید آپ کو اس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بات کا علم ہے کہ میرے ملازم بھی چلے گئے ہیں' گھر پر خاصی پریشانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔''

''سر بالکل اتفاق ہے' میں اسی سلسلے میں ایک شخص کو لے کر آپ کے پاس گھر گیا تھا' چھوٹی سی فیملی ہے' اس کی بیوی ہے دو بچے ہیں' ڈرائیونگ کرلیتا ہے' بیوی گھر کے کام کاج کے لئے تیار ہے' میں نے سوچا کہ اسے گھر دکھادوں اور آپ سے ملادوں لیکن آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''ابھی تھوڑی دن کے لئے میں نے گھر پر تالا لگا دیا ہے عنایت صاحب اور ایک ہوٹل میں مقیم ہوگیا ہوں' ہوٹل کے بارے میں آپ کو نہیں بتاؤں گا' میں کسی بھی ضرورت پر آپ سے رابطہ نہیں کرسکتا' کیونکہ میں صرف آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور ضرور سر ضرور' آپ آرام کرلیجئے۔''

''شکریہ' بس آپ کو یہی اطلاع دینی تھی' سارے معاملات آپ خود ہی سنبھالیں' میں خود آپ سے رابطہ قائم کروں گا۔''

''آپ بالکل اطمینان رکھیں سر۔'' عنایت صاحب نے کہا اور وہ مطمئن ہوگیا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی' سب کچھ تو ہو رہا تھا لیکن اب وہ اپنے آپ کو سنبھالنا چاہتا تھا بہت سے فیصلے کئے تھے اس نے یہاں رہ کر' شاداب کے ساتھ اس نے دنیا کے کئی ملکوں کی سیر کی تھی' اس وقت مزہ ہی دوسرا آیا تھا' لیکن شاداب نے سب کچھ تو چھین لیا' کمبخت نے سب کچھ چھین لیا' چلو لعنت بھیجو اس پر' تھوڑا سا وقت یہاں گزارا جائے اور اس کے بعد عنایت صاحب کو ہدایت کر کے کسی ملک کی سیر کو نکلا جائے' اس ماحول سے چھٹکارہ ملے گا اور ذہن شاداب کے تصور سے آزاد ہوجائے گا۔

بہر حال اس کے بعد بھی اس نے اپنا وقت ہوٹل کے کمرے ہی میں گزارا البتہ شام کو ذرا بیزاری سی ہونے لگی' کوئی خوف کی بات تو تھی نہیں۔ ہوٹل ایک پر رونق جگہ ہے' اس نے اپنے کمرے سے اس کا جائزہ لیا تھا۔ بہت ہی خوبصورت تھا یہ ہوٹل' اگر تھوڑی دیر کے لئے باہر نکل جائے تو کوئی ہرج نہیں ہے' چنانچہ اس نے اپنا ایک شاندار لباس نکالا' غسل خانے میں جا کر شیو کیا پھر نہا کر لباس تبدیل کیا' اس وقت تک رات ہوچکی تھی چنانچہ وہ ہوٹل کے کمرے سے باہر نکل آیا اور اس نے ریفرشنگ ہال کا رخ کیا۔

یہاں واقعی پوری رونق ہوچکی تھی' آرکسٹرا کی مدہم آوازیں ابھر رہی تھیں' ہوٹل کھچا کھچ بھرا ہوا تھا' کافی لوگ یہاں آئے ہوئے تھے' ان میں تنہا لوگ بھی تھے' جوڑے بھی تھے' مقامی بھی تھے اور غیر مقامی بھی' ویٹر نے اس کی میز کی جانب رہنمائی کی اور وہ اپنی میز پر جا بیٹھا' پھر اس نے ایک مشروب طلب کرلیا تھا' یہ صرف شغل کے لئے تھا۔ اس کی نگاہیں ہوٹل میں موجود مہمانوں ک اجائزہ لے رہی تھیں' پھر اچانک ہی اس کی نظریں اس لڑکی کی جانب اٹھی تھیں۔

اسے لڑکی ہی کہا جاسکتا تھا لیکن علی شاہ کے ذہن کو جو جھٹکا لگا تھا اس نے تھوڑی دیر کے لئے اسے جھنجھنا کر رکھ دیا تھا' وہ ایک خوبصورت لباس پہنے ہوئے تھی' بہت ہی خوبصورت' دودھ جیسی رنگ والی' سفید چہرہ جس کے نقوش انتہائی دلکش لگ رہے تھے لیکن اس کے نقوش نے ہی علی شاہ کو حواس باختہ کیا تھا کیونکہ یہ شاداب ہی تھی۔ وہی بالوں کا اسٹائل' وہی قد و قامت وہی جسامت وہی چہرہ' لیکن اس وقت وہ جس انداز میں نظر آرہی تھی ایسا اسے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ شاداب پہلے بھی حسین تھی بعد میں بھی علی شاہ سے شادی کرنے کے بعد جب اسے زندگی کی تمام آسائشیں ملیں تو اور بھی حسین ہوگئی' لیکن اس وقت وہ بہت عجیب نظر آرہی تھی۔ اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ دلکش لگ رہا تھا۔ آنکھیں تو

Downloaded from Paksociety.com

اصلی معلوم ہو رہی نہیں رہی تھیں' اس نے نیلے رنگ کے لینس لگائے ہوئے تھے لیکن لگ ایسی رہی تھی کہ کوئی بھی ایک بار اسے دیکھے تو دوبارہ اسے دیکھے بغیر نہ رہ سکے' علی شاہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری' یہ کیا قصہ ہے' کیا یہ شاداب ہی ہے یا اس کی کوئی ہمشکل' اگر شاداب ہے تو موت کے بعد پراسرار سائے کی شکل میں تو آئی تھی لیکن باقاعدہ انسانی وجود میں پہلی بار نظر آ رہی تھی۔ وہ چند لمحات اسے دیکھتا رہا' پھر اس کے دل میں ایک عجیب سا نفرت کا احساس جاگا' اس نے سوچا کہ اگر وہ یہاں تک اس کے تعاقب میں آ گئی ہے تو اسے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیئے' بالکل اضطراری طور پر اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور اس کے قریب پہنچ گیا تھا' لیکن اس کے پاس جا کر اسے اپنے جسم میں ایک نامعلوم دہشت کا سا احساس ہوا تھا' دہشت کی لہروں کے ساتھ ہی اس کے رونگٹے بھی تھرا گئے تھے' اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس وقت شاداب اس قدر دلکش لگ رہی تھی کہ تھوڑی دیر کے لئے انسان ساری باتیں بھول جائے۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور کسی قدر خفیف سے مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''ہیلو۔''

اس دوران علی شاہ نے خود کو سنبھال لیا تھا' اس نے جواب میں کہا۔

''ہیلو۔''

''جی فرمایئے۔'' وہ بولی۔

''بیٹھ سکتا ہوں۔''

''بیٹھ جایئے مگر میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

''جی میرا نام علی شاہ ہے۔'' علی شاہ نے کہا اور صرف یہ جاننے کے لئے کہ وہ جسمانی شکل اختیار کر کے آ تو گئی ہے لیکن کیا اس کے اندر جسمانیت بھی پیدا ہو گئی ہے اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا' لڑکی نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اس کا ہاتھ قبول کر لیا' لیکن علی شاہ کو یوں لگا جیسے اس نے دہکتے ہوئے کوئلوں پر انگلیاں رکھ دی ہوں' اس نے گھبرا کر اپنا ہاتھ پیچھے کیا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر اس نے لڑکی کی جانب نگاہیں اٹھائیں اور ہلکے سے مسکرا دیا۔

''کیسی ہیں آپ شاداب۔''

''جی۔ سوری سوری جناب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو' میرا نام شاداب نہیں بلکہ عینی ہے' میں نورعین ہوں اور مجھے عینی کہا جاتا ہے۔''

''کیا نام بتایا آپ نے۔''

''عینی عینی۔''

''لیکن میں آپ کو شاداب ہی کہوں گا کیونکہ میرا اور آپ کا ایک گہرا تعلق رہ چکا ہے۔'' علی شاہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا اس عورت کے اندر اسے ایک شیطانی روح کا احساس ہو رہا تھا' اس کی آنکھوں سے روشنی کی شعاعیں سی پھوٹتی لگ رہی تھیں اور اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی سحر انگیز قوت پوشیدہ تھی جو دماغ میں سوراخ کرنے لگتی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ انسانی شکل میں کوئی پراسرار وجود ہے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور علی شاہ پھر بولا۔

''تو آپ کا نام نورعین ہے ویری گڈ۔'' علی شاہ کے لہجے میں طنز سا تھا۔

''میں نہیں سمجھی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' لڑکی کے اندر کسی قدر جھنجھلاہٹ سی پیدا ہو گئی تھی اس نے بے چین نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اچانک ہی اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی اٹھی' وہ لہر اس شخص کو دیکھ کر اٹھی تھی جو اس ہال کے داخلی دروازے سے اندر آیا تھا۔

''مس نورعین آپ شاید۔''

''جی فرمایئے۔'' وہ بولی' اتنی دیر میں وہ شخص بھی قریب پہنچ گیا تھا۔

''ہیلو عینی' یہ کون صاحب ہیں۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''میں نہیں جانتی ابھی میرے پاس آئے ہیں اور مجھے شاداب کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں۔''

''اوہو۔شاید ان کو غلط فہمی ہوئی ہے' جی سر' کیا آپ یہاں سے اٹھنا پسند کریں گے۔'' اس شخص نے تیکھے لہجے میں کہا اور اچانک ہی علی شاہ کے ذہن میں ایک اور پھلجھڑی چھوٹی' یہ آدمی' یہ آدمی...... اس نے غور سے اس شخص کو دیکھا اور اس کے ذہن میں اپنے گھر کی اوپر کی کھڑکی سے نظر آنے والے دونوں سایوں میں سے مرد کے سائے کا احساس ہوا' جسمانی طور پر یہ شخص ویسا ہی تھا' تو یہ ہے وہ شخص جس کی وجہ سے اسے زندگی کے بدترین لمحات سے دوچار ہونا پڑا' مگر اس روح کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے' کیا وہ بھی مر چکا ہے' مگر کیسے۔علی شاہ کے ذہن میں الٹی سیدھی باتیں آنے لگیں۔ وہ شخص منتظر نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

''محترم میں نے آپ سے درخواست کی ہے کہ آپ یہاں سے اٹھ جایئے پلیز' ہم لوگ آپس میں بات چیت کرنا چاہتے ہیں اور اس وقت کسی اور کی گنجائش نہیں ہے' کیا آپ یہاں سے اٹھنا پسند کریں گے۔'' اس بار اس کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا تھا' علی شاہ کا دل چاہا کہ اسے گردن سے پکڑے اور یونہی میز پر رگڑ دے' لیکن وہ ہوش کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا' اب یہ دونوں اس شکل میں نظر آئے ہیں تو انہیں چھوڑنا آسان نہیں ہوگا' اس نے فیصلہ کیا اور آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا پھر وہ اپنی میز کی طرف جا رہا تھا اور وہ دونوں اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ پھر لڑکی کے منہ سے آواز نکلی۔

''یا تو اسے واقعی غلط فہمی ہوئی ہے یا پھر یہ تھوڑی سے دماغی عدم توازن کا شکار ہے۔''

''ایسا ہی لگتا ہے۔'' مرد نے کہا اور پھر سرگوشی میں عورت سے کچھ کہنے لگا اور عورت کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے۔ وہ اپنی میز پر آ گیا تھا اور یہاں سے ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا' دونوں کئی بار نگاہوں سے اسے دیکھ چکے تھے اور کچھ گھبرائے ہوئے سے تھے۔

''یہ کمبخت زندہ ہے یا پھر اس کی آوارہ روح ہے اور یہ مردود کیا اسے معلوم ہے کہ اس کی محبوبہ اب صرف ایک مردہ وجود ہے یا پھر وہ دھوکے میں ہے' لیکن سنا ہے روحیں مجسم نظر تو آ سکتی ہیں مگر ان کے وجود صرف ہوا ہوتے ہیں' ممکن ہے یہ صرف وہم ہو' لوگوں کو پوری حقیقت معلوم نہ ہو' کیونکہ میں نے تو اسے چھو کر دیکھا ہے' اس کا وجود بے شک انتہائی گرم تھا' کسی دھوکے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' دونوں مجرم روشنی میں تھے اور اب بری طرح گھبرا رہے تھے۔

اچانک اس نے ان دونوں کو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے دیکھا حالانکہ ابھی انہوں نے اپنے کھانے پینے کے لئے بھی طلب کچھ نہیں کیا تھا۔ شاداب کو اگر اپنے عاشق کا انتظار بھی تھا تب بھی انہیں کچھ کھا پی کر یہاں سے اٹھنا چاہیے تھا' صاف ظاہر تھا کہ شاداب کو اس کی یہاں موجودگی کا علم نہیں تھا اب وہ خوفزدہ ہو کر یہاں سے اٹھ رہی ہے۔ علی شاہ کے ہونٹوں پر ایک مدہم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تو تو ایک روح ہے شاداب تجھے کسی سے کیا خوف ہو سکتا ہے' لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا تو کسی بھی شکل میں میرے سامنے آئے میں اس کائنات میں تیرا وجود برداشت نہیں کر سکوں' اگر مجھے سو بار تجھے قتل کرنا پڑے تو میں ایسا ہی کروں گا۔''

وہ دونوں دروازے سے باہر نکلے تو وہ پھرتی سے خود بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا حالانکہ نیچے آتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ کہیں جائے گا لیکن بس عادتاً اس نے گاڑی کی چابی جیب میں ڈال لی تھی اور اس وقت اسے اپنی یہ عادت بری نہیں لگی' باہر نکل کر اس نے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لابی کے دوسرے سرے پر پارکنگ لاٹ میں ایک کار کے پاس دونوں کو کھڑے ہوئے دیکھا' نوجوان کار کا دروازہ کھول رہا تھا' پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور شاداب اس کے پاس بیٹھ گئی۔

علی شاہ دوڑتا ہوا باہر نکلا اور اپنی کار کے پاس پہنچ گیا' اس نے پھرتی سے کار کا دروازہ کھولا اندر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا' کار دو تین دن سے اسی طرح کھڑی ہوئی تھی اس لئے رات اسے تین چار سیلف لگانے پڑے' اس دوران آگے والی کار ہوٹل کے بڑے گیٹ سے باہر نکل گئی تھی' بہرحال اس کی کار بھی اسٹارٹ ہوگئی اور وہ اسے بڑی احتیاط سے دوسری کاروں کے درمیان سے نکال کر گیٹ تک لایا' کار باہر نکال کر دائیں بائیں نگاہ ڈالی' بائیں سمت ایک کار کی روشنیاں نظر آرہی تھیں جبکہ ذہنی سمت کسی کار کا دور دور تک کوئی وجود نہیں تھا چنانچہ اس نے اسی سمت کار آگے بڑھا دی اور ان روشنیوں کا تعاقب کرنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ صحیح کار کا تعاقب کررہا ہے' چنانچہ وہ احتیاط سے کار ڈرائیور کرنے لگا' وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ لوگ کہاں جاتے ہیں' یہ بھی ایک دلچسپ عمل تھا اور اس سے یہ اندازہ ہوسکتا تھا کہ شاداب کا محبوب شاداب کی حقیقت جانتا ہے یا نہیں۔ کئی سڑکیں طے ہوئیں اور علی شاہ کو یہ اندازہ ہوگیا کہ ان لوگوں کو اپنے تعاقب کا پتہ چل چکا ہے' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کہاں تک جاؤ گے تم لوگ مجھ سے بچ کر۔'' اس نے کہا اور احتیاط سے ان کا تعاقب کرتا رہا' اسے یہ اندازہ ہورہا تھا کہ اب وہ اس سے خوفزدہ ہیں اور کار کو بے مقصد ہی ادھر ادھر دوڑا رہے ہیں' لیکن اس وقت وہ ذرا سا پریشان ہوگیا جب اچانک ہی آگے جانے والی کار نے رخ تبدیل کیا اور ایک کٹ سے فوراً واپس مڑ گئی۔

علی شاہ کو اپنی کار کی رفتار ہلکی کرنی پڑی تھی لیکن آگے جانے والی کار کو ڈرائیور کرنے والے نوجوان نے غالباً وہ گلی دیکھ لی تھی جو اس کٹ سے تھوڑے فاصلے پر تھی' علی شاہ نہیں جانتا تھا کہ وہ گلی کیسی ہے لیکن جب تک اس نے کٹ کو کراس کیا آگے والی کار اس گلی میں مڑ چکی تھی' علی شاہ بریکوں کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ کٹ سے ٹرن ہوا اور اس گلی کے کنارے پر پہنچ کر رکا' دیکھنا چاہتا تھا کہ گلی کہیں آگے سے بند تو نہیں ہے' لیکن دوسری کار کا اب وہاں کوئی وجود نہیں تھا۔

علی شاہ نے اپنی کار گلی میں موڑ لی اور پھر گلی کے آخری سرے تک چلا گیا' گلی ایک دوسری سڑک پر جا کر نکلتی تھی' جب علی شاہ اس سڑک پر پہنچا تو اس نے سڑک پر دونوں طرف نگاہیں دوڑائیں' کہیں بھی کار کی پچھلی روشنیوں کا نشان نظر نہیں آیا تھا۔

اب بے مقصد کار دوڑنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا وہ لوگ صاف نکل گئے تھے' علی شاہ کو تھوڑا سا افسوس ہوا وہ ان کا تعاقب کرنے میں ناکام رہا تھا۔ کچھ لمحے وہ افسردگی کے عالم میں وہیں کھڑا رہا' پھر اس نے کار ریورس کی اور واپس گلی میں ٹرن ہوگیا' دوسری طرف سڑک پر آکر اس نے کار آگے بڑھا دی تھی' تھوڑی دیر کے بعد وہ ہوٹل کی پارکنگ لاٹ میں کار کھڑی کر کے اپنے کمرے کی طرف جارہا تھا اور اس کے ذہن میں عجیب وغریب خیالات تھے۔ کمرے میں آکر اس نے لباس تبدیل کیا اور پھر بستر پر دراز ہوگیا۔

''کیا فرق پڑتا ہے شاداب' اپنا کام تو میں نے کرہی دیا' بلکہ مجھے خوشی ہے کہ وہ بیوقوف کا بچہ اب بھی تیرے پیچھے لگا ہوا ہے' یقیناً اسے ابھی تک تیری موت کا علم نہیں ہوا' کوئی بات نہیں اسے بھی دنیا سے رفو چکر کرنا میرا مشن ہوگا' وہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کچھ لمحے سوچتا رہا' پھر اپنے آپ سے بولا۔
''لیکن نہیں' یہ تو میں غلط کردوں گا' یہ تو میں نے بڑی بیوقوفی کی بات سوچی ہے' یعنی تیرے محبوب کی روح ہی تیرے پاس پہنچ جائے گی۔ لاحول ولاقوۃ کتنا غلط فیصلہ تھا میرا' خدا کا شکر ہے کہ میں نے اس پر عمل نہیں کیا' گویا میں تیری موت کے بعد تیرے محبوب کا تحفہ بھی تجھے پیش کردوں' نہیں شاداب' میں اسے ہلاک نہیں کروں گا' لیکن تو تو اگر سو بار بھی میرے سامنے آئی تو میں تیری روح کا بھی وجود مٹانے کی کوشش کروں گا' یہ میرا عہد ہے سمجھی' یہ میرا عہد ہے' یہ میری زندگی کا مقصد ہوگا۔'' اس نے آنکھیں بند کیں اور کروٹ لے کر لیٹ گیا تاکہ نیند آجائے' بہت دیر تک وہ پراذیت انداز میں کروٹیں بدلتا رہا اور آخر کار نیند آ ہی گئی۔

نجانے کتنی دیر گزری تھی اسے سوتے ہوئے کہ ایک ہلکی سی آہٹ کا احساس ہوا کچھ لمحے وہ اسی طرح غنودگی کے عالم میں لیٹا رہا' اسے ایک عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی' پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور واش روم کی جانب بڑھ گیا' واش روم کا دروازہ کھولا' ابھی اندر داخل ہو کر لائٹ بھی نہیں جلائی تھی کہ اچانک ایک چھناکہ سا ہوا اور اس کے ساتھ ہی ڈز ڈز ڈز کی چار پانچ آوازیں ابھریں' شیشہ ٹوٹنے کی آواز تاریکی میں دور تک پھیل گئی تھی۔ ڈز ڈز کی آوازیں بھی ایسی تھیں کہ اچھے خاصے طریقے سے انہیں سن لیا جائے۔

اس نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا' کمرے کے دروازے پر بہت ہی خوبصورت شیشے لگے ہوئے تھے' جو عام سائز کے نہیں تھے بلکہ ان سے کافی بڑے تھے اور انہی میں سے ایک شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ ڈز ڈز کی یہ آوازیں اس کے لئے تھوڑی سی نامانوس ضرور تھیں لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ سمجھ گیا کہ یہ سائلنسر لگے ہوئے پستول سے فائرنگ کی آواز تھی' گویا کمرے کا شیشہ ٹوٹا تھا اور فائرنگ ہوئی تھی' اس راہداری میں متعین رات کے گارڈ نے دونوں آوازیں سن لیں اور پھر راہداری میں مدہم شور کی آوازیں نمودار ہوگئیں۔ علی شاہ نے کچھ لمحے کے لئے سوچا اور پھر وہیں اپنی جگہ کھڑے ہو کر واش روم کی لائٹ جلائی' کمرے میں مدہم روشنی پھیل گئی' اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں' لیکن کمرے میں کوئی موجود افراد کی آوازیں دروازے کے پاس آئیں' پھر دروازہ زور زور سے بجایا جانے لگا' وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ دروازے کے قریب ہی کمرے کے اندر کے لائٹ سوئچ لگے ہوئے تھے' علی شاہ نے سوئچ دبایا اور دروازہ کھول دیا' باہر ہوٹل کے سپروائزر سیکورٹی گارڈ اور ایک دو دوسرے افراد کے چہرے نظر آئے تھے۔

''کیا ہوا سر خیریت تو ہے' کیا بات ہے' کیا بات ہے۔'' بہت سی آوازیں ابھریں اور وہ ٹوٹے ہوئے شیشے کو دیکھنے لگا جو فرش پر بکھر گیا تھا۔

''کیا...... یہ کیسے ٹوٹا ہے سر۔''

''میرے سر سے ٹوٹا ہے۔'' اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''مم...... میں نہیں سمجھا جناب۔'' سپروائزر نے کسی قدر کپکپاتی آواز میں کہا۔

''یار صاف ظاہر ہے کہ کسی نے شیشہ توڑ کر اندر فائرنگ کی ہے۔''

''میں بھی یہی کہہ رہا تھا جناب' سائلینسر لگے ہوئے پستول سے فائرنگ کی گئی تھی' میں تو گیلری کے آخری سرے پر تھا۔'' سیکورٹی گارڈ نے کہا۔

''تم ڈیوٹی پر تھے' کوئی آیا اس نے کمرے کا شیشہ توڑا فائرنگ کی اور فرار ہوگیا' اچھی ڈیوٹی کررہے تھے بھائی۔'' علی شاہ نے سیکورٹی گارڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''سر کسی کو پہلے سے تو کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ کچھ ہونے والا ہے۔'' سیکورٹی گارڈ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''آپ تو خیریت سے ہیں جناب۔''

''جی ہاں اتفاق سے' واش روم گیا ہوا تھا' واش روم کی لائٹ جلانے والا تھا کہ اس بیوقوف شخص نے فائرنگ شروع کر دی جو مجھے ہلاک کرنے والا تھا۔''

''سر میں پولیس کو فون کر رہا ہوں۔'' سپر وائزر نے کہا اور علی شاہ تھوڑا سا بے چین ہو گیا' شاید یہ بہتر نہیں ہوگا اس عالم میں تو اسے اس شخص کے بارے میں بتانا پڑے گا اور پھر تو پوری کہانی ہی منظر عام پر آ جائے گی لیکن سپر وائزر کو اس کے فرض کی ادائیگی سے کیسے روکا جا سکتا تھا' کمرے میں تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی اور علی شاہ کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ یہ اندازہ تو اس نے لگا لیا تھا کہ اس پر حملہ کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو آج اسے ہوٹل میں ملا تھا یعنی شاداب کا عاشق' میں نے چونکہ اس کا پیچھا کیا تھا اور وہ مجھے ڈاج دے کر نکل گیا تھا' پتہ نہیں شاداب نے اس سے کیا کہا ہوگا' وہ شاید مجھے ختم کرنے کے لئے ہی یہاں آیا ہوگا۔ بستر کے قریب پہنچ کر اس نے بستر میں پانچ سوراخ دیکھے' واقعی قدرت کو اسے بچانا مقصود تھا ورنہ یہ پانچ سوراخ اس کے جسم میں ہوتے اور اس کے بعد بھلا زندگی کی کیا گنجائش تھی۔

اس دوران ہوٹل کا سپر وائزر پولیس کو فون کر چکا تھا' اس کے ساتھ ہی اس نے ہوٹل کے منیجر کو بھی فون کر دیا تھا' کچھ اور لوگ بھی یہاں جمع ہو گئے تھے' پولیس آفیسر بھی ایک نوجوان انسپکٹر تھا جو چہرے سے کافی ذہین نظر آتا تھا' ہوٹل کا منیجر بھی پہنچ گیا تھا اور علی شاہ سے اظہار ہمدردی کر چکا تھا پھر اس نے کہا۔

''یقیناً جناب' ایسے جان لیوا حملے بلا وجہ نہیں ہوتے ان کا کوئی پس منظر ہوتا ہے' جی آپ تشریف رکھئے' میں وہی پس منظر معلوم کرنے آیا ہوں۔'' انسپکٹر نے طنزیہ انداز میں ہوٹل کے منیجر سے کہا۔

''جی جی سوری سر۔'' منیجر جلدی سے بولا۔

انسپکٹر نے علی شاہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سر یہاں کی کارروائی مکمل کئے لیتے ہیں' کیا آپ میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا پسند کریں گے۔''

''اب تو ہر معاملہ آپ کی پسند پر ہے انسپکٹر صاحب جیسا آپ چاہیں۔''

''بہتر یہی ہوگا سر کہ آپ ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلیں' اس دوران آپ کے سامان وغیرہ کی نگرانی ہوٹل کی انتظامیہ کی ذمہ دار افراد کریں گے' یہاں پولیس موجود ہوگی' آپ بالکل اطمینان رکھیں آپ کی کوئی چیز غائب نہیں کی جائے گی' ہاں اگر آپ لباس تبدیل کرنا چاہیں تو......'' انسپکٹر نے کہا۔

علی شاہ کو اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ اچھی خاصی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے' لیکن اس قدر بے وقوف بھی نہیں تھا کہ اپنے طور پر الٹے سیدھے فیصلے کرتا' اس نے اپنی بیوی کو قتل کیا تھا اور اس کی بیوی کی روح مسلسل اسے عذاب میں گرفتار کئے ہوئے تھی' اس مشکلات سے بچنے کے لئے اسے پورے ہوش و حواس سے کام لینا تھا چنانچہ اس نے انسپکٹر سے بھرپور تعاون کیا' الماری سے لباس نکالا اور ہوٹل کے سپر وائزر سے بولا۔

''میرے پاس کوئی قیمتی چیز نہیں ہے' لیکن پھر بھی یہ چند چیزیں موجود ہیں۔''

''سر آپ بالکل اطمینان رکھیں ذرہ برابر بھی کوئی ایسی گڑبڑ نہیں ہوگی' ہمارے آدمی یہاں موجود رہیں گے۔'' منیجر نے جواب دیا۔

انسپکٹر نے کچھ اور لوگوں کو فون کئے اور جب چند منٹ کے بعد اس کے اسٹاف کے کچھ لوگ پہنچ گئے تو اس نے کہا۔ ''سر ہمارے ساتھ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جار ہے ہیں' اس جگہ کا پورا نقشہ تیار کرلو' ایک ایک چیز پر نگاہ رکھنا اور تفصیلی رپورٹ تیار کر کے پولیس اسٹیشن آ جانا۔''

''یس سر۔'' پولیس کے ایک افسر اعلیٰ نے کہا جو شاید ماہر نشانات تھا' اس دوران علی شاہ واش روم میں جاکر لباس تبدیل کر چکا تھا۔ ذرا سی بھی لغزش زندگی بھر کے لئے عذاب بن سکتی تھی' انسان حالات کا کتنا ہی شکار ہو جائے موت کی طلب کوئی آسان بات نہیں ہوتی اور علی شاہ کو تو اب موت کی طلب بالکل نہیں تھی' وہ اپنی سوچ بدل چکا تھا' زندگی کو اتنا بے وقعت کیوں سمجھا جائے کہ کسی کی تھوڑی سی کوششیں اسے باآسانی ختم کردیں۔

پولیس اسٹیشن میں پولیس آفیسر نے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔

'ہم نے آپ سے آپ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا سر' براہ کرم تھوڑی سی تفصیل اگر آپ پسند کریں گے تو یا پھر آپ آرام کرنا چاہیں گے' صبح کو ساری باتیں ہو جائیں گی' ویسے بھی آپ کا ہوٹل سے چلے آنا زیادہ مناسب ہوا' جن حملہ آوروں نے آپ کی جان لینے کی کوشش کی تھی وہ دوبارہ بھی کوشش کر سکتے تھے' وہاں اس جگہ آپ کا معقول تحفظ ذرا مشکل کام تھا۔''

''آفیسر یہ سب میرے لئے بھی ناقابل فہم ہے' میں آپ سے بھرپور تعاون کرنا چاہتا ہوں۔''

''شکریہ' آپ اپنے بارے میں بتانا پسند کریں گے۔''

''میں ایک پرامن شہری ہوں' محب وطن ہوں اور مجھ سے آج تک کبھی کوئی ایسا عمل سرزد نہیں ہوا جو خلاف قانون ہو۔ ایک لمبا عرصہ ملک سے باہر رہا ہوں۔ وہاں سے میں نے کاروبار کے سلسلے میں کافی کام بھی کیا ہے' ایک معزز شخص کے ساتھ اور اس کے بعد اسی کام کی داغ بیل یہاں ڈالی ہے' میرے والدین کا انتقال ہو چکا تھا ایک بہن تھی جس کی میں نے شادی کردی اور وہ چلی گئی' میری ذمہ داریاں ختم ہوگئی تھیں اور میں اپنی فیکٹری کو سنبھالے ہوئے تھا' پھر میں نے شادی کر لی' میری مسز میرے ہی آفس میں میری سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرتی تھیں۔ ہم دونوں کے درمیان تھوڑی سی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تھی' میں نے تھوڑی سی کا لفظ بالکل جائز استعمال کیا ہے کیونکہ نہ ہمارے درمیان عشق و محبت کی منازل طے ہوئیں اور نہ ہم نے ایک دوسرے کے لئے آہیں بھریں' بس کچھ ایسے بزرگ حضرات جن کا تعلق فیکٹری سے ہی تھا اور جو میرے ان الفاظ کے سلسلے میں گواہی دے سکیں گے درمیان میں آئے اور انہوں نے ہماری شادی کرادی' شاداب میری مسز کا نام تھا' ہمارے درمیان بڑی خوشگوار زندگی گزر رہی تھی کہ اچانک ہی شاداب نے گھر کے معاملات سے لاتعلقی برتنا شروع کردی اور مجھے یوں لگا جیسے ان کے اندر کوئی احساس پل رہا ہو' بڑے مخلصانہ طریقے سے میں نے پچھلے تعلقات کا حوالہ دیتے ہوئے ان سے پوچھا کہ کیا انہیں مجھ سے کوئی شکایت ہوگئی ہے تو انہوں نے سادگی سے جواب دیا کہ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے' ویسے بھی میں نے ایسا عمل نہیں کیا تھا یعنی کوئی نئی سیکریٹری وغیرہ جس پر انہیں اعتراض ہوتا۔ پھر ایک دن اچانک وہ گھر چھوڑ کر چلی گئیں اور مجھے پتہ بھی نہیں چل سکا کہ انہوں نے گھر کیوں چھوڑ دیا' اصل میں ان کا کوئی خاندان نہیں تھا' ایک فلیٹ میں کرائے پر رہتی تھیں ماضی کیا تھا نہ انہوں نے کبھی بتایا اور نہ میں نے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی' میں ان پر اعتماد کرنے لگا تھا' میں نے بھرپور طریقے سے انہیں تلاش کیا لیکن ان کا پتہ نہیں چلا اسی دوران گھر میں کچھ ایسے پراسرار واقعات ہونے لگے جو ناقابل فہم تھے اور انہی واقعات کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بناء پر میرا ملازم فضل خان گھر چھوڑ کر چلا گیا' اس کا کہنا تھا کہ میرا گھر آسیب زدہ ہو گیا ہے' خیر مجھے کسی ایسی آسیب زندگی کا احساس نہیں ہوا' لیکن میں گھر سے بددل ہو گیا تھا' اکیلے گھر پر پڑے پڑے میرا دل گھبرانے لگا تھا' نئے ملازم بھی نہیں آئے تھے میں نے سوچا کہ چلو گھر سے کچھ دور رہ کر تھوڑا سا وقت گزارا جائے اور میں نے اس ہوٹل میں کمرہ حاصل کیا اور اس میں مقیم ہو گیا۔ میں ذرا بھی یہ بات نہیں جانتا کہ ایسا کون دشمن ہے جو میری زندگی کے درپے ہو گیا ہو اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر مجھ پر حملہ بھی ہوا ہے تو ممکن ہے کسی غلط فہمی کی بنیاد پر ہوا ہو۔''

''کمال ہے بڑے تعجب کی بات ہے' بہت حیرت ناک اور نہ سمجھ میں آنے والی' ایک بات بتایئے' آپ نے کہا کہ آپ کی منز کا کوئی خاندان نہیں تھا' تھا ہی نہیں یا آپ نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''میں نے آپ سے عرض کیا ہے کہ ہمارے درمیان مکمل اعتماد قائم تھا اور میں نے کبھی ان سے ان کے بارے میں نہیں پوچھا' وہ بھی ایک مخلص خاتون تھیں' میرے ساتھ انہوں نے کبھی ایسا برتاؤ نہیں کیا جو میرے لئے تکلیف دہ یا پریشان کن ہوتا بس یہ بات تھی۔''

''لیکن ان کے گھر چھوڑ کر جانے کی کوئی وجہ تو ہو گی۔''

''میں سمجھتا ہوں ہر کام کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے' لیکن آپ میرے اس بیان پر یقین ضرور کیجئے گا کہ میں خود بھی کئی دن تک حیران رہا کہ آخر یہ ہوا کیا۔''

''آپ کے ملازم کو اس بات کا احساس کیسے ہوا کہ گھر میں کچھ آسیب زدگی ہو گئی ہے' کیا پہلے بھی اس قسم کے کوئی آثار آپ کو ملے تھے۔''

''ذرہ برابر نہیں اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے کوئی ایسی بات بالکل نہیں محسوس کی' پتہ نہیں فضل خان کو کیا ہوا۔''

''فضل خان آپ کے ملازم کا نام تھا۔''

''جی جی۔''

''کیا آپ کے خیال میں آپ کا وہ ملاز جس کا نام فضل خان تھا کہیں ایسا تو نہیں ہے ک اس نے ورغلا کر یا کسی کے کہنے پر آپ کی منز بدظن کیا ہو اور وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی ہوں۔''

''فضل خان بہت ہی سیدھا سادہ آدمی تھا کافی عرصے سے میرے ساتھ تھا میں نہیں سمجھ کہ اسے کوئی ایسی ضرورت پیش آ گئی ہو او انسپکٹر صاحب یہ بات تو آپ جانتے ہیں ک انسانوں کی شناخت بہت ہی مشکل کام ہے۔''

''فضل خان کہاں گیا ہے۔''

''وہ سرحدی آدمی تھا' کہنے لگا اپنے وطن جا رہا ہے' اس کا کوئی پتہ نہیں۔''

''اوہو آپ نے بغیر پتے کے اسے ملازم رکھ لیا۔''

''جی وہ مجھے یہیں ملا تھا اور میں نے اسے ملازم رکھا تھا' میں نے اس سے بھی کبھی اس کے بارے میں تفصیل نہیں پوچھی۔''

''حالانکہ پولیس کی طرف سے ہمیشہ یہ کہا جاتا ہے کہ اپنے ملازموں کو پولیس اسٹیشن میں رجسٹر کرا دیئے۔''

''ہاں آپ کا فرمانا بجا ہے' بس تھوڑی سی لاپرواہی ہو گئی تھی' مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھے اس طرح کے واقعات سے دوچار ہونا پڑے گا۔''

انسپکٹر اس سے کچھ پتے وغیرہ معلوم کرنے کے بعد بولا۔ ''کیا آپ ہوٹل جانا پسند کریں گے۔''

''ابھی تو نہیں جانا چاہتا کل دن میں دیکھا جائے گا' ویسے انسپکٹر صاحب میں شدید حیران ہوں کہ آخر وہ حملہ آور کون تھا۔''

''آپ بتایئے کہ اب آپ کے لئے کیا کیا جائے۔''

Downloaded from Paksociety.com

"یہ تو آپ بہتر سمجھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' آپ اپنا خیال رکھئے گا اور اگر گھر جارہے ہیں آپ اور آپ کو پولیس کے تعاون کی ضرورت ہو تو میں آپ کو دو سپاہی مہیا کرسکتا ہوں جو آپ کے گھر کے دروازے پر پہرہ دیں گے۔"

"آپ کا تعلق انتظامیہ سے ہے انسپکٹر صاحب اگر آپ یہ مناسب سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہے' ورنہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آخر کب تک میں ان حالات کا شکار رہوں گا' اب یہ ہوا ہے تو میں دیکھوں گا کہ دوبارہ اس قسم کی کوشش ہوتی ہے یا نہیں۔"

"گویا آپ پھر واپس جائیں گے یا ہوٹل ہی میں قیام مناسب سمجھیں گے۔"

"نہیں میں ہوٹل ہی میں رہنا پسند کروں گا کیونکہ گھر سے مجھے ایک وحشت ہونے لگی ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ اپنا بیان لکھوا کر دستخط کردیجئے گا۔" انسپکٹر نے محرر کی جانب اشارہ کیا اور محرر نے کچھ منٹ لگانے کے بعد علی شاہ کا بیان اس کے سامنے رکھ دیا جسے پڑھ کر اس نے اس پر دستخط کردیئے تھے۔

"صبح ہونے میں بہت زیادہ دیر تو نہیں ہے ہم آپ کے لئے بہت زیادہ آرام تو مہیا نہیں کرسکتے لیکن دوسرے کمرے میں کچھ ایسی بینچیں پڑی ہوئی ہیں جن پر آپ لیٹ سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے انسپکٹر شکریہ۔" علی شاہ نے کہا اور پھر وہ اس کمرے میں چلا گیا جہاں چوڑی بینچیں پڑی ہوئی تھیں اس وقت اس کی ذہنی کیفیت بہت خراب تھی چنانچہ بینچ اس کے لئے بہت آرام وہ چیز ثابت ہوئی اور وہ ہاتھ کا تکیہ بنا کر بینچ پر سیدھا لیٹ گیا' اس کی نگاہیں اوپر اٹھی ہوئی تھیں اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یقینی طور پر شاداب نے اپنے اس عاشق کے ذریعے اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی ہے' حالانکہ اسے اس کی ضرورت نہیں تھی' اسے شدید حیرت ہوئی کہ اس نے تو شاداب کی راکھ تک ملیا میٹ کردی تھی' کیا واقعی شاداب ایک روح کی شکل اختیار کرچکی ہے' یا پھر اس کے اندر اور کوئی خفیہ راز چھپا ہوا ہے۔ کیا روحیں اس طرح منظر عام پر آسکتی ہیں۔

اسے وہ لمحات یاد آئے جب اس نے شاداب کو چھو کر دیکھا تھا' اس کا ہاتھ بے شک غیر معمولی طور پر گرم تھا لیکن مرنے والوں کے جسم تو سرد ہوا کرتے ہیں' پھر یہ کیا قصہ ہے' بہت دیر تک سوچتا رہا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا' اس کے بعد کمرے کے کونوں کھدروں سے صبح کی روشنی جھلکنے لگی تھی۔

نیند تو خراب ہو ہی چکی تھی' وہ اٹھ کر باہر نکل گیا' ایک کانسٹیبل سے منہ دھونے کی جگہ پوچھی تو کانسٹیبل نے ایک گندے سے باتھ روم کی جانب اشارہ کردیا' زندگی میں اسے مراحل کوئی نئی بات نہیں ہوتی' باتھ روم جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا پھر انسپکٹر کے کمرے میں پہنچ گیا جہاں اس وقت کوئی نہیں تھا صرف دو کانسٹیبل بیٹھے ہوئے تھے۔

"میرے لئے ایس ایچ او صاحب کی کوئی ہدایت تو نہیں ہے' میں جانا چاہتا ہوں۔"

"نہیں سر ہم سے کچھ نہیں کہا گیا آپ کے بارے میں' اگر آپ کہیں تو کچھ چائے وغیرہ کا بندوبست کریں۔"

"نہیں شکریہ' مجھے ایک ٹیکسی لادو۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

"ایس ایچ او صاحب سے کہہ دینا کہ میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں ہوں۔"

"جی سر۔" کانسٹیبل نے بھرپور تعاون کیا تھا اور کچھ دیر کے بعد وہ ہوٹل میں داخل ہوگیا تھا۔ علی شاہ ہوٹل واپس چل پڑا ہے۔ اب ذرا ادھر دیکھیں کہ شرمین پر کیا گزری۔ دروازے سے جمال کی آواز سنائی دی تھی' لیکن وہ اندر نہیں آیا تھا لیکن شرمین بری طرح سہمی ہوئی تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

وہ جمال کے اندر آنے کا انتظار کرتی رہی لیکن جمال اندر نہیں آیا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ شدید بے چینی کا شکار رہی تھی۔ رات کے دوسرے پہر تک جاگتی رہی۔ بمشکل نیند آئی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر تک سوئی تھی کہ ایک دردناک چیخ فضا میں ابھری اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

مدھم روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف دیکھنے لگیں ایک بار پھر وہی چیخ کانوں میں ابھری۔ بڑی دردناک چیخ تھی یوں لگ رہا تھا جیسے کسی کی گردن پر چھری پھیری جا رہی ہو۔ وہ دہشت سے کانپ اٹھی۔ پھر اس کے حواس نے اسے ایک اور چرکا لگایا۔ جو اجنبی چیز اسے نظر آئی تھی وہ مٹی کے تیل کی لالٹین تھی۔

لالٹین...... اور اس کے گھر میں...... اس نے تو کبھی اپنے گھر میں لالٹین نہیں دیکھی تھی۔ اس نے وحشت زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دوبارہ دیکھا اور وحشت سے کانپ اٹھی۔

اس بھیانک چیخ نے پہلے ہی اعصاب کشیدہ کر دیئے تھے اور اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا لیکن جاگتے حواس اور بھی کچھ احساس دلا رہے تھے۔ اس کے بدن کے نیچے بانوں کی۔ چارپائی تھی۔ یہ بھی انوکھی بات تھی۔ ان کے گھر میں بانوں کی کوئی چارپائی بھی نہیں تھی۔ آہ یہ تو ہمارا گھر بھی نہیں ہے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ یہ تو اس کا گھر بھی نہیں ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں اس چارپائی کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔

بھیانک چیخ کی آواز پھر سنائی دی تو وہ بستر سے نیچے اتر آئی۔ دروازہ دیکھا اور اس کے قریب پہنچ گئی اسے کھولنے کی کوشش کی تھیں دروازہ نہیں کھلا۔ وہ باہر سے بند تھا۔ وہ بے اختیار ہو گئی۔

''دروازہ کھولو۔ کون ہے باہر۔ دروازہ کھولو۔ کھولو۔ مجھے اندر کیوں بند کیا ہے دروازہ کھولو۔''

کوئی دو منٹ تک وہ زور زور سے دروازہ پیٹتی رہی تب باہر قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر ایک کرخت آواز ابھری۔

''دم لے بی بی دم لے۔ کیوں مری جا رہی ہے۔''

''میں کہتی ہوں دروازہ کھولو۔'' وہ چیختے لہجے میں بولی۔

دروازہ کھل گیا۔ دوسری طرف ایک بھیانک شکل کا لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔ اس کی مونچھیں کافی بڑی اور آنکھیں سرخ تھیں۔

وہ سہم گئی۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آواز بند ہو گئی۔ مونچھوں والا اسے غصے سے گھور رہا تھا۔ پھر اس کی بھاری آواز ابھری۔

''کیا ہے۔''

''مم۔ میں کہاں ہوں۔ تم۔ تم کون ہو۔''

''اور کچھ......'' وہ بولی۔

''بتاؤ مجھے میں کہاں ہوں۔''

''صبح ہونے دو۔ سب پتہ چل جائے گا۔ اور سنو۔ اب شور مت مچانا ورنہ۔ کھوپڑی گھوم جائے گا۔'' اس نے تیز آواز کے ساتھ دروازہ بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔

شرمین کا بدن پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ دہشت سے اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ یہ کیا ہوا۔ کیسے ہو گیا۔ میں تو اپنے گھر میں' اپنے کمرے میں سوئی تھی۔ یہاں تک کیسے آ گئی کون اسے اٹھا کر لایا۔ اسے پتہ کیوں نہیں چلا۔ گزرے ہوئے واقعات۔ ساری باتیں اس کے ذہن میں چکرانے لگیں۔

بمشکل تمام وہ لڑکھڑاتے قدموں سے واپس چارپائی تک آئی اور اس پہ آ کر سسکنے لگی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

آہ۔ یہ کیا ہوگیا۔ میرے گھر والے میرے دشمن بن گئے۔ وہ سب ایک دم اجنبی ہوگئے۔ میرا تو کوئی قصور بھی نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا۔

رات موم کی طرح پگھل رہی تھی سو آخرکار صبح کی روشنی چمکنے لگی۔ اندازے سے سات ساڑھے سات کا وقت تھا جب دروازہ کے پر آئیں ہوئیں اور دروزہ کھل گیا۔ شرمین نے سہمی ہوئی نظروں سے سامنے دیکھا۔ رات والا چہرہ اس کی آنکھوں میں آ گیا۔ ایک خوفناک چہرہ۔

لیکن وہ جمال احمد تھا۔

''چاچو۔'' اس کے حلق سے آواز نکلی اور جمال سے لپٹ گئی۔ ''آپ آگئے چاچو۔ آپ میری مدد کو آئے دیکھئے نہ جانے کون مجھے گھر سے اٹھا کر یہاں لے کر آیا ہے۔ چاچو۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والا۔ وہ چاچو۔ چاچو۔'' وہ بلکنے لگی۔

''نہ۔ نہ۔ نہ۔ شرمین۔ نہ بیٹے۔ نہ۔ نہ۔ یہ گھر میرا ہے بیٹے چپ ہو جاؤ۔ آؤ چلو منہ ہاتھ دھولو۔ ناشتہ تیار ہے۔''

''آپ۔ آپ۔ آپ کا چاچو۔ آپ کا۔'' ایک دم چپ ہوگئی۔ جمال اسے سہارا دے کر باہر نکال لایا۔ وہ حیران تھی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی یہ چاچو کا گھر ہے لیکن وہ یہاں کیسے آ گئی۔ کیوں آ گئی۔

چھوٹا سا صحن تھا۔ تین چار کمرے تھے۔ صحن کچا تھا۔ برامدے میں دو تخت پڑے ہوئے تھے۔

''آؤ۔ منہ دھولو۔'' جمال نے کہا۔ اور اسے نلکے کے پاس چھوڑ کر تولیہ لینے چلا گیا۔ اس کے منہ دھوکر دوپٹے سے چہرہ صاف کیا۔ اس بار جمال ایک موٹی سی عورت کے ساتھ باہر آیا تھا۔

''یہ اماں زمانی ہے۔ اسے دیکھو لو۔ یہ بہت عرصے تک تمہارے ساتھ رہے گی۔''

شرمین نے خوفزدہ نظروں سے بوڑھی کو دیکھا تو وہ مسکرادی۔ پھر بولی۔ ''بالکل فکر مت کرو کلیجے سے لگا کر رکھوں گی۔''

''جمال چچا۔ یہ کونسی جگہ ہے۔''

''بتایا تھا نا بیٹا۔ یہ میرا ڈیرہ ہے۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد بھائی جان بھی یہاں آئیں گے۔ تم سے ملیں گے۔''

''مگر جمال چاچو۔ میں یہاں کیسے آ گئی۔''

''میں لایا ہوں تمہیں۔''

''آپ۔ مگر کیوں۔''

''بتادوں گا بیٹا۔ بتادوں گا۔ اتنی دیر میں زمانی ناشتہ لے آئی۔'' چلو شاباش ناشتہ کرو۔''

''نہیں چاچو۔''

اندازِ فکر

تحفظ

عورت کا مرد سے بنیادی مطالبہ صرف ایک ہے وہ تحفظ جو گھر کی چار دیواری میں حاصل ہوتا ہے۔

حلیہ

مرد کو شوہر کی حیثیت سے اور عورت کو بیوی کی حیثیت سے اپنا حلیہ درست رکھنا چاہیے۔

سانپ

دنیا میں ہر شخص کو دولت کی خواہش ہے لیکن جب یہ خواہش ہوس کا روپ دھارتی ہے تو انسان سانپ کی طرح زہریلا ہو جاتا ہے۔

دوستی

دوستی کا رشتہ ریشم کی ڈور کی طرح ہوتا ہے۔ باریک اور مضبوط لیکن کبھی کبھی اس رشتے کو کچے دھاگے کی مانند توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

زندگی

یہ سمندر کی طرح ہے۔ وسیع و بے پایاں جس کا صرف ایک ہی کنارہ ہے۔ ایک ہی ساحل ہے۔ جہاں رونقیں ہیں، میلے ہیں، چراغاں ہیں، ہجوم ہیں، تنہائیاں اور اداسیاں بھی ہیں۔ دوسرے کنارے کی کسی کو خبر نہیں جو لوگ دوسرے کنارے کی خبر لینے گئے ہیں واپس نہیں لوٹے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''کیوں۔''

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔''

''نہیں بیٹا۔ لے لو۔ چائے لے لو۔''

بمشکل تمام اس نے چائے کی ایک پیالی پی۔ پھر گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''جمال چاچو۔ میں یہاں کیسے آ گئی۔''

''میں نے بتایا نہ بیٹا۔ میں لایا ہوں۔''

''کیسے چاچو۔ کیا بے ہوش کر کے۔''

''ہاں۔ مجبوری تھی۔''

''میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے چاچو۔''

''میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ تم پڑھی لکھی ہو شرمین۔ تمہیں زمانہ شناس ہونا چاہیے اس وقت دنیا کی نوے فیصد آبادی یہ سوچنا چھوڑ چکی ہے کہ کیا صحیح ہے کہ غلط۔ تم یہ بات بھی مان لو کہ دنیا کے بارے میں میرا تجربہ بھائی جان سے زیادہ ہے۔ بھائی جان محکمہ پولیس میں رہے کیا نہیں کر سکتے تھے وہ، لیکن شرافت اور نیکیوں کے چکر میں پڑے رہے۔ ان کی دوسری ملازمت بھی خوش نصیبوں کو ہی ملتی ہے۔ مگر وہ اسے بھی نہیں چلا سکے۔ اور اب۔ بس وہ اب بھی صرف نوکری ہی کر رہے ہیں۔ کیا ملتا ہے انہیں تھوڑی سی تنخواہ کے سوا۔ میں نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے وہ ہماری تقدیر بدل دے گا۔''

''لیکن چاچو۔''

''میں تمہیں بتا دوں کہ جو منصوبہ میں نے تمہیں بتایا ہے وہ بھائی جان کا ہی بنایا ہوا ہے لیکن بھائی جان اس دنیا سے ناواقف ہیں۔ اپنے اس منصوبے کی تکمیل کے لئے انہیں میرا ہی سایا نہیں پڑا ہے۔ اور اب میں اس کیس کا کمانڈر ہوں۔''

''لیکن چاچو۔''

''سنتی رہو شرمین۔ مجھے تمہارے مستقبل کے لیے بہت تشویش ہے۔ اور میں نے خلوص سے یہ سارے فیصلے کئے ہیں لیکن میرا دماغ پڑھا ہے۔ تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھ سے تعاون کرنا اور میرے دماغ کو ٹیڑھا نہ ہونے دینا۔ میرے کام کرنے کا انداز۔ دوسرا ہے تمہیں اس کا خیال رکھنا ہوگا۔ دوسری صورت تمہارے لئے مشکل پیدا کرے گی۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا چاچو۔''

''تمہیں تھوڑی سی تفصیل بتا چکا ہوں۔ مزید بتاؤں گا۔ پہلا کام یہ تھا کہ تمہیں گھر سے ہٹانا تھا۔ وہ کام میں کر چکا ہوں۔ اب اس گھر سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں رہ گیا ہے۔ بھائی جان اور بھابھی کو سب معلوم ہے۔ وہ سب اس منصوبے سے اتفاق کرتے ہیں۔ تم جب بھی چاہو اس گھر میں ان سے مل سکتی ہو۔''

''جمال چاچو۔ مجھے گھر میں ہی کیوں نہیں رہنے دیتے۔ یہاں میرا دم گھٹ جائے گا یہاں سے مجھے وحشت ہو رہی ہے۔''

''بہت کم وقت تمہیں یہاں گزارنا ہوگا۔''

''رات کو یہاں چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔''

''او تم نے انہیں سنا تھا۔''

''ہاں۔ میرا دل کانپ گیا تھا۔''

''بیٹا۔ یہاں مختلف لوگ لائے جاتے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہوتے ہیں جو میرے احکامات کی تعمیل نہیں کرتے۔ مجبوراً ان کی گردنوں پر چھری پھیرنی پڑتی ہے۔''

''چھ۔ چھری۔ قتل۔ قتل......'' شرمین کا سانس رکنے لگا۔

یہ داستان جاری ہے۔
بقیہ واقعات آئندہ ماہ
ملاحظہ کریں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اردو ادب کا سنگھار......ادب کی خوشبو

حالات پڑھ کر اور تصویر دیکھ کر میرا دل بھر آیا' میں سوچنے لگی که میری نادانی تھی جو میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ بدنصیب سمجھتی تھی' اس لڑکی سے اپنا مقابله کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا که میں نے زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں بند کرلی تھیں' شبنم کے متعلق جان کر میں بے چین تھی' مجھے سکون تو اس وقت ملا جب......!!

روشنی کی طرف

دانش کمال

اس شمارے کے لیے ایک دل گداز و حساس تحریر

جیسے ہی اشتہار پر نظر پڑی' لاشعور میں سویا احساس جاگ اُٹھا' اس کے لیے میں نے جو قدم اُٹھایا' اس پر میں اپنے آپ جھنجھلائی۔

انسان اور انسانیت سے میرا کیا واسطہ' یہ معاشرے اور انسانیت کے سارے ناتے فراڈ ہیں' آخر میں نے کیا سکھ پایا' مجھے کسی سے کیوں لگاؤ ہو' کسی کے درد سے میں کیوں تڑپ جاؤں' بھلا مجھے اس کا کیا صلہ ملے گا' پھر میں نے جو قدم اُٹھایا تھا' اس سے میں پلٹ نہ سکی' آخر کیوں! آخر کیوں؟ یہ ساری باتیں میرے دماغ سے ٹکراتی ہیں' جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

ماضی کی یاد کیا آئی جیسے کسی نے دل میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

چٹکی بھرلی......

آخر وہ بھی کوئی زندگی تھی‘ تین وقت پیٹ بھرا اور سوگئی‘ میں تو ایک مشین بن کر رہ گئی تھی‘ وہ رات کو بارہ ایک بجے جھومتے ہوئے آتے‘ بستر سے سر لگایا کہ خراٹے بھرنے لگے‘ میں دو میٹھے بول کے لیے ترس گئی تھی‘ جی کس بری طرح جلتا تھا کہ کوئی پیار کی دو باتیں کرے‘ کسی کے بازوؤں میں جھول جاؤں‘ کبھی کبھار خفا ہوجاؤں اور کوئی منالے...... پھر میں اس کے سینے سے چمٹ جاؤں‘ سما جاؤں‘ لیکن یہ تو خواب تھا‘ صبح میں باورچی خانہ میں ہوتی کہ وہ چور کی طرح گھر سے نکل بھاگتے‘ شاید انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا‘ وہ اپنی حرکت پر نادم نظر آتے‘ وہ مجھ سے آنکھ بچانا چاہتے لیکن دن ڈھلا اور رات آئی کہ پھر وہی بارہ بجتے اور میں انتظار کرتے کرتے سوجاتی۔

دیر سے گھر لوٹنا ان کا معمول ہوگیا‘ بات اگر یہاں تک رہ جاتی...... جیسے تیسے دن کاٹ ہی دیتی لیکن اب ان کا ہاتھ اُٹھنے لگا‘ اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے وہ زبردستی کرنے لگے‘ مار پیٹ ہونے لگی‘ اس زور کا غل مچاتے کہ آواز محلے بھر میں سنائی دے‘ اب میرا جینا دوبھر ہوگیا‘ میں اپنے ہمسائے میں منہ دکھانے سے بھی رہی‘ صرف ہمسایہ کا سہارا تھا کہ دن کٹ جاتا اور رات نیند کی نذر ہوجاتی‘ اب ہمسائیوں میں اُٹھنے بیٹھنے سے میں ہچکچاتی‘ مبادا وہ رات کے شور اور میرے ہاتھ اور گالوں پر پڑے نشانوں کی وجہ پوچھیں۔

بھلا میں انہیں کیا جواب دیتی‘ کس منہ سے کہتی کہ ایک شرابی اور بدکار سے میرا واسطہ پڑا ہے‘ اب میرے لیے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ ان سے علیحدگی اختیار کرلوں۔ کہتے ہیں جس گھر میں ڈولی جاتی ہے وہیں سے ڈولا بھی نکلنا چاہیے‘ سچ پوچھیے تو یہ بات مجھ پر صادق آتی تھی‘ بھلا میں کہاں کی جیتی جاگتی عورت تھی‘ میں تو ایک چلتی پھرتی لاش تھی جو خلع کے بعد اپنے ابا کے گھر پڑی رہی اور میری آنکھوں کی افسردگی نے میرے بابا کی زندگی کا سارا رس نچوڑ لیا۔

میری تعلیم بھی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ کوئی اچھی ملازمت مل جاتی لیکن میں نے ایک فرم میں معمولی ملازمت ہی قبول کرلی‘ اکیلی جان کے لیے بہت کچھ تھا۔

میں دنیا اور دنیا والوں سے اتنی بیزار تھی کہ فرم کے کسی مرد سے دوستی رکھنا مجھے گوارا نہ تھا‘ صرف اشد ضرورت پر اپنے ساتھیوں سے بول لیتی‘ میرے اس رویے سے ان لوگوں نے بھی مجھ سے دوری اختیار کرلی‘ اکثر مجھے اپنے آپ پر رحم آنے لگتا۔

میری زندگی کا واحد مشغلہ صرف پڑھنا تھا‘ کتابیں‘ رسائل‘ اخبار اور یہاں تک کہ تمام اشتہارات پڑھ ڈالتی۔

چند دنوں سے مسلسل ایک اشتہار نمایاں طور پر چھپ رہا تھا اور میری نگاہ بار بار اس پر رک جاتی‘ یہ اشتہار اس بات کا اعلان کررہا تھا کہ اگر کوئی چاہے تو بے کس بچوں کو گود لے سکتا ہے‘ گود سے مراد سرپرستی قبول کرنا تھی اور ایک قلیل رقم اس لڑکے یا لڑکی کو بھجوانی تھی‘ جس سے اس کی غذا‘ لباس‘ اسکول کی فیس اور کتابوں کا انتظام کیا جاسکے۔

میں نے وقتی جذبے کے تحت بیس روپے اس انجمن کے نام بھیج دیے۔ جو ان چیزوں کا بندوبست کرتی تھی‘ میں نے یہ بھی نہ چاہا کہ ہر ماہ بیس روپے بھیج دوں‘ یہ میرے لیے بہت زیادہ تھے‘ پھر میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس طرح کسی سے میل ملاپ بڑھے‘ زمانے نے مجھے کیا کم ستایا تھا جو میں زمانے والوں سے محبت کرتی‘ صرف نفرت کی ایک آگ تھی جو میرے تن بدن میں سلگ رہی تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پیسے بھیجے دو تین ماہ کا عرصہ ہوگیا تھا اور تقریباً میں اس واقعہ کو بھلا چکی تھی کہ ایک دن مجھے انجمن کی جانب سے ایک تصویر ملی اور اس کے متعلق تفصیلات۔

یہ ایک لڑکی کی تصویر تھی جو میرے لیے چنی گئی تھی۔ شبنم کوئی آٹھ سال کی تھی' اس کا باپ ڈرائیور تھا جو اپنی لڑکی اور بیوی کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا' ماں پاگل ہوگئی' لڑکی کو ہمسائے کی ایک غریب بوڑھی عورت نے اپنایا' سرکار سے اس عورت کو ماہانہ دس روپے ملتے تھے۔

تصویر سے یہ بات نمایاں تھی کہ شبنم رنج و الم کا ایک مجسمہ ہے' مفلسی کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے زیادہ کی لگتی تھی' اس کے چہرے سے غم اور عجیب وحشت ٹپکتی تھی' اس کے حالات بتاتے تھے کہ اس میں ایسا شعور پیدا ہوگیا تھا جو غیر فطری تھا' وہ زندگی سے بیزار نظر آتی تھی۔

حالات پڑھ کر اور تصویر دیکھ کر میرا دل بھر آیا' میں سوچنے لگی کہ میری نادانی تھی جو میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ بدنصیب سمجھتی تھی' اس لڑکی سے اپنا مقابلہ کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں نے زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں بند کرلی تھیں' شبنم کے متعلق جان کر میں بے چین تھی' مجھے سکون تو اس وقت ملا جب سیدھے ڈاک خانے پہنچ کر میں نے اپنی ساری پونجی اس لڑکی کو بھجوادی جو ڈاکخانے میں جمع تھی۔

کئی ہفتوں بعد مجھے شبنم کا خط ملا جو اس نے کنٹری زبان میں لکھا تھا' جس کا انجمن نے ترجمہ کرکے مجھ تک پہنچایا تھا۔

ڈیر آنٹی!

آپ نے مجھے نئی زندگی دی' میں آپ کی ممنون ہوں' آپ نے مجھے بہت کچھ نوازا مگر ایک چیز سے ابھی تک محروم رکھا ہے' آخر کیوں؟ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میرا جی نہ چاہتا ہوگا' میں آپ سے یہ چیز ضرور لوں گی اچھا تو آپ ہی

انتخاب

فیشن

☆ عید کی نماز پڑھ کر میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوا تو ایک اجنبی چہرے کو گھر سے باہر نکلتے ہوئے پایا۔ خیر دستوراً ہم نے انہیں عید مبارک کہتے ہوئے اپنی بانہوں میں بھرلیا اور ان کی ہچکچاہٹ کے باوجود عادتاً تین بار گلے ملے بغیر نہ چھوڑا۔ عید کی خوشی اور شور شرابے میں اس اجنبی کے بارے میں گھر والوں سے بھی پوچھنا یاد نہ رہا۔ دوپہر کو جب تمام گھر والے کھانا کھانے بیٹھے تو امی جان کہنے لگیں۔ ''اپنے ساتھ والے گھر میں جو نئے ہمسائے آئے ہیں آج ان کی بیٹی اپنے گھر آئی تھی۔ کافی ماڈرن قسم کی ہے پوری لڑکا بنی ہوئی تھی۔''

امی جان کے اس آخری فقرے نے ہمیں سرتاپا ہلا کر رکھ دیا۔ اب ہمیں اس اجنبی شخص کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی جس سے ہم صبح عید ملے تھے۔

☆ ایک صاحب اپنے دوست کو بتارہے تھے۔ ''میں ایک دفعہ نیلام گھر گیا تھا اور میں نے ایک انعام جیتا تھا۔''

''اچھا، تم سے کون سا سوال پوچھا گیا تھا۔؟''

''مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ بلی کی کتنی ٹانگیں ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بلی کی تین ٹانگیں ہوتی ہیں۔''

''کمال ہے بلی کی تو چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔''

''تمہارے جواب کو درست کیسے جان لیا گیا۔؟''

وہ صاحب کہنے لگے۔ ''اصل میں صحیح جواب کے قریب ترین میں تھا۔ اس لیے درست قرار دے دیا گیا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پوچھیے کہ مجھے اور کیا چاہیے۔؟'

میں سوچنے لگی بھلا یہ لڑکی مجھ سے اور کیا چاہتی ہے' میں نے دماغ پر لاکھ زور دیا مگر میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا' میں خط آگے پڑھنے لگی۔

'ہاں تو آنٹی' بھلا بتایئے تو میں آپ سے اور کیا چیز لینا چاہوں گی' نہیں پہچانا آپ نے؟ اچھا تو میں ہی بتا دوں۔ وہ ہے میری پیاری آنٹی جان کی تصویر' میں تو آپ کو دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔

آپ کی اپنی...... شبنم'

محبت میں ڈوبے اس خط کو میں نے نہ جانے کتنی مرتبہ پڑھا' میرے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں الماری میں رکھے البم کی طرف لپکی' لیکن البم میں میری کوئی تصویر تھی ہی نہیں' میں نے تو اپنی تمام تصویریں آگ کی نذر کر دی تھیں' میں ماضی کی کوئی نشانی اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتی تھی۔

اب مجھے اپنی تصویر کھنچوانی تھی' میں ایک لمحہ بھی برباد کرنا نہیں چاہتی تھی' فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی' آئینے پر سے دھول صاف کی' برسوں بعد آئینہ دیکھتے کچھ عجیب سا لگا' وہ شفق کے سے گال' مسکراتے ہونٹ اور ہمیشہ سنورے ہوئے بالوں کا کہیں پتا نہ تھا' بے ترتیب بال' ملگجے کپڑے اور اداس صورت سے ایک عجیب بے بسی ٹپک رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ اس حالت میں تصویر اچھی نہیں آئے گی' میں نے بالوں میں کنگھی کی' الماری سے میسور سلک کی لال ساڑھی نکال کر پہنی اور اسٹوڈیو پہنچ کر اپنی تصویر کھنچوانے بیٹھی تو میں مسکرائی بھی......

برسوں بعد ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ اُٹھی' مجھ میں عورت پھر سے جاگ اُٹھی تھی۔

تصویر پا کر شبنم نے جن الفاظ میں اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا اسے پڑھ کر میرا دل بری طرح اچھلنے لگا' ایسا لگتا تھا کہ کسی دم سینے کو پار کر کے میری ہتھیلی پر آ جے گا' اس نے اپنی ایک تصویر اور بھجوائی تھی' جس میں میری بھجوائی ہوئی نئی شلوار اور قمیض میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ صحت منداور پیاری لگ رہی تھی۔ شبنم کو بہتر حالت میں دیکھ کر میں خوشی سے پھولے نہ سمائی اور میں اپنی خوشی کا اظہار اپنے فرم کے ساتھیوں سے کیے بغیر بھی نہ رہ سکی' میں نے فخریہ طور پر شبنم کی تصویر بھی دکھائی' اب انہیں پتا چلا کہ چند دنوں سے جو تبدیلی انہوں نے مجھ میں دیکھی تھی اس کی اصل وجہ کیا تھی۔

میں ان لوگوں میں زیادہ گھل مل گئی' اب مجھے زندگی میں لطف آنے لگا' میں ساتھیوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی' فرم کے مالک سے بھی یہ بات چھپی نہیں رہی' جب انہیں پتا چلا کہ میں نے کنڑی زبان سیکھ لی ہے اور براہ راست اسی میں شبنم سے خط و کتابت کرتی ہوں تو انہوں نے کرناٹک میں مجھے اس فرم کی مختلف برانچوں کا انچارج مقرر کر دیا اور میری تنخواہ بھی بڑھا دی۔

میں نے شبنم کے لیے کھلونے خریدے' میں جانتی تھی کہ بچوں کے لیے صرف روٹی ہی ضروری نہیں ہوتی۔

کئی دن سے شبنم کا خط نہیں آیا تھا' میں پریشان تھی کہ نا جانے کیا بات ہوگئی' بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ سخت بیمار ہے' میں نے یہاں کے اچھے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا اور دوا بھجوائی' شبنم کو یہ احساس تھا کہ میں اس کے لیے بے قرار ہوں' اس نے میری پریشانی کا خیال کرتے ہوئے چند سطریں لکھ بھیجیں۔

'آنٹی پیاری!

آپ بالکل بے فکر رہیے' میں اب اچھی ہوں' میں اس وقت تک مرنا نہیں چاہتی جب تک

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کہ میں آنٹی جان کو دیکھ نہ لوں کیا آپ کا جی نہیں چاہتا مجھے دیکھنے کو۔؟''

میں نے فوراً رخت سفر باندھا' جب ٹرین پلیٹ فارم پر خرگوش سے کچھوے کی چال چلنے لگی تو میں نے اس کو دور ہی سے دیکھ لیا تھا' وہ بھی مجھ کو پہچان چکی تھی' وہ خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی' وہ بے تحاشا میرے کمپارٹمنٹ کی طرف یہ کہتے ہوئے دوڑی چلی آئی۔

''میں نے اپنی آنٹی جان کو پہچان لیا' آپ تو بالکل اپنی تصویر ہیں۔'' وہ میری باہوں میں جھول گئی' میں نے پیار سے اس کو چمٹا لیا' اس کے ہونٹوں' گالوں اور آنکھوں کو دیوانہ وار چومتی رہی' میں اپنی محبت میں یہ بالکل فراموش کر بیٹھی تھی کہ کسی کی آنکھیں مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہیں' میں ابھی تک یہ نہیں دیکھ پائی تھی کہ شبنم کسی کے ساتھ اسٹیشن آئی ہے۔

''میں انہیں انکل کہتی ہوں' آپ کی طرح یہ بھی مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔''

شبنم نے تعارف کرایا ''آنٹی یہ آپ کے گن گایا کرتے ہیں' کہتے ہیں کہ آپ کتنی اچھی ہیں' آپ کے دل میں کتنا خلوص ہے۔''

''مجھے آپ سے مل کر مسرت ہوئی۔'' وہ کہہ رہے تھے۔ ''میں ایک افسانہ نگار ہوں' آپ سے ملنے کا مجھے بڑا اشتیاق تھا' شبنم کی زبانی سب کچھ جان کر مجھے خوشی ہوئی' آپ کا جذبہ قابل تحسین ہے' آپ نے مجھے بھی راہ دکھائی۔''

''جی!......آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔''

''یہ تو آپ کا عجز کہہ رہا ہے۔''

''بات اصل میں یہ ہے کہ میں خود غرض ہوں' میں نے اپنے سکون کے لیے یہ سب کچھ کیا' اس طرح مجھے میرا چین واپس ملا' مجھے زندگی کا احساس ہوا' شبنم نے مجھے ذمہ داری کا احساس دلایا۔''

''آپ تو اس نوع کے انسان ہیں جو احسان کرتے ہیں مگر ظاہر کرنا نہیں چاہتے' یہی آپ کی سب سے بڑی صفت ہے۔''

میں خاموش ہو گئی' یہ ان کا بڑھا ہوا خلوص تھا جو ان سے یہ سب کچھ کہلوا رہا تھا' مجھے ایسا لگا کہ میں صرف آئینہ ہوں اور وہ اپنا عکس مجھ میں دیکھ رہے ہیں' ان کی آنکھوں میں پیار چھلک رہا تھا' مجھے پتا چلا کہ انہوں نے بھی دو بچوں کو اپنایا ہے' میری نگاہوں میں وہ اور اونچے ہو گئے' جب میں نے ان بچوں کے متعلق پوچھنا چاہا تو ٹال گئے۔

''میں نے تو آپ کی عملی راہ کی پیروی کی ہے' یہ کوئی بڑی بات نہیں ہوئی' البتہ پہل کرنا بڑی بات ہوتی ہے۔''

میں اپنے وطن لوٹ آئی اور اپنے ساتھ ایک کسک لے آئی۔ شبنم کے خطوط تو ان کی تعریف سے بھرے ہوئے ہوتے۔ یہ انکل بہت اچھے ہیں آنٹی' اب تو یہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ چاہنے لگے ہیں' کہتے ہیں اپنی آنٹی کی منظور نظر جو ٹھہریں تم......

ایک صبح ان کا خط پا کر میرا دل دھڑکنے لگا' بہت ہی مختصر خط تھا۔

'تمہاری خیریت شبنم کے خط سے مل جاتی ہے اور ساری تفصیل شبنم ہی سے جان لیتا ہوں' لہٰذا تمہیں خط لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی' آج براہ راست تمہیں اس لیے لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ یہ بات ہے ہی کچھ ایسی کہ بچوں سے لکھوانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ شبنم تمہاری لڑکی ہے' بادل اور ساز میرے لڑکے ہیں کیوں نہ شبنم' بادل اور ساز ہمارے ہو جائیں' اگر تمہیں منظور ہو تو میں تمہیں لینے آ جاؤں۔!'

خط پڑھ کر میں گلابی ہو گئی' پیڈ اُٹھا کر صرف اتنا لکھ سکی' ہاں' یہ بچے اب ہمارے ہیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اردو ادب کا سنگھار......ادب کی خوشبو

خودکشی

بیدم سیف آبادی

میں نے ان کا بازو پکڑ کر بستر پر بٹھایا۔ مگر وہ بجائے بیٹھنے کے گر گئے اور میں بری طرح گھبرا گیا۔ کریم احمد خاں بے ہوش ہو چکے تھے۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور ڈاکٹر حسینی کو لیکر آیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے بتایا کہ انہیں کوئی سخت صدمہ پہنچا ہے۔ یہ ایک اور ہی معمہ شروع ہو گیا۔

اردو کے ایک حساس ادیب کے قلم سے ایک فکر انگیز تحریر

اور جب میں اپنے نئے عہدہ کا چارج لینے کے لیے پہنچا تو اسٹیشن پر دفتر کا کافی عملہ استقبال کے لیے آیا ہوا تھا۔ گو ذاتی طور پر میں ان تمام روایات کا سخت مخالف ہوں۔ مگر کیا کیا جائے کہ یہ بدعتیں بدستور قائم ہیں اور ماتحت عملہ بھی غریب کیا کرے۔ کچھ لوگ ہیں جو رخصت کرنے اور استقبال کرنے کو ہی سرکاری فرائض کی مد میں شامل کرتے ہیں اور جو اس میں کوتاہی کرے وہ اپنی ڈیوٹی سے روگردانی کا مجرم گردانا جاتا ہے۔ سب سے پہلے آفس سپرنٹنڈنٹ نے آگے بڑھ کر میرا استقبال کیا اور پھر دیگر اسٹاف سے تعارف کرایا۔ میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''آپ لوگوں نے کیوں تکلیف کی۔ میں ان تکلفات کا قائل نہیں ہوں۔''

میں نے محسوس کیا کہ اکثریت نے اس جملہ کا اچھا تاثر لیا۔ مگر چند ایسے بھی تھے جو اپنی حرکات سے انتہائی خوشامدی لگتے تھے۔ اور انہوں نے اپنی اس عادت کا کسی نہ کسی طرح اظہار بھی کر ہی دیا اور میں نے خاموشی سے عملہ کے تمام ارکان کا ہلکا سا جائزہ لینا بھی ضروری سمجھا تاکہ انسان کی نظریں ان پر پڑتے ہی نفرت کی ہلکی ہلکی لہریں دل میں اٹھنے لگتی ہیں۔ حالانکہ بظاہر کوئی وجہ، کوئی سبب ہی نہیں ہوتا اور بعض لوگوں کو ایک نظر دیکھ کر ہی ہم محبت سی محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تو آفس سپرنٹنڈنٹ کا چہرہ پہلی قسم کے چہروں میں تھا اور نہ جانے کیوں مجھے ایک دم اس سے نفرت سی ہو گئی۔ کہتے ہیں انسان کا چہرہ اس کے کردار عادات اور اطوار کا آئینہ ہوتا ہے اور بعض آئینے بہت صاف ہوتے ہیں۔ اور بعض دھندلے اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں شکل خراب لگتی ہے یا اچھی مگر جیسی ہوتی ہے ویسی نظر نہیں آتی۔ اس نے اپنا نام نہ جانے کیا بتایا تھا مگر ہاشمی مجھے یاد رہ گیا ہاشمی ادھیڑ عمر کا بہت ہی خرانٹ اور چاپلوس آدمی نظر آتا تھا۔ مگر اس کے ہر جملہ میں سرکی اتنی بہتات ہوتی کہ میں چڑھ گیا۔ مگر آج تو پہلا ہی دن تھا۔ کیا میں اتنی جلد ننگا ہو جاتا یہ ان کی کتنی بڑی کامیابی ہوتی کہ وہ اپنے افسر کو ایک ہی دن میں سمجھ لیتے۔ ایسا نہیں ہو گا۔ مجھے سمجھنے کے لیے کم سے کم انہیں ایک سال تو انتظار کرنا چاہیے۔

دفتر کی عمارت بہت ہی خوبصورت اور صاف ستھری تھی۔ غالباً کچھ اہتمام میری آمد کے سلسلہ میں بھی کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے میں نے پورے دفتر کا جائزہ لیا۔ ہاشمی کے کمرے کے باہر ایک چپراسی عجیب شان استغناء سے بیٹھا ہوا تھا۔ چپراسی مجھے دیکھ کر بڑی تیزی سے کھڑا ہوا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اور مودب کھڑا رہا۔ مگر وہ بوڑھا چپراسی بے نیازی سے بیٹھا رہا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ مجھے اچھا لگا۔ ادھر میرے عقب میں ہاشمی پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ وہ سخت غیض کے عالم میں اس بوڑھے چپراسی کو ہاتھ سے کھڑا ہونے کا اشارہ کر رہا تھا۔ مگر وہ جیسے ہم سب کی موجودگی سے قطعی طور پر بے نیاز تھا۔

''السلام علیکم بابا۔'' میں نے بے اختیار کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس کے لہجے میں کرختگی تھی مگر اب چہرہ بدل گیا تھا۔ چہرے پر حیرت کے آثار تھے اور آنکھوں میں حیرانی بھری نرمی تھی۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اور میں آگے بڑھ گیا۔ ہاشمی کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ سخت شرمندہ اور جھنجلایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

''سر یہ چپراسی' بہت ہی خودسر ہے۔ انتہائی مغرور اور خودسر' میں نے کئی بار رپورٹ کی ہے مگر سر کچھ نہیں کیا گیا۔ اب دیکھئے نا سر' اس طرح اور لوگ بھی بگڑ جاتے ہیں۔''

''خیر' خیر کوئی بات نہیں دیکھا جائے گا۔'' میں اس موضوع پر کچھ سننے کے موڈ میں بالکل ن تھا۔

راؤنڈ مکمل کر کے میں اپنے کمرے میں آ بیٹھا تھا اور بار بار ذہن میں اس عجیب وغریب چپراسی کی شخصیت آ جاتی تھی اس کے بیٹھنے کا انداز' اس کی باوقار ادائیں' جیسے سب اس کے ماتحت ہوں اور یہ تصور کر کے کہ ہاشمی کو اس کی موجودگی سے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی۔

میں اپنے سرکاری رویہ کے معاملہ میں اپنے دیگر ساتھیوں میں بڑا بدنام ہوں' وہ برملا کہتے ہیں کہ مجھے افسری زیب نہیں دیتی اور وجہ صرف یہ ہے کہ میں دفتر میں عضو معطل کی طرح نہیں رہتا۔ اب یہ بھلا کہاں کی افسری ہے کہ میز کے ایک کونے پر فائل پڑی ہے اور آپ گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلاتے ہیں کہ یہ فائل اٹھا کر دے دو۔ یا قریب ہی صراحی اور گلاس رکھا ہے مگر آپ خود اٹھ کر پانی پینا کسرشان سمجھتے ہیں۔ اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے بھی میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

چپراسی نہیں بلاتا۔ دورِ غلامی کی اس وراثت کو نہ جانے کب تک ہم اپنے سینوں سے لگائے رہیں گے۔ گویا افسر نہ ہوئے ایک مفلوج انسان ہوئے جو خود کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اکثر بعض فائلیں میں خود لے کر ماتحت عملہ کے پاس چلا جایا کرتا ہوں اور یہی وہ باتیں ہیں جن کی بناء پر مجھے افسری کے لیے نااہل سمجھا جاتا ہے۔ بہرنوع میں نے ہر قسم کا طنز برداشت کیا اور کبھی اپنی رویہ میں تبدیلی کا خیال تک نہ کیا۔

آج میرا پہلا ہی دن تھا' پھر بھی کسی ضرورت سے میں ہاشمی کے کمرے کی طرف گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ بوڑھا چپراسی ایک دم اپنے اسٹول سے کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھیں' بیٹھیں بابا آپ تشریف رکھیں۔'' کہتا ہوا میں ہاشمی کے کمرے میں چلا گیا دوسرا چپراسی پھٹی پھٹی نظروں سے بوڑھے کو دیکھ رہا تھا۔

یہ آج کیسا معجزہ ہو گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں سارے دفتر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ کریم احمد خاں پہلی بار نئے افسر کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہاشمی خود حیران تھا کہ آخر اس چپراسی میں یہ تبدیلی کیسے آ گئی۔

کئی دن گزر گئے تھے کریم احمد خاں میں کافی تبدیلی آ گئی تھی مگر صرف میرے لیے۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک دم کھڑے ہو جاتے اور سلام کرتے۔ میں مزاج پرسی کرتا تو وہ بڑے مٹھاس بھرے لہجے میں خالص لکھنوی انداز میں جواب دیتے۔

''اللہ کا کرم ہے۔ نوازش ہے جناب کی۔''

باقی لوگوں کے ساتھ ان کا عمل قطعی طور پر وہی تھی اور ہر شخص ان سے نالاں نظر آتا۔ آخر چند دن بعد ہاشمی نے یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ میرے مزاج میں کافی حد تک دخیل ہو چکا ہے کریم احمد خان کی شکایت کی اور ایک سخت نوٹ لکھ کر لایا تاکہ پہلے معطلی ہو اور پھر برخاست کر دیے جائیں نوٹ پڑھ کر مجھے غصہ تو آیا مگر ظاہر نہ ہونے دیا بعد میں میں نے ملائمت سے ہاشمی کو کہا کہ وہ میرا ایک چپراسی لے لیں اور اس کی جگہ کریم کو میرے پاس بھیج دیں۔

''مگر سر میں نے عرض کیا نا وہ بڈھا بہت بد دماغ ہے۔ اعلیٰ افسران کے دورے پر بھی وہ ایسی ہی حرکتیں کرتا ہے سر نتیجہ میں دفتر کی شہرت خراب ہوتی ہے سر۔'' ہاشمی کے لہجے میں تلخی اور بے عزتی کا احساس تھا۔ یہ بھی ہمارے دفتری نظام کا طرہ امتیاز ہے کہ ماتحت عملہ اپنی Noting کے خلاف تو کجا اس میں کسی قسم کی ترمیم کو بھی پسند نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تمام تر فیصلوں کا حق اسی عملہ کو ہوتا ہے اور افسروں کا کام صرف ایک دستخطی مشین کی طرف اپنی منظوری ثبت کرنا ہوتا ہے۔

''بس ہاشمی صاحب میں نے جیسا کہا ہے وہی ہونا چاہیے۔''

اور ہاشمی بہتر سر کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ مگر اس کا لہجہ بالکل بے جان تھا۔

اور اس طرح کریم احمد خان براہ راست مجھ سے منسلک ہو گئے۔ مگر مجھے فوراً ہی اندازہ ہوا کہ میں نے ایک مصیبت مول لے لی ہے۔ اکثر یوں ہوتا کہ دوسرے چپراسی کو میں نے کہیں بھیجا ہوتا اور کسی ضرورت پر گھنٹی بجاتا مگر کوئی اندر نہ آتا۔ جھنجھلا کر گھنٹی کو طول دیتا مگر نتیجہ صفر اور کریم احمد خاں کبھی میرے کمرے میں داخل نہ ہوتے تو کیا واقعی یہ چپراسی باہر اسٹول پر بیٹھے رہنے کی تنخواہ لیتا ہے۔ اکثر مجھے غصہ آ جاتا۔ مگر ایک دن یہ عقدہ بھی کھل کر رہا۔ ہاشمی نے ایک دن بتایا کہ بڑے میاں گھنٹی کی آواز پر کبھی کان نہیں دھرتے جب تک خود ان کو آواز نہ دی جائے۔ ایک دن میں نے آزمایا تو واقعی یہی بات نکلی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ایک بار گھنٹی بجائے کوئی نہ آیا اب میں نے آواز دی۔ ''خان صاحب'' اور وہ ایک دم کمرے میں داخل ہو گئے۔

''جی جناب فرمایئے۔''

''دیکھیئے ذرا ہاشمی صاحب کو بلا لایئے۔''

''بہتر جناب۔''

اور اب میں سمجھ گیا تھا کہ کریم احمد خاں بڑے اچھے ماحول کے پروردہ ہیں۔ انہوں نے حکومت کی ہے۔ ایک ہی انداز میں دنیا دیکھی ہے۔ اور اب برے وقت کا شکار ہیں۔ کوئی انتہائی مجبوری انہیں یہ ذلیل نوکری کرنے پر آمادہ کیے ہوئے ہے۔

اس دن کریم احمد خاں غیر حاضر تھے۔ پھر ان کی چھٹی کی درخواست آئی۔ شدید بخار کی وجہ سے وہ دفتر آنے سے معذور تھے اور مجھے یوں لگا کہ جیسے دفتر میں کوئی زبردست خلا پیدا ہو گیا ہو۔ چھٹی کے وقت دوسرے چپراسی نے حسب معمول میرا پورٹ فولیو لیا اور کار میں رکھ دیا کار میں بیٹھنے سے پہلے میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ کریم کا گھر جانتا ہے۔ وہ بڑی حیرانی سے مجھے دیکھتا رہا اور پھر اثبات میں جواب دیا۔ میں نے اسے گاڑی میں بٹھا لیا اور ہدایت کی کہ مجھے اس کے گھر لیجائے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اسے میری دماغی حالت پر شبہ ہو۔ وہ پتھر کا بت بنا بیٹھا رہا۔ اس کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایک اعلیٰ افسر اپنے چپراسی کی عیادت کو جائے۔ مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ہم لوگ ایک کچی بستی میں پہنچے تنگ تنگ گلیاں۔ جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے ایک گلی کے پاس مجھے کار روکنا پڑی۔ اس سے آگے گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔ چپراسی میرا راہبر تھا۔ ایک چھوٹے سے کچے مکان کے سامنے جا کر وہ ٹھہر گیا اور دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور پھر تھوڑی دیر میں ہلکی چرچراہٹ سے دروازہ کھل گیا۔

کریم احمد خان کمبل میں لپٹے ہوئے دروازے میں حیران و پریشان کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں بخار کی شدت سے سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ مبہوت کھڑے مجھے دیکھتے رہے پھر ارے آپ جناب آپ کے علاوہ ان کے منہ سے اور کچھ نہ نکل سکا۔

''آپ آرام کریں۔ بستر پر تشریف رکھیں۔ بخار کی حالت میں یوں کھڑا رہنا ٹھیک نہیں۔''

میں نے ان کا بازو پکڑ کر بستر پر بٹھایا۔ مگر وہ بجائے بیٹھنے کے گر گئے اور میں بری طرح گھبرا گیا۔ کریم احمد خاں بے ہوش ہو چکے تھے۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور ڈاکٹر حسینی کو لیکر آیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے بتایا کہ انہیں کوئی سخت صدمہ پہنچا ہے۔ یہ ایک اور ہی معمہ شروع ہو گیا۔ حیرت اور خوشی کے جذبات تو ممکن تھے مگر صدمہ۔

تھوڑی دیر میں کریم احمد خاں ہوش میں آ گئے۔ اب وہ ٹکٹکی باندھے مجھے بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور آنسو ان کی آنکھوں سے رواں تھے۔ میں نے گھر آ کر ایک نوکر بھیجا جو ان کی دیکھ بھال کرتا میں روزانہ دفتر کی چھٹی کے بعد ان کو دیکھنے جایا کرتا۔ چند دنوں بعد وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گئے اور دفتر آنے لگے۔ اب ان کا رویہ میرے لیے پدرانہ حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ چائے کافی وہ خود بنا کر مجھے دیتے تھے اور دوسرے چپراسی کو تو عملی طور پر پنشن ملنے لگی تھی۔ پھر میں نے سنا کہ ہاشمی میرے سخت خلاف ہو گیا ہے۔ اور اس نے دبے لفظوں میں یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ یہ افسر کسی نیچ خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور احساس کمتری کا بری طرح شکار ہے وغیرہ وغیرہ۔ اسی دوران مجھے معلوم ہوا کہ ہاشمی کی رسائی وزارت متعلقہ کے اعلیٰ افسران تک ہے۔ بہر نوع مجھے ان باتوں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سے کیا لینا تھا۔

ان دنوں جوائنٹ سکریٹری اور ڈپٹی سکریٹری کی آمد آمد تھی۔ پورے دفتر میں کھلبلی مچی ہوئی تھی اور ہاشمی مجھے ان افسران کی بد دماغی اور سخت رویہ کے متعلق کئی داستانیں سنا چکا تھا۔ اس نے مجھے نصیحت بھی کی کہ میں کریم احمد خاں کو سمجھا دوں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی موجودگی میں کوئی ناخوشگوار حادثہ ہو جائے۔ پھر ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ کریم احمد خاں نے کبھی چپراسیوں والی وردی نہ پہنی تھی اور بعض حکام اس بات سے بھی منغض ہوئے تھے۔

جوائنٹ سکریٹری آچکے تھے اور ایک راؤنڈ لے کر جب وہ میرے کمرے کی طرف آئے تو خود میری نظریں یقین نہ کرسکیں۔ کریم احمد خاں وردی میں تھے اور بڑی مستعدی سے کھڑے ہو گئے۔

''السلام علیکم جناب حضور سکریٹری صاحب۔''

ان کے لہجہ میں نشتر کی سی کاٹ تھی۔ طنز کا اتنا بھرپور لہجہ میں نے کبھی نہیں سنا تھا اور پھر مزید حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جوائنٹ سکریٹری جواب نہ دے سکے۔ ان کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ میں بری طرح گڑبڑا گیا اور جلدی سے ان کو اپنے کمرے کے اندر لے گیا۔ ایک چپراسی کی یہ جرات کہ وہ جوائنٹ سکریٹری سے طنز کرے اور ان کو کیا ہوا۔

بہت دیر بعد سکریٹری صاحب اپنے ہواس میں آئے پھر بھی وہ سخت مضطرب اور پریشان نظر آتے تھے۔ میں نے چائے کے لیے دانستہ گھنٹی بجائی تاکہ دوسرا چپراسی آئے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ آج گھنٹی کی آواز پر کریم احمد خاں خود اندر آگئے۔

''خاں صاحب چائے لے آیئے۔''

''بہتر جناب۔'' ان کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

مگر جوائنٹ سکریٹری نے چائے نہیں پی ان کے چہرے پر زردی چھا گئی تھی اور وہ فوری طور پر واپس جانا چاہتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد پہلی بار میں نے کریم احمد خان کو طلب کیا اور بری طرح ڈانٹا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے سنتے رہے۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں اور پھر ساون بھادوں کا منظر پیش کرنے لگیں۔ بعد کو مجھے اپنے اس رویہ پر افسوس بھی ہوا۔

اس واقعہ کو کافی دن گزر گئے۔ میں دفتری کاموں میں سخت ہوتا گیا اور اکثر ہاشمی کی رائے کے برعکس فیصلے کرتا۔ وہ میرا دشمن ہوتا گیا اور پھر حالات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ میرے خلاف ایک جھوٹا کیس بن گیا اور معاملات نے ایسی سنگین صورت اختیار کی کہ میری تنزلی یقینی ہو گئی۔ ہاشمی اور اس کے دیگر ساتھی میرے خلاف بڑے اہم گواہ تھے۔ ان دنوں میں بہت پریشان اور متفکر تھا اور اکثر انسانیت کی اعلیٰ اقدار سے میرا ایمان اٹھتا نظر آتا۔ کریم احمد خاں میری پریشانی بھانپ گئے تھے اور آخر ایک دن ان کے بہت اصرار پر میں سب کچھ کہہ بیٹھا۔ وہ بڑے سکون اور اطمینان سے سنتے رہے۔ پھر تھوڑی دیر کشمکش کے آثار ان کے چہرے پر نظر آئے۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں جناب سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اور اس تسلی پر مجھے ہنسی آنے لگی۔ جسے بمشکل میں روک سکا۔

میرا کیس وزارت میں تھا اور وہاں سے جواب طلبی ہوئی تھی۔ اور میں حیران تھا کہ اپنی بے گناہی کا ثبوت کہاں سے لاؤں۔ اسی دوران کریم احمد خاں نے پندرہ دن کی رخصت لے لی۔ کوئی ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ وزارت سے پھر ایک مراسلہ موصول ہوا۔ میں لفافہ کھولتے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ خدا معلوم اب کیا ہو۔ شاید یک طرفہ کارروائی۔ شاید تنزلی کے احکامات۔ دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ چاک کیا اور نفس مضمون دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ میرے اوپر لگائے گئے تمام الزامات بے بنیاد قرار دیے گئے تھے اور مسرت سے دیوانہ ہوتے ہوئے میں نے کریم احمد خان کو آواز دی اور جب دوسرا چپراسی آیا تو احساس ہوا کہ وہ تو رخصت پر ہیں۔

کریم احمد خاں کی رخصت ختم ہو رہی تھی اور میں ایک ایک دن گن رہا تھا کہ ان کا استعفیٰ آ گیا مجھے بہت کوفت ہوئی غصہ بھی آیا کہ اس شخص نے مجھے خط بھی نہ لکھا۔ یہی معلوم کر لیتا کہ میرے کیس کا کیا ہوا۔ عجیب ہے یہ دنیا بھی اور اس کے بسنے والے بھی۔

چند دن بعد ایک بہت بڑی خوشخبری ملی مجھے ترقی دیدی گئی تھی حالات نے اس رفتار سے پلٹا کھایا تھا کہ ہاشمی حیران رہ گیا اور اس نے بھی طویل رخصت لے لی۔ اس ترقی کے بعد مجھے وزارت میں اپنے فرائض سنبھالنے تھے۔ نئے افسر کو چارج دے کر جب میں دارالحکومت روانہ ہونے لگا تو بے اختیار کریم احمد خان یاد آئے اور پھر غصہ بھی کہ اس قدر بے مروت انسان ثابت ہوئے۔

اسٹیشن پر یہ دیکھ کر فخر اور مسرت سے میرا سینہ پھول گیا کہ جوائنٹ سکریٹری بذات خود مجھے لینے آئے تھے۔ وہ میرے بڑی عزت کر رہے تھے کار میں بٹھاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''آپ میرے گھر چلیں گے صدیقی صاحب والد صاحب کا یہی حکم ہے۔ وہ آپ سے ملنے کو بے چین ہیں۔''

اور میں حیران و ششدر اس معمہ کو حل نہ کر سکا۔ ان کے والد بھلا مجھے کیا جانیں۔

کوٹھی کے گیٹ پر کریم احمد خاں کو دیکھ کر میرے تمام حواس جواب دے گئے۔

اندازِ فکر

تعلیم قابل قدر ہے مگر اس سے کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہیں ہوتا کیونکہ یہ ہمیں بولنا تو سکھاتی ہے مگر یہ نہیں سکھاتی کہ کب اور کتنا بولنا چاہیے۔

انسان نے اپنی معلومات کے باعث کائنات تک تو دسترس حاصل کر لی مگر افسوس کہ اپنے جیسے انسانوں کا دل تسخیر کرنے میں ناکام رہا۔

انسان نے گورے، کالے، خوب صورت اور بدصورت میں تمیز کرنا تو بہت جلد سیکھا مگر کاش وہ بدی کی تلخی اور نیکی کی چاشنی کو بھی محسوس کر سکتا۔

کسی کے اعتماد کو دھوکا دینا سب سے مشکل کام ہے۔ جس کو دھوکا دیا گیا ہو بات کے کھل جانے کے بعد اس کا سامنا کرنا موت کے برابر ہے۔

''مگر آپ' آپ اور وہ ذلیل نوکری۔''

''صدیقی صاحب مجھ سے ایک موقع پر غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ ابا جان سمجھے میں یہ کہتے ہوئے جھجکتا ہوں کہ وہ میرے والد ہیں اور اس احساس سے وہ مجھ سے ناراض ہو گئے اور سزا دینے کی ٹھانی۔''

جوائنٹ سکریٹری اس وقت بالکل معصوم بچے کی طرح لگ رہے تھے۔

''آپ کا احسان میں کبھی نہ بھولوں گا۔ کیونکہ آپ کے کیس نے ابا جان کو مجبور کر دیا کہ وہ مجھے معاف کر دیں۔'' ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اور کریم احمد خاں کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دھار والا

عزیز احمد خان

ہاتھ پائوں توڑ کر کوئی دھندا کرنا ھمیں اچھا نھیں لگا بابا۔ ھم اسی دن اس کے گھر سے بھاگ گیا۔ ایک ھمارے جیسا پھیے والا بولا۔ ھمارا پھیه گھمائو دو آنه روز ملے گا۔ بھیک مانگنا بھت برا ھے۔ اس میں غیرت جاتا رھتا ھے۔ ھم نے اسی دن پھیه والا کا نوکری کر لیا۔ اس نے یه کام ھمیں سکھا دیا۔

ایک حساس ادیب کے قلم سے ایک فکر انگیز تحریر

وہ چھری، چاقو اور قینچی کی دھار بنانے والا ایک نوجوان تھا اور کمر پر لوہے کا پہیہ اٹھائے گلی کوچوں میں گھومتا رہتا تھا۔ اس کی رفتار جتنی تیز تھی زبان بھی اتنی ہی تیز تھی جیسے اس نے اپنی زبان کی قینچی کو بھی سان پر رکھ کر خوب چمکا لیا ہو۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا دوپہر کو اکثر گلی میں اس کی آواز سنا کرتا تھا۔

''قینچی دھار والا

چاقو دھار والا''

ایک دن جب اس کی آواز بھونرے کی گنگناہٹ کی مانند گلی میں گونج رہی تھی۔ میں نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا۔ ایک سرخ و سفید رنگ کا مضبوط اور گٹھیلے جسم کا نوجوان گلی میں اکڑوں بیٹھا قینچی کی دھار بنا رہا تھا۔ ایک لڑکا لکڑی کے اوپر لپٹے ہوئے چمڑے کے تسمے کو کھینچ کر پہیہ گھما رہا تھا اور وہ قینچی کو تیز گھومتے ہوئے پہیے کی نوک سے لگا دیتا تھا ایک آواز پیدا ہوتی اور چھوٹی چھوٹی چنگاریاں جھڑنے لگتیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اپنا وہی نعرہ دہراتا رہتا۔

قینچی دھار والا۔

چاقو دھار والا۔

مجھے اس کے چہرے کی چمک میں ایک عجیب قسم کے وقار کا احساس ہوا اس وقار کی تہہ میں ذہانت کی روشنی بھی نظر آئی اور مجھے نہ جانے کیوں اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ الجھے ہوئے گھنگھریالے بال بھورے بھورے چمکتے گال۔ چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھیں۔ بھرے بھرے بازو' جسم پر پھٹا ہوا میلا کرتہ' اور اس کے نیچے گھٹنوں سے ذرا نیچا تہمد۔ کسی دن آوازیں لگاتا وہ گلی کے اس سرے سے آخری سرے تک چلا جاتا اور پھر اسی تیزی سے لوٹ آتا۔ اس کی ان آوازوں میں بڑی نغمگی اور رسیلا پن تھا۔ اس گلی میں بیڑی بنانے والوں کے مکانات تھے۔ مرد مختلف دھندے کرتے تھے۔ عورتیں اور لڑکیاں گھروں میں پاؤں پھیلائے چٹائیوں اور تھیلیوں پر بیٹھی چٹکیوں سے پتوں میں تمباکو لپیٹتی رہتیں۔ ان کے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں ایک ساتھ بڑی تیزی سے کام کرتیں۔ گھٹنوں پر ایک سوپ رکھا رہتا۔ اس میں تیندو کے ایک خاص ڈھب سے کٹے ہوئے پتے ہوتے اور بیچ میں باریک زرد

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

(تمباکو) ہوتا' انگلیاں جلدی جلدی پتیوں کو لپیٹتی رہتیں اور عورتوں کا اوپری دھڑ عجیب انداز سے ہلتا رہتا قینچی دھار والے کی آواز سنتے ہی بہت سی عورتیں کواڑوں کی آڑ میں آ کھڑی ہوتیں اور قینچیاں اس کی طرف بڑھا کر پوچھتیں۔

''کیا لوگے۔''

''وہی دو آنے۔''

''ایک آنہ ملے گا۔''

''لائیو ایک آنہ دو ایک پھل بنا دے گا۔''

''نہیں دونوں پھل بنوائیں گے۔''

''پھر دو آنہ لے گا۔''

''چاہے دھار ایک ہی دن میں الٹ جائے۔''

''دھار اور مت کی بات مت کرو بائی۔ ان دونوں کو الٹتے دیر نہیں لگتی۔ ہمارا ابا مادیکھتے ہی دیکھتے پاگل ہو گیا اور یہ تو بتاؤ بیڑیاں کتنی بنا لیتی ہو روز۔''

''دو سو' کبھی تین سو۔''

''اور تین سو پتیاں کاٹتے کاٹتے ایک دن میں قینچی کی دھار الٹ جائے تو بھلا کون سے غضب کی بات ہوئی۔ ہماری تو زبان آوازیں لگاتے لگاتے گھس جاتی ہے لاؤ دو آنے نکالو۔''

اور ہری پیلی چوڑیوں والا کوئی گورا چٹا ہاتھ دروازہ سے باہر آ جاتا۔ جس کی انگلیوں کے پوروں میں بیڑیاں بنانے کے نشان ہوتے یہ عورتیں بیڑیاں بنا کر لوگوں کو دل کی بیماریاں نہیں بانٹتی تھیں بلکہ اپنی زندگی کی اندھیری دور کرتی تھیں اور اپنے شوہروں کا بوجھ ہلکا کرتی تھیں۔ جب دس بیس قینچیاں اکٹھی ہو جاتیں تو وہ گلی میں ایک جگہ بیٹھ کر اپنا پہیہ کھڑا کر لیتا اور پاس کھڑے ہوئے کسی لڑکے سے کہتا۔

''بیٹا پانی لے آ ایک گلاس میں۔''

''اور بیڑی بھی پیو گے۔''

''نہیں بیٹا بیڑی ہم نہیں پیتا۔ کلیجہ جلا ڈالتی ہے اور یہاں کلیجہ پہلے ہی کباب ہو چکا ہے۔''

پانی پینے کے بعد وہ تہمد سے منہ پونچھ کر دروازوں پر نظر ڈالتا جن کی درزوں سے آفتاب و ماہتاب جگمگاتے دکھائی دیتے اس کا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

چہرہ دمک اٹھتا۔ اسی بیچ میں کوئی عورت سوال کرتی۔

''اور چھری کی دھار کتنے میں بنا دو گے۔''

''چھری ایک طرح کی نہیں ہوتی مائی' پہلے بتاؤ کاہے کی ہے۔ لوہے کی ہے اور کاہے کی ہوتی۔''

''ہم پوچھتا ہے مرگی' مرغی حلال کرنے کی ہے یا ترکاری کاٹنے کی یا گوشت بنانے کی۔''

''ہم تو سب کام کر لیتے ہیں اسی ایک چھری سے۔''

''پھر دھار کیوں بنواتی ہو' مولوی نے پہلے ہی پڑھ کر دی ہو گی اسے دیکھو مخول مت کرو ہمارے دروجے (دروازے) پہ بیٹھ کر' نہیں تو گلی میں آنا بند ہو جائے گا۔''

''اے مائی! وہ سر پر دونوں ہاتھ مار کر کہتا۔ ہم تم سے مخول کرے گا۔ لاؤ چھری ادھر پھینکو' مفت بنائے گا۔''

''ہم فقیر نہیں ہیں' پیسے بتاؤ۔''

''اللہ نہ کرے جو کوئی فقیر ہو' چھ آنہ ہو گا۔ مائی پہلے ہم بھی فقیر تھا' بہت دن بھیک مانگا۔ ہمارا طبیعت اس سے اکتا گیا۔ بڑی بے غیرتی کا دھندا تھا۔''

''چھ آنے بہت ہیں دو آنے دیں گے۔''

''یہ بھی رکھو شام کو گھر والا آئے اسے دینا وہ پتھر پر رگڑ لائے گا چاقو کی دھار کتنے میں بناؤ گے۔'' ایک نیا سوال ہوتا۔

''کچے لوہے کا ہے' یار جس کا ہے۔ ہم فرخ آبادی اور رام پوری کا دو آنہ لیتا ہے۔ ہاتھرس کا ایک آنہ میں بناتا ہے اور وزیر آباد کے چاقو کو ہاتھ نہیں لگاتا۔''

''اسے دانتوں سے پکڑتا ہے!'' اور گلی میں ایک دم سے نقرئی قہقہے گونج جاتے وہ بھی مسکرانے لگتا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ کی بوندیں چمکنے لگتیں اور آنکھوں میں شعلے سے لپک اٹھتے اور وہ پھر کسی سے کہتا۔

''ایک گلاس پانی اور پلاؤ بیٹا۔''

آہستہ آہستہ مجھے اس سے بڑی دلچسپی ہو گئی اور ایک دن میں نے دو تین پرانی قینچیاں ڈھونڈ کر مسہری کے قریب رکھ لیں۔ ایک زنگ آلود تلوار پڑی تھی اسے بھی نکال کر وہیں ڈال لیا' تین دن کے بعد وہی آواز کانوں میں آئی۔

قینچی دھار والا۔

چاقو دھار والا۔

اور میں کمرے کا دروازہ کھول کر گلی میں آ گیا۔

''اے اے قینچی دھار والا کیا نام ہے تمہارا' ادھر آؤ! نام پوچھتا ہے ہمارا نام قینچی دھار والا۔'' اس نے اسی تیزی سے جواب دیا۔

''یہ بھی کوئی نام ہے۔''

''جس سے پیٹ بھرتا ہے وہی سب سے اچھا نام ہے بابا! نہیں ماں باپ کا رکھا ہوا نام پوچھتا ہوں۔''

''ننگا بھوکا نام رکھا ہو گا انہوں نے ہم چھٹپن میں بھیک مانگتا تھا۔ قبرستان میں رہتا تھا۔ ہم نے اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھا۔ بھیک مانگنے کا دھندا چھوڑ کر اب دھار بناتا ہے ہتھیاروں کی۔''

اس کی بات میں بڑا درد اور سوز تھا۔ میں نے اسے کمرے ہی میں بلا لیا۔ ''کس سے سیکھا تھا یہ کام۔''

''کسی اسکول یا مدرسہ میں نہیں بابا' ہم بھیک مانگتا تھا۔ ہمارا ایک ساتھی تھا' اللہ والا ہماری ہی عمر کا تھا۔ منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکالتا تھا۔''

''مائی روٹی دو۔

بابا پیسہ دو۔

مولا بھوک لگی۔

اللہ بھلا کرے گا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''وہ صبح سے شام تک بہت سا پیسہ لے آتا اور اپنے باپ کی جھولی میں ڈال دیتا۔ ایک دن اس کا باپ ہم سے بولا کہ ہم تمہارا ایک ہاتھ توڑ دیتا ہے۔ پھر تمہیں بھیک خوب ملے گا اور ہم تمہارا خرچ اٹھائے گا۔

ہاتھ پاؤں توڑ کر کوئی دھندا کرنا ہمیں اچھا نہیں لگا بابا۔ ہم اسی دن اس کے گھر سے بھاگ گیا۔ ایک ہمارے جیسا پہیے والا بولا۔ ہمارا پہیہ گھماؤ دو آنہ روز ملے گا۔ بھیک مانگنا بہت برا ہے۔ اس میں غیرت جاتا رہتا ہے۔ ہم نے اسی دن پہیہ والا کا نوکری کرلیا۔ اس نے یہ کام ہمیں سکھا دیا۔ اللہ والا بہت خفا ہوا بولا۔

کمینہ! نوکری کرے گا۔ دوسرے کا غلامی' ارے دو آنے میں تو پیٹ بھی نہیں بھرے گا۔ پھر دس گھروں کی ترکاری میں جو مزہ ہے وہ بڑے سے بڑی ہوٹل کے سالن میں بھی نہیں۔

فقیری میں عزت نہیں۔

عزت کا تصور کہاں سے آیا تمہارے دماغ میں۔

ہم نہیں جانتا۔ ہر بات اللہ کی طرف سے آتا ہے۔ جو پیدا کرتا ہے وہی باتیں سکھاتا ہے۔ بچپن میں بچہ لوگ ننگا پھرتے نہیں شرماتا اور جب بڑا ہو جاتا ہے' وہ کپڑا بدن سے الگ کرتے لجاتا ہے۔ اسے یہ باتیں کون سکھاتا ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔ عبدالصمد' فطرت اور وقت ہی سب کچھ سکھاتا ہے آدمی کو۔''

''عبدالصمد! کسے بولا تم۔''

اس نے تعجب سے میری طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''تمہیں' ہم نے تمہارا یہی نام رکھ دیا۔''

وہ بہت زور سے ہنسا' بولا۔

''عبدالصمد! بہت بڑے آدمی کا سا نام ہے۔ ہم بہت چھوٹا ہے قینچی دھار والا۔''

''نہیں عبدالصمد' تم بہت بڑے آدمی ہو۔

مسکرایئے

جنت میں ایک صاحب دیوار پھاند کر دوزخ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ فرشتوں نے اس سے پوچھا کہ لوگ تو جنت کی آرزو کرتے ہیں تم دوزخ میں جانے کے لیے کیوں بے چین ہو رہے ہو؟

اس شخص نے کہا کہ ابھی ابھی میری بیگم کا انتقال ہوا ہے اور لوگ اس کے حق میں جنت مقام ہونے کی دعا کر رہے ہیں۔

☆☆

ایک چالیس سالہ کنوارے کی شادی نہیں ہو پا رہی تھی اور وہ اپنے دوست کے سامنے شکایت کر رہا تھا کہ یار میں جب بھی کسی لڑکی کو پسند کر کے امی سے ملانے لے جاتا ہوں وہ اسے ناپسند کر دیتی ہیں۔ دوست نے مشورہ دیا کہ تم ایسا کرو کہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرو جو شکل وصورت، عادات واطوار اور مزاج کے اعتبار سے تمہاری امی سے ملتی جلتی ہو۔

چھ ماہ بعد ملاقات ہوئی تو دوست نے سب سے پہلے شادی کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ ''ہاں بالکل ویسی ہی لڑکی مجھے مل گئی تھی۔''

دوست نے شکوہ کیا کہ ''اچھا چپکے چپکے شادی بھی کر لی اور بلایا بھی نہیں۔''

کنوارے نے کہا ''نہیں یار جب میں وہ لڑکی لے کر گھر گیا تو والد صاحب نے کہا کہ اگر تم نے اتنی بدصورت بدمزاج اور بدسلیقہ و پھوہڑ لڑکی سے شادی کی تو وہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے!''

☆☆

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تم نے اپنے ہاتھ پاؤں نہیں توڑے۔ بلکہ ان سے بہت اچھا کام لے رہے ہو۔ تم سچ مچ بہت بڑے ہو۔ ہمارے شہر کے نواب سے بھی بڑے۔ ہمارا نواب کوئی کام نہیں کرتا۔ وہ باپ دادا کی گدی پر بیٹھ کر کسانوں اور دکانداروں سے پیسہ وصول کر کے پیٹ بھرتا ہے۔ وہ بھی ایک طرح کا فقیر ہے۔ تم اس سے بہت بڑے ہو۔"

وہ حیرت سے میرا منہ تکتا رہا اور پھر میں نے میرٹھ کی قینچیاں اس کو دیتے ہوئے کہا۔

"ان کی دھار بناؤ اور ایک تلوار بھی ہے میرے پاس اسے بھی سان پر رکھ دو۔"

"تلوار نہیں بنائے گا' قینچیاں ابھی بناتا ہے۔"

اس نے جلدی سے پہیہ کھڑا کیا' اور تسمہ ٹھیک کرنے لگا۔ بیڑی بنانے والی عورتوں نے پہلے ہی اس کی آواز سن لی تھی اور وہ دروازوں سے جھانک کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ انہیں تعجب تھا کہ آج میں نے کیوں اسے کمرے میں روک رکھا ہے۔ میں تو بیڑی بھی نہیں بناتا کپڑے بھی نہیں سیتا۔ گوشت کی دوکان بھی نہیں لگاتا۔ بہت سے چہرے دمک رہے تھے' ان پر آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چوڑیوں کے ساز بج رہے تھے۔ کتنی کشش تھی اس آواز میں' میں نے بیڑی والیوں کی بیتابی سے متاثر ہو کر اس سے کہا۔

"عبدالصمد پہلے تم ان عورتوں سے کہہ آؤ کہ گھنٹہ بھر تک یہاں مصروف رہو گے' وہ سب تمہاری منتظر ہیں۔ شاید کندھار کی قینچی چلاتے چلاتے ان کی انگلیاں دکھنے لگتی ہیں۔ ان نازک مزاج عورتوں کے پورے شاعروں کی انگلیوں سے نزاکت میں کم نہیں ہوتے۔ قلم چلاتے چلاتے شاعروں کی انگلیاں زخمی ہو جاتی ہیں قینچیاں ان کی انگلیوں کو بھی لہولہان کر دیتی ہوں گی۔"

اس نے میری باتوں کو بڑی توجہ سے سنا اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ پہلے ہی اندر وازوں کے قریب جانے کے لیے بیتاب تھا۔ شاید ان چہروں میں سے کوئی چہرہ اسے پسند ہو۔ اس پر چمکتی ہوئی آنکھیں پسند ہوں یا آنکھوں پر جھکی ہوئی پلکیں پسند ہوں۔ وہ تہمد سنبھالتا ہوا اٹھا اور کمرے سے نکل کر بڑے شاعرانہ انداز سے چیخا۔

"قینچی دھاروالا۔
چاقو دھاروالا۔
ابھی آتا ہے' بابا کی قینچیاں بنا کر ابھی آتا ہے۔"

"اور تم رہتے کہاں ہو عبدالصمد۔" میں نے اس کے واپس آتے ہی پوچھا۔

"اللہ والا کے گھر میں' مفت نہیں چار روپیہ مہینہ کرایہ دیتا ہے بال بچے بھی ساتھ ہیں۔"

"ابھی تو شادی بھی نہیں کی۔"

"کیوں۔"

"چھوٹے سے کمرے میں ہمارا ہی گزارہ نہیں ہوتا بیوی بچوں کو کہاں رکھے گا۔"

"کسی کو پسند بھی کیا۔"

اس نے غور سے میری طرف دیکھا جیسے میں نے اس کے دل کا چوڑ پکڑ لیا ہو اور جو عورت اس کے دل کی کوٹھری میں بند تھی اسے کھڑکی کھول کر باہر نکال لیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ لیا ہو ہاں ایک عورت کو پسند کر رکھا ہے ہم نے۔

"کیا نام ہے اس کا کہاں رہتی ہے۔"

"نام ہاجرہ ہے۔ پتہ نہیں بتائے گا۔"

"دیکھو عبدالصمد دل کی پوری بات بتاؤ' ہم اس سے تمہاری شادی کرانے میں پوری کوشش کریں گے۔"

اس نے پھر میری طرف دیکھا' میری باتوں میں اسے خلوص کی چمک محسوس ہوئی اور ذرا سی دیر میں اس نے مجھے اپنا بہت بڑا ہمدرد سمجھ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لیا۔ وہ میرے قریب سرک آیا اور بہت راز دارانہ انداز میں بولا۔

''ہاجرہ اسی گلی میں رہتا ہے۔ صاحب بڑا عمدہ عورت ہے اس کا گھر والا گذر چکا ہے۔ بیڑی بناتا ہے اور تیسرے دن قینچی کی دھار بنواتی ہے۔ ہم اس سے پیسہ نہیں لیتا۔''

''گھبراؤ مت عبدالصمد' ہم ہاجرہ سے تمہاری شادی ضرور کرادیں گے نا صاحب اس کا بھائی نہیں مانتا وہ بہنوئی کا پنشن وصول کرتا ہے اور بہن سے بیڑی بنواتا ہے۔''

عبدالصمد اس کے بعد بھی میرے پاس آتا رہا اور ہاجرہ سے اپنی محبت کا اظہار کرتا رہا۔ اب وہ مجھ سے بہت بے تکلف اور مانوس ہو گیا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ہاجرہ کا بھائی اس سے اپنی بہن کی شادی کر دے۔ لیکن وہ کسی اور جگہ سودا کر چکا تھا۔ کسی طرح تیار نہ ہوا۔ ایک روز عبدالصمد آیا تو میں نے اس سے کہا۔

''ہاجرہ کا بھائی کسی طرح تیار نہیں ہوتا۔''

''ہم جانتا ہے وہ پکا بدمعاش ہے۔''

''ایک کام کرو۔''

''کیا۔''

''ہاجرہ تمہیں پسند کرتی ہے۔ اسے لے کر تم یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔''

''ایسا نہیں کرے گا کبھی نہیں کرے گا۔''

اس نے انگلیوں سے دونوں کانوں کو چھو کر کہا۔ ''کسی کو بے عزت نہیں کرے گا۔ کسی کا لڑکی بھاگانا ایک دم بری بات ہے۔''

عبدالصمد اس روز بہت مایوس ہو کر گیا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس کے پورے چہرے پر سیاہی پھیل گئی تھی اور اس کے بعد وہ بھی اس گلی میں نہیں آیا۔ مجھ سے بھی نہیں ملا۔ میں روز دوپہر کو اس کا منتظر رہتا۔ اسی درمیان ہاجرہ کا بیاہ ہو گیا اور وہ ایک گاؤں میں اپنے شوہر کے پاس چلی گئی۔ ایک سال گذر گیا اور عبدالصمد کہیں دکھائی نہیں دیا ایک دن شہر میں بہت بڑا مشاعرہ تھا۔ میرے چند پسندیدہ شاعر بھی آ رہے تھے۔ میں نے پہلے درجہ کا ٹکٹ خریدا اور پہلی قطار میں اسٹیج کے قریب ہی جگہ حاصل کی۔ شروع میں بالکل نئے اور نومشق شاعر آتے رہے۔ پھر جو ایک مرتبہ میری نظر اسٹیج کی طرف گئی تو دیکھا عبدالصمد ایک ہاتھمیں مائک پکڑے کھڑا ہے۔ وہی الجھے ہوئے گھونگھریالے بال۔ بھورے بھورے گال چمکتی اور مسکراتی آنکھیں مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے نہایت نغمہ ریز اور دردیلی آواز میں پانچ شعر سنائے۔ ان کی زبان بہت اکھڑی اکھڑی اور غیر مانوس تھی مگر جذبات اور خیالات میں بڑی تاثیر تھی۔ الفاظ دل میں اترتے جا رہے تھے۔ سارا مجمع مسحور ہو کر رہ گیا اور جب میں ذرا حواس میں آیا تو سکریٹری کہہ رہا تھا۔

''یہ تھے عبدالصمد محروم شہر کا مشہور دستکار' لوگ انہیں قینچی دھار والا کے نام سے اچھی طرح جانتے ہیں۔''

میں دیر تک عبدالصمد کے متعلق سوچتا رہا اور اس کے بعد کوئی شعر میرے ذہن تک نہیں پہنچ سکا۔

ہاجرہ سے اس کی شادی نہیں ہو سکی۔ شاید اسی ناکامی نے اسے شاعر بنا دیا۔ جنس گھٹ کر اکثر فنون لطیفہ کی شکل میں ظاہر ہوا کرتی ہے میں نے تحقیقات سے جلدی ہی معلوم کر لیا کہ اب وہ گلیوں اور کوچوں میں نہیں گھومتا۔ اس کے ایک دوکان کرایہ پر لے رکھی ہے۔ وہیں بیٹھ کر قینچیوں کی دھار بناتا ہے۔ دوکان پر جو بورڈ لکھا ہے اس پر اس کا وہی نعرہ جلی حروف میں مرقوم ہے۔

قینچی دھار والا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اردو ادب کا سنگھار......ادب کی خوشبو

اور اسی وقت گیٹ پر ایک ہنگامہ سا ہوا۔ لوگوں کی توجہ ادھر بٹ گئی۔ پتہ چلا کہ ایک آدمی ہے اسے آنے سے روکا جارہا ہے اور وہ آدمی آنے پر بضد ہے۔ آخر مینا کے مالک نے اپنے نوکروں کو ڈانٹا کہ اسے آنے دو۔

مرزا حیدر عباس

اردو کے ایک نام ور ادیب کے قلم سے ایک فکر انگیز تحریر

چھٹی اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے۔ اور چھٹی کے دن کام کرنا گویا کفران نعمت ہے۔ چنانچہ میں ہر چھٹی کے دن کاہلی کا ایک شاندار ریکارڈ قائم کرتا ہوں۔ اس دن بھی جمعہ تھا یعنی چھٹی تھی میں نو بجے سو کر اٹھا' اور بستر میں سے ہی ہانک لگائی۔

''ارے بھئی نو بج گئے اور ہمیں ابھی تک چائے بھی نہیں ملی۔''

بیوی نے سائیڈ ٹیبل پر چائے کی پیالی رکھی تو منے نے اخبار لاکر دے دیا۔ آج کل کے اخبارات بھی اللہ کے فضل سے پورے رسالے ہوتے ہیں۔ ایک اخبار کو پورا پڑھنے کے لیے کئی آدمی درکار ہوتے ہیں۔ اس لیے میں نے اپنی پسند کا صفحہ نکالا۔ اور بڑے خشوع و خضوع سے پڑھنے لگا۔ یہ فلموں کے اشتہارات کا صفحہ تھا کہتے ہیں کہ عورتوں کا کھانا پکاتے پکاتے ہی کھانے کی بو باس سے پیٹ بھر جاتا ہے۔ میں فلموں کے سلسلے میں یہی کرتا ہوں سینما کے اشتہارات سے بھرے ہوئے دونوں صفحے تین تین بار پڑھنے کے بعد فلم دیکھنے کی خواہش ختم ہو جاتی ہے' اس سے دو فائدے ہوتے ہیں ایک تو تین گھنٹے ضائع ہونے سے بچ جاتے ہیں اور دوسرے پیسوں کی بچت بھی ہو جاتی ہے۔ فلموں کے اشتہارات کے بعد میری دوسری دلچسپی ضرورت والے اشتہارات ہیں۔ یا مخصوص ضرورت رشتہ والے۔ اسی صفحے پر ایک مینا کی تصویر تھی۔ اوپر لکھا تھا پانچ لاکھ روپے۔

پانچ لاکھ روپے اچھی خاصی رقم ہے اور بغیر محنت کے مل جائے تو دنیا کی بہترین چیز ہے' چنانچہ میں نے اس اشتہار کو بھی دلجمعی سے پڑھا' پورا پڑھنے کے بعد قدرے افسوس ہوا اس لیے کہ اشتہار دینے والا پانچ لاکھ روپے دینا نہیں چاہتا بلکہ لینا چاہتا تھا اور وہ بھی اس کالی کلوٹی مینا کے۔

اشتہار میں درج تھا کہ یہ مینا خوب بولتی ہے اور دل بہلاتی ہے۔ اس کا نیلام ہونا ہے۔ نیلام سے پہلے ہی اس مینا کے پانچ لاکھ لگ چکے ہیں۔ مطلب یہ کہ بولی پانچ لاکھ سے شروع ہوگی۔ نیلام کا وقت شام کا دیا گیا تھا پتہ جو درج تھا وہ بھی زیادہ دور کا نہ تھا۔ میں نے اسی وقت

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

فیصلہ کرلیا کہ آج یہ تماشا دیکھا جائے گا۔ چنانچہ بیوی سے کہہ دیا کہ آج شام میں اس نیلام میں جاؤں گا۔ ذرا میرا سوٹ استری کر دینا۔

وہ کوٹھی جہاں یہ نیلام ہونا تھا کوئی ایک ہزار گز کی تھی۔ پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ اور بزبان حال کہہ رہا تھا کہ صدائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے۔ میں پھاٹک میں داخل ہوا تو ایک طرف شامیانہ نظر آیا جسے باقاعدہ جھنڈیوں سے اس طرح سجایا گیا تھا جیسے وہاں کوئی شادی ہونے والی ہو۔ شامیانے کے نیچے ایک طرف اسٹیج تھا۔ جس پر ایک بڑی میز رکھی تھی۔ میز پر سنہری رنگ کا پنجرہ تھا جس میں وہ مینا بند تھی۔ اسٹیج کے سامنے کرسیاں رکھی تھیں جن کی تعداد کم از کم پچاس تھی۔ میں چونکہ دیئے ہوئے وقت پر پہنچا تھا اس لیے قبل از وقت آنے والوں میں شمار ہوا۔ اور ایک طرف اکیلا بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک نوکر آیا۔ اس نے بغور میرا جائزہ لیا اور جب اسے یہ اطمینان ہوگیا کہ میرا سوٹ نیا ہے اور خاصا قیمتی ہے تو اس نے پوچھا۔

''آپ اس نیلام میں حصہ لینے آئے ہیں۔'' ''اگرچہ میرے پاس پانچ لاکھ کبھی نہ ہوئے اور قوی امید بلکہ یقین واثق ہے کہ کبھی نہ ہوں گے لیکن جب بات عزت کی آپڑتی ہے تو پیسہ کون دیکھتا ہے۔ میں نے گردن اکڑا کر کہا۔

''ہاں۔''

وہ نوکر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں شربت کا گلاس لے کر واپس آیا۔ شربت پلا کر جاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''آپ چاہیں تو اس سے ایک دو باتیں کرلیں۔ بڑی ذہین مینا ہے' غضب کے جوابات دیتی ہے۔ مگر زیادہ تھکا مت دیجئے کیونکہ جتنے لوگ آئیں گے وہ سب ہی اس سے ایک ایک دو دو باتیں کریں گے۔'' میں نے ایک فرمائشی مسکراہٹ چہرے پر بکھیری اور کہا۔ ''مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔''

آدھے گھنٹے بعد پہلی گاڑی کوٹھی میں داخل ہوئی پھر پندرہ منٹ میں تین آئیں۔ اور اس کے بعد آدھے گھنٹے میں ان کا احاطہ گاڑیوں سے بھر چکا تھا میں نے کوٹھی سے باہر نکل کر جائزہ لیا تو پتا چلا کہ ان کی کوٹھی کے سامنے کی سڑک اب بالکل بلاک ہو چکی ہے۔ لمبی لمبی اور چمکتی دمکتی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گاڑیوں سے لوگ مینا کے مالک کی توقع سے زیادہ آ گئے تھے۔ جب نیلام کے شروع کیے جانے کا اعلان ہوا تو کافی لوگ ایسے تھے کہ چہرے پر امارت کے نقوش کے باوجود انہیں کرسی نہیں مل سکی تھی۔

اور اسی وقت گیٹ پر ایک ہنگامہ سا ہوا۔ لوگوں کی توجہ ادھر بٹ گئی۔ پتہ چلا کہ ایک آدمی ہے اسے آنے سے روکا جا رہا ہے اور وہ آدمی آنے پر بضد ہے۔ آخر مینا کے مالک نے اپنے نوکروں کو ڈانٹا کہ اسے آنے دو۔

وہ شخص سوٹ تو پہنے تھے لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ لنڈا بازار سے خریدا گیا ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور صورت سے ایسا لگ رہا تھا کہ اگر پاگل نہیں ہے تو کم از کم بہت زبردست قسم کا بے وقوف ضرور ہے۔ وہ سیدھا مینا کے مالک کے پاس گیا۔ مینا کے مالک نے پوچھا۔ ''آپ مینا دیکھنے آئے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''جناب میں الو دیکھنے آیا ہوں۔''

مالک نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''یہاں مینا کا نیلام ہو رہا ہے الو کا نہیں' آپ مینا دیکھئے۔ وہ رہی۔''

اس شخص نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ ''میں تو الو دیکھنے آیا ہوں۔ صرف الو دیکھوں گا۔'' اب مالک کو غصہ آ گیا۔ وہ گرج کر بولا۔ ''تمہارا دماغ خراب ہے۔ مینا کا نیلام ہو رہا ہے اور تم اصرار کر رہے ہو کہ الو دیکھو گے۔ یہاں کوئی الو ولو نہیں ہے۔''

مگر وہ شخص بڑے سکون سے بولا۔ ''مجھے یقین ہے۔''

مالک نے چیخ کر کہا۔ ''پاگل ہے نکلوا اسے۔''

نوکر بڑھے مگر اس شخص نے مالک کا دامن پکڑ کر کہا۔ ''آپ میری بات نہیں سمجھ رہے۔ جو شخص ایک مینا کو پانچ لاکھ روپے میں خریدے گا وہ الو نہیں ہوگا تو اور کون ہوگا۔ میں اس الو کو دیکھنے آیا ہوں۔ مینا دیکھنے نہیں آیا۔ آپ نیلام شروع کریں جی ہاں۔''

مسکرائیے

* ایک گھر داماد اور زن مرید شوہر نے نفسیاتی معالج کو بتایا کہ وہ ہر رات ایک ہی خواب دیکھتا ہے کہ وہ بارہ خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ ایک ویران جزیرے میں رہ رہا ہے اور اس خواب نے اس کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے۔ نفسیاتی معالج نے کہا ''میری سمجھ میں نہیں آتا ایسا پر لطف خواب دیکھنے سے آپ کی زندگی کیسے اجیرن ہو سکتی ہے؟''

زن مرید شوہر بولا ''پر لطف کیا خاک۔! میں پوچھتا ہوں آپ نے کبھی بارہ لڑکیوں کے لیے کھانے پکانے کا عذاب بھگتا ہے؟''

☆☆

* ایک بار ایک ہوائی جہاز کی کمپنی نے دو ہفتے کے لیے ایک پرکشش پیشکش کی کہ اس کے ہوائی جہازوں میں اگر شوہر بیوی ایک ساتھ سفر کریں تو انہیں آدھے کرائے کی چھوٹ دی جائے گی۔

دو ہفتے کی تمام پروازیں ہو چکیں تو کمپنی کے پبلٹی سیکشن نے مسافروں کی بیویوں کو خط لکھے کہ کمپنی کے جہازوں میں سفر کرنا انہیں کیسا لگا۔

سب بیویوں کی طرف سے ایک ہی جواب آیا۔

''ہم نے کب سفر کیا؟''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہمارے معاشرے کی عکاس......ایک دلگداز...... سچی کہانی

وہ بہار کے مہینے کا تیرھواں دن تھا اور اس دن ساحرہ بہت خوش تھی کیوں کہ ملکہ بہار کا تاج قسمت نے اس بار اس کے سر پر رکھ دیا تھا۔ دن بھر وہ میلے میں مست ہرنی کی طرح گھومتی رہی اور دن ڈھلے جوہی اور چنبیلی کے پھولوں سے سنگھار کرنے بیٹھ گئی۔ آج کی رات اسے اپنے محبوب کے لیے ایک یادگار رقص کرنا تھا۔

عشق کا دیوتا حسن کی دیوی پر فریفتہ ہو گیا تھا نتیجتاً اس پراسرار کہانی نے جنم لیا۔

تیری پائل کی جھنکار

ہما شاہین

اس شمارے کے لیے ایک حساس وجذباتی ودل گداز سچی کہانی

میرے ڈرائنگ روم میں دیوار پر لگے لکڑی کے اسٹینڈ پر پیتل کا ایک نہایت ہی خوب صورت مجسمہ رکھا ہوا ہے۔ رقص کرتی ہوئی عورت کے ہاتھ میں تیر کمان والا یہ مجسمہ اپنے اندر ایک بہت ہی عجیب سحر اور کشش رکھتا ہے' شاید یہی وجہ ہے کہ میرے ڈرائنگ روم میں آنے والا ہر نیا مہمان اسے بہت دیر تک بغور دیکھنے کے بعد یہ سوال ضرور کرتا ہے کہ یہ مجسمہ میرے پاس کہاں سے آیا یا میں نے اسے کہاں سے لیا۔ میں نے یہ مجسمہ اب سے کوئی دس' بارہ برس پہلے وادی چترال کی سیر کے دوران ایک نہایت ہی بوڑھے چترالی سردار سے حاصل کیا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تھا۔ مذکورہ سردار نے یہ مجسمہ مجھے تحفے میں دیتے ہوئے اس کے حوالے سے ایک عجیب وغریب پراسرار کہانی بھی سنائی تھی۔ اس کہانی پر میں نے نہ تو اس وقت یقین کیا تھا اور نہ ہی اب یقین رکھتا ہوں۔ اس کے باوجود آپ کو یہ کہانی اس خیال سے سنا رہا ہوں کہ سچی یا جھوٹی کے قطع نظر کہانی اپنے اندر مکمل دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ کرافٹ کے حوالے سے بھی بھرپور اور مکمل ہے لیکن ایسا ہونے میں کمال میرا نہیں بلکہ اس بوڑھے چترالی سردار کا ہے جو اس کہانی پر اسی طرح یقین رکھتا ہے جس طرح میں اور آپ آسمان پر چمکتے چاند کے حوالے سے چاندنی پر رکھتے ہیں۔

چترال بڑی ہی خوب صورت دادی تھی۔ تین طرف برف پوش پہاڑوں سے گھری ہوئی خوش نما جھیل اور چوتھی طرف دور تک پھیلا ہوا سبزہ زار جس کا آخری سرا کردنا کی پہاڑی سے جا کر مل گیا تھا۔ اس پہاڑی پر صدیوں پرانے ایک مندر کے آثار تھے، جس کا کلس شکستہ ہو چکا تھا اور محرابوں کی سنہری پچی کاری کا رنگ اب سیاہ پڑ چکا تھا۔ مندر کے صحن میں، پتھر کا دل چیر کر سال کے ایک لمبے سے درخت نے اپنی جڑیں جمالی تھیں۔ جھیل کے کنارے کاشانہ نامی بستی میں قبیلہ جیران آباد تھا۔ تیر اندازی اس قبیلے کا آبائی پیشہ تھی۔ اس فن میں عورتیں بھی مردوں سے پیچھے نہ تھیں۔ قبیلے کی نوجوان لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ ہی تیر اندازی سیکھتی تھیں۔ بستی کے لوگ ہر سال بہار کے مہینے کی چودھویں رات کو جشن بہار مناتے تھے۔ اس دن بستی کے قریب ہی ایک میلہ لگتا اور سورج ڈوبنے کے بعد جشن بہار شروع ہو جاتا، جو رات بھر جاری رہتا۔ جشن میں بستی کی تمام دوشیزائیں ایک خوب صورت رقص کرتیں، جس کا نام رقص بہار تھا۔ ناچ کی رہ نمائی کے لیے ہر مرتبہ قرعہ اندازی کے ذریعہ ایک حسینہ کا انتخاب کیا جاتا اور اسے ملکہ بہار کا خطاب دیا جاتا۔ جشن کے موقع پر بستی کی تمام لڑکیاں پھولوں کا سنگھار کرتیں۔ نوجوان انگوروں کا رس نکالتے۔ پھر جب چاند مغرب سے ابھارتا تو بستی کے سارے لوگ سامنے والے کھلے میدان میں جمع ہو جاتے اور رقص بہار شروع ہو جاتا۔

شمعون ’قبیلہ جیران‘ کے سردار کا اکلوتا لڑکا تھا۔ بستی میں اس کے متعلق یہ انوکھی روایت مشہور تھی کہ اگر غصے میں اس کی نظر بد کسی پر پڑ جائے تو وہ مر جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اپنا حق سمجھ کر وہ بستی کی نوجوان لڑکیوں کو چھیڑا کرتا اور قبیلے کے لوگ اس روایت کے منحوس سائے سے بچنے کی خاطر اس کی زیادتیاں خاموشی سے سہہ لیا کرتے اور پھر ایک دن کاشانے کا ہیرا اس کی نظروں میں آ گیا۔ یہ ساحرہ تھی، جو بستی کے ایک غریب بت تراش سے محبت کرتی تھی۔ اس فن کار کے تراشے ہوئے مجسمے زبان حال سے کہانیاں کہا کرتے تھے۔ قوموں کی تاریخوں کی کہانیاں، ظالموں کے ظلم وستم کے قصے حسن وعشق کی رنگین داستانیں۔ ساحرہ کی قسمت کہ وہ زندگی کے متوازی خطوط سے ٹکرا گئی تھی ورنہ خود اس کی جھولی میں غربت، فاقہ کشی اور محبت کرنے والے دل کے سوا کچھ نہ تھا۔ ساحرہ کا حسن بجلی کی طرح گرا اور آندھی کی آگ کی مانند سنگتراش کے ہوش وحواس پر چھا گیا۔ وہ محبت کے بہاؤ میں تنکے کی طرح بہا جا رہا تھا۔ بہت دن پہلے ایک مرتبہ ایک ویرانے میں وہ پتھر کو بت میں ڈھال رہا تھا کہ نہ جانے کدھر سے ساحرہ آ گئی۔

”تم تنہائیوں سے اتنا پیار کیوں کرتے ہو سنگ تراش!“ ساحرہ کی آواز کے ترنم سے جل ترنگ سا بج اٹھا۔

”اس لیے کہ میرے تراشے ہوئے مجسمے سچ بولتے ہیں اور آبادیاں سچ سے نفرت کرتی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہیں۔'' سنگ تراش نے جواب دیا۔
''لیکن اگر کوئی سچ سے نفرت نہ کرے تو!''
لہجے میں سپردگی کا احساس تھا۔ کام کرنے والے ہاتھ ٹھہر گئے۔ فن کار نے نگاہ اوپر اٹھائی حسن کی آنچ بہت تیز تھی پتھر دل پسیجنے لگا۔
''تو وہ میری ان تنہائیوں کا شریک بن سکتا ہے۔'' فضا پر ایک بوجھل خاموشی چھا گئی۔ دو دھڑکتے ہوئے دلوں کی آواز سنانے کا سینہ چیرنے کی کوشش کر رہی تھی اور دور کہیں آبشار کے گرنے کا مدھم راگ سنائی دے رہا تھا۔
''لیکن کون ہے وہ۔'' سنگ تراش کے ہونٹوں پر دل کی تمنا مسکرانے لگی۔
''ایک بت!'' ساحرہ کے ہونٹ بھی کھل اٹھے۔ ''تم کیسے بت ساز ہو جو بتوں کی خاموش زبان کو نہیں سمجھ سکتے!'' وہ کھلکھلا کر ہنسی اور ہنس کر بھاگ گئی۔ فضا میں گھنگروؤں کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔ پتھر دل فن کار کا دل اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔
شمعون کی نگاہ ساحرہ پر پڑی تو وہ اس پر مرمٹا اور بت ساز اسے راہ کا کانٹا نظر آیا۔ اس نے ساحرہ کو اپنے بس میں کرنے کے لیے لاکھ جتن کیے لیکن اس کا ہر وار خالی گیا۔ ساحرہ اور بت ساز کی محبت پروان چڑھتی رہی۔ محبت کی بازی میں ایک ایک کر کے تمام مہرے پٹ جانے کے بعد اس ہارے ہوئے جواری کو اب اس بازی میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی اور ایک جھلائے ہوئے کھلاڑی کی مانند بساط کو الٹ دینے کے لیے وہ کسی مناسب موقعے کا منتظر تھا۔
ساحر کی طرف سے شمعون کی بدلتی ہوئی نگاہوں کو سنگ تراش اس کے غضب ناک تیوروں سے بھانپ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ ساحرہ کو پا لینے کی تمنا کرنا اسے کھو دینے کے برابر ہے۔ اس کے سامنے ترازو کے دو پلڑے تھے جن میں سے ایک میں اس کی اپنی آرزوئیں تھیں

شادی نامہ

. دوسری نگاہ میں ہی وہ اس پر عاشق ہوگیا کیونکہ پہلی نظر میں اسے معلوم نہ ہوسکا تھا کہ وہ اتنی امیر ہے۔
. شاعروں کو شادی ضرور کرنی چاہیئے۔ اگر بیوی اچھی ملی تو زندگی اچھی ہوجائے گی۔ اور اگر بیوی اچھی نہ ملی تو شاعری اچھی ہوجائے گی!
. شادی ایک ایسا باب ہے جس میں ہیرو پہلے ہی باب میں ختم ہوجاتا ہے۔
. کنوارہ شادی شدہ مرد پر ہنستا ہے، شادی شدہ کنوارے پر ہنستا ہے اور عورت دونوں پر ہنستی ہے۔
. پہلی مرتبہ شادی بیوقوفی ہوتی ہے، دوسری مرتبہ غلطی اور تیسری مرتبہ پاگل پن۔

اور دوسرے میں ساحرہ کی زندگی اور وہ اپنے وجود کو ان میں سے ایک کا ساتھی بنانے پر مجبور تھا۔ آخرکار طویل ذہنی کشمکش کے بعد محبوب کی زندگی محبوب کو پانے کی تمنا پر غالب آگئی اور ترازو کا ایک پلڑا جھکتا چلا گیا۔ اس نے عہد کیا کہ وہ آئندہ جشن بہار کے دوسرے دن اپنی تمام آرزوؤں کے سینے پر پتھر کی سل رکھ کر کاشانے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا۔
جشن بہار سے دو دن پہلے ایک چاندنی رات میں ساحرہ نے سنگ تراش سے ایک عجیب سی فرمائش کی۔
''سنگ تراش۔'' وہ ایک ادا سے بولی۔
''تم حقیقتوں کے مجسمے بنایا کرتے ہو۔ میں بھی تو ایک حقیقت ہوں میرا بھی ایک مجسمہ بنا دو نا۔''
''تمہارا مجسمہ تو یہاں ہے۔'' اس نے ساحرہ کا خوب صورت ہاتھ اٹھا کر اپنے دل پر رکھ لیا اور چند لمحوں کے لیے وہ ہر غم کو بھلا بیٹھا۔
''نہیں۔'' حسن شرما گیا۔ ''مذاق نہیں۔ سچ مچ میرا ایک مجسمہ بنا دو۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''اچھا بنا دوں گا۔'' وہ اس کے گالوں پر تھپکی دیتا ہوا بولا۔

''لیکن کب۔؟''

''جشن بہار کے بعد۔'' مسکراہٹ کی جگہ اداسی نے لے لی۔

''ارے ہاں' میں تو بھول ہی گئی تھی دو دن بعد جشن بہار ہے۔ میں تمہارے لیے ایک بڑا ہی خوب صورت رقص کروں گی۔ دیکھنے آؤ گے نا۔''

''تم کہتی ہو تو ضرور آؤں گا۔'' لہجے میں اداسی ٹپکنے لگی۔ ساحرہ نے اپنی خمار آلود پلکیں اٹھا کر اس کے یاس آلود چہرے کی طرف دیکھا۔

''ان دنوں تم بہت پریشان اور کھوئے کھوئے سے رہتے ہو۔'' وہ بے چین ہو اٹھی۔ ''مجھے نہیں بتلاؤ گے کیا بات ہے۔''

''میں چاہتا ہوں تم مجھ سے پیار کرنا چھوڑ دو۔ اس بات کو دل سے بھلا دو کہ ان تنہائیوں کو گواہ بنا کر ہم نے کچھ عہد و پیماں کیے تھے۔'' وہ بہت نڈھال لہجے میں بولا۔

''پیار چھوڑنے کے لیے نہیں کیا جاتا سنگ تراش۔'' لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ''لیکن یہ خیال تمہارے دل میں کیوں کر آیا۔''

''تم مجھ سے پیار کرتی ہو اور شمعون تم کو چاہتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں۔''

''وہ تم کو مار نہ ڈالے۔'' طنز کی تیزی سے جملہ کٹ گیا۔

''نہیں۔ پروانہ تو پیدا ہی اس لیے ہوتا ہے کہ وہ شمع پر جل مرے۔ مجھے تو خود شمع کی فکر ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی نظر بد۔''

''مجھے نہ کھا جائے!'' ساحرہ کا قہقہہ ویرانے میں دور تک گونجتا چلا گیا اور سنگ تراش نے گھبرا کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''تم پگلے ہو سنگ تراش۔'' وہ اپنے منہ پر سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔ ''ہماری محبت کے تیز دھارے کے آگے شمعون کا وجود ایک تنکے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ تم اطمینان رکھو وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' لیکن حسن کا یقین آندھیوں کا چراغ ثابت ہوا۔ سنگ تراش کے اندیشے رنگ لا کر رہے اور ایک دن شمعون کی زہریلی نظر ساحرہ کو کھا ہی گئی۔

وہ بہار کے مہینے کا تیرھواں دن تھا اور اس دن ساحرہ بہت خوش تھی کیوں کہ ملکہ بہار کا تاج قسمت نے اس بار اس کے سر پر رکھ دیا تھا۔ دن بھر وہ میلے میں مست ہرنی کی طرح گھومتی رہی اور دن ڈھلے جوہی اور چنبیلی کے پھولوں سے سنگھار کرنے بیٹھ گئی۔ آج کی رات اسے اپنے محبوب کے لیے ایک یادگار رقص کرنا تھا۔

سب سے اونچے چنار کی چوٹی پر چاند کے آتے ہی نقارے کی صدا نے جشن بہار شروع ہونے کا اعلان کر دیا۔ کاشانے کی آبادی جوق در جوق میدان میں آنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے رقص کے لیے بنے ہوئے دائرے کے چاروں طرف انسانوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ نوجوانوں کی نگاہیں دائرے کے مرکز پر لگی ہوئی تھیں' جہاں پھولوں میں لپٹی ہوئی ملکہ بہار تیر کمان ہاتھ میں لیے' کاشانے کے اچھوتے حسن کے ہمراہ ناچ کی رہنمائی کے لیے تیار تھی۔ سردار نے اپنی مشعل کو حرکت دی اور رقص بہار شروع ہو گیا۔ ساری وادی پھولوں کی خوشبو سے مہک اٹھی۔ حسن دائرے کے اندر پارے کی طرح گردش کر رہا تھا۔ پائلوں کی جھنکار اور ساحرہ کے ہونٹوں پر مچلنے والے گیت نے ہر ایک کو مدہوش بنا رکھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سازوں کی مدھم لے بہت تیز ہو گئی اور پائلوں کی جھنکار کے جادو نے پوری وادی کو اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر عین اس وقت جب کہ رقص بہار اپنے عروج پر پہنچا' شمعون کی نظر بد کا وار اپنا کام کر گیا۔ رقص میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ایک انگڑائی کے دوران ساحرہ کا گداز جسم تیورا کر گرا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔ ایک روایت ایک حقیقت میں بدل چکی تھی۔ سازوں کے سر یکبارگی چیخ کر خاموش ہو گئے۔ ناچ ادھورا رہ گیا۔ لوگ موتی کی ٹوٹی ہوئی لڑیوں کی طرح ادھر ادھر بکھرنے لگے۔ آنسوؤں کے بجائے شمعون کی آنکھوں میں خوشی کی فاتحانہ چمک دیکھ کر ان کے دلوں کا شبہ اب یقین سے بدل گیا تھا۔ سنگ تراش نہ ہنس رہا تھا' نہ رو رہا تھا۔ شدت غم سے اس کا جسم' اس کے آنسو اور اس کے لب سب کے سب پتھر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ کھو گیا تھا' بستی سے دنیا سے اور شاید اپنے آپ سے بھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے قدم گردنا کی پہاڑی کی طرف اٹھ رہے تھے' مندر کا صحن پار کرتے ہوئے اسے ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔

دوسرے دن اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ ایک قدم آدم مجسمہ تراش رہے تھے۔

''میں بھی تو ایک حقیقت ہوں۔ میرا بھی ایک مجسمہ بنا دو نا!'' اس کے کانوں میں رہ رہ کر ساحرہ کا یہ جملہ گونج رہا تھا اور وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔

''کاش تیرے بدلے میں مر جاتا میری زندگی۔'' وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ ''یا تو نے میرا کہا مان کر مجھے چھوڑ دیا ہوتا۔'' ''پیار چھوڑنے کے لیے نہیں کیا جاتا سنگ تراش۔'' ہواؤں کی سنسناہٹ نے سرگوشی کی اور بے تاب ہو کر اس نے اپنا سر پتھر پر دے مارا۔

آخر کار اکیس دن کی سخت محنت کے بعد وہ ساحرہ کے جسم کو پتھر کا روپ دے کر موت کے خوف ناک جبڑوں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ پتھریلے لباس میں اس کے سامنے رقص بہار کی ملکہ مسکرا رہی تھی۔ وہی شاداب جسم' ادھ کھلی خمار آلود آنکھیں' گلاب کی پنکھڑیوں جیسے گاتے ہوئے ہونٹ' رقصاں قدم' انگڑائی کے دوران اٹھے ہوئے گداز بازوؤں میں کھنچی ہوئی کمان اور نشانے کی طرف اڑنے کے لیے بے تاب تیر۔ اس نے پتھر کے اس بت کو اٹھا کر مندر کے صحن کی سیڑھیوں پر رکھ دیا تھا' اور اب وہ گھنٹوں پیاسی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھ کر ساحرہ کے بت کو گھورا کرتا تھا۔ ہر مہینے جب چاند جوان ہوتا رقص بہار کا وہی نغمہ اس کے لبوں پر آجاتا جو کبھی ساحرہ کے لبوں پر مچلا تھا۔ گنگناتے گنگناتے وہ بے خود ہو جاتا اور گیت کی لے تیز ہو جاتی پھر جب گیت اپنے عروج پر پہنچتا تو ایک عجیب بات ہوتی۔ ایک ایسی بات جو کبھی دیکھی تھی نہ سنی تھی۔ پتھر کے مجسمے کے پیر خود بخود حرکت میں آتے اور پتھریلی پائلوں کی جھنکار گیت کی جادو بھری آواز سے ہم آہنگ ہو کر وادی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکرانے لگتی۔ عین اسی وقت سنگ تراش کی آنکھوں میں خواب کے بادل تیر جاتے' خواب میں وہ دیکھتا کہ رقص بہار جاری ہے۔ چھم چھم ناچتی ہوئی ساحرہ اس کے قریب آکر پھولوں میں لپٹے ہوئے اپنے دونوں بازو اس کے گلے میں حمائل کر دیتی ہے۔ یکا یک شمعون کی سفاک نظروں سے دو پھلتے ہوئے فولادی تیر نکل کر اس کے جسم میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ وہ تیورا کر زمین پر گر پڑتی ہے اور اس کے جسم سے خون کے فوارے پھوٹنے لگتے ہیں۔ سنگ تراش بے تابی سے اس پر جھک جاتا ہے اور اس کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیتا ہے۔ ملکہ بہار کے لبوں کو جنبش ہوتی ہے اور وہ اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب لے آتا ہے۔

''میری پائلیں پیاسی ہیں سنگ تراش۔ رقص ابھی ادھورا ہے!'' وہ ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہتی ہے۔ ''لیکن تم گھبرانا مت۔ ایک دن یہ نامکمل ناچ ضرور پورا ہوگا۔ پائلوں کی پیاس بجھے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گی اور میں...... اور میں...... آہ۔'' وہ تکلیف سے کراہ کر دم توڑ دیتی ہے...... ایک جھٹکے کے ساتھ سنگ تراش خواب سے بیدار ہوتا اور بے تاب ہوکر اپنا سر مجسمہ کے قدموں سے ٹکرانے لگتا یہاں تک کہ اس کی پیشانی خون سے تربتر ہوجاتی اور بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑتا۔

آہستہ آہستہ کاشانے کے لوگ گھنگروں کی جھنکار اور اس آواز کی بازگشت کے عادی ہوگئے اور ان کے دلوں میں چھپا ہوا یہ شبہ اب یقین میں بدل گیا کہ ساحرہ کی بھٹکتی ہوئی پیاسی روح نے کرونا کی پہاڑی کے مندر کو اپنا مسکن بنا رکھا ہے لیکن ایک شخص ایسا بھی تھا جو اس بازگشت کو سن کر زخمی سانپ کی طرح سر پٹکنے لگتا۔ یہ شمعون تھا جو ایک مضبوط دل کا مالک تھا اور یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ یہ آواز ساحرہ کی بھٹکتی ہوئی روح کی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی بے تابیاں بڑھتی گئیں اور پھر ایک دن اس کے قدم کرونا کی پہاڑی کی طرف اٹھ ہی گئے۔ مندر میں پہنچ کر اس نے مدت کے گم شدہ سنگ تراش کو ساحرہ کے قد آدم مجسمے کے سامنے دو زانو پایا اور پھر یہ دیکھ کر تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ سنگ تراش کے لبوں پر مچلتے ہوئے گیت کی لے تیز ہوتے ہی مجسمہ کے پاؤں خود بخود حرکت میں آگئے اور پتھریلی پائلوں سے ایک من موہنے والی جھنکار نکل کر ہوا میں تیرنے لگی۔ ساتھ ہی سنگ تراش کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس کے بازو ناچتے ہوئے قدموں کا ہالا بن گئے اور سر مجسمہ کے قدموں میں جھکتا چلا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ گہری نیند سو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک جھٹکے سے وہ بیدار ہوا اور اپنے سر کو بار بار پتھر پر پٹکنے لگا یہاں تک کہ اس سے خون کی دھار پھوٹ نکلی اور ایک پرانے زخم کا کھرنڈا اکھڑ کر زخم پھر تازہ کر گیا۔ وہ بے ہوش ہوکر مجسمہ کے قدموں میں گر گیا۔

پہاڑی سے واپسی پر شمعون کا دل غم و غصہ اور نفرت و حقارت کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ زندگی میں اس نے جب بھی ساحرہ کو حاصل کرنا چاہا' منہ کی کھائی۔ جب بھی اس نے سنگ تراش کو ایک معمولی سا کانٹا سمجھ کر اپنی راہ سے ہٹانا چاہا' حسن اسے بچانے کے لیے ڈھال بن گیا۔

''اب دیکھتا ہوں تجھے میرے ہاتھوں سے کون بچاتا ہے۔'' وہ چلتے چلتے بڑبڑانے لگا اور اس کی سفاک آنکھوں میں وہی چمک پیدا ہوگئی جو شکار کو سامنے پاکر بھیڑیے کی آنکھوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ گھر پہنچ کر اس نے اپنی کلہاڑی کے تیز پھل پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک قاتلانہ مسکراہٹ تھی اور وہ اپنے دل میں ایک بھیانک فیصلہ کر چکا تھا۔

اگلے مہینے کی تیرہ تاریخ کو دن ڈھلے وہ کرونا کی پہاڑی کی طرف چل پڑا۔ اس کا خون رگوں میں تیزی کے ساتھ گردش کر رہا تھا اور کاندھے پر رکھی ہوئی کلہاڑی کا تیز پھل سورج کی ترچھی شعاعوں میں رہ رہ کر چمک اٹھتا تھا۔ مندر کے قریب پہنچ کر بڑی احتیاط سے خودرو جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا وہ سال کے درخت کے تنے کے پیچھے چھپ گیا۔ یہاں سے ساحرہ کا مجسمہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سنگ تراش مجسمے کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی پشت شمعون کی طرف تھی۔

چودھویں رات کے آسمانی مسافر نے جب مندر کے شکستہ کلس کی چوٹی سے سر ابھارا تو بڑی مدھم لے میں سنگ تراش رقص بہار کے گیت کو گنگنانے لگا۔ جسے سن کر شمعون کی سانسیں یک بارگی بے ترتیب ہوگئیں اور کلہاڑی کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ چاند چڑھنے لگا' گیت کی لے ابھرنے لگی اور پھر جب نغمہ اپنے شباب پر پہنچا تو پتھر کی رقاصہ کے قدموں کو حرکت ہوئی اور اس کی پائلوں سے وہی نشیلی جھنکار نکل کر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

فضا میں منتشر ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پائلوں کے سر نغمے سے ہم آہنگ ہوگئے، گیت کی لے بہت تیز ہوگئی اور نغمہ و ساز کی ملی جلی بازگشت وادی کے ہر کونے سے سنائی دینے لگی۔ عین اسی وقت سنگ تراش کی آنکھیں بند ہونے لگیں اس کے بازو ناچتے ہوئے قدموں کا ہالا بن گئے اور اس کا سر مجسمے کے قدموں میں جھکتا چلا گیا......

دور...... بہت دور خوابوں کی وادی میں کہیں رقص بہار شروع ہو چکا تھا اس کی ساحرہ پھولوں کا لباس پہنے ناچ رہی تھی۔ شمعون آہستہ سے آڑ سے نکلا اس کی آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اڑ رہی تھیں اور کلہاڑی کے دستے پر گرفت کی سختی سے ہاتھوں کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا وہ سنگ تراش کے قریب پہنچ گیا۔ غافل سنگ تراش کے اداس ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ پلکوں پر آنسوؤں کے چند قطرے تھم گئے تھے اور پیشانی کا کھرنڈ پک کر جگہ جگہ سے چیخ چکا تھا۔ شکار کی گردن کو اپنے سے اتنے قریب پا کر کلہاڑی کی پیاس ایک دم تیز ہو گئی۔ شمعون کا دل ایک بار بڑی زور سے دھڑکا۔ بجلی کی سی سرعت سے اس کے قوی بازو سر سے بلند ہوئے اور...... یکایک شائیں کی آواز کے ساتھ ایک دل دوز چیخ سناٹے کا سینہ چیر کر پہاڑوں کے ساتھ ٹکراتی چلی گئی۔ سنگ تراشوں نے چونک کر نگاہ اوپر اٹھائی اور اس کی آنکھوں نے ایک حیرت انگیز ماجرا دیکھا۔ مجسمے کی کمان خالی تھی اور اس سے نکلا ہوا پتھر کا تیر قریب ہی سیڑھیوں پر پڑے ہوئے شمعون کے سینے میں آدھے سے زیادہ اتر چکا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں کلہاڑی کا دستہ تھا اور بایاں ہاتھ گرم اور سرخ خون کی اس موٹی سی دھار کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا جو بہہ بہہ کر مجسمے کے قدموں میں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک تڑپنے کے بعد اس کا جسم ٹھنڈا ہوگیا۔

آج نا تمام رقص بہار پورا ہو چکا تھا۔ بوالہوس کے خون سے پیاسی پائلوں کی پیاس بجھ چکی تھی۔ اس دن کے بعد سے سنگ تراش پھر کبھی دکھائی نہیں دیا اور ادھورے گیت کی گونج اور پائلوں کی جھنکار کا شانے میں پھر کبھی سنائی نہیں دی۔

......

*انتخابی اشتہار

☆ [illegible]
[illegible] پی)
☆صدر: [illegible]
فروش عرف لوٹا خان
☆انتخابی دفتر: کھاؤ پیو ہاؤس
☆فون نمبر: ۴۲۰۹۲۱۱

منشور:

☆ملک سے امن و امان کا خاتمہ
☆تمام قومی دولت پارٹی کے ورکروں میں بانٹنے کا پکا وعدہ
☆نہایت آسان شرائط پر ڈش انٹینا اسکیم کا اجراء
☆عورتوں کا بغیر میک اپ کے گھر سے نکلنا بند
☆عوام پر مختلف اہم ٹیکسوں کا فوری نفاذ مثلاً پیدل چلنے پر ٹیکس، سانس لینے پر ٹیکس، بولنے پر ٹیکس
☆اہم ملکی راز بیچنے کا اصولی فیصلہ
☆لوٹوں کی پیداوار میں عالمی ریکارڈ قائم کرنے کا عزم

پارٹی ٹکٹ حاصل کرنے کی شرائط

☆پارٹی میں شمولیت کے لیے بے ضمیر ہونا لازمی ہے سابقہ لوٹوں کو ترجیح دی جائے گی۔
☆ڈاکو بھائیوں سے گذارش ہے کہ وہ اپنے ہمراہ ڈاکہ ڈالنے کی سند ضرور لائیں۔
☆ہر وہ شخص جس کے پاس بے ایمانی کے نئے نئے طریقے ہوں پارٹی ممبر بن سکتا ہے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہمارے معاشرے کی عکاس......ایک دلگداز......سچی کہانی

مردہ لوٹتا ہے

لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ جسم مر گیا سب کچھ ختم ہو گیا کیا یہ سچ ہے۔ وہ جسم کی قید سے آزاد ہو کر بھی گھر والوں کو بھولا نہیں تھا۔
ایک روح نے ایمبولنس ڈرائیور کا گھر دیکھ لیا تھا مگر کیوں۔

نازش شاہین

اس شمارے کے لیے ایک حساس و جذباتی و دل گداز سچی کہانی

میری برات ایمبولینس پر آئی تھی، سائرن بجاتی ایمبولینس پر۔ آپ کو حیرت ہو رہی ہے۔ یقین کریں ایسا ہی ہوا تھا کیونکہ میرے دولھے راجا ایمبولینس چلاتے ہیں، وہ صرف اپنے تشخص کے لیے ہی ایمبولینس پر برات لائے تھے جبکہ ان کے تمام دوست احباب منع کر رہے تھے کہ لوگ کیا کہیں گے، مگر وہ مان کر نہ دیے۔

خیر میں بیاہ کر اپنے گھر میں آ گئی جہاں ایک بڑا سا ہال نما کمرا تھا باہر چھوٹا سا صحن، ساتھ میں غسل خانہ اور باتھ روم اور صحن میں ہی چھوٹا سا کچن تھا۔ عموماً بڑے گھر سے چھوٹے سے گھر میں آ کر لڑکیاں گھبرا جاتی ہیں لیکن میں نے سجدہ شکر ادا کیا تھا کیونکہ یہ میرا اپنا گھر تھا۔ میں نے اس ہال نما کمرے کو درمیان میں سے پارٹیشن کر کے دو کر دیا تھا۔ ایک کو ڈرائنگ روم اور ایک کو بیڈ روم کی شکل دے دی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں خوب سیر سپاٹے کیے، خوب دعوتیں کھائیں۔ کبھی ساحل سمندر پر تو کبھی گارڈن میں دن گزارے۔ میرے شوہر عبداللہ کے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع تھا اس لیے دعوتوں کا سلسلہ بھی کئی مہینے تک چلا پھر زندگی معمول پر آ گئی۔

عبداللہ کی ڈیوٹی بھی دن کی ہوتی تو بھی رات کی۔ رات کو عبداللہ ایمبولینس صحن میں ہی کھڑی کر دیتے۔ میرے ساس سسر تو تھے نہیں ایک نند تھی جو سکھر میں رہتی تھی اور شاذ و نادر ہی آتی تھی۔ اس وجہ سے گھر میں ہر دم خاموشی کا ڈیرا ہوتا۔ کبھی کبھی تو مجھے عبداللہ کی نوکری سے کوفت محسوس ہوتی کیونکہ اندھیری رات میں اکیلے گھر، کب کون دیوار کود کر آ جائے یہی خوف دامن گیر رہتا۔ میں نے اپنے خوف کا ذکر عبداللہ سے بھی کیا تھا تو وہ بولے تھے۔

''یاد رکھنا زلیخا! انسانی زندگی بچانا بھی نیکی ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ نیکی کمانا چاہتا ہوں پھر اس کام میں عزت کے ساتھ پیسے بھی ہیں۔ لوگ منہ مانگی رقم دیتے ہیں۔''

ایک روز عبداللہ کی نائٹ شفٹ تھی۔ وہ ڈیوٹی پر گئے ہوئے تھے، میں گھر میں اکیلی تھی۔ اس رات پتا نہیں کیسے یکایک حالات خراب ہو گئے۔ گولیاں چلنے لگیں اور میرا دل ہولنے لگا۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ ''خدا خیر کرے، عبداللہ جلدی گھر آ جائیں۔'' شاید میری

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دعا ہی کا اثر تھا کہ وہ رات گیارہ بجے لوٹ آئے۔ انہوں نے گاڑی کھڑی کی اور ہنستے ہوئے بولے۔ ''زلیخا آج تو قسمت اچھی تھی ورنہ میری لاش اسی ایمبولینس میں آتی۔''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' میں سہم اٹھی۔

''بزدل کہیں کی۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے تم کھانا گرم کرو میں نہا کر آتا ہوں۔''

میں نے کھانا گرم کیا اور وہ کھانا کھا کر لیٹ گئے۔ دراصل عبداللہ کی ایک عادت تھی وہ روزانہ مجھے دن بھر کی روداد ضرور سناتے تھے۔ کہنے لگے۔ ''جب میں اسپتال سے سامان (نعش) لے کر نکلا تو راستے میں حالات خراب ہو گئے اور میں قبرستان جانے کی بجائے یہاں آگیا۔ اب صبح مجھے قبرستان جانا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''خیر تو ہے۔''

کہنے لگے۔ ''کیا بتاؤں پیٹ بھی بڑی بری چیز ہے ورنہ میں کوئی رستم زماں نہیں ہوں' کبھی اس ایمبولینس کے ذریعے زندگیاں بچاتا ہوں تو کبھی لاشے ڈھوتا ہوں۔ آج بھی اسپتال میں ایک نوجوان کا آپریشن ہوا تھا جسے گولی لگی تھی۔ اس کی جان بچانے کے لیے اس کی ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ کو کاٹنا پڑا۔ اسپتال کی ایمبولینس موجود نہیں تھی اس لیے انہوں نے فون کر کے مجھے بلا لیا اور کہا کہ یہ اعضاء قبرستان میں گورکن کو دے آؤ تا کہ وہ دفنا دے۔'' میں نے کہا۔

''تو کیا وہ ٹانگ اور ہاتھ گاڑی میں موجود ہے۔''

''ہاں! کیا دیکھو گی۔''

میں نے کہا۔ ''نا بابا نا مجھے تو اب خوف سے نیند نہیں آئے گی۔''

عبداللہ کہنے لگا۔ ''پگلی وہ تو بے جان ہیں' ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ اب سو جاؤ مجھے صبح جلدی جا کر اسے دفنانا ہے۔'' کہہ کر عبداللہ نے کروٹ بدل لی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ سو گئے۔

میں نے کھانے کے برتن اٹھائے اور کچن میں رکھنے گئی تو میری نظریں ایمبولینس پر پڑیں' پتا نہیں کیوں میرے اندر خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ تبھی مجھے عبداللہ کی باتیں یاد آگئیں' یہ بے جان چیزیں ہیں۔ اس جملے نے مجھے حوصلہ دیا اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں نے رخ موڑ لیا مگر اس ہلکی سی آواز نے مجھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے ایمبولینس کا دروازہ کھلا ہے۔ میں نے دروازے پر نظر ڈالی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ واقعی دروازہ ہل رہا تھا لیکن یہ وقفہ بہت تھوڑا ثابت ہوا۔ کئی منٹ تک دیکھنے کے بعد بھی جب حرکت محسوس نہ ہوئی تو میں واہمہ سمجھ کر کمرے میں واپس آ گئی اور عبداللہ کے برابر میں لیٹ گئی۔ وہ گہری نیند میں ڈوب چکے تھے تبھی مجھے پھر ایسی آواز آئی' جیسے کسی نے ایمبولینس کا دروازہ کھولا ہو مگر میں نے توجہ نہ دی یہی سوچا کہ میرے کان بج رہے ہیں اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی پھر آنکھ لگ گئی۔ صبح میری آنکھ عبداللہ کے جھنجھوڑنے پر کھلی۔

ان کا انداز اتنا جارحانہ تھا کہ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ''کیا ہوا۔''

''زلیخا غضب ہو گیا' ہمارے گھر چوری ہو گئی۔'' یہ سنتے ہی میری نظر اپنے اکلوتے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی پر پڑی' شکر خدا کا کہ وہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ گھر میں ایسا کچھ نہیں تھا جو چور لے جاتا۔ میں نے عبداللہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا چوری ہو گیا۔''

''کسی نے ایمبولینس میں رکھے اعضاء میں سے ہاتھ چرا لیا۔'' عبداللہ بولے۔

''آں! کیا کہا۔ ہاتھ چرا لیا۔ یہ بھی کوئی چرانے کی چیز ہے۔ تلاش کیجئے وہیں کہیں پڑا ہو گا۔''

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے ایمبولینس تک لے گئے پھر جھٹکے سے دروازہ کھول کر بولے۔ ''لو دیکھ لو۔''

میں نے اندر کا جائزہ لیا سیٹ کے نیچے ٹانگ تو تھی پر ہاتھ غائب تھا۔

''آپ جا کر تھانے میں رپورٹ کیجئے۔''

میں نے مشورہ دیا۔

''پگلی! اگر میں نے تھانے میں رپورٹ لکھا دی تو پولیس والے مجھ پر ہی کیس بنا دیں گے۔ خیر تم زبان بند رکھنا۔ قبرستان جا رہا ہوں۔''

میں صفائی میں لگ گئی۔ کھانا بنایا کپڑے دھوئے نماز پڑھی اور سو گئی۔ ابھی مجھے سوئے ہوئے شاید آدھا گھنٹا ہوا ہو گا کہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی کھڑکی کے پاس ہے اور کھڑکی بجا رہا ہے۔ میں نے جلدی سے بستر چھوڑ دیا اور اٹھ کر دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا میں مڑنے والی تھی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کھڑکی پر پانچ انگلیوں کے نشان تھے۔ خون سے بھرے پنجے کا واضح نشان۔ میں نے گھبرا کر آواز لگائی۔ ''کون ہے۔'' لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اٹھ کر کمرے کے دروازے کو بند کر کے کنڈی چڑھائی اور پلنگ کے پاس بنی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں سے صحن اور بیرونی دروازہ نظر آتا تھا۔ وہ دروازہ بند تھا۔ ساری دوپہر اور شام تک میں اندر سے دروازہ بند کیے بیٹھی رہی۔ رات کو جب عبداللہ نے ہارن بجایا تبھی میں نے دروازہ کھولا۔ عبداللہ کہنے لگے۔ ''خیر تو ہے آج صحن کی بھی بتی بند تھی اور تم نے دروازہ کھولنے میں بھی اتنی دیر لگا دی۔ خیر جلدی سے روٹی دو۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''عبداللہ آج میں نے آٹا نہیں گوندھا۔''

''اچھا کیا طبیعت خراب تھی۔''

''نہیں۔'' اور دوپہر والا واقعہ سنا دیا۔

''ارے نہیں تمہارا وہم ہو گا۔''

''نہیں عبداللہ وہم نہیں ہے آؤ دیکھو!''

کہہ کر میں انہیں کھڑکی کے پاس لے گئی۔ نشان ویسا ہی تھا مگر عبداللہ کہے جا رہے تھے کہ یہاں تو کچھ نہیں ہے۔ کھڑکی صاف ہے میں نے کہا۔

''غور سے دیکھو یہ کیا نشان ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

عبداللہ نے کہا۔ ”زلیخا! یہاں کچھ نہیں ہے‘ کھڑکی صاف ہے۔ دراصل تم ڈر گئی ہو چلو آج باہر سے کھانا کھا کر آتے ہیں چلو بیٹھو گاڑی میں۔“

میں نے چادر لی اور ایمبولینس میں جا کر بیٹھ گئی۔ کلفٹن کی سیر کی‘ بیسن لگی مچھلی کھائی پھر ساحل کے پاس گاڑی بند کرکے تازہ ہوا میں بیٹھ گئے۔

”مجھے پیاس لگی ہے عبداللہ۔“ میں نے کہا۔

”اچھا تم گاڑی میں بیٹھو میں بوتل لے آتا ہوں۔“ کہہ کر عبداللہ سامنے والی دکان کی طرف چل پڑے۔

ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں ہر طرف چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ فضا میں پانی کا شور گونج رہا تھا۔ بڑا رومان پرور ماحول تھا۔ میں اس ماحول سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ میری نظر بیک ویو میرر پر پڑی اور میں اچھل پڑی۔ آئینے میں ایک نوجوان کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ نوجوان بڑے آرام سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں گھبرا گئی اس طرح سے بغیر آواز پیدا کیے کوئی شریف نوجوان تو اندر آ ہی نہیں سکتا۔ یقیناً وہ کوئی چور اچکا ہوگا۔ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ”کون ہو اور کیا کر رہے ہو اندر کیسے آئے۔“

وہ کہنے لگا۔ ”ناں ناں ایک ساتھ اتنے سوال نہ کرو میں تمہارا عاشق ہوں۔ تمہارے لیے کہیں بھی آ سکتا ہوں۔ تم صرف اور صرف میری ہو۔“ اس نے گھٹیا عاشقوں کی طرح جواب دیا۔

میں اس کی دلیری پر حیران تھی۔ ”اترو نیچے اترو۔ اگر میرے شوہر نے دیکھ لیا تو وہ تمہیں جان سے مار دے گا۔“

نوجوان نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں لیکن رات میں پھر تم سے ملنے آؤں گا۔“

پھر مجھے دروازہ کھولنے کی آواز آئی دیکھا تو ہاتھ میں بوتل لیے عبداللہ کھڑے تھے۔ ”کتنی آوازیں دیں کہاں کھوئی ہوئی تھیں۔ بوتل جلدی سے پیو۔“ میں نے پیچھے دیکھا تو سیٹ خالی تھی۔

سارا راستہ الجھی رہی دماغ اس گورکھ دھندے میں الجھا ہوا تھا۔ گھر آ کر بھی چین نہ ملا۔ بڑی مشکل سے نیند آئی۔ صبح اٹھی تو عبداللہ ڈیوٹی پر جا چکے تھے۔ سارا دن کسی کام میں دل نہ لگا‘ شام میں عبداللہ جلدی آ گئے تو کچھ سکون آیا۔ کھانا کھایا‘ ٹی وی دیکھا پھر دروازے کو اچھی طرح بند کرکے ہم باتیں کرنے لگے‘ باتوں کے دوران وقت گزرنے کا احساس نہ رہا پھر نہ جانے ہم کب سو گئے۔ میری آنکھ کسی کے ہلانے سے کھلی‘ دیکھا تو وہی نوجوان پاس کھڑا تھا۔ میں نے گھبرا کر عبداللہ کو اٹھانا چاہا مگر عبداللہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ میں نے کئی آوازیں دیں لیکن بے سود میری بے بسی پر وہ نوجوان کہنے لگا۔ ”زلیخا! کیوں کوشش کر رہی ہو وہ صبح سے پہلے نہیں اٹھے گا۔“

میں حیران تھی کہ دروازہ بھی اندر سے بند ہے یہ اندر کیسے آیا۔ ”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”اتنا کہنا کافی نہیں کہ میں تمہارا عاشق ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”خبردار جو پاس آئے‘ میں شور مچاؤں گی۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”کوئی فائدہ نہیں۔“

میں نے پلٹ کر پھر عبداللہ کو جھنجھوڑا لیکن وہ اٹھ کر نہ دیے اور وہ میرے قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا تبھی میری نظر اس کے پیروں پر پڑی۔ وہ ایک ٹانگ سے محروم تھا اور ایک ہاتھ سے خون بھی بہہ رہا تھا۔ ”زلیخا پلیز! یہ زخم سی دو۔ دیکھو تو کتنی تکلیف ہے یہ دیکھو۔“ کہہ کر اس نے آستین اوپر کرلی اس کا ایک بازو شانے سے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گویا لٹک رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ میں کب تک بے ہوش رہی خود مجھے خبر نہیں۔ اسی بے ہوشی کے دوران مجھے یوں لگ رہا تھا کہ کوئی مجھے پکار رہا ہے۔ آواز کافی دور سے آرہی تھی۔ یہ تو عبداللہ کی آواز لگتی ہے۔ میرے ذہن نے سرگوشی کی جب آنکھ کھول کر دیکھا تو واقعی عبداللہ زمین پر بیٹھے مجھے آوازیں دے رہے تھے۔

میں عبداللہ کو صحیح سلامت دیکھ کر خوشی سے رو پڑی کہ خدا کا شکر ہے آپ زندہ ہیں۔

اب حیران ہونے کی باری عبداللہ کی تھی وہ بولے۔ ''مجھے کیا ہوا ہے۔ تم خود بستر کے بجائے زمین پر بے ہوش پڑی تھی تمہیں کیا ہوا تھا۔''

میں نے رات والا واقعہ جب عبداللہ کو سنایا تو وہ کہنے لگے۔ ''تم نے ضرور کوئی بھیانک خواب دیکھا ہوگا چلو اٹھو آج میں تمہیں امی کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔''

امی کے گھر وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا رات کو عبداللہ مجھے لینے آئے تو میں نے انہیں وہیں روک لیا۔

صبح میں گھر آگئی اور عبداللہ کام پر چلے گئے گھر گندا پڑا تھا۔ اس لیے میں صفائی میں لگ گئی۔ کمرے کی صفائی کی' صحن میں جھاڑو لگائی اور پائپ لگا کر صحن کو دھویا۔ اس کے بعد وائپر لگانے لگی وائپر لگا کر آگے بڑھتی جا رہی تھی کہ مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جہاں سے فرش سوکھ گیا تھا اس سوکھی جگہ پر کسی کے گیلے پیروں کے نشان تھے جیسے ابھی ابھی کوئی چل کر گیا ہو۔ میں نے دوبارہ وائپر کر دیا چند لمحوں بعد وہی نشان پھر واضح ہو گیا۔

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر وہاں کوئی اور نہ تھا۔ آواز دینے کے لیے منہ کھولا پر آواز گلے کے اندر ہی کہیں رہ گئی اور میں وائپر وہیں پھینک کر اندر کمرے میں آگئی پھر کھڑکی سے باہر دیکھا تو پورا صحن ایک پیر کے نشان سے بھرا پڑا تھا۔ فوراً آیت الکرسی پڑھ کر چاروں طرف پھونک ماری تو صحن صاف شفاف ہو گیا جیسے کبھی کوئی نشان بنا ہی نہ تھا۔ آخر کار دل کو مضبوط کر کے کچن میں گئی کھانا پکایا' روٹی بنائی' کپڑے دھوئے۔ کام کرتے کرتے شام ہو گئی۔ نہا کر کپڑے بدلے اور ٹی وی لگا کر بیٹھ گئی۔ چینل بدل بدل کر دیکھنے لگی کہ شاید کوئی اچھا پروگرام آرہا ہو۔ پر بے سود ایک چینل سے نصابی پروگرام اور دوسرے پر دل دہلا دینے والی خبریں چل رہی تھیں اچانک ٹی وی کی اسکرین پر وہی نوجوان نمایاں ہوا اور التجا کرنے لگا۔ ''زلیخا! میرے بازو کوسی دو۔''

پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں رگڑ ڈالیں لیکن وہ میرا وہم نہ تھا۔ لپک کر ٹی وی بند کر دیا کہ آخر یہ شخص مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ میں نے کیا بگاڑا ہے اس کا کہ اچانک ٹی وی پر اس کی آواز گونجی۔ میں نے چونک کر دیکھا تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ٹی وی میں نے خود بند کیا تھا بلکہ پلگ بھی نکال لیا تھا۔ پلگ زمین پر پڑا تھا لیکن ٹی وی کا اسکرین روشن تھا۔ اسکرین پر موجود تھا۔ میرے اعصاب چیخ رہے تھے۔ دل و دماغ پر دہشت چھائی جا رہی تھی۔ سینے میں دھڑکتا ہوا دل اس بری طرح سے دھڑکنے لگا تھا جیسے وہ حلق کے راستے باہر نکل آئے گا۔ میں نے خوف کو کم کرنے کے لیے چیخ کر پوچھا۔ ''تم کیا چاہتے ہو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔''

''تم نے نہیں تمہارے ظالم اور لالچی خاوند نے میری یہ حالت کی ہے۔ میری موت کا ذمہ دار وہی ہے۔'' اس نے مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو میرا شوہر انسانیت کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

خدمت کرتا ہے' خطروں میں لوگوں کی زندگیاں بچاتا ہے تم میرے شوہر پر بہتان لگا رہے ہو۔''

''یہ بہتان نہیں حقیقت ہے۔ جانتی ہو جس رات مجھے گولیاں لگی تھیں میں سڑک پر تڑپ رہا تھا اور وہاں تمہارا نیک دل شوہر جو لوگ مر چکے تھے ان کی جیبیں خالی کر رہا تھا۔ اگر وہ بروقت مجھے اٹھا کر اسپتال پہنچا دیتا تو میں نہ مرتا مگر اسے تو گھڑی' انگوٹھی اور رقم کی پڑی تھی۔ جب وہاں ہجوم اکٹھا ہونا شروع ہو گیا تب تمہارے میاں نے چند لاشوں کے ساتھ مجھے بھی ایمبولینس میں ڈالا اور جب میں نے اس سے یہ التجا کی کہ' بھائی مجھے جلدی اسپتال پہنچا دو کل میری بہن کی مائیوں ہے میں اپنے مالک سے ایڈوانس لے کر گھر جا رہا تھا تو جانتی ہو اس نے کیا کیا۔ اس نے فوراً گاڑی روکی اور پیچھے آکر میری جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے اس لیے میں گھگھیایا۔ ''ارے بھائی خدا کا خوف کرو مجھے جلدی لے چلو۔'' میری آواز سن کر وہ رک گیا اور بولا۔ ''دراصل میں تمہاری جیب سے شناختی کارڈ نکال رہا ہوں۔'' پھر میری نقاہت سے آنکھیں بند ہو گئیں یا شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹروں نے مجھے بچانے کے لیے میرا ایک بازو اور ایک ٹانگ کاٹ دی لیکن خون اتنا ضائع ہو چکا تھا کہ مجھے بچا نہ سکے۔ اگر تمہارا شوہر لوٹ مار نہ مچاتا اور مجھے جلدی اسپتال پہنچا دیتا تو میری جان نہ جاتی۔ میری ماں منتظر بیٹھی نہ رہتی اور میری بہن کی شادی نہ رکتی۔ مجھے اپنے مرنے کا غم نہیں پر غم ہے تو اتنا کہ وہ روپے جو تمہارے شوہر نے میری جیب سے نکالے ہیں تو وہ میرے گھر والوں کو دے دینا اب تم فیصلہ کرو میرا قاتل' میری بہن کی خوشیوں کا قاتل کون ہے۔''

میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اب خوف کی جگہ دکھ نے لے لی۔ ایک لمحے کو مجھے

انتخاب

ایک صاحب کی بیگم فوت ہو گئیں۔ وہ صاحب زار و قطار اپنی بیگم کے غم میں آنسو بہا رہے تھے۔ اتفاق سے مرنے والی خاتون کی ایک قریبی خوبصورت سہیلی بھی وہیں موجود تھی۔ اس سہیلی نے شوہر صاحب سے دریافت کیا کہ:

سہیلی: ''اگر مرحومہ کی کوئی یادگار قریبی نشانی مجھے مل جائے تو کتنا اچھا ہوتا۔''

شوہر (آنسو بھری آنکھوں سمیت): ''میرے بارے میں کیا خیال ہے؟''

☆☆☆

گاؤں میں واقع سرکاری اسکول کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ حالت یہ تھی کہ بغیر چھتوں اور دیواروں کے کلاسوں میں بچوں کے ساتھ آوارہ کتے بھی آکر کلاسوں میں بیٹھ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ اسکول ماسٹر نے کلاس میں داخل ہوتے ہی ایک بھورے رنگ کے کتے کی طرف اشارہ کر کے بیزار ہو کر کہا: ''کم از کم اس ڈھیٹ کو تو نکال باہر کرو یہ دو سال سے یہی کلاس اٹینڈ کر رہا ہے۔''

☆☆☆

اسکول ٹیچر نے ایک بچے کی سالانہ رپورٹ ترتیب دیتے ہوئے کچھ یوں لکھا کہ ''بچہ نا صرف بہت بدتمیز ہے بلکہ روزانہ اسکول بھی آتا ہے!''

☆☆☆

ایک خاتون ہر وقت اپنے شوہر سے لڑائی جھگڑے میں مصروف رہتی تھی۔ ان کی چیخ و پکار سے پڑوسیوں کی زندگی عذاب بنی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ ان کے پڑوسیوں کے پاس ایک صاحب تشریف لے گئے اور کہا'' آپ کے پڑوس میں رہنے والی عورت اس قدر بدتمیز جھگڑالو اور شور مچانے والی عورت ہے۔ آپ لوگ اسے منع کیوں نہیں کرتے؟''

پڑوسی: '' آپ ان کے پڑوسی ہیں؟''

صاحب: ''نہیں میں اس عورت کا شوہر ہوں۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اپنے آپ سے اپنے شوہر عبداللہ سے شدید نفرت ہونے لگی۔ شام کو جب عبداللہ گھر لوٹے تو مجھے پریشان دیکھ کر کہنے لگے۔ ''خیریت تو ہے۔''

میں برس پڑی۔ ''میں تو تمہیں ایک اچھا انسان سمجھتی تھی تمہارا روزگار تو مقدس تھا۔ میں نے کبھی تم سے کوئی فرمائش کی' کبھی کوئی گلہ شکوہ کیا۔ پھر تم نے آخر ایسا کیوں کیا' مردوں کی جیبیں کیوں خالی کیں۔''

عبداللہ ایک لمحے کو چونکے۔ ''تمہیں یہ سب کس نے بتایا۔''

جب میں نے انہیں ساری تفصیل سنائی تو وہ دنگ رہ گئے اور کہنے لگے۔ ''یہ سچ نہیں ہے اور تم اس حالت میں اتنا مت سوچو بچے پر برا اثر پڑے گا۔''

''عبداللہ! تم اپنے بچے کو ایسی کمائی کھلاؤ گے تو کیا برا اثر نہیں پڑے گا۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

اس رات نہ میں نے کھانا کھایا نہ عبداللہ نے بلکہ صبح جاتے ہوئے کہہ گئے کہ۔ ''زلیخا تمہیں میری زبان پر یقین نہیں ہے۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے شام کو فیصلہ کر لینا کہ تمہیں میرے پاس رہنا ہے کہ ماں کے گھر جانا ہے۔''

ظاہر ہے ایک غریب طبقے کی لڑکی کا جو فیصلہ تھا وہ میرا بھی ہو گیا مگر دل میں بنی خلیج کم نہ ہوئی۔ ایک روز میں نے ڈرتے ڈرتے عبداللہ سے کہا۔ آپ نے جو کیا سو کیا اب جا کر اس لڑکے کے گھر روپے دے آئیں تا کہ اس کی روح کو سکون پہنچے۔

عبداللہ بھڑک اٹھے۔ ''خبردار جو تم نے یہ فضولیات شروع کیں۔''

لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اس کے گھر جاؤں گی۔ اسی رات وہ نوجوان پھر آیا اور کہا۔ ''زلیخا! میری بہن اور ماں بہت پریشان ہیں ان کی مدد کرو۔''

میں نے کہا۔ ''میں تمہارے گھر کیسے جاؤں۔'' اس نے مجھے پتا بتایا اور میں نے وعدہ کر لیا کہ ضرور جاؤں گی۔

دوسرے روز صبح جیسے ہی عبداللہ کام پر گئے میں بھی گھر سے نکل پڑی اور اس نوجوان کے گھر پہنچ گئی۔ گھر کے باہر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ دستک دینے پر ایک گیارہ بارہ سالہ لڑکی باہر نکلی۔ میں نے کہا میں ناصر کے دوست کی بیوی ہوں۔ وہ لڑکی مجھے اندر لے گئی' چھوٹے سے صحن میں چارپائی پر ایک لڑکی بیٹھی سپارہ پڑھ رہی تھی۔ جب میں نے بتایا کہ میں ناصر کی دوست کی بیوی ہوں اور افسوس کے لیے آئی ہوں تو اندر سے اس کی والدہ بھی نکل آئیں۔ جوان بیٹے کی موت نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ اس کی ماں نے کہا۔ ''بیٹی میری دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ ایک تو چل بسا دوسرا بھائی کی جگہ کام پر لگ گیا ہے۔ دراصل اس روز ناصر اپنے مالک سے ایڈوانس تنخواہ لینے گیا تھا لیکن اسپتال کے عملے کے مطابق اس کے پاس کچھ نہ تھا جبکہ اس کے مالک نے ہمیں خود بتایا ہے کہ وہ اس روز پچیس ہزار کی رقم لے کر نکلا تھا۔'' دونوں ماں بیٹیاں روتی رہیں اور میں وہاں سے لوٹ آئی اور فیصلہ کر لیا کہ میں ان کی مدد ضرور کروں گی۔

دوسرے روز جیسے ہی عبداللہ گھر سے گئے' میں نے عبداللہ کی الماری کی تلاشی لے ڈالی۔ اندر کے خانے سے ایک گھڑی' سونے کی انگوٹھی ملی اور ایک چین ملی' اسے میں نے اپنے قبضے میں کیا اور اس کے علاوہ وہ کچھ نہ تھا۔ جلدی سے اپنی چار چوڑیاں اور ایک سیٹ جو جہیز میں ملا تھا' لیا اور صرافہ بازار پہنچ کر اسے فروخت کر دیا یہ ساری چیزیں تقریباً انیس ہزار کی فروخت ہوئیں' اسی وقت ناصر کے گھر گئی تو ان کے گھر کچھ عورتیں بیٹھی تھیں جو ناصر کی بہن کی ساس اور نند

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تھی اور غالباً شادی کی تاریخ لینے آئی تھیں۔ ناصر کی ماں کچھ وقت مانگ رہی تھیں۔ آج کے دور میں شادی بیاہ بھی کاروبار بن چکے ہیں۔ میں سمجھ گئی اور جلدی سے لفافہ نکال کر ناصر کی والدہ کو دیا اور کہا۔ ''خالہ جان آپ تاریخ دے دیجیے۔''

بیچاری کبھی مجھے دیکھتیں کبھی لفافے کو' آخر کار تاریخ طے پا گئی۔ جب وہ سسرالی چلے گئے تو میں نے کہا۔ ''دراصل ناصر سے میرے شوہر نے یہ رقم ادھار لی تھی۔ وہ میں دینے آئی تھی۔'' یہ کہہ کر میں وہاں سے نکل آئی۔ جلدی سے گھر پہنچی اور شام کا انتظار کرنے لگی۔ جب عبداللہ گھر آئے تو میں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ ایک پل کو عبداللہ گھبرا گئے۔ ''کیا ہوا ہے۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔ ''دراصل صبح میں اسپتال گئی تھی میری طبیعت خراب تھی تو نجانے کون آیا اور میری چوڑیاں اور سیٹ چرا کر لے گیا۔''

گھڑی' چین اور انگوٹھی کا ذکر گول کر گئی کیونکہ ان کا ذکر کبھی عبداللہ نے نہ کیا تھا۔ عبداللہ لپک کر الماری کے پاس گئے اور اپنے مخصوص خانے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ میں ناک رگڑتی رگڑتی پاس گئی اور کہا۔ ''کیا کچھ اور بھی چوری ہوا ہے۔ عبداللہ خاموش رہے پھر بولے۔ ''چلو چپ کر جاؤ اللہ اور دے گا۔'' میں مطمئن تھی دل سے بوجھ اتر گیا تھا پر ایک دکھ تھا کہ میرا شوہر اتنا لالچی ہے۔ آخر بیوی ہونے کے ناتے میرا فرض تھا کہ انہیں سیدھا رستہ دکھاؤں۔ اس رات ناصر پھر آیا اور کہا۔ ''زلیخا! تم واقعی عظیم ہو۔ تم نے میرا بوجھ اپنے کندھوں پر لے لیا ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''

میں رو پڑی اور کہا۔ ''ناصر میرے شوہر کو معاف کر دو۔''

''زلیخا! میں معاف کر بھی دوں پھر بھی اس کے گناہ کم نہیں ہوں گے۔ نجانے کتنے مجبوروں کو اس نے لوٹا ہوگا۔ کتنے اس کی وجہ سے اجڑے ہوں گے۔ خدا اسے معاف کرے۔'' کہہ کر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ ساری رات میں روتی رہی۔ وقتاً فوقتاً عبداللہ کے کانوں میں نیکی اور ایمانداری کا سبق ڈالتی رہی پر وہ اپنے کیے پر شرمندہ نہ تھے بلکہ منکر تھے کہ یہ سب بکواس ہے اور ایک روح کی بات مان کر میں اپنے شوہر پر کیچڑ اچھال رہی ہوں۔

انسان لاکھ حقیقت کو جھٹلائے پردے ڈالے پر خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ آخر وقت قریب آ گیا پھر تخلیق کا لمحہ مکمل ہوا اور میں نے ڈاکٹر سے پوچھا تو اس نے کہا زلیخا بیٹا ہوا ہے لیکن تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔ میں ڈاکٹر کی بات سمجھی نہیں' آخر آپ کیا کہہ رہی ہیں مجھے میرا بیٹا دکھائیں۔ ڈاکٹر نے نرس کو اشارہ کیا وہ بچے کو لے آئی پیاری شکل' خوب صورت آنکھیں۔ میں حیران ہو کر ڈاکٹر کی شکل دیکھنے لگی وہ سمجھ گئی اس نے جب چادر اتاری تو میں دنگ رہ گئی اس کا نہ ایک بازو تھا نہ ایک پیر وہ قدرتی طور پر اپاہج تھا خدا نے اپنا انصاف کر دیا۔ عبداللہ کو جب میں نے بچہ دکھایا تو اس کے آنسو رواں ہو گئے۔ میں نے تڑپ کر کہا۔ ''کاش تم یہ پچھتاوے کے آنسو پہلے بہا لیتے۔ توبہ کر لیتے۔ اب بھی وقت ہے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔''

اس روز کے بعد سے عبداللہ بالکل بدل گئے۔ مہینے کی ہر پہلی کو کچھ روپے ناصر کی ماں کو دے آتے ہیں۔ خرم کے بعد اللہ نے مجھے دو بیٹے اور دیے ہیں جو خدا کے فضل و کرم سے تندرست ہیں۔ خرم نقلی اعضاء کے سہارے چل پھر سکتا ہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نقشِ دوام

ایم اے راحت

مجبوراً اس نے ھانگ کانگ جانے کی تیاری کرنی پڑی۔ سیٹھ سکندر علی نے بذات خود اسے بریف کیا اور پھر وہ ھانگ جانے کے لیے تیار ہوگیا جہاز کا سفر اس کے لیے بڑا دلچسپ تھا اسی طرح ھانگ کانگ جہاں اسے ایک ہوٹل میں ٹھہرنا تھا' ہوٹل کی رات ایک مقامی شخص نے اس سے ملاقات کی جو صاف اردو بولتا تھا اپنی شناخت کرانے کے بعد اس نے وہ سوٹ کیس شہریار سے لے لیا جو وہ ساتھ لایا تھا پھر دوسرے دن ایک لڑکی نے اس سے ملاقات کرکے ایک نایاب ماڈل اس کے حوالے کیا اور مسکراہٹ کی بجلیاں گراتی ہوئی چلی گئی۔

ایک معاشرتی کہانی' عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

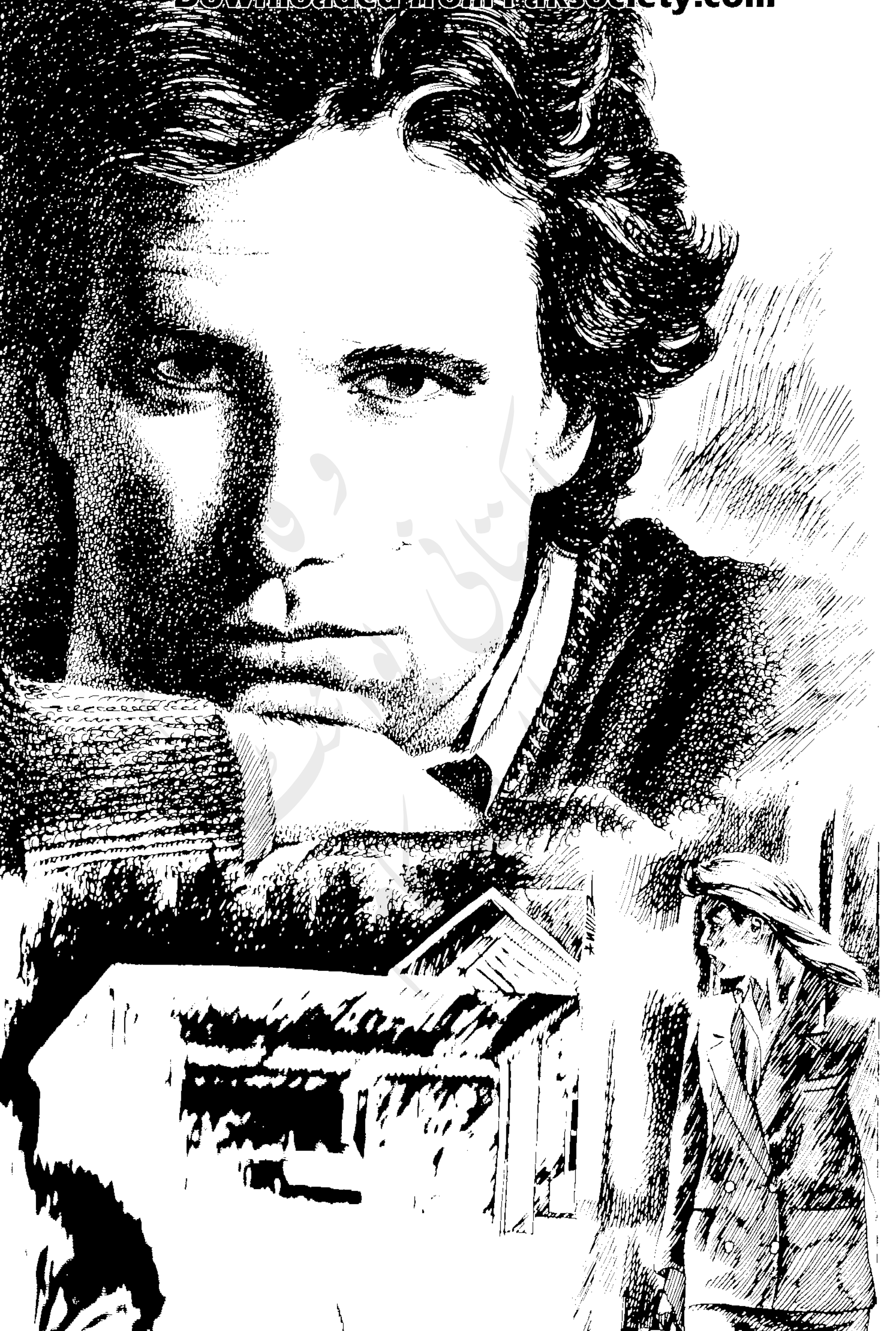

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

صاف ستھرا محلہ تھا پڑھے لکھے لوگ آباد تھا پرامن اور مہذب ایک دوسرے سے رابطہ رکھنے والے، اس دن بارش ہو رہی تھی۔ صمد یار صاحب نے بیگم سے بارش کے پکوڑے کی فرمائش کی تھی چنانچہ اس وقت باورچی خانے میں چھن چھن کی موسیقی جھنکاریں آرہی تھی اور گول گول پوریاں تیل کی کڑاہی میں رقص کررہی تھیں۔

''یار یہ کڑاہی سے باہر کب آئیں گی۔''

شیر یار نے ندیدوں کی طرح پوریوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

''کیوں قبلہ والد صاحب۔'' شہریار بولا۔

''کیونکہ میں تمہارا باپ ہوں۔''

''آہ کاش۔ ہم بھی کسی کے باپ ہوتے۔'' شہریار حسرت سے بولا۔

''صاحبزادے......'' صمد یار کے جملہ پورا ہونے سے پہلے دروازے کی گھنٹی تیز آواز میں بجی اور سب چونک پڑے۔

''یہ کون آ گیا۔ بارش میں۔''

''جاؤ دیکھو۔'' صمد یار بیٹے سے بہت بے تکلف تھے۔

''میں۔'' شہریار چنچناتے ہوئے بولا۔

''اور کیا میں۔ باپ تم ہو کہ میں۔'' صمد یار نے کہا اس دوران گھنٹی دوبارہ بجی تھی۔ شہریار منہ بسورتا ہوا اٹھ گیا۔ ''مالک دوجہاں' مجھے بھی جلدی سے ایک بیٹے کا باپ بنادے' گن گن بدلے لوں گا سرے سے۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اور اس کی چھوٹی بہن عشنا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

وہ بڑبڑاتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ بارش خوب تیز تھی وہ دروازے تک جاتے جاتے بھیگ گیا اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔

دروازہ کیا کھلا جیسے کائنات چمک اٹھی۔ اتنی حسین لڑکی تھی کہ انسان سب کچھ بھول جائے گلابی لباس میں مہکتا گلاب سر پر پلاسٹک اوڑھے ہوئے دودھ جیسے چہرے پر بھیگے بالوں کی تیئں چپکی ہوئی۔

''سوری سر۔ ہم آج ہی آپ کے برابر والے گھر میں شفٹ ہوئے ہیں۔ آپ کو تکلیف دینے کی معذرت اگر ماچس دیدیں تو شکریہ۔''

وہ بول رہی تھی اور شہریار اس کی آواز کی نغمگی میں کھویا ہوا تھا۔

''آپ اندر آجایئے بری طرح بھیگ رہی ہیں۔''

''پلیز آپ ماچس دے دیجیے۔''

''یہ لائٹر رکھ لیجیے۔'' اس نے جیب سے لائٹر نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ لائٹر لیے ہوئے اس کی انگلیاں شہریار کے ہاتھ سے چھو گئیں اسے زور کا کرنٹ لگا تھا۔

''شکریہ پلیز۔''

زور آسمان پر بجلی چمکی بادلوں کا کڑاکا ہوا اور لڑکی غائب ہوگئی۔

''بھائی جان۔ کون ہے۔'' اندر سے ریشم کی آواز سنائی دی جو اس کی بہن تھی۔

شہریار دروازہ بند کرکے پلٹا تو اس کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی بارش میں بھیگی لڑکی اس کے حواس پر بجلی بن کر گری تھی۔

''کون تھا شیری۔'' امی نے پوچھا۔

''ارے کیا دیکھ آئے بھائی جان۔ بولتی بند ہوگئی ہے۔''

''وہ لڑکی۔ ماچس مانگنے آئی تھی۔''

''کون۔''

''برابر والے گھر میں نئے کرائے دار آئے ہیں۔''

''ہاں۔ تو پھر۔''

''وہیں سے لڑکی آئی تھی۔ ماچس مانگ رہی تھی۔''

''ہاں۔ آج ہی ان کا سامان آیا ہے چلو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سمشی صاحب کا یہ ویران گھر آباد تو ہوا ورنہ وہاں بس بھوت ہی آنے والے تھے۔''

''خدا کرے اچھے لوگ ہوں۔'' امی نے کہا۔

بارش کی یہ رات نقش دور بن گئی ایسا نقش جو کبھی نہیں مٹتا۔

بعد میں عالیہ کے بارے میں سب کچھ پتہ چل گیا وہ چار بہنیں تھیں اور ایک بھائی جو سب سے چھوٹا تھا اس کے والد ایک سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک تھے عالیہ گھر کی سب سے لاڈلی سب سے خوبصورت اور سب سے ذہین تھی گریجویشن کر رہی تھی جبکہ شہریار کے والد صمد یار کا اپنا چھوٹا سا کاروبار تھا اور شہریار بھی ملازمت کرتا تھا یوں گھر کے حالات کافی بہتر تھے۔

وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ دونوں گھرانوں میں بہت جلد گہرے تعلقات ہوگئے۔ عشنا' عالیہ سے کافی چھوٹی تھی لیکن دونوں گہری دوست بن گئیں۔ عشنا میٹرک میں پڑھتی تھی اور عالیہ بہ کافی۔ تھی عشنا کو بہت جلد پتہ چل گیا کہ بھائی عالیہ میں بہت دلچسپی لیتا ہے وہ دونوں سے خوب چھیڑ چھاڑ کرتی تھی۔

شہریار یکدم اندر آیا تو وہ بولی۔

''ارے ارے کہاں گھسے چلے آرہے ہیں۔ پردہ ہے۔''

''کیسے پردہ ہے۔'' پہلے تو شہریار کچھ نہ سمجھا پھر عالیہ کی ہنسی کی آواز سنائی دی تو سمجھ گیا کہ بہنیں شرارت کر رہی ہے اندر داخل ہوکر بولا۔

''ٹھیک ہے ذرا پردہ نشین کی زیارت تو کریں۔''

''وہ تو آپ کر چکے ہیں۔''

''کب۔''

''زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات۔'' عشنا شرارت بھرے انداز میں کہتی۔

یہ حقیقت بھی تھی' معاملات تو زندگی کی آخری رات تک کا۔ بن گئی تھی شہریار نے کچھ اس طرح دل ہارا تھا کہ محبت کے سمندر میں ایک جزیرہ بن گیا تھا دل کے اس جزیرے پر جو دستک اتری تھی وہ کبھی نہ مٹنے والی تھی رفتہ رفتہ اس کی شدت بڑھتی جارہی تھی اور جب دل کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو اس نے ماں سے کہا۔

''امی۔''

''ہاں۔ کیا بات ہے شہریار۔''

''امی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''خدا خیر کرے۔ ایسی کیا بات ہے کہ تم اتنے سنجیدہ ہوگئے۔''

''امی۔ میں عالیہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا اور امی مسکرادیں پھر بولیں۔

''میں بھی عالیہ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''ایں۔'' اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''تمہاری......'' امی نے کہا اور وہ خوشی سے پاگل ہوگیا۔ اس پاگل پن میں اس نے عالیہ کے سامنے زبان کھول دی۔

''عالیہ...... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ عالیہ میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ عالیہ بڑی مشکل سے میں نے تم سے یہ الفاظ کہے ہیں میں جواب چاہتا ہوں۔''

اسے امید نہیں تھی کہ عالیہ بھی اسی آگ میں سلگ رہی ہے اور صرف ایک لمحے کے فاصلے پر ہے اس کی زبان بھی کھل گئی۔

''میں جواب دوں اس کا شیری۔ میں۔ میں ہوں کہاں۔ میں تو تم ہوچکی ہوں شیری جواب میں نہیں دے سکتی تم دو۔ تم شیری تم۔''

''تم اپنی امی سے بات کرو۔''

''کیا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''یہی کہ میری امی اس سلسلے میں تمہارے گھر آنا چاہتی ہیں۔''

''میں کیسے کہوں شیری۔ ایسی باتیں بیٹیاں اپنے منہ سے نہیں کرتیں۔ منہ پر پھٹکار یہ نہ لگتی ہے۔'' وہ ہنس پڑی۔

''پھر میں کیا کروں۔'' میں بے بسی سے بولا۔

''امی کو بھیج دو۔''

''اور لیکن تمہاری امی مان جائیں گی۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''

''عالیہ۔ میری محبت عبادت کی منزل میں داخل ہوگئی ہے اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں زندگی کھو بیٹھوں گا۔''

''خدا نہ کرے۔ میں بھی تمہارے بغیر جینے کا تصور نہیں کرسکتی۔''

صدیوں کے فاصلے لمحوں میں طے ہوگئے۔ دونوں کے دل ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے۔

شہریار نے امی کو عالیہ کے گھر بھیج دیا اور لمحہ لمحہ ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ عشنا بھی امی کے ساتھ گئی تھی۔ امی واپس آئیں تو ان کا موڈ عجیب سا تھا۔

''کیا ہوا امی۔'' اس نے بے قراری کا مظاہرہ کیا۔

''کیا ہوسکتا تھا تیرے خیال میں۔ ایسے فیصلے لمحوں میں ہوتے ہیں۔''

''پھر بھی کچھ تو کہا ہوگا انہوں نے۔''

''ہاں کہنے لگیں اپنے شوہر سے بات کریں۔ وہ جو بھی فیصلہ کریں گے۔''

''آپ کے خیال میں وہ ہمارے حق میں فیصلہ کریں گی۔''

''میں نہ تو ولی ہوں، نہ درویش کہ سب کچھ بتادوں۔ ویسے بھی بڑی گہری عورت ہیں عالیہ کی امی۔''

''کوئی جواب تو دیا ہوگا۔''

''ہاں۔ کہنے لگیں ایک ہفتہ لگ جائے گا غور کرنے میں۔''

''اف۔ ایک ہفتہ۔'' وہ بولا اور امی اسے تیز نظروں سے دیکھنے لگیں وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔

لوگ دن گنتے ہیں وہ لمحے گننے لگا۔ ایک ہفتہ دو ہفتے اور پھر ایک مہینہ گزر گیا کوئی جواب نہیں آیا۔ غضب یہ ہوا کہ عالیہ کا ان کے گھر آنا جانا بھی بند کردیا گیا۔ شہریار پر زندگی وبال ہوگئی۔ وہ عالیہ کو دیکھ کر جیتا تھا اب ایکدم اس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی کوئی الٹا سیدھا قدم وہ اٹھانا نہیں چاہتا تھا ورنہ کہیں اور ملنے کی سعی کرتا کسی کو پتہ چل گیا تو قیامت آجائے گی۔

اس دوران بے چاری امی کئی بار عالیہ کے گھر گئی تھیں لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا اس نے امی سے کہا۔

''آخر وہ جواب کیوں نہیں دے رہے۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''

''آپ ان سے صاف بات کریں امی۔ میں پریشان ہوں۔''

''ٹھیک ہے تم کہو تو میں ان سے دوٹوک بات کروں۔''

''ہاں میری امی لیکن کوئی سخت بات نہ کریں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کوئی پاگل ہوں۔'' امی کو اس کے دل کا اندازہ ہوگیا تھا۔ امی گئیں واپس آئیں تو ان کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ شہریار کا دل دھک سے ہوگیا بمشکل تھام اس نے امی سے کہا۔

''کیا ہوا امی۔''

''سر پھرے لوگ ہیں۔ پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتے ہیں۔''

''کیا ہوا امی۔'' اس نے اندھی آواز میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پوچھا۔

''پہلے ہی منع کر دیتے تو کیا تھا اتنے دن تک کیوں زبان بند رکھی اب کہہ رہی ہیں کہ عالیہ کی بات کہیں اور طے ہے۔''

''کیا۔'' شہریار کو چکر آ گیا۔

''ہاں۔ میں نے کہا پہلے ہی بتا دیتیں تو کیا تھا۔''

''پھر۔''

''میں، شرمندہ تھیں۔ ویسے مجھے کچھ اور بھی پتہ چلا ہے۔''

''کیا امی۔''

''ان کے بھائی کا لڑکا ہے جو دبئی میں تھا اب وہاں سے واپس آ کر کراچی میں کاروبار کرے گا سب دولت کا کھیل ہے پہلے ان کے دل میں یہ خیال نہیں تھا اب یہ موقع نظر آیا تو چہرہ بدل گئیں سنا ہے وہ بڑے پیسے والے ہیں۔''

''غلط ہے۔ یہ غلط ہے نقصان اٹھائیں گے وہ لوگ۔ نقصان اٹھائیں گے۔'' شہریار نے کہا۔ عالیہ کے لیے وہ ہزاروں زندگیاں قربان کر سکتا تھا اس نے عشنا کے ذریعے عالیہ سے ملاقات کا انتظام کیا۔ عالیہ خود اس کے لیے پاگل تھی مطلوبہ جگہ پہنچ گئی، اس نے سسکتے ہوئے شیریار سے کہا۔

''تم میرے روئیں روئیں میں ہو شیری۔ مجھے کسی اور کا ہونے سے بچالو۔''

''نہیں ہونے دوں گا میں تمہیں کسی اور کا عالیہ۔ چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔''

''مجھے یقین دلا دو۔ ورنہ میں کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔''

''نہیں مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں ساری دنیا سے لڑ جاؤں گا۔ وہ لڑکا کون ہے جو دبئی سے آیا ہے۔''

''ابو کے دوست کا بیٹا ہے۔ ہمارے گھر میں تمہارا رشتہ منظور ہو چکا تھا کہ وہ کمبخت درمیان میں ٹپک پڑا اور ابو بات بدل گئے ورنہ سب ٹھیک ہو گیا تھا ہاں کہی جانے والی تھی اور اب۔ اب۔''

''ہاں اب کیا۔''

''اگلے ماہ شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے۔''

''تم انکار کیوں نہیں کر دیتیں۔''

''کاش میں ایسا کر سکتی۔''

''کیوں نہیں کر سکتیں۔''

''مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے لیکن۔''

''لیکن کیا۔''

''میں خودکشی کر لوں گی۔ یقین کرو، میں زندہ نہیں رہوں گی۔''

''ایسا کبھی نہ کرنا عالیہ۔ ایسا کبھی مت سوچنا۔''

''شیری۔ میں تمہاری جگہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''میں جانتا ہوں عالیہ۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں۔'' شہریار نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''اب کیا کریں شیری۔ وقت پر لگا کر اڑا جا رہا ہے۔''

''ہاں مجھے اندازہ ہے۔ کروں گا عالیہ کچھ کروں گا۔'' شہریار راتوں کو جاگنے لگا کچھ بھی ہو جائے عالیہ کی شادی کسی دوسری جگہ نہیں ہو سکتی۔ ایک ہی راستہ ہے عالیہ کو لے کر کہیں دور نکل جائے دو خاندانوں کو رسوا کر کے۔

کوئی موثر فیصلہ نہیں ہو سکا اور شادی کا دن قریب آ گیا تب اس نے عشنا کے ذریعہ عالیہ کو ایک خط بھجوایا جس میں اس نے عالیہ سے کہا تھا کہ اس کے ساتھ فرار ہونے کے لیے فلاں جگہ آ جائے اور پھر وقت مقررہ پر وہ طے شدہ جگہ اس کا انتظار کرنے لگا۔

عشنا کو نہیں معلوم تھا کہ بھائی ایسا کرے گا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس نے تو فرض پورا کردیا تھا لیکن خط پڑھ کر عالیہ کے اعصاب کشیدہ ہو گئے اسے شدید چکر آ گئے۔ اس نے لکھا تھا کہ میں ایسا تو کرسکتی ہوں لیکن ماں باپ کی عزت کو اس طرح جوتوں تلے روند کر نہیں جاسکتی۔

شیری تمہاری محبت میرے ساتھ قبر تک جائے گی میں تمہیں کبھی نہیں بھلاسکوں گی مگر میں ماں باپ کو اپنے لیے ہلاک نہیں کرسکتی۔

وہ آنسو بہاتے ہوئے خط پڑھتی رہی کتنی بار اس کا دل چاہا کہ شہریار کے پاس جائے اس کے سامنے جاکر اس سے بات کرے لیکن رات کے اس پہر باہر جاکر اس سے ملنا بھی خطرناک تھا کوئی دیکھے تو کیا سمجھے کل اس کی شادی تھی آنسو بہانے کے علاوہ کچھ نہ کرسکی ساری رات تکیے پر سر رکھے سسکتی رہی۔

ادھر شہریار اس کا انتظار کررہا تھا۔ وقت شدید وحشت کے عالم میں گزر رہا آنکھیں اس راستے کو دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی تھیں۔ سے عالیہ کو آنا تھا مقررہ وقت گزر گیا۔ ایک بجے' دو بجے' تین بج گئے۔ آس دم توڑنے لگی۔ پاؤں سن ہو گئے۔ دماغ تھک کر سو گیا۔

وہ نہیں آئی۔ وہ نہیں آئے گی۔

یہاں تک کہ روشنی نمودار ہونے لگی۔ پر امید دم توڑ گئی۔ ٹھیک سوچا تم نے عالیہ واقعی ٹھیک سوچا تم نے۔ میں جانتا ہوں تم کیوں نہیں آئیں۔ موازنا کیا ہوگا تم نے اس دولت مند شخص کا اور میرا۔ واقعی دولت ہمیشہ جیت پاتی ہے ایک کلرک کے پاس تمہیں کیا ملتا۔ اب کیا کروں یہاں رہنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔

وہ وہاں سے سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا اور ایک ٹرین آئی تو اس میں بیٹھ گیا۔ انسان کتنا خودغرض ہوتا ہے صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے وہ اپنی محبت میں ناکام ہوا تو' ماں' باپ نہیں سب کو بھول گیا۔

بالآخر تھک ہار کر یارو' ہم نے تو تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا' باقی سب افسانے ہیں

کوئی منزل نہیں تھی' کوئی نظریہ نہیں تھا' ریل میں ٹکٹ خریدا اور کراچی پہنچ گیا۔ روشنیوں کے طوفان میں گھرا کراچی جس کی وسعت قلب بے پناہ ہے وہ سب کو اپنے دل میں جگہ دے دیتا ہے۔

تھوڑی سی رقم ساتھ لایا تھا سوچا تھا کہ عالیہ کا ساتھ ہوگا سر چھپانے کا ٹھکانہ تلاش کرے گا پھر نوکری تلاش کرے گا اور عالیہ کے ساتھ پرعیش زندگی گزارے گا لیکن۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں۔

ایک گندا سا ہوٹل مل گیا اس میں قیام کیا غم کے طوفان سمیٹے وہ ہوٹل کے کمرے میں پڑا رہتا۔ ہوٹل کے ایک بیرے نے جس کا نام مجید خان تھا اس کی۔ کے کیفیت بھانپ کی اور بولا۔

''کس غم کے مارے ہو بابو۔''

''کیوں۔''

''اپن کو لگتا ہے۔ چاہے تو اپن کو یار بنالو۔''

''کیا فائدہ۔''

''فائدے نقصان کی بات اپن نہیں کرتا۔ باقی تمہارا مرضی۔'' مجید خان نے کہا۔

اور اس نے مجید خان کی پیشکش قبول کرلی۔

مجید خان واقعی کام کا آدمی تھا۔ چند روز کے بعد اس نے پیشکش کردی۔

''اپن تمہارے کو مشورہ دے شیری بابو۔''

''ہاں بولو۔''

''تم ادر بیرا گیری کرلو۔''

''بیرا گیری۔''

''ہاں جگہ خالی ہے۔ سیٹھ مجید میرے بولا کوئی بندہ ہو تو لے آؤ۔''

''سیٹھ مجید کون ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''اس ہوٹل کا مالک۔ اس کا نام بھی مجید خان ہے۔ بس تھوڑا سا فرق میرے اور اس کے ساتھ۔''

''کیا۔''

''وہ سیٹھ مجید خان ہے اور اپن بیرہ مجید خان۔ وہ اپن کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتا ہے۔''

''ٹھیک ہے تم بات کرلو۔'' شہریار نے کچھ سوچ کر کہا۔ دل کے زخم کبھی چین سے سونے نہیں دیتے تھے پیسے بھی ختم ہوتے جارہے تھے اس نے سوچا یہاں کب تک رہے گا جینے کے لیے کچھ تو کرنا تھا کیوں نہ زندگی کو یکسر بدل دیا جائے چنانچہ اس نے بیرہ گیری قبول کرلی مجید خان نے اسے اپنے کوارٹر میں رہنے کے لیے جگہ دیدی تھی وہاں خوب رونق رہتی تھی مجید خان جوا کراتا تھا اور بہت سے جواری وہاں جوا کھیلتے تھے۔ شہریار کی تقدیر نے اسے چرکا دیا تھا بارش کی وہ رات اس پر عذاب بن کر نازل ہوئی تھی اور وہ عشق کے ازار میں مبتلا ہوگیا تھا جس کے لیے دربدر کردیا تھا لیکن ابھی بہت سے عذاب اس کے منتظر تھے سب کچھ چھوٹ گیا تھا گھربار' ماں باپ' بہنیں' لیکن تقدیر ابھی اس سے بہت کچھ چھیننا چاہتی تھی۔

ایسی ہی ایک رات تھی۔

وہ اس۔ رات میں نہ جانے کب تک آنسو بہا کر سویا تھا کہ اچانک زلزلہ سا آگیا بہت سے لوگ کوارٹر کی دیواریں پھلانگ کر اندر آگئے تھے۔ یہ پولیس والے تھے جو پوری طرح مسلح تھے انہوں نے اس کی چارپائی الٹ دی وہ زمین پر گرا تو انہوں نے اس کے بدن پر کئی ٹھوکریں ماریں۔

''اٹھ اوئے کھڑے ہو۔''

وہ کھڑا ہوگیا دوسرے پولیس والے نے اسے بالوں سے پکڑ کر دھکا دیا۔ ''بٹھاؤ سالے کو گاڑی میں۔''

''کیا ہوا کیا بات ہے مجھے بتاؤ تو سہی۔'' اس نے کہا۔

''ہائے معصوم فرشتے۔ جوئے کا اڈہ چلارہا ہے اور فرشتہ بن رہا ہے چل آگے بڑھ۔'' پولیس والے نے اسے دھکا دے کر کہا۔

''میری بات سنیں۔ یہ گھر میرا نہیں ہے' میں تو کچھ روز پہلے ہی یہاں آیا ہوں۔''

''پھر کس کا گھر ہے۔''

''مجید خان کا۔''

''مجید خان کہاں ہے۔''

''اس وقت مجھے نہیں معلوم۔''

''اچھا تو تو تھانے چل۔ مجید خان کو بھی دیکھ لیں گے۔'' پولیس والوں نے کچھ اور جواریوں کو بھی پکڑا تھا لیکن مجید خان اس میں نہیں تھا۔ اسے ساری رات تھانے میں بند رکھا گیا صبح کو مجید خان اس سے ملنے آیا تو وہ غصے سے بولا۔

''یہ تو نے کیا کیا مجید خان۔''

''میری بات سن شیری۔ تیری زندگی بن جائے گی تھوڑی سی سزا بھگت لے میری جان میں جیل میں تجھے کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔''

''کیا بکواس کررہا ہے۔ میں شریف آدمی ہوں۔''

''اویار...... شرافت بیکار چیز ہے' کوئی فائدہ نہیں ہوگا تجھے شرافت سے۔ ویسے بھی میرا کام پکا ہے پولیس تجھے چھوڑ دے گی۔''

مجید خان کچا کھلاڑی نہیں تھا اس نے خود کو صاف بچالیا اور شہریار کو جوئے کا اڈہ چلانے کے الزام میں سزا ہوگئی۔

تب اس نے جیل کی دنیا دیکھی خود پر ہنسنے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔ عالیہ تم نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا محبت کتنی نامراد شے ہے لیکن عالیہ تقدیر نے ساتھ دیا تو تم سے ایک بار ملوں گا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ضرور۔

جیل ایک یونیورسٹی ہوتی ہے جہاں ہر طرح کی تعلیمات کا بندوبست ہوتا ہے۔ ایک سے ایک چھٹے ہوئے مجرم سے اس کی دوستی ہونے لگی۔ وہ سب اسے اپنے داؤ پیچ سکھانے لگے اور وہ فنکار بنتا چلا گیا پھر ایک دن مجید خان اس سے ملنے آیا۔

''کیسے ہو دوست۔''

''بالکل ٹھیک ہوں انتظار کر رہا ہوں یہاں سے نکلنے کا' سب سے پہلے تمہارا میں ادھار چکاؤں گا فکر مت کرو۔'' وقت گزرتا رہا' شہریار اب شہریار نہیں رہا تھا۔ وہ سچ مچ شیری بن چکا تھا پہلے سے بالکل مختلف جیل میں جیلا اس کا بہترین دوست تھا۔

''تیری رہائی آرہی ہے۔'' جیلا نے کہا۔

''ہاں یار۔''

''کیا کرے گا باہر جا کر۔''

''کوئی فیصلہ نہیں کیا۔''

''پتہ دیتا ہوں۔ سائیں فضلا سے مل لینا۔'' جیلا نے اسے فضلا کے بارے میں تفصیل بتائی پھر اس کا پورا پتہ بتا دیا اور آخر کار ایک نیا شیری جیل سے باہر آگیا۔ ایک معصوم نوجوان محبت کا مارا ایک خوفناک روپ اختیار کر گیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے فضلا کو تلاش کیا باقاعدہ ایک اڈہ چلاتا تھا۔

''مجھے استاد جیلا نے بھیجا ہے۔''

''اوئے ہش کے جیل سے آئے ہو۔''

''ہاں۔''

''شکل سے تو شریفے کا پھول لگتے ہو۔''

''اس کے برعکس ہوں۔''

''کیا نام ہے۔''

''شیری۔''

''اوئے ہش کے نام تو ٹھیک ٹھاک ہے شیری بدمعاش' ہاہا چلے گا۔ چلے گا جیل کیوں گئے تھے۔''

''تقدیر لے گئی تھی۔''

''ہاں پہلے تقدیر ہی لے جاتی ہے۔ اس کے بعد بندے کا باہر جی نہیں لگتا۔ کچھ پڑھے لکھے ہو۔''

''ہاں۔''

''ہش کے۔ کام کرو گے۔''

''کرنا ہی ہے۔''

''مل جائے گا۔ میرے پاس ہر مرض کی دوا ملتی ہے۔ چلو کھانا کھالو پھر تمہیں آرام کے لیے بھجوا دیتا ہوں۔ کسی نئے کام کے لیے خود کو تیار رکھنا۔'' کھانا بہت اچھا تھا کھانے سے فارغ ہوا تو فضلا نے ایک آدمی کو بلایا اور بولا۔

''انہیں بیس نمبر پہنچا دو۔'' بیس نمبر ایک فلیٹ نمبر تھا جس کا تالا کھول کر شہریار کو اندر جانے کی ہدایت کی گئی۔ شہریار کو کوئی جھجک نہیں ہوئی تھی اب وہ بالکل بدل گیا تھا۔ جیل کے دوستوں نے اسے نئی دنیا دکھادی تھی ماضی کو بھلا دیا تھا اس نے سوائے ایک نقش کے یہ نقش دوام تھا آخری سانسوں کے ساتھ قبر کی گہرائیوں تک کا ہمسفر۔

فلیٹ خوب آرام دہ تھا سکون کی نیند سویا۔ صرف عالیہ آئی تھی خواب میں وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے۔ رات کو فضلا نے عمدہ کھانا کھلایا تھا۔ ناشتہ اس نے خود تیار کیا۔ کچن میں ہر چیز موجود تھی۔

دن کو گیارہ بجے استاد فضلا آ گیا۔

''مبارک ہو' تمہارے لیے پہلا کام نکل آیا۔''

''کام۔''

''ہاں تمہیں ہانگ کانگ جانا ہوگا۔ بہت بڑے سیٹھ کا کام ہے تم نے سکندر علی کا نام سنا ہے۔''

''نہیں۔''

''اب سن لو۔ تمہارا اسی سے واسطہ رہے گا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''مجھے ہانگ کانگ جانا ہوگا۔''

''ہاں۔ بندہ آجائے گا۔ تصویریں وغیرہ نکلوالو تاکہ پاسپورٹ بن جائے۔ اس ہفتے تمہیں جانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' شہریار نے خوش ہوکر کہا۔ پھر بولا۔ ''استاد فضلا ایک ذمے داری ہے میری جس کے لیے میں نے قسم کھائی تھی کہ جیل سے نکل کر اسے پوری کروں گا۔''

''مجھے بتاؤ۔ اور یہ بھی بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔'' فضلا نے کہا اور شہریار نے اسے پوری کہانی سنادی جسے سن کر فضلا نے کہا۔

''بدلہ لگتا تو نہیں ہے کیونکہ اس نے تمہیں انسٹیٹیوٹ آف کرائم بھجوایا تھا۔ جہاں سے تم ہیرو بن کر نکلے لیکن قسم، قسم ہوتی ہے اسے ضرور پوری کرنا چاہیے۔ البتہ ایک ہدایت ضرور کروں گا۔''

''جی۔''

''قاتل بننے سے گریز کرنا۔''

''میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا بس اسے تھوڑا سا پیار کرنا چاہتا ہوں۔'' شہریار نے سفاک ہنسی ہنستے ہوئے کہا اور فضلا بھی ہنسنے لگا۔

لیکن مجید خان کی تقدیر اچھی تھی وہ اس گھر کو چھوڑ کر جاچکا تھا مسلسل کوشش کے بعد بھی کہیں سے اس کا پتہ نہیں چل سکا۔

مجبوراً اس نے ہانگ کانگ جانے کی تیاری کرنی پڑی۔ سیٹھ سکندر علی نے بذات خود اسے بریف کیا اور پھر وہ ہانگ جانے کے لیے تیار ہوگیا جہاز کا سفر اس کے لیے بڑا دلچسپ تھا اسی طرح ہانگ کانگ جہاں اسے ایک ہوٹل میں ٹھہرنا تھا، ہوٹل کی رات ایک مقامی شخص نے اس سے ملاقات کی جو صاف اردو بولتا تھا اپنی شناخت کرانے کے بعد اس نے وہ سوٹ کیس شہریار سے لے لیا جو وہ ساتھ لایا تھا پھر دوسرے دن ایک لڑکی نے اس سے ملاقات کرکے ایک نایاب ماڈل اس کے حوالے کیا اور مسکراہٹ کی بجلیاں گراتی ہوئی چلی گئی۔

بس یہی کام تھا جس کی اسے ہدایت کی گئی تھی اپنے کام کی انجام دہی کے بعد تین دن تک اس نے ہانگ کانگ کی سیر کی پھر پاکستان چل پڑا۔ ایرپورٹ پر اس کے لیے مکمل انتظام تھا چنانچہ اس مجسمے کو ایرپورٹ سے باہر لانے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی اور وہ مجسمہ اس نے فضلا کے حوالے کردیا۔

''سیٹھ صاحب تم سے بہت خوش ہیں۔ ہانگ کانگ میں لطف آیا۔''

''ہاں۔''

''یہ لو۔ یہ تمہارا معاوضہ ہے۔'' ایک لاکھ روپے کے نوٹ اس نے اکٹھے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

''یہ۔''

''تمہارا معاوضہ ہے۔ اب تین ہفتے تک آرام کرو۔''

''تین ہفتے تک۔''

''ہاں پھر تمہیں دوبارہ ہانگ کانگ جانا ہوگا۔ دوسری بار معاوضہ ڈبل ہوگا اور ہاں ایک کام اور کرو۔''

''کیا۔''

''شیو بڑھالو۔ دوسری بار تمہیں داڑھی میں جانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔''

دوسرا دورہ بھی کامیاب رہا پہلے پیسے ہی ختم نہیں ہوئے تھے دو لاکھ اور مل گئے۔ فضلا نے کہا۔

''یار دنیا بہت خوب صورت ہے دولت کماؤ اور لٹا دو۔ یہی زندگی ہے۔'' فضلا نے اسے ریس کی لت لگادی اسے گھوڑوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا چنانچہ گھوڑوں نے اس سے وفا نہیں کی اور پھر وہ اپنی کمائی کھونے لگا سارے پیسے ختم ہوگئے فضلا سے اس نے کبھی کچھ نہیں مانگا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تھا دماغ میں برے خیالات آنے لگے اس دن وہ بہت پریشان تھا جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی سوائے لمبے چاقو کے جو اسے فضلا نے تحفے میں دیا تھا۔

اسے اپنی رہائش گاہ جانا تھا جو یہاں سے کافی دور تھی وہ سڑک پر پیدل جا رہا تھا کہ ایک ٹیکسی قریب آ گئی ڈرائیور نے اس کے قریب آ کر اس۔ ٹیکسی کی رفتار سست کی کہ شاید کوئی سواری مل جائے۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور اسے چلنے کے لیے کہا پھر اچانک اس کے ذہن میں شیطان داخل ہو گیا اس نے جیب سے چاقو نکال کر ڈرائیور کی گردن پر رکھ دیا۔ ''چلو ٹیکسی روکو۔'' ڈرائیور کی گھگھی بندھ گئی تھی۔

''کتنے پیسے ہیں جیب میں۔''

''تین چار سو مائی باپ۔'' ڈرائیور بری طرح کانپ رہا تھا۔

''نکالو۔'' وہ بولا۔

''مائی باپ میرے چھوٹے۔''

''نکالو ورنہ ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔'' اس نے گرج کر کہا اور ڈرائیور نے جلدی سے جیب سے ساری رقم نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ رقم لے کر اس نے کہا۔ ''چلو گاڑی سے نیچے اتر جاؤ۔''

''مر جاؤں گا مائی باپ۔'' ڈرائیور رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

''نیچے اتر۔'' شہریار گرجا اور ڈرائیور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا وہ دھیمی آواز میں رو رہا تھا لیکن اس نے پرواہ نہ کی تو ٹیکسی آگے بڑھا دی اس کا ذہن سادہ تھا ان ظلم و ستم کا عادی ہو چکا تھا ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اچانک ایک ذیلی سڑک سے ایک پولیس موبائل نکل آئی' یہ سڑک اس سمت سے آئی تھی یہاں اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو چھوڑا تھا۔

پولیس موبائل نے اس کا راستہ بند کر دیا اور مسلح پولیس والے ایک افسر کی سرکردگی میں نیچے اتر آئے وہ ٹیکسی ریورس کرتا تو پولیس والے اسے بھون کر رکھ دیتے یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا پھر موبائل سے ٹیکسی ڈرائیور کو نیچے اترتے دیکھ کر اس نے گہری سانس لی تھی چنانچہ وہ ٹیکسی سے نیچے اتر آیا۔

پھر جو ہونا تھا جو ہوا ایک بار پھر اسے جیل یاترا روانہ کرا دیا گیا لیکن وہاں اس کا دوست جیلا موجود تھا جو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

''آ گیا میرا شیر۔ اوئے بڑا بدل گیا تو کتنے دن کی ہے۔''

''صرف ایک مہینہ۔'' شہریار نے لاپرواہی سے کہا۔

''ایک مہینہ۔'' جیلا انگلیوں پر حساب لگانے لگا پھر ایک دم خوش ہو کر بولا۔ ''اوئے۔ پھر تو ساتھ ساتھ نکلیں گے۔''

دونوں کی ساتھ ساتھ رہائی ہوئی تھی جیل سے باہر فضلا ان کا منتظر تھا۔ بن گیا خوب کمائی ہونے لگی لیکن پیسہ رکتا کہاں ہے بڑی بڑی رقمیں حاصل ہوتی تھیں کبھی ریس کورس کی سیر ہو جاتی تھی۔

''مزے کر رہے ہو جانی۔'' جیلا نے ایک دن کہا۔

''مہربانی ہے تمہاری جیلا لیکن ایک حسرت ہے۔''

''کیا میری جان۔''

''ایک بندہ۔ لگ رہا اس سے بدلہ ضرور لینا ہے۔''

''کون ہے چندا۔'' جیلا نے پوچھا اور شہریار نے مجید خان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا جیلا ہنسنے لگا تھا وقت کچھ اور گزرا پھر ایک دن جب وہ فضلا کے ساتھ موٹر سائیکل پر جا رہا تھا کہ اسے مجید خان نظر آ گیا وہ ایک اسٹور سے نکلا تھا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اور ایک گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑا تھا اس کی شان ہی بدلی ہوئی تھی۔

''استاد۔'' شہریار کے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

''خیر ہے کیا بات ہے۔''

''وہ نیلی گاڑی۔''

''ہاں کیا ہے اس میں۔''

''مجید خان۔'' وہ بولا اور فضلا نے موٹر بائیک نیلی کار کے پیچھے لگا دی رات کا وقت تھا ٹریفک بہت کم تھا وہ آرام سے مجید خان کا پیچھا کرنے لگے۔

''کیا کرنا ہے۔'' فضلا نے پوچھا اس کی زندگی بس یہیں تک تھی۔ شہریار نے خونخوار لہجے میں کہا۔ مجید خان ایک فلیٹوں کے علاقے میں رکا اور کار کھڑی کر کے آگے بڑھ گیا فضلا نے بھی بائیک پارکنگ میں کھڑی کر دی اور مجید خان کے پیچھے پیچھے چل پڑے مجید خان کو گمان بھی نہیں تھا کہ موت پیچھے آ رہی ہے اس نے ایک فلیٹ کی بیل بجائی اور دروازہ ایک خوبصورت سی عورت نے کھولا یہ دونوں سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

''ہاں کیا کہتے ہو۔'' فضلا بولا۔

''چلتا ہوں۔'' شہریار نے کہا۔ ''تم نگرانی رکھو۔''

''پرواہ مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' فضلا بولا اور شہریار آگے بڑھ کر فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا پھر اس نے کال بیل پر انگلی رکھدی دروازہ مجید خان نے ہی کھولا تھا شہریار نے چاقو ہاتھ میں سنبھال رکھا تھا دوسرے لمحے اس نے چاقو مجید خان کے پیٹ میں اتار دیا مجید خان کے چیخنے سے پہلے اس نے مزید دو وار اور کیئے پھر لات مار کر مجید خان کو اندر پھینک دیا اور خود دروازے سے اندر داخل ہو گیا مجید خان انہیں پر جا پڑا تھا۔

''ہاں میری جان پہچان لے اپنے شیری کو۔'' اس نے کہا اور جھک کر مجید خان کی ناک کاٹ لی پہچان گئے نا وہ دوبارہ بولا اس وقت عورت آ گئی جو شاید مجید خان کی بیوی تھی۔

''نہیں اگر تمہارے حلق سے آواز نکلی تو تم بھی ناک سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔''

یہ دھمکی سن کر عورت کی چیخ حلق میں ہی رک گئی شیر یار بولا۔

''کیا کروں تمہارا مجید خان سوچا تو یہ تھا کہ تمہیں اوپر بھیج دوں لیکن مزہ نہیں آئے گا چلو جیو اور یاد کرتے رہو کہ تم نے کسی بے گناہ کو جیل بھجوایا تھا میں نے اپنا قول پورا کر دیا ہے۔''

اس کے بعد وہ باہر نکل آیا تھا اور پھر وہ واپس چل پڑے۔

''مار دیا۔'' فضلا نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''خوش ہو۔''

''ہاں بڑی آرزو تھی۔''

''اب تو کوئی خلش دل میں نہیں رہ گئی۔''

''خلش۔'' اس کی آواز میں حسرت پیدا ہو گئی جو خلش اس کے دل میں تھی وہ تو زندگی کا حصہ تھی اس رات پھر عالیہ اس کے دل میں چبھنے لگی اور اس نے جی بھر کر شراب پی لیکن عالیہ ساری رات کسکتی رہی تھی۔

برائی جب قریب آتی ہے تو اسے دور کرنا بہت مشکل ہوتا ہے شہریار کے دل سے بھی سارے احساسات نکل گئے تھے وہ ماں باپ کو بہن کو بھول گیا تھا' ہاں اسے عالیہ یاد تھی عالیہ کا نقش اس کے دل میں ایسا بیٹھا تھا کہ نکالے نہ نکلتا اس نے عالیہ کو شراب میں ڈبونے کی کوشش کی لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہوا کبھی کبھی تو عالیہ اس کے دل میں بری طرح سلگتی تھی اب وہ شیری دادا بن گیا تھا ایک خطرناک مجرم قاتل اور نہ جانے کیا فضلا جیلا اور نہ جانے کون کون پر سب سیٹھ سکندر علی کے لیے کام کرتے تھے اور وہ انہیں اپنے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تعلقات کی وجہ سے کسی مشکل میں نہیں پڑتے دیتا تھا۔

ایک دن سکندر علی نے اسے طلب کرلیا اسے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

''یار تو شکل سے وہ نہیں لگتا جو تو ہے۔''

''میرا قصور نہیں ہے سر۔''

''ہاں مگر یہ بڑے کام کی بات ہے خیر چھوڑ کام کرنا ہے تجھے۔''

''حاضر سر حکم کریں۔''

''پتہ دے رہا ہوں تجھے میرے دوست ہیں شہباز دستی بہت بڑے سیٹھ ہیں ان کا کوئی کام ہے جو تجھے کرنا ہے۔''

''جی سر جی۔''

''کل ٹھیک بارہ بجے اس کے پاس پہنچ جاؤ۔ وہی بتائیں گے۔''

ٹھیک بارہ بجے وہ شہباز دستی کے آفس میں داخل ہو گیا شہباز دستی نے اسے دیکھ کر خشک لہجے میں کہا۔

''ہاں کون ہو تم۔ کیا بات ہے۔''

''سکندر علی نے بھیجا ہے مجھے۔''

''تمہیں۔''

''جی سر۔''

''آؤ بیٹھو۔ کیا سکندر نے مجھ سے مذاق کیا ہے۔''

''یہ تو وہی بتا سکیں گے سر۔''

''نہیں میرا مطلب ہے تمہیں معلوم ہے کہ میرا کام کیا ہے۔''

''نہیں سر۔''

''ایک بندے کو اڑانا ہے۔''

''اڑ جائے گا نام اور پتہ بتا دیں۔''

''کتنا معاوضہ لو گے۔''

''آپ سکندر صاحب کے دوست ہیں۔''

''ہاں۔''

''پھر یہ کام وہی کریں گے۔''

''نہیں تم بتاؤ۔''

''سوری سر۔ وہ ہمارے سرپرست ہیں اور آپ ان کے دوست معاوضے کا فیصلہ وہیں کریں گے آپ صرف ہمیں اس بندے کے بارے میں بتائیں۔''

''مجھے حیرت ہے کون تفتیش کرے گا کہ تم کس کو قتل بھی کر سکتے ہو پڑھے لکھے اور شریف آدمی جیسے لگتے ہو۔''

''لگتا ہوں مگر ہوں نہیں کسی کو قتل کرنے کی منزل تک پہنچتے پہنچتے نہ جانے خود کتنی بار قتل ہوتا پڑتا ہے۔''

''ہاں یہ انسان کی زندگی کی کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی ہے خیر یہ لو اس میں تمہاری محنت کا معاوضہ ہے۔'' سیٹھ شہباز نے ایک وزنی لفافہ اسے دیتے ہوئے کہا اور اس نے لفافہ جیب میں رکھ لیا۔ ''اور یہ اس کی تصویر، جسے تم شکار کرو گے۔''

شہریار نے تصویر دیکھی اور گردن ہلانے لگا۔ ''کہاں ملے گا۔''

''یہ بھی بتاتا ہوں لیکن ایک خاص بات اور ہے۔''

''بولیں۔''

''قتل کی یہ واردات ڈکیتی کی واردات لگنی چاہیے۔''

''ڈکیتی کی۔''

''ہاں۔''

''کیوں۔''

''قتل کا شبہ میری طرف بھی جا سکتا ہے کیونکہ حال ہی میں میرا اس سے جھگڑا ہو چکا ہے بہت سے لوگ اس کے گواہ ہیں۔''

''ٹھیک ہے اس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتائیں۔''

''وہ میرا بزنس پارٹنر ہے شاہد بیگ نام ہے میرے ساتھ فیکٹری میں بیٹھتا ہے شہباز اس کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بارے میں مکمل تفصیل بتانے لگا تفصیل سننے اور معلوم کرنے کے بعد شہریار وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔

تمام تر منصوبہ بندی کرنے کے بعد دوسرے دن شہریار اس خوبصورت پروجیکٹ پر پہنچ گیا جہاں شاہد بیگ رہتا تھا شاہد بیگ کا اپارٹمنٹ اس وقت لاک تھا اپارٹمنٹ کا تالا کھول لینا شہریار کے لیے معمولی بات تھی اس نے مہارت سے تالا کھولا اور اندر داخل ہو گیا فلیٹ میں اندھیرا تھا اس نے تمام روشیاں جلا لیں اور فلیٹ کی اندرونی سجاوٹ دیکھنے لگا بے حد شاندار فلیٹ تھا اور لگتا تھا کہ بے حد دولت مند شخص کی رہائش گاہ ہے خوب صورت صوفے دیدہ زیب قالین بڑے بڑے لیمپ البتہ دیوار پر صرف ایک تصویر لگی ہوئی تھی تیز روشنی میں اس نے اس حسین عورت کی تصویر دیکھی اور ان کا دل بند ہونے لگا۔

یہ عالیہ کی تصویر تھی۔

اس کی عالیہ کی۔

''عالیہ......'' اس کے منہ سے نکلا اور وہ آہستہ آہستہ تصویر کی طرف بڑھ گیا اس کے منہ سے آواز نکلی۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو عالیہ۔ بولو تم اتنے عرصہ کے بعد میرے سامنے کیوں آئی ہو اور اور مگر تم یہاں کیا کر رہی ہو تم جانتی ہو میں یہاں کیوں آیا ہوں اوہ آہ عالیہ تم...... تم اتنے عرصے کے بعد آخر کیوں تم یہاں کیوں ہو میں یہاں قاتل بن کر آیا ہوں ایک مجرم تمہارے سامنے ہے عالیہ آہ کیا یہ تمہارا گھر ہے تمہارے شوہر کا گھر کون ہے تمہارا شوہر کیا شاہد بیگ اگر ایسا ہے تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہے تقدیر نے مجھے اس شخص سے انتقام لینے کا موقع دیا ہے میں نے تمہیں مجھ سے چھین لیا تھا آج میں اس سے اس کی زندگی چھین لوں گا۔''

وہ جنون میں بکتا گیا پھر اچانک اسے ایک خیال آیا کیا واقعی یہ عالیہ ہی کی تصویر ہے اس سے ملتی جلتی کوئی اور بھی ہو سکتی ہے۔

اب کیا کروں۔

وہ سوچتا رہا تصویر کو گھورتا رہا پھر اس کی نظریں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں کوئی اور تصویر کوئی اور ثبوت اور یہ ثبوت اسے بیڈ روم کی ایک الماری سے مل گیا یہ تصویروں کا البم تھا عالیہ اور شاہد بیگ کی شادی کا البم۔

اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اس البم میں عالیہ اور شاہد کی شادی کی تصویریں تھیں اس کے گھر والوں کی تصویریں بھی تھیں شہریار پر سکوت سی کیفیت طاری ہو گئی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اسے وہ رات یاد آ گئی جب وہ صبح تک پتھر کے بت کی طرح کھڑا انتظار کرتا رہا تھا اور وہ نہیں آئی تھی۔

آہ کس قیامت کی رات تھی۔

کس قدر جان لیوا انتظار تھا۔

اور پھر صبح ہو گئی تھی۔

لیکن ایک تاریک صبح جس نے سب کچھ چھین لیا۔

اس کا شہر۔

ماں باپ۔

عشنا۔ بہن۔

گھر۔ جہاں سارا بچپن گزرا تھا۔

پانچ سال ہو گئے تھے دنیا بدل گئی تھی لیکن اب تک ان سے عالیہ کی یاد نہیں نکلی تھی وہ اب بھی اسے اتنا ہی چاہتا تھا وہ شاہد اور عالیہ کی شادی کی تصویریں دیکھتا رہا اور اس کی آنکھوں سے [illegible] چھایا قیامت گزر گئی تھی اس کے دل پر

رشتہ منظور ہو گیا تھا کہ [illegible]

سے آ گیا اور عالیہ اس سے چھن گئی [illegible]

تھا جس نے دولت کے بل پر عالیہ اس سے چھین لی تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس نے جیب سے چاقو نکالا اور پھر اس نے شاہد کی ایک ایک تصویر کو چاقو سے گود کر رکھ دیا اب عالیہ کے ساتھ اس کی کوئی تصویر سلامت نہیں رہی تھی' اچانک بیرونی دروازے پر ایٹ ہوئی اندر آنے کی آواز سنائی دی اور کوئی سیٹی بجاتا اندر آنے لگا پھر۔ والا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

سامنے شہریار چاقو سنبھالے خونی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شاہد کا چہرہ خوف سے بگڑ گیا اس نے پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی تو شہریار چھلانگ لگا کر اس پر جا پڑا اس کے دو تین گھونسوں نے شاہد کے حواس چھین لئے تب شہریار نے اسے ایک کرسی پر بٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیے۔

''کک کون ہو تم اور یہ...... یہ تصویریں۔''

اس نے فرش پر پڑی تصویروں کے ٹکڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم ڈاکو ہو۔''

''ڈاکو...... ڈاکو میں نہیں تم ہو۔'' شہریار غرایا۔

''ہیں۔ کیا مطلب۔'' وہ بولا۔

''تم عالیہ کے شوہر ہو۔''

''ایں۔'' وہ چونک پڑا۔ ''تم عالیہ کو کیسے جانتے ہو۔''

''وہ میرا پیار تھی وہ مجھے زندگی سے زیادہ پیاری تھی اور تم نے میری زندگی مجھ سے چھین لی تم دبئی سے لوٹنے والے کس سے کیا کیا چھین لیتے ہو تم نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔''

''لیکن پانچ سال ہو گئے میری شادی کو اور تم اب۔ تم اب مجھ سے بدلہ لینے کے لیے آئے ہو۔''

''پانچ سال بعد میری۔ یہ خوبصورت موقع عطا کیا ہے۔''

''اوہ ایک بات بتاؤ۔''

''ہاں پوچھو میری جان پھر مجھے بھی تم سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔''

''کیا تمہارا نام شہریار ہے۔''

''ہاں تم نے یہ نام کیسے سنا۔''

''مجھے عالیہ نے ہی تمہارے بارے میں بتایا تھا۔''

''کیا کہا تھا میری روح نے۔''

''بس اتنا کہ تم اس کے پڑوس میں رہتے تھے اور اچانک گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔''

''بس۔''

''ہاں تمہارے والدین بہت غمزدہ تھے۔''

''اور...... اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی زندگی تھے ایک دوسرے کے ساتھ جیتے تھے پھر تم ہماری جنت میں سانپ بن کر آ گئے۔''

''نہیں دوست مجھے تمہاری محبت کا پتہ نہیں تھا۔ میرا قصور نہیں ہے اگر بات مجھے پتہ چل جاتی تو میں خود تم دونوں کی شادی کراتا لیکن عالیہ ہمیشہ مجھ سے دور رہی آج مجھے پتہ چلا کہ وہ کیوں۔ اس قدر اداس رہتی ہے لیکن ایک بات بتاؤ۔''

''پوچھو۔''

''تم یہاں ڈاکہ ڈالنے آئے ہو۔ یا مجھ سے اپنے پیار کا بدلہ لینے۔''

''میں تمہیں قتل کرنے آیا ہوں لیکن اس کی وجہ کچھ اور ہے۔''

''بتاؤ گے۔''

''ہاں سیٹھ شہباز دستی نے تمہارے قتل کی سپاری دی ہے۔''

''اوہ۔ مجھے اس کمینے سے یہی امید تھی دیکھو۔ زندگی موت اللہ کے ہاتھ ہے زندگی جانے کے لیے آئی ہے لیکن تم ایک برے انسان کے لیے میری زندگی لے رہے ہو۔ میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں جواب دو گے۔''

''بولو۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''تمہیں عالیہ سے اب بھی محبت ہے۔''

''ہاں اپنی روح سے محبت کبھی کم ہوتی ہے۔''

''پھر تم مجرم کیوں اور کیسے بن گئے محبت تو دلوں میں رحم پیدا کرتی ہے۔''

''تقدیر نے مجھے اس راستے پر لا ڈالا ہے۔''

''ایک بات اور بتاؤ۔''

''ہوں۔''

''تم نے اب تک یہ نہیں پوچھا کہ عالیہ کہاں ہے۔''

''اپنے والدین کے گھر گئی ہوگی۔''

''ہاں وہ وہیں ہے آج مجھے پتہ چلا ہے شہریار کہ وہ آج تک تمہیں چاہتی ہے ہم دونوں کبھی میاں بیوی نہیں بن سکے کیونکہ اس کے دل میں تم تھے......اور......ہو اور بس تمہیں شہباز دستی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ضرور بتاؤ تمہاری اس سے کیا دشمنی ہے۔''

''وہ میرا پرانا دوست ہے کالج کے زمانے کا ساتھی۔ میں نے دبئی میں بڑی دولت کمائی پھر پاکستان آ گیا یہاں میری شادی کا سلسلہ چل پڑا میں نے شہباز دستی کے ساتھ مل کر ایک فیکٹری قائم کی میرے پاس سرمایہ تھا اس کے پاس تجربہ کاروبار میں میرا حصہ پچھتر فیصد تھا اور اس کا پچیس فیصد۔ ہم نے سخت محنت کر کے اپنے کاروبار کو بہت آگے بڑھا لیا ہے لیکن اب شہباز دستی کی نیت خراب ہو چکی ہے وہ پورے کاروبار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور۔''

''اور کیا۔''

''کہتا ہے اپنا سرمایہ واپس لے کر فیکٹری سے دور ہو جاؤ لیکن کچھ اور بھی عوامل ہیں جن کی وجہ سے وہ ایسا ہو گیا ہے۔''

''مثلاً۔''

''عالیہ۔''

''کیا مطلب۔'' شہریار کا سانس رک گیا۔

''عالیہ بھی اس میں ملوث ہے۔''

شہریار کا ذہن ہوا میں اڑنے لگا اس نے چاقو کھول لیا اور خونی نظروں سے شاہد بیگ کو گھورنے لگا۔

''مجھے اندازہ تھا کہ تم یہ سن کر برا مان جاؤ گے لیکن پوری بات سن لو۔ عالیہ نے مجھ سے بے وفائی نہیں کی بلکہ شہباز دستی نے عالیہ پر نیت خراب کی اور مجھے اپنے راستے صاف کرنے کے لیے تمہیں میرے قتل پر مجبور کیا۔''

''عالیہ کا کیا رویہ رہا۔''

''وہ ایک پاکباز لڑکی ہے یقین کرو اگر وہ آج بھی تم سے محبت کا اقرار کرے تو میں اس سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔''

''یعنی۔''

''میں اس کی اور تمہاری محبت کو یکجا کر دوں اس کے پس پردہ ایک اور خواہش بھی ہے۔'' شاہد بیگ نے کہا۔

''کیا۔''

''ظاہر ہے پھر تم مجھے قتل نہیں کرو گے لیکن افسوس آج وہ یہاں نہیں ہے۔''

''تو کیا تم۔''

''ہاں میں آج تک اس کا شوہر نہیں بن سکا میں اسے طلاق دے کر تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔''

''کیا۔'' شہریار کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''عالیہ کبھی میری نہیں ہو سکی۔ میرا خیال تھا وہ میری عمر سے منحرف ہے مگر اب مجھے اس کی حقیقت معلوم ہو گئی ہے چنانچہ میں تم سے سودا کر سکتا ہوں۔''

''سودا۔''

''ہاں سودا' مجبوری کا سودا۔'' شاہد بیگ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اداس لہجے میں بولا۔ ''لیکن میں نے لفظ سودا بلاوجہ نہیں کہا۔''

''کیا مطلب۔''

''کیا تم عالیہ کو حاصل کر کے اپنی مجرمانہ زندگی ختم کرو گے۔''

''میں اس کے لیے زندگی ختم کرنے کو تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے عالیہ کو حاصل کرنے کے لیے تمہیں آخری جرم کرنا ہوگا تبھی عالیہ تمہیں مل سکتی ہے۔''

''آخری جرم۔''

''ہاں۔''

''وہ کیا۔''

''تمہیں شہباز دستی کو ختم کرنا پڑے گا۔ اس کے لیے میں تمہیں اس رقم سے چار گنا زیادہ رقم دے سکتا ہوں جو اس نے تمہیں دی ہے۔''

شہریار کھو سا گیا عالیہ کے حصول کے لیے وہ سب کچھ کرسکتا تھا اسے رقم کی ضرورت نہیں تھی اسے بس عالیہ درکار تھی محبت کبھی کبھی ایسے رنگ بھی اختیار کر لیتی ہے پھر اس نے کہا۔ ''مجھے تمہاری بات پر بھروسہ کیسے ہو۔''

''طلاق نامہ' میں ابھی تمہیں لکھ کر دے سکتا ہوں لیکن تمہیں شہباز دستی کو ختم کرنا ہوگا عالیہ اس وقت تمہیں ملے گی۔''

''میں تیار ہوں۔'' شہریار نے کہا اور شاید بیگ کے ہاتھ کھولنے لگا۔

واپسی میں وہ عالیہ کی قربت کے نشے میں سرشار جب فلیٹ میں داخل ہوا تو اسے احساس ہوا کہ کوئی اندر موجود ہے اس نے جلدی سے خنجر نکال کر ہاتھ میں لے لیا سامنے کے کمرے میں روشنی تھی وہ آہستہ آہستہ اس کمرے کی طرف بڑھنے لگا اندر جو کوئی موجود تھا اسے بھی کسی کے فلیٹ میں آنے کا احساس ہوگیا لیکن روشنی بند نہیں ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔

شہریار حملہ کرنے کی پوزیشن میں آ گیا لیکن اس وقت اسے فضلا کی آواز سنائی دی۔ ''اوئے شیر دل' اوئے شیر دل میں ہوں یار میں ہوں۔'' شہریار نے خنجر والا ہاتھ نیچے کر لیا۔

''تم۔'' وہ بولا۔

''ہاں نا جانی تیری نئی بھابی کے ساتھ۔''

''اندر کیسے آ گئے۔''

''او بھول گیا دوسری چابی میرے پاس ہے۔''

''اوہ کہاں ہے نئی بھابی۔''

''اندر ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے میں اپنے بیڈ روم میں جا رہا ہوں۔''

''اوئے نہیں جانی تیرے ساتھ چائے پیوں گا۔''

''ٹھیک ہے چائے بنائی ہے کیا۔''

''او نہیں بھائی اب تو میرے لیے چائے بھی نہیں بنائے گا۔''

''ٹھیک ہے بناتا ہوں ڈرائنگ روم میں آ جانا تھوڑی دیر کے بعد۔'' شہریار نے کہا اور فضلا نے اندر جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

فضلا کے بڑے احسانات تھے اس پر' اسے فضلا کے اعمال سے غرض نہیں تھی' وہ شرابی تھا عیاش تھا شہریار کو اس سے بھی اختلاف نہیں تھا وہ جانے اور اس کا کام' فضلا کے کئی بار اسے بھی عیش کوشی کی دعوت دی تھی لیکن یہاں وہ عالیہ سے مخلص تھا اس نے عالیہ کو اپنے دل میں بسا رکھا تھا وہ اس کے خیال سے غداری نہیں کر سکا تھا اس لیے اس نے فضلا کی کوئی پیشکش قبول نہیں کی تھی۔

اور آج...... اسے اس کی وفا کا صلہ مل گیا تھا اچھا ہوا اس نے جلد بازی نہیں کی اور شاہد بیگ کو دیکھتے ہی ٹھکانے نہ لگا دیا ورنہ عالیہ کی کہانی راز میں رہ جاتی شاہد بیگ اچھا آدمی تھا اس کے عالیہ کی محبت کی قدر کی تھی اور آخرکار۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

آخر کار۔ اسے زندہ رہنا چاہیے وہ میرا اور عالیہ کا محسن ہے۔ بہت بڑی قربانی دے رہا ہے وہ ہم دونوں کے پیار کے لیے۔

اس نے چائے تیار کی اور ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا کچھ دیر کے بعد فضلا بھی مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔

''کیا زبردست خوشبو آ رہی ہے چائے کی۔''

''بیٹھو......'' اس نے کہا اور فضلا بیٹھ گیا۔

''ہاں جانی۔ تم سناؤ۔''

''بہت بڑی خوش خبری ہے۔'' شہریار نے کہا۔

''اوئے زبردست جانی۔'' فضلا نے چائے کی پیالی اپنی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

''مجھے عالیہ مل گئی۔'' شہریار خوشی کے عالم میں بولا اور فضلا کے ہاتھ سے چائے کی پیالی ہل گئی' عالیہ کے بارے میں اسے تفصیل معلوم تھی۔

''کیا۔'' وہ حیرت سے بولا۔

''ہاں یار مجھے میری زندگی مل گئی۔''

''او میری جان۔ تو میرا میں تیری خوشی میں شریک ہوں۔ کہاں مل گئی۔ کیسے مل گئی مجھے بتا تو سہی۔'' فضلا واقعی خوش ہو گیا۔

''میں......شاہد بیگ کو ٹھکانے لگانے گیا تھا مگر شاہد بیت وہی بندہ نکلا جو دبئی سے آ گیا تھا اور اس نے عالیہ کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ عالیہ اس کی بیوی ہے۔''

''وہ مارا۔ پھر تو تو نے اس ماں کے۔ کے ٹوٹے کر دیے ہوں گے۔''

''نہیں۔''

''ایں۔ چھوڑ دیا ہے۔''

''ہاں۔''

''کیوں۔''

''وہ تو بڑے کام کا بندہ تھا۔''

''کیسے۔'' فضلا نے پوچھا اور شہریار نے

پوری کہانی سنانے لگا اس نے شہباز دستی کی پوری کہانی بھی اسے سنا دی اور وہ طلاق نامہ بھی فضلا کو دکھایا جسے دیکھ کر فضلا بہت حیران ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

''کیا بات ہے۔'' شہریار نے پوچھا۔

''یار گڑبڑ ہو گئی۔''

''ایں......کیا۔''

''تم شہباز دستی کو قتل کر دو گے۔''

''ہاں۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے۔''

''مگر وہ سکندر سیٹھ کا گہرا دوست ہے اور تم جانتے ہو کہ ہم سکندر علی کے گروپ کے بندے ہیں اور وہ ہماری پشت پناہی کرتا ہے۔''

شہریار خاموش ہو گیا پھر اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اس نے اوندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''فضلا۔ یہ میری زندگی کی پہلی خوشی ہے میرے دوست۔ میں نے آج تک زندگی ترس ترس کر گزاری ہے۔ تڑپتا ترستا رہا ہوں میں زندگی بھر۔ عالیہ مجھے مل رہی ہے مجھے میری کائنات مل جائے گی سب کچھ چھوڑ دیا ہے میں نے عالیہ کے لیے سب کچھ۔''

اس کی سسکیاں جاری ہو گئیں اور فضلا جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''ارے۔ ارے میری جان۔ ارے ارے تیری آنکھوں میں آنسو ارے میرے یار۔''

''ماں باپ' بہن بھائی سب چھوٹ گئے فضلا بھائی عالیہ کے لیے اور اب وہ مجھے ملی ہے تو......تو میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔''

''بھائی کہہ دیا تو نے سرے۔ بھائی کہہ دیا ارے پاگل میں بھی تو ترسا ہوں ساری زندگی کسی سے بھائی کا لفظ سننے کے لیے۔ بھائی کہہ دیا تو نے۔ اب کسی کی مجال ہے کہ میرے بھائی کا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دل توڑے۔''
فضلا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے دیر تک دونوں تاثر میں ڈوبے رہے پھر فضلا نے کہا۔
''میں تجھے نئی زندگی کی مبارک باد دیتا ہوں۔ اور سن۔ اب شہباز دستی کو تو نہیں میں ٹھکانے لگاؤں گا۔''
''نہیں بھائی فضلا۔ یہ آخری کام مجھے دیانت داری سے کرنے دے۔''
''میری بات سن شیری۔''
''جی بھائی۔''
''وہ بہت شاطر ہے تجھے کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔''
''نہیں بھائی۔ یہ کام مجھے ہی کرنے دو۔''
شہریار نے کہا اور فضلا خاموش ہو گیا۔
حسب پروگرام شہریار اس وقت شہباز دستی کے آفس میں داخل ہوا جب وہ تنہا تھا شہباز کسی سے فون پر بات کر رہا تھا شہریار کو دیکھ کر اس نے فون بند کر دیا اور مسکرا کر بولا۔
''آؤ شیری یقیناً تم شاہد بیگ کی موت کی خوشخبری لائے ہو۔''
''نہیں شہباز دستی۔'' شہریار نے جیب سے چاقو نکال کر اسے کھولتے ہوئے کہا اور شہباز کو کسی خطرے کا احساس ہو گیا اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
''کک۔ کیا مطلب۔''
''کھیل بدل گیا۔ شہباز سیٹھ۔''
''کیا کہنا چاہتے ہو۔''
''یہ کہ شاہد بیگ کے بجائے اب تمہیں مرنا ہوگا۔''
''کیا بکواس کر رہے ہو۔''
''تمہیں تمہاری موت کی خوشخبری دے رہا ہوں۔''
''لیکن کیوں۔'' شہباز دستی نے چالاکی سے میز کی دراز سے موبائل فون نکالنے کی کوشش کی تو شہریار غرا کر بولا۔
''اپنی زندگی کو اور کم کرنے کی کوشش مت کرو مسٹر شہباز۔ دونوں ہاتھ میز پر رکھ لو۔'' یہ کہہ کر شہریار نے چاقو حملہ کرنے کے انداز میں پکڑ لیا اور شہباز دستی نے گھبرا کر دونوں ہاتھ میز پر سامنے رکھ دیے پھر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔
''لیکن میں نے تمہیں۔''
''ہاں بولو میں تمہیں بات کرنے کی مہلت دے رہا ہوں۔''
''میں نے تمہیں اسے قتل کرنے کا بھاری معاوضہ دیا ہے۔''
''میں تمہیں وہ رقم واپس بھی کر سکتا ہوں لیکن اب کیا کرو گے موت کے بعد وہ رقم تمہارے کس کام آئے گی اسے میرے پاس ہی رہنے دو۔''
''آخر تمہارا مائنڈ کیسے بدل گیا مجھے بتاؤ تو سہی۔''
''میں یہ چاقو پھینک کر تمہیں قتل کر سکتا ہوں۔ اس میں ایک لمحہ نہیں لگے گا چاقو تمہارے حلق میں پیوست ہو جائے گا۔''
''مگر مجھے میری موت کی وجہ تو بتا دو۔''
''مجھے باتوں میں لگا کر تم کوئی چالاکی کرنے کی کوشش کرو گے تو فوری موت کے شکار ہو جاؤ گے۔''
''میں ایسا نہیں کروں گا۔''
''شاہد بیگ نے تمہارا کچا چٹھا مجھے بتا دیا ہے۔''
''آہ گویا اس نے تمہیں الٹا میرا دشمن بنا دیا۔''
''یہ سمجھ۔''
''وہ بہت شاطر ہے شیری آخر کار اس نے تمہیں بھی بے وقوف بنا دیا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''اس نے نہیں تم نے دنیا کو بے وقوف بنا دیا ہے وہ ایک شریف اور بے ضرر آدمی ہے۔''

''بے ضرر۔'' شہباز نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

''ہاں بے حد شریف۔''

''ہاں وہ اتنا شریف اور بے ضرر ہے کہ اس ظالم نے اپنی معصوم اور خوب صورت بیوی تک کو سسکا سسکا کر ہلاک کر دیا۔''

''ویری گڈ۔ نئی کہانی۔'' شہریار ہنس پڑا۔

''کہانی نہیں ایک ایسا سچ جسے دنیا جانتی ہے۔'' شباز دستی نے کہا۔

''اور دنیا یہ نہیں جانتی کہ تم نے اس کی بیوی کو اپنے جال میں پھانسنا چاہا تھا یہیں سے تم دونوں کی دوستی میں جال پڑا۔''

''کیا اس نے تمہیں یہ کہانی سنائی ہے۔''

''یہ کہانی ہے۔'' شہریار نے طنزیہ کہا۔

''ہاں شیری صرف کہانی۔ اس کی معصوم بیوی اب اس دنیا میں نہیں ہے وہ منوں مٹی کے نیچے سو رہی ہے۔''

شہریار کا دل جیسے بند ہونے لگا اس کے پورے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔ آہ یہ مردود کیا بک رہا ہے شہباز دستی پھر بولا۔

''میں تمہیں اس کی قبر بھی دکھا سکتا ہوں جس پر اس نے بڑا۔ کتبہ لگوایا ہے۔''

''بکواس مت کرو۔'' شہریار حلق پھاڑ کر چیخا۔ اور شباز دستی حیرت سے اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

''تم اس کی بیوی کے تذکرے پر اس قدر حواس باختہ کیوں ہو گئے۔''

''پلیز۔ یہ بکواس مت کرو۔ پلیز۔ مجھے بتاؤ تم جھوٹ بول رہے۔''

''مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے شہری کیا اس کی بیوی سے تمہارا کوئی رشتہ تھا، او کرم بیٹھ جاؤ میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا۔''

''دیکھو۔ دیکھو۔ میں یہ چاقو تمہاری گردن پر پھیر دوں گا میں تمہارے ٹکڑے کر دوں گا مجھے بتا دو تم جھوٹ بول رہے ہو وہ تو بہت اچھا آدمی ہے اس نے میرے لیے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے یہ دیکھو طلاق نامہ۔''

شہریار نے طلاق نامہ اس کے سامنے کر دیا۔

شہباز دستی نے طلاق نامہ دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے پھر اس نے کسی قدر زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اب تم بیشک مجھے قتل کر دو ورنہ میں تمہیں ایک افسوسناک کہانی سنا دوں گا۔''

''کیسی کہانی بتاؤ۔ پلیز بتاؤ۔''

''تمہارا نام شہریار ہے نا۔''

''ہاں۔'' شہریار نے دھڑکتے دل سے کہا۔

''اس کی بیوی کا نام عالیہ تھا۔''

''تھا نہیں ہے۔'' شہریار بولا۔

''نہیں شہریار عرف شہری۔ ہے نہیں تھا۔''

''تم بکواس بند نہیں کرو گے کیا مطلب ہے تمہارا۔''

''چلو بند کیے دیتا ہوں تمہاری مرضی۔''

''ٹکڑے کر دوں گا سمجھے ٹکڑے کر دوں گا تمہارے۔'' شہریار نے شدید جنوب کے عالم میں لمبا تیز دھار چاقو شہباز دستی کے نرخرے پر رکھ دیا۔

''اپنے بارے میں سنو' تم شاہد بیگ کی بیوی عالیہ کے پڑوسی تھے پھر تم دونوں کے درمیان عشق ہو گیا تمہاری عالیہ سے شادی ہونے والی تھی لیکن اچانک شاہد بیگ درمیان میں ٹپک پڑا اور عالیہ کے والدین نے دولت کی ریل پیل سے چکاچوند ہو کر عالیہ کی شادی عمر رسیدہ شاہد بیگ سے کر دی۔ کیا سمجھے۔ یہ جھوٹ ہے۔''

''نہیں۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''اور تم وہی شہریار ہو۔''

''ہاں۔ آگے بولو۔''

''چاقو میری گردن کاٹ رہا ہے۔ اسے ہٹاؤ۔''

''ایک شرط پر۔''

''کیا۔''

''تم صرف سچ بولو گے۔''

''تمہاری شناخت میرا سچ نہیں ہے۔''

''ہاں۔''

''تب میں آگے بھی سچ بولوں گا چاقو ہٹاؤ۔'' شہریار نے جلدی سے چاقو شہباز کی گردن سے ہٹالیا تو اس نے کہا۔ ''یہ طلاق نامہ بہت بڑا فراڈ ہے اس نے جان بچانے کے لیے تمہارے ساتھ یہ فریب کیا ہے جبکہ تمہارے اور عالیہ کے عشق کی کہانی سن کر اس نے عالیہ سے بھیانک انتقام لیا شادی کے بعد وہ کبھی اپنے میکے نہیں جاسکی اس نے چار سال شدید اذیت میں گزارے اور پھر زندہ نہ رہ سکی اور سسک سسک کر مرگئی۔''

''خدا کے لیے۔ یہ مت کہو۔''

''وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔ شاہد اسے ہفتوں بھوکا پیاسا رکھتا تھا شدید اذیتیں دیتا تھا۔''

''نہیں پلیز نہیں۔''

''بہت سے لوگ گواہ ہیں فیکٹری کے ملازم بھی۔ تم چاہو تو میں انہیں بلا کر عالیہ کی موت کی تصدیق کرا سکتا ہوں۔''

''نہیں۔'' شہریار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

شام کو شہریار گھر پہنچا تو فضلا اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ شہریار کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ رنگ زرد تھا اور وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔

''ارے خیر ہے جانی۔ تمہیں کیا ہوا۔''

''برباد ہوگیا یار۔ تقدیر نے ایک بار پھر چرکہ لگا دیا۔ سب کچھ ختم ہوگیا۔''

''مجھے بتاؤ تو...... کیا ہوا۔''

''اس نے بہت بڑا دھوکہ کیا ہے میرے ساتھ۔''

''کس نے۔''

''شاہد بیگ نے۔''

''ایں۔ کیسے کیا طلاق نامہ۔''

''جسے اس نے طلاق دی ہے وہ اب اس دنیا میں ہی نہیں ہے۔''

''کیا۔'' فضلا اچھل پڑا۔

''عالیہ کو مرے ہوئے ایک سال گزر چکا ہے۔''

''کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔'' فضلا سر کھجاتا ہوا بولا۔

''ہاں یار۔ اس نے میری عالیہ کو مار دیا۔'' شہریار ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا پھر اس نے ساری کہانی فضلا کو سنا دی۔

''یہ تمہیں شہباز نے بتایا ہے۔''

''ہاں۔''

''ممکن ہے اس نے بھی اپنی جان بچانے کے لیے یہ کہانی گھڑی ہو۔''

''نہیں ہر بات کی تصدیق ہوگئی ہے بہت بری طرح اذیت دی ہے شاہد نے اسے۔ بہت بڑی سزا ملی ہے اسے۔ مار دیا اس نے میری عالیہ کو۔ مرگئی میری عالیہ۔''

''حوصلہ کرو شہری میرے یار۔ تمہاری عالیہ تو اس دن مرگئی جب تم ساری رات اس کا انتظار کرتے رہے اور وہ نہ آئی۔''

''وہ بے وفا نہیں تھی مجبور تھی۔''

''اس کی مجبوری نے تم سے سب کچھ چھین لیا شہری۔''

''میں اس سے شکایت کرنے جارہا ہوں فضلا میرے بھائی۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''کک ...... کیا ...... کہاں۔''
''اس دنیا میں۔ جہاں وہ چلی گئی ہے۔''
''کیا فضول بات کر رہے ہو۔'' فضلا تڑپ کر بولا۔
''ہاں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا میں۔ یہ اس سے بے وفائی ہو گی۔''
''اور شاہد بیگ ...... اس کا قاتل۔''
''اسے بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ عالیہ کی عدالت میں۔ وہ روپوش ہو گیا ہے لیکن میرا نام بھی شہریار ہے ڈھونڈ لوں گا اسے۔ کتے کی موت ماروں گا اسے۔ ایسی موت کہ اس نے خواب میں بھی نہ سوچا ہو گا۔''
''میری بات سنو شہری۔''
''میرے دوست۔ میرے بھائی۔ مجھے دعا دو کہ میں اپنی عالیہ کے قاتل کو تلاش کروں۔''
اس کی لگن سچی تھی کہ صرف تین دن کے بعد ہی شاہد بیگ اسے نظر آ گیا وہ ایک ہوٹل میں داخل ہوا تھا اور شہریار نے اسے دیکھ لیا تھا۔
پھر کئی گھنٹے شہریار کو انتظار کرنا پڑا۔ البتہ وہ اس کی کار کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا تھا اسے کام اب اس کے لیے مشکل نہیں تھے۔ پھر شاہد بیگ واپس آیا اور کار میں بیٹھ کر چل پڑا۔ شہریار کو اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں جا رہا ہے لیکن ایک سنسان سڑک پر وہ سیٹوں کے درمیان سے نکل کر سیدھا ہو گیا اور اس نے سیٹوں کی نال شاہد کی گدی پر رکھ دی۔ شاہد کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہک گئے تھے۔
''چلتے رہو۔ چلتے رہو میری جان۔ گاڑی مت روکنا۔''
''تت تم ...... شہری ...... شہریار۔''
''عالیہ کا شہریار۔''
''مم مگر یہ کیا ہے۔''
''پستول۔''
''میری گردن پر کیوں ہے۔''

اندازِ فکر

سوال: آپ کے شوہر کیسے ہیں مسز کولن؟
جواب: بہت بیمار ہیں انہیں خون کی کمی کی شکایت ہے۔ ان کے جسم میں خون اتنا کم ہے کہ اگر کبھی رات کو دیر تک جاگتے ہیں تو اگلی صبح صرف ایک آنکھ سرخ ہوتی ہے۔

☆☆☆

سوال: میں نے سنا ہے آپ کے شوہر کسی حادثے کا شکار ہو گئے تھے؟
جواب: ہاں اور اس حادثے میں ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہوا یہ کہ انہوں نے کھلے مین ہول میں پہلے سگریٹ پھینکا اور عادتاً جوتے کی نوک سے اسے بجھانے کی کوشش کی تھی۔

☆☆☆

ایک استاد نے بچوں کو ہمارے ماں باپ کے عنوان سے مضمون لکھنے کے لیے دیا۔ ایک بچے نے کچھ اس طرح سے لکھا ہوا تھا۔
''ہمارے ماں باپ ہمیں اس وقت ملتے ہیں جب وہ بڑے ہو چکے ہوتے ہیں لہٰذا ان کی عادتوں کو بدلنا ہمارے لیے مشکل ہوتا ہے۔''

☆☆☆

ایک مرتبہ میاں بیوی دونوں ایک ساتھ بیمار ہو گئے مثلاً پیٹ میں درد، چکر آنا، متلی وغیرہ۔ ڈاکٹر کے خرچے سے بچنے کی خاطر دونوں میاں بیوی نے یہ طے کیا کہ دونوں میں سے ایک ڈاکٹر کے پاس جائے۔ انہوں نے ٹاس کیا اور فیصلہ بیوی کے حق میں ہوا۔
ڈاکٹر سے ملاقات کے بعد واپسی پر جب شوہر نے بیوی سے پوچھا کہ ڈاکٹر نے کیا کہا تو بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ''ڈاکٹر کی تشخیص کے مطابق ہم دونوں امید سے ہیں۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''عالیہ کا خون تمہاری ہی گردن پر ہے۔ اپنے فلیٹ پر چلو۔''

کچھ دیر کے بعد شہریار شاہد بیگ کو پستول کے۔فلیٹ میں داخل ہوگیا۔اندر پہنچ کر روشنیاں جلائیں اور پھر ایک زوردار لات شاہد کی کمر پر رسید کی اور شاہد اچھل کر دور جا گرا۔

''آخر...... آخر......'' اس کے منہ سے نکلا۔موت کے سائے اس کے چہرے پر رقصاں ہو گئے تھے۔

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے شہریار۔''

''عالیہ کہاں ہے۔'' شہریار غرایا۔

''میکے۔میکے گئی ہے وہ۔''

''افسوس۔میکے تو تم نے اسے ایک بار بھی نہیں جانے دیا۔''

''اس مکار شہباز نے تمہیں یہ کہانی سنائی ہو گی۔''

''نہیں اس نے نہیں بہت سے لوگوں نے۔تم میری اس سے بات کرا سکتے ہو لو میرے فون سے اس کا نمبر ملاؤ۔بات کراؤ میری اس سے۔''

''میری بات تو سنو۔''

''ساری باتیں سن لی ہیں میں نے بس اب دیر نہ کرو۔ہم دونوں عدالت عالیہ میں چل رہے ہیں وہیں چل کر باتیں کریں گے۔''

شہریار نے پستول جیب میں رکھ کر چاقو نکا لیا اور شاہد لرز گیا۔

''شہریار...... مجھے معاف کر دو۔میں تمہیں اتنی دولت دوں گا کہ......'' ابھی شاید نے اتنا ہی کہا تھا کہ شہریار باز کی طرح جھپٹا اور اس نے شاہد کو دبوچ لیا پھر اس کی قمیص کی آستین کاٹی اور اسے رول کر کے شاہد کے حلق میں ٹھونس دیا۔

اب شاہد صرف اشاروں سے اس سے معافی مانگ رہا تھا۔زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا تب شہریار نے اس کے بازو میں چاقو پیوست کر دیا اور اسے چیرتا چلا گیا۔شاہد بری طرح تڑپنے لگا تھا۔

''تم نے اسے بھوکا رکھا تھا۔''

شاہد نفی میں گردن ہلانے لگا تھا۔

''مارا بھی ہوگا۔''

''اور......اور۔''

Pakistanipoint

ہر جملے کے ساتھ وہ شاہد کے جسم پر چاقو کے وار کرتا جا رہا تھا اور شاہد کے جسم سے خون کی دھاریں پھوٹ رہی تھیں لیکن شہریار کا جنون ختم نہیں ہو رہا تھا۔

Waqar Azeem

''ٹھیک ہے نا عالیہ۔دیکھو بس میرے آنے کی دیر تھی۔سارے بدلے چکا دیتا ہوں میں تمہارے۔'' شہریار پر جنون طاری تھا اس کے لہو میں وحشتیں ناچ رہی تھیں اس کے ہاتھ میں دبا چاقو وحشیانہ انداز میں شاہد بیگ کے جسم کو چھلنی کر رہا تھا۔وہ ہر ضرب کو لگاتے ہوئے مسکرا کر عالیہ کی تصویر کو دیکھتا تھا۔

''ٹھیک ہے نا عالیہ۔ٹھیک ہے نا میری زندگی' چار سال اذیتیں برداشت کی ہیں نا تم نے میرے لیے دیکھو۔میں اس سے تمہارا بدلہ لے رہا ہوں۔دیکھو عالیہ کیا پھڑ پھڑا رہا ہے یہ۔''

شاہد کا جسم سرد ہو گیا لیکن شہریار کی وحشت کم نہیں ہو رہی تھی۔اس نے شاہد کے جسم کا قیمہ کر کے رکھ دیا تھا۔ایک انچ کی جگہ بھی نہیں چھوڑی تھی۔پھر وہ خود بھی تھک گیا اور اس نے غور سے شاہد کو دیکھا۔

''ارے یہ تو چل بسا مجھ سے پہلے تمہارے پاس پہنچ گیا نہیں میری جان اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں بس ایک منٹ میں آ رہا ہوں۔آیا میں۔'' اس نے چاقو پھینک کر جیب سے پستول نکالا اس کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM